آرزوئے حسن

آرزوئے حُسن

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر
ایم۔ اے۔ ڈی لٹ
سابق وائس چانسلر اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور

فیروز سنز لمیٹڈ
لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی

اِنتساب

اپنے صاحبِ دِل و صالح بیٹے

آصف ناصِر

کے نام

فہرستِ مضامین

حرفِ اوّل و آخر

اسلام کیا ہے؟ اس کا ایک لفظ میں جواب دینا ہو تو وہ ہے، آرزوئے حُسن۔ حُسن سے مراد حُسنِ صوری و معنوی بھی ہے اور حُسنِ الٰہی بھی، اور اِلٰہِ حقیقی چونکہ حُسنِ محض ہے، لہٰذا اسے "الحُسن" سے تعبیر کرنا بیجا نہ ہوگا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ جواب بعض طبائع کو عجیب سا لگے گا اور کچھ طبائع کے بدک جانے کا بھی احتمال ہے۔ وجہ یہ ہے کہ حُسن اگرچہ انتہائی مقدّس و پاکیزہ اور لطیف و نظیف لفظ ہے، لیکن جیسا کہ بعض مقدّس ناموں کے ساتھ ہوا ہے، اس کے مفہوم میں جنسی عنصر اس قدر غالب آگیا کہ اس کی معنویت کی لطافت طہارت حجابِ شعور[1] میں مستور ہوگئی۔ اس کا نتیجہ ہے کہ ہماری زبان و ثقافت میں لفظ حُسن و عشق کا شمار مبتذل الفاظ اور جنسی مفہوم میں ہونے لگا ہے۔ لیکن اس کے باوجود صوفیہ کی نظم و نثر میں حُسن اور عشق کا استعمال اُن کے حقیقی معنیٰ و مفہوم میں ہوتا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لفظِ حُسن کُل صفاتِ حسنہ، جُملہ مکارمِ اخلاق و حسنات[2]، کُل ادبی و فنّی اور ثقافتی محاسن، جمال و جلالِ الٰہی[3] تیز جمالیاتی اقدار[4] کا مخزن ہے۔ کوزے میں دریا بند کرنا محض محاورۂ زبان اور شاعرانہ مبالغہ ہے، لیکن جہاں تک لفظِ حُسن کا تعلق ہے، یہ مثال اس پر پوری طرح صادق آتی ہے۔

اگر انسان اپنے زندہ و فعّال جمالیاتی۔ باطنی نظام[5] پر غور و فکر کرے، اس کی صدائے حال کو گوشِ حق نیوش سے سُنے اور عواطف و امیال میں مُضمر اس آرزو کو عقلِ سلیم[6] سے معلوم کرے جو اسے مضطرب و بیقرار رکھتی ہے اور اس کے خیال و فکر اور قول و عمل کی عاملہ و مُحرّکہ بھی ہے اور غایت بھی، تو وہ اس نتیجے پہ پہنچے گا کہ وہ آرزوئے حُسن ہے۔ اس پر مزید تدبر بالحق کرنے سے اُس پر یہ راز منکشف ہوگا کہ وہ حُسن سے حسین تر کی طلب و جستجو ہے۔ آخر

میں مسلسل تفکّر و تدبّر بالحق[۸] سے اسے اس حقیقت کا اذعان و ایقان ہو جائے گا کہ یہ آرزو و جستجو دراصل "الحُسن" کی ہے، جو اس کا ربّ اور اِلٰہ ہے۔ یہ دونوں قرآن حکیم کی اصطلاحات ہیں اور اپنے اندر دفترِ معانی رکھتی ہیں۔ ربّ کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ جو کُل عوالم اور اُن کی مخلوقات کا خالق و رازق، پروردگار اور نشو و نما کرنے والا، آقا و مالک ہے، نیز وہ ہادی و مرشد، مزکّی و مربّی، وکیل و نصیر، حافظ و مولیٰ، سمیع و بصیر اور مجیب الدعوات ہے۔ علاوہ بریں، وہ رحمٰن و رحیم، جمیل و جلیل، وہّاب و کریم، غفّار و توّاب اور سبحان و صمد ہے۔ وہ جس طرح کُل کائنات کا مالک و بادشاہ ہے اسی طرح یوم الدّین (= بنی نوعِ انسان کے یومِ محاسبہ اور جزا و سزا کے دن) اور الحیوان (= دارالآخرت یا جنّت و جہنم) کا مالک بھی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ یکتا و یگانہ، حیّ و قیّوم اور وحدہٗ لاشریک ہے۔ قرآنِ مجید کی رُو سے اِلٰہ کا مطلب ہے: معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود؛ نیز ممدوحؐ و مسجود۔ ہم نے اِلٰہ کے لیے معروضِ حسن و عشق کی جمالیاتی تعبیر بھی اختیار کی ہے۔

آرزوئے حُسن وہبی و طبعی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے انسان کے زندہ و فعّال جمالیاتی۔ باطنی نظام میں ودیعت کی ہے۔ اس کی طرف قرآنِ مجید نے ایک از بس فکر انگیز و بصیرت افروز تلمیحی اشارہ کیا ہے، جسے جمالیات کی اصل قرار دیں تو بیجا نہیں بلکہ انسب ہوگا۔ تلمیح یہ ہے کہ الحُسن نے روزِ الست و شہود[۸] کُل ارواحِ انسانی کو اپنے حضور جمع کر کے اپنا جلوہ دکھلایا تھا۔ الحُسن کے جمال و جلال کے نظارے کی حریف ارواح کیسے ہوئیں؟ یہ تو "وہی" جانتا ہے، لیکن اس کا اثر ہر روح میں الحسن کی آرزوئے مدام بن گیا۔ یوں بھی دیکھا جائے تو الحُسن اِلٰہ بھی ہے اور ربّ بھی، لہٰذا اُس نے انسان کو اپنا شاہد بنا کر اُس کے دل میں محبّتِ حُسن کا شرار ودیعت کر دیا، اور اس شرارِ محبّت میں آفتابِ عشق[۹] بننے کی استعداد بھی رکھ دی، جسے ذکر و فکرِ الٰہی اور حُسنِ عمل کے ذریعے قوّت سے فعل میں لایا جا سکتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہی مقصودِ حیات، غایتِ دین، مقتضائے فطرتِ انسانی اور رضائے دوست ہے تو یہ مبالغہ نہیں، اعترافِ حقیقت ہوگا؛ نیز اگر یہ کہا جائے کہ اس حقیقتِ کبریٰ کی طلب اور حکیمانہ جستجو عبارت ہے فلسفے سے تو یہ بھی ایسی جمالیاتی۔ علمی صداقت کا اظہار ہوگا، جسے

تسلیم کر لیا جائے تو فلسفے، علم و حکمت اور سائنس و ٹیکنالوجی کے رُخ کا اپنی حقیقی سمت ہو جانا یقینی ہے۔ آخر میں اگر یہ کہا جائے کہ تصوّف کی غایت بھی یہی ہے تو یہ قول تصدیقِ حق ہوگا۔

دین کُل زندگی کو محیط ہے، اور کُل زندگی کا مطلب انفرادی۔ اجتماعی، موضوعی۔ معروضی اور دُنیوی۔ اُخروی زندگی ہے۔ اس سے استنباط کر سکتے ہیں کہ انسان کو زندگی کے ہر عالم اور گوشے میں طبعاً حُسن کی طلب و جستجو رہتی ہے اور رہنی چاہیئے، اور اس کے فکر و نظر اور قول و عمل میں حسن ہر حال میں قائم و دائم اور فعّال و حرکی رہنا چاہیئے۔ یہی روحِ دین ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے احسن و اکمل اور زندہ و محفوظ کلامِ آخر قرآن مجید میں "اسلام" سے تعبیر کیا ہے۔ اس تمہید کے بعد اب ہم زندگی کے مختلف گوشوں میں آرزوئے حسن کی کارفرمائیوں اور شیطان کی جمالیاتی فریب کاریوں[۱۱] کا جائزہ لیں گے۔

حواشی و تصریحات

۱۔ حجابِ شعور: یہ اصطلاح مغربی نفسیات کی مصطلحہ Subconscious جس کے لیے اردو میں تحت الشعور کی تعبیر مروّج ہے، کے مترادف کے طور پہ استعمال کی گئی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ تحت الشعور اور لاشعور Unconscious کی اصطلاحات میرے نزدیک ناقص ہیں، لٰہذا میں نے ان کے بجائے حجابِ شعور اور پاتالِ شعور کی اصطلاحات وضع کی ہیں اور انھیں احسن و اصح سمجھتا ہوں۔ ان اصلاحات پر مفصّل بحث کے لیے دیکھیے مصنّف کی کتاب فلسفۂ حُسن، مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور ۱۹۸۲ء ص۔

۲۔ حسنات جمع حسنہ۔ یہ قرآنِ مجید کی از بس اہم اور جامع و مانع اصلاحات میں سے ہے۔ اس کے معنیٰ کی وسعت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں جمالیاتی ثروت کے علاوہ ہر قسم کی خیر، فلاح و بہبود، صلاح و کامیابی، رحمت و عنایت، احسان و کرم اور انعام و اکرام کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ جمالیاتی ثروت سے مراد جمالیاتی لذّت و مسرّت، طمانیت و سکینت، سوز و سُرور، کیف و مستی، ذوق و شوق، حُسنِ یقین و عمل، قناعت و توکّل، تقویٰ و صبر

اور آرزوئے حسُن و زندگی ہے۔ آرزوئے حسن و زندگی کا مطلب ہے: اپنے معروضِ حسن و عشق (= اِلٰہ و ربّ) کی دید و رضا، خوب سے خوب تر اور حسُنِ زندگی کی طلب و جستجو۔

۳۔ جمال و جلالِ الٰہی: یہ حسُن کے دو عناصرِ ترکیبی ہیں، جنہیں "جمالیاتی زوجین" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ان کی فرداً فرداً مختصر صراحت کر دی جاتی ہے: (ا) جمال میں حسُن کی لطافت و نزاکت، معصومیت و نظافت، محبوبیّت و دلربائی اور جاذبیّت و دلآویزی کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ عالمِ انسانی میں اس کی مثال صنفِ نازک کا حسُن ہے، جس کے لیے ہم نے صنفِ جمیلہ کی تعبیر اختیار کی ہے۔ (ب) جلال عموماً عظمت و کبریائی، قوت و جبروت، ہیبت و سطوت، اور جبّاری و قہّاری پر دلالت کرتا ہے۔ عالمِ انسانی میں اس کی مثال مردانہ حسُن ہے۔ چنانچہ مرد کے لیے ہم نے صنفِ جلیلہ کی تعبیر اختیار کی ہے۔ (ج) اِلٰہ۔ یہ قرآن مجید کی اُن اہم ترین اصطلاحات میں سے ہے، جن پر دین و ایمان کی بنیادیں استوار ہیں؛ اور اس کی رُو سے اس کا مطلب ہے: معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود۔ چونکہ اللہ تعالیٰ ربّ ذوالجلال والاکرام اور الٰہِ جمیل ہے، لہٰذا اس کی جمالیاتی معنویت کی بنا پر اس کے لیے ہم معروضِ حسُن و عشق کی تعبیر بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

۴۔ جمالیاتی اقدار: انگریزی میں Aesthetic values۔ اس سے مفصل بحث کے لیے دیکھیے مصنّف کی کتاب "جمالیات، قرآن حکیم کی روشنی میں" طبع اوّل مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور، ۱۹۵۸ء؛ طبع ثانی نیشنل بُک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۷۶ء۔

۵۔ جمالیاتی۔ باطنی نظام: یہ خطِ وصل (-) اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ انسان کا باطنی نظام فطرۃً احسن و اکمل ہے اور ہر فردِ بشر کو قدرت کی طرف سے ودیعت ہوتا ہے۔ باطنی نظام دراصل نفسِ انسانی کے تین مربوط و لاینفک نظاموں پر دلالت کرتا ہے، جنہیں حواس، قلب اور نفس سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جن کے لیے ہم نے جمالیاتی۔ حسّی۔ قلبی۔ نفسی نظام کی تعبیر اختیار کی ہے۔ اس موضوع سے ہم اپنی کتاب "فلسفہ حسُن" میں سیر حاصل بحث کر چکے ہیں۔

۶۔ عقلِ سلیم : اس کا مطلب ہے حسین و کامل اور ہر نقص سے پاک عقل جو انسان کو قدرت کی طرف سے ودیعت ہوتی ہے۔ کانٹ نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف Cretique of pure reason میں "عقلِ محض" سے سیر حاصل بحث کرنے کے باوجود "عقلِ سلیم کے اصل مفہوم و وظائف سمجھنے میں غالباً اس لیے کامیاب نہ ہو سکا کہ وہ اس کی جمالیاتی اصل تک رسائی حاصل نہ کر سکا، جو نورِ حسن ہے۔ بیرازیں اہم اصل ہمیشہ پیشِ نظر رہنی چاہیئے کہ عقل اور ہر حاسہ بلکہ جمالیاتی حسّی۔ قلبی نفسی نظام کا ہر کل پرزہ اپنے اندر ایک نظام رکھتا ہے جو نورِ حسن کی بدولت اپنے فطری وظائف ادا کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارے جمالیاتی باطنی نظام اور اس کے ہر جزو کی اصل نورِ حسن ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اپنے ربّ سے اپنے نور کے ارتقاء و اتمام کی دعا مانگنا اہلِ حُسن و سُرور کا وظیفۂ حیات ہے (التحریم ۶۶ : ۸)۔

۷۔ تدبّر بالحق : اس کا مطلب حکیمانہ غور و فکر ہے جو حقیقت کی طلب و جستجو کے لیے ہو۔

۸۔ روزِ الست و شہود : اس تلمیح کو سمجھنے کے لیے دیکھیے قرآنِ مجید کی سورۃ الاعراف ۷ : ۲، ۱۷ ابعد۔

۹۔ آفتابِ عشق : عشق کے لفظ پر عموماً یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ قرآنِ مجید کا لفظ نہیں۔ یہ درست ہے کہ قرآنِ مجید نے یہ لفظ استعمال نہیں کیا، لیکن اس کے بجائے اس نے " اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰہِ " کے الفاظ استعمال کیے ہیں ؛ لٰہذا یہ اعتراض نہ وقیع ہے نہ موزوں، بلکہ قرآنِ مجید کی روح کے منافی ہے۔ علاوہ بریں، ہمارے اکابر عُلماء و صوفیہ، مفسّرین، سیرت نگاروں اور فقہا نے عشق کا لفظ بکثرت استعمال کیا ہے، نیز انہوں نے کثرت سے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جو قرآنِ مجید میں نہیں ہیں۔ پھر اسلام نے کہاں یہ حکم دیا ہے کہ ہم غیر قرآنی لفظ یا الفاظ استعمال نہ کریں اور قرآنِ مجید نے اہلِ ایمان کی ایک بنیادی صفت یہ بتاتی ہے کہ وہ سب سے زیادہ محبت اللہ تعالیٰ سے کرتے ہیں ؛ لٰہذا عشق شدید ترین محبّتِ الٰہی پر دلالت کرتا ہے۔ یہ استنباط قرآنِ مجید کی اس آیت جلیلہ سے کیا گیا ہے :

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ (البقرہ ۲: ۱۶۵) انسانوں میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو ہمسر و ہم پلّہ بناتے ہیں اور ان سے اس طرح محبّت کرتے ہیں جس طرح اللہ سے محبت کرنی چاہیئے؛ لیکن جو اہلِ ایمان ہیں وہ سب سے زیادہ محبّت (یعنی عشق) اللہ سے کرتے ہیں۔

۱۰۔ <u>شیطان کی جمالیاتی فریب کاری</u>: قرآنِ مجید کی رُو سے شیطان انسان کو دھوکہ دینے کی خاطر اس کی خواہشات و اعمال کو چاہے وہ کتنے قبیح اور گھناؤنے کیوں نہ ہوں، مزیّن کر کے دکھاتا ہے۔ اس کے اس طریقِ واردات کے لیے ہم نے "جمالیاتی فریب کاری" کی تعبیر اختیار کی ہے؛ مفصّل بحث کے لیے دیکھیے مصنّف کی کتاب "فلسفۂ حُسن" مطبوعہ مجلسِ ترقیِ ادب لاہور ۱۹۸۲ء۔

مقام ۱

سوچ کے سفر میں سوال ؟

سفرِ زندگی جاری رہا اور میں سوچتا رہا:

میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ کہاں جاؤں گا؟ مجھے اس دنیا میں کون لایا ہے اور کیوں لایا ہے؟ مجھے یہاں کیا کرنا ہے؟ زندگی کیسے کرنی ہے؟ یہاں سے کہاں جانا ہے اور جا کر واپس آنا ہے یا نہیں؟ میری منزلِ آخر کوئی ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کہاں ہے؟ مجھے وہاں کیسے اور کیونکر پہنچنا ہے؟ زندگی کیا اور موت کیا ہے؟ ان کے ہنگاموں کی غایت کیا ہے؟ زمان و مکان کی حقیقت کیا ہے؟ حُسن کیا اور قُبح کیا ہے؟ حسنہ و سیئہ کی حقیقت کیا ہے؟ نور و ظُلمت اور رنگ و بُو کی ماہیت کیا ہے؟ یہ دُنیا کیا ہے؟ کس نے بنائی اور کیوں بنائی ہے؟ سرور و سوز اور خوف و غم کیا ہے؟ انسان رہینِ محنت و مشقّت کیوں ہے؟ یہ قانونِ مکافاتِ عمل کیا اور کیوں ہے؟ آدمی مطمئن کیسے اور بیقرار کیوں ہوتا ہے؟ یہ سب کچھ کیا اور کیوں ہے؟ سب سے بڑھ کر یہ کہ "وہ" کون ہے جس کی آرزو مجھے بیقرار رکھتی ہے؟ میرا "اُس" سے رشتہ کیا ہے؟ وہ کیوں مجھے پیار کرتا اور میرے پاس رہتا ہے؟ وہ مجھے روزی بھی دیتا ہے؛ میری دُعائیں سنتا اور میری حاجات بھی پوری کرتا ہے۔ میں بیمار ہوتا ہوں تو وہ مجھے شفا دیتا ہے۔ وہ میرا وکیل و کارساز اور حافظ و ناصر بھی ہے۔ وہ ایسا کیوں کرتا ہے؟ مجھے بھی کیوں "اُس" سے اس قدر پیار ہے کہ اس کے بغیر قرار ہی

نہیں آتا؟ کیوں اس کی یاد وجہ طمانیت دل ہے؟ کیوں میرے پاس ہوتے ہوئے بھی وہ مجھ سے حجاب میں رہتا ہے؟ یہ کیوں ہے کہ وہ میری رگِ جان کے قریب بھی ہے اور حدِ ادراک سے وراء الوراء بھی ہے۔ مجھے کیوں اس کی طلب و جستجو رہتی ہے؟ کیوں اس کی آرزو مجھے بیقرار رکھتی ہے؟ "میں" اور "وہ"، حیات اور موت، زمان اور مکان اور دنیا اور آخرت سب کیوں میرے لیے معمّا ہیں؟ کیا یہ معمّا حل ہو گا یا نہیں؟

میں سوچتا رہا، یہ سوال مجھے بیقرار کرتے رہے اور میرا سفرِ زندگی جاری رہا۔

"وہ" سوچ کے سفر میں میرا ہمسفر رہا، میرے دل کی دھڑکنیں سنتا اور اس کی بیقراریاں دیکھتا رہا اور سفرِ حیات جاری رہا، زمانہ گزرتا گیا اور وہ برابر سفر میں میرے ساتھ رہا۔ عالمِ حُسنِ ذات سے میں عالمِ ارواح میں آیا اور سفرِ حیات جاری رہا۔ آخر کار اس کرۂ ارضی میں آیا، بصورتِ بشر آدم بنا۔ کچھ عرصہ جنّت میں رہا اور اس کے حسین و دلفریب نظاروں کو دیکھتا رہا، میں جنّت کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوتا رہا اور سفرِ حیات جاری رہا۔

جنّت میں کوئی حاجت و ضرورت تھی نہ ذمے داری، کوئی کام کاج تھا نہ فرضِ منصبی، زندگی رنگِ مقصدیت سے ابھی آشنا نہ ہوئی تھی اور میں بیکار تھا۔ وہاں نہ تو زندگی کے گوناگوں ہنگامے اور نہ المیہ و طربیہ کے بوقلموں نظارے ہی تھے۔ وجہ یہ تھی کہ جنّتِ ارضی ابھی موت کی ہلاکت آفرینیوں، زندگی کی تعمیری سرگرمیوں اور شیطان کی جمالیاتی فریب کاریوں کی جلوہ گاہ نہ بنی تھی، تصویرِ جہاں بےرنگ تھی، میری زندگی بےکیف ہو گئی اور میں جنّت کی اس زندگی سے اُکتا گیا، لیکن سفرِ زندگی جاری رہا۔

شیطان جو موقع کی تلاش میں تھا، اُسے میری اس کیفیت اور جنّت کی صورتِ حال سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کا موقع مل گیا، چنانچہ وہ مجھے زندگی کی یکسانیت و بےکیفی اور اُداسی و بیزاری کو دُور کرنے اور اُسے رنگین و دلکش اور خوشگوار و لذّت انگیز بنانے کی ترغیب دینے اور اس مقصد کی خاطر مجھے ہنگامہ آرائی کرنے پر اُکسانے لگا۔ اُسے جب بھی موقع ملتا، مجھے ناصحانہ و دوستانہ انداز میں سمجھانے لگتا: "کب تک بیکار بیٹھے بیٹھے زندگی برباد کرو گے؟ مر جاؤ گے تو کوئی یاد کرنے والا نہ ہو گا۔ زندہ

اور خوش رہنا ہے تو زندگی کے ہنگاموں میں حصہ لو، کھاؤ، پیو اور عیش کرو۔ اپنی رفیقۂ حیات کو دیکھو۔ وہ شجرِ جمال و لذت ہے، نعمت غیر مترقبہ ہے۔ اس میں تمہاری حیاتِ ابدی کا راز مضمر ہے۔ اس میں بار آور ہونے کی استعداد ہے، جسے قوت سے فعل میں لاؤ اور اپنی اولاد کی صورت میں قیامت تک زندہ رہو۔"

بات غلط تو نہ تھی، لیکن یہ شجر "اُس" کے حکم سے "شجرِ ممنوعہ" تھا۔ ابلیس اِدھر میرے دل میں وسوسہ اندازی اور اُدھر میری زوجہ کے ایک ایک انگ کی طرف اشارہ کرتا رہا؛ اس کے گل و لالہ اور برگ و بار کو خوشنما بنا کر دکھاتا رہا، میں دیکھتا رہا، دیکھتا رہا اور آخر کار شجرِ جمیل میری ناظورۂ حیات بن گئی اور اس کا ہر نظارہ رہزنِ تمکین و ہوش اور غارتگرِ ایمان و آگہی بن گیا۔ میرا دل آخر بشر کا دل تھا؛ حریفِ نظارہ نہ ہو سکا اور شجرِ ممنوعہ کی لذت سے آشنا ہو ہی گیا۔ ساتھ ہی شعورِ برہنگی اور احساسِ گناہ و ندامت بیدار ہو گیا۔ یہ میری اوّلیں لغزش و خطا، زندگی کا پہلا ہنگامہ اور ابلیس کی پہلی کامیابی تھی۔ یہ ہنگامہ برپا کرنا تھا کہ "وہ" ناراض اور مجھ پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا۔ دل طمانیت و مسرت سے محروم ہو گیا، لیکن احساسِ گناہ قلب کو لذتِ آہ و فغاں سے آشنا کر گیا۔ آرزوئے حسنِ "ہُو" فعال و حرکی بن گئی۔ "ہُو" کی جلوہ سامانیاں نہ رہیں تو جنت اپنے جمیل و جلیل نظاروں اور نعمتوں کے باوجود نظارہ سوز بن گئی؛ میرا دل اب یہاں کیسے لگتا کہ یہاں تو میں نے اپنے دشمن سے مات کھائی تھی اور اُس نے میری دولتِ دل لوٹی تھی؟ میرے دل میں یہاں سے کہیں دُور چلے جانے کی آرزو مچلنے لگی۔ "وہ" جو مستجیب الدعوات ہے، اُس نے مجھے اس جنت سے ہجرت کرنے اور نیچے میدان میں جا بسنے کا حکم دیا۔ اس طرح محنت و مشقت سے روزی حاصل کرنا اور زندگی کرنا میرا مقدر بن گیا۔ مجھے اس ہبوطِ صبر آزما کی ایک سزا یہ ملی کہ میری اولاد ایک دوسری کی دشمن بن گئی اور اس عداوت و مخاصمت کا سلسلہ اتنا ہی دراز ہے، جتنا سفرِ زندگی کا سلسلہ طویل ہے۔ اس کی دوسری سزا یہ ملی کہ میری زندگی رہینِ قانونِ مکافات ہو گئی؛ دُنیا میرے لیے امتحان گاہ بن گئی اور میرے امتحانِ زندگی کا آغاز ہو گیا، اور میرا سفرِ زندگی جاری رہا۔ میں سوچتا رہا اور میرے سوال مجھے بیقرار

رہتے رہے۔

دنیا کے نظارے اس قدر جمیل و جلیل اور زندگی کے ہنگامے اس قدر دلکش و جاذب نظر ہیں کہ میں ان میں بار بار گم ہو جاتا تھا، لیکن نشۂ بے خودی اُترتا تھا تو یہ سوال جو تیر نیم کش کی طرح میرے دل میں پیوست تھے، ان کی خلش مجھے مضطرب و بیقرار کر دیتی اور میری سوچ کا سفر شروع ہو جاتا۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ میں دُنیا میں سفر کر رہا ہوں یا اپنی سوچ میں؟ آواز آتی ہے: "دونوں میں" میں نے اپنے سفرِ زندگی کے دوران سراب کے فریب بھی کھائے؛ غولِ بیابانی نے چراغ بھی دکھائے؛ ابلیس نے بصورتِ خضر غلط راہوں پر بھی لگایا؛ فرعونوں، ہامانوں اور قارونوں کے ظلم و ستم بھی سہے؛ آزروں اور نمرودوں نے شرک و بت پرستی کے سبز باغ بھی دکھائے اور میں نے جنگوں کے ہلاکت آفریں نظارے بھی دیکھے، لیکن میرا سفرِ زندگی جاری رہا، اور "وہ" میرا ہمسفر رہا۔ زندگی اور سوچ کے سفر میں صدیاں گزر گئیں۔

سچ ہے: افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر! وہ کیا حسین و مبارک لمحہ تھا کہ میری دُعا نے اجابت کو اپنا منتظر پایا۔ میرے قلب ایک موجۂ حسنِ بے مثال کے نور سے جگمگا اُٹھا؛ اس میں نغمۂ روح بھی تھا جس کے بول تھے: اُٹھو! سنو! دیکھو! پڑھو! سوچو اور لکھو!

میں نے امتثالِ امر میں آوازِ خلق اور سکوتِ روحِ حیات کو گوشِ ہوش سے سنتا، زندگی کے ہنگاموں کو دیدۂ عبرت نگاہ سے دیکھتا، کتابِ کائنات اور تفسیرِ زندگی کو قلبِ سلیم سے پڑھتا اور سوچتا رہا۔ اس میں صدیاں بیت گئیں اور سفرِ حیات جاری رہا۔ انجام کار "اس" نے مجھے قلم دیا اور میں خامہ فرسائی کرنے لگا اور خامہ فرسائی کرتے کرتے ایک زمانہ گزر گیا۔

ایک شب میں تھا، سکوتِ جانفزا اور گوشۂ تنہائی تھا، لظاہر ہر چیز ساکن تھی، لیکن سوچ کا سفر جاری تھا۔ دفعتاً میرے دل میں نغمۂ حسن کی ایک مدھم سی گونج اُٹھی اور میری روح اس سے ہم آہنگ ہو گئی۔ معنویت خود بخود الفاظ کی صورت میں جلوہ پیدا کرنے لگی اور الفاظ قلب پر منقش ہونے لگے، اور قلم ان کی قلمکاری کرنے لگا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کوئی مجھ سے مخاطب ہے اور کہہ رہا ہے:

حواشی و تشریحات

۱- قانونِ مکافاتِ عمل :

اسے قانونِ مجاوزات اور قانونِ جزا و سزا بھی کہتے ہیں۔ اسلام کی رُو سے بنی نوع انسان کے لیے یہ دُنیا دارالعمل یا امتحان گاہ ہے اور آخرت دارالجزاء ہے۔ قیامت کا دن انسان کے محاسبے کا دن ہوگا، جسے قرآنِ مجید نے "یوم الدین" سے تعبیر کیا ہے۔ اسے یوم الحساب، روزِ مکافات اور روزِ جزا و سزا بھی کہتے ہیں۔ اس دن انسان کے اعمال کے حُسن و قبح کے مطابق مالکِ یوم الدین کے حکم سے اُسے جنّت ملے گی یا دوزخ میں جانا پڑے گا۔ اگر دنیا میں اسے حُسن و زندگی کی آرزو و جستجو رہی ہوگی اور اس نے اس آرزو کو پورا کرنے کی مقدور بھر کوشش کی ہوگی تو بہشت اس کا حُسنُ المآب ہوگا۔ بخلاف اس کے اگر دنیا میں اُس نے اپنی آرزوئے حُسن و زندگی کو اپنی نفسانی خواہشات کے بارِ گراں کے نیچے دبا دیا ہوگا اور کفر و شرک، ظلم و عدوان، جرم و گناہ اور فتنہ و فساد کی راہ اختیار کی ہوگی اور اس کے نتیجے میں حُسن و زندگی سے محروم رہا ہوگا تو آخرت میں دوزخ اس کا شرّ المآب ہوگا، جہاں وہ لذتِ حیات و موت سے محروم رہے گا۔

حُسن المآب اور شرّ المآب دونوں قرآنِ مجید کی فکر انگیز و بصیرت افروز اصطلاحات ہیں۔ ان کی مختصراً صراحت کر دی جاتی ہے۔ حُسن المآب کا مطلب ہے ایسا گھر جو حُسنِ محض ہو اور جس میں رہنے والے اہلِ حُسن و سُرور ہوں اور وہ حُسن و نور، آرام و راحت، طمانیت و مسرّت، لذت و حظ اور کیف و سُرور کی جنّت ہو۔ جنّت اہلِ حُسن و سُرور کا حُسن المآب ہے۔ بخلاف اس کے کہ جہنّم اہلِ نار کا شرّ المآب ہے، یعنی ایسا گھر جس میں ایک تو خوف و حزن، حسرت و ندامت، محرومی و ناکامی اور یاس و قنوطیت کی آگ کا عذاب ہوگا اور دوسرے آتشِ دوزخ

کا عذاب ہوگا۔ یہاں اس لطیف نکتے کی بھی صراحت کر دی جاتی ہے کہ اس میں شک نہیں کہ قیامت کا دن ہی حقیقی اور آخری فیصلے کا دن ہے اور حقیقت میں وہی یوم الدّین ہے؛ لیکن قرآن مجید کی رُو سے اللہ تعالیٰ سریع الحساب (البقرہ ۲: ۲۰۲ و بمواضع کثیرہ) اور سریع العقاب (الانعام ۶: ۱۶۵) بھی ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو اس دنیا میں اس کے اعمال کی جزا و سزا ہر آن ملتی رہتی ہے۔ ہر جرم وگناہ سے اس کے دل میں خوف وحزن اور ندامت و پشیمانی کی آگ لگتی ہے اور وہ اپنی جمالیاتی ثروت سے محروم ہو جاتا ہے۔ "جمالیاتی ثروت" کا مطلب ہے حُسن و نور، طمانیت وسکینت، حسنہ و خیر، لذّتِ حیات و حلاوتِ ایمان، صدق و تقویٰ اور قُرّۃُ العین۔ اسی طرح ایمان وعملِ صالح سے انسان کو فوراً جمالیاتی ثروت ملتی ہے۔

۲۔ مطمئن انسان :

قرآنِ مجید کے فلسفۂ طمانیّت کا خُلاصہ یہ ہے کہ ایمان واعمالِ صالحہ سے قلب میں طمانیت و سکینت پیدا ہوتی ہے اور یہ معیار ہے نیکی، خیر یا حسنہ کا۔ لہٰذا نفسِ مطمئنّہ یا مُطمئن انسان ہی جنّت میں جائے گا اور ربِّ ذوالجلال والاکرام کس پیار سے اسے مخاطب کر کے فرمائے گا :

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِىْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً
فَادْخُلِىْ فِىْ عِبٰدِىْ ۝ وَادْخُلِىْ جَنَّتِىْ ۝ (الفجر ۸۹ : ۲۷تا۳۰) اے نفسِ مطمئن! آجا اپنے ربّ کی طرف! تو اُس سے خوش اور راضی اور وہ تجھ سے خوش اور راضی۔ لہٰذا میرے بندوں میں داخل ہوجا اور میری جنّت میں داخل ہوجا۔

یہاں اس بصیرت افروز نکتے کی طرف مجمل اشارہ کیا جاتا ہے کہ مفصلہ بالا آیات میں ربِّ ذوالجلال والاکرام نے اپنے مطمئن بندوں (جن کے لیے ہم نے اہلِ حُسن و سُرور کی جمالیاتی تعبیر اختیار کی ہے)

کی صحبت و رفاقت کو جنّت کے داخلے پر مقدّم رکھ کر یہ جتایا ہے کہ انسان کی قدر و قیمت جنّت سے کہیں زیادہ ہے اور اہلِ حُسن و سُرور کی رفاقت و صحبت جنّت سے افضل و اعلیٰ ہے، کیونکہ وہی جنّت کی رونق ہوں گے اور ان کی صحبت ہی میں جنّت کی نعمتوں سے حقیقی لذّت و مسرّت ملے گی اور خوب ملے گی؛ نیز ان کی وجہ سے جو کیف و سُرور ملے گا وہ مستزاد ہوگا۔ اس بات کی طرف بھی اشارہ کر دینا فائدے سے خالی نہ ہوگا کہ قرآنِ مجید کی رُو سے اہلِ حُسن و سُرور کی چار اصناف ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے انعام یافتہ ہیں: انبیآء، صِدیقینؑ، شُہدآء اور صالحین (النسآء ۴: ۶۹)، اور قرآنِ مجید کی رُو سے یہی چاروں گروہ "اولیآء اللہ" ہیں۔

۳۔ عالمِ حُسنِ ذات :

اللہ تعالیٰ قدیم، زندہ بالذّات، قائم بالذات اور خالق و فاطرِ کائنات ہے، لٰہذا آسمانوں اور زمین سے وراء الوراء ہوا۔ اگرچہ اس کی کُنہ و ماہیّت کا فہم و ادراک اس کی مخلوق و محدود عقلِ انسانی کے لیے محال ہے، کیونکہ یہ اس کے مقدور ہی میں نہیں، لیکن اس کے اپنے ارشاد کے مطابق وہ یکتا و یگانہ اور بے مثال و بے نظیر ہونے کے باوجود "الواحد" اور "وحدہٗ لاشریک" ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ایک مُتشخّص ہستی ہے۔ چونکہ "وہ ہے" اور اس وقت بھی تھا جب عالمِ کون و مکان تھا نہ کچھ اور تھا؛ نیز وہ جملہ عوالم سے وراء الوراء ہے، اس لیے عقل یہ چاہتی ہے کہ اس کا جہان خود اس کی اپنی ذات ہونی چاہیے۔ اس کی ذات کیا ہے؟ اس کی ماہیّت تو صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، لیکن قیاس چاہتا ہے کہ وہ حُسن و حق، حیات و قیومیت، علم و حکمت اور ارادہ و قدرت کا بے مثال و بے نظیر، یکتا و یگانہ اور ناقابلِ فہم و ادراک جہانِ قدیم ہوگی جس کے لیے ہم نے عالمِ حُسنِ ذات کی تعبیر اختیار کی ہے۔

۴۔ شیطان کی جمالیاتی فریب کاری:

یہ اصطلاح دراصل قرآنِ مجید کی مندرجۂ ذیل آیات سے مأخوذ ہے:

فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ (الانعام ۶: ۴۳)؛ پس جب ہماری طرف سے ان پر سختی آئی تو کیوں نہ انہوں نے عاجزی اختیار کی؟ مگر ان کے دل اور سخت ہو گئے اور شیطان نے جو کچھ وہ کر رہے تھے، اُسے ان کے لیے خوشنما بنا دیا (اور وہ اس کے اس خوشنما فریب میں مارے گئے) وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ ○ (النّمل ۲۷: ۲۴ و بمواضع کثیرہ)؛ میں نے دیکھا کہ وہ (= ملکہ) اور اس کی قوم اللہ کے بجائے سورج کے آگے سجدہ (یعنی اس کی پرستش) کرتی ہے۔ شیطان نے ان کے اعمال ان کے لیے خوشنما بنا دیئے اور انہیں (اللہ تعالیٰ کے) راستے سے روک دیا اور اس وجہ سے وہ سیدھا راستہ نہیں پاتے (کہ اللہ کو سجدہ یعنی اس کی عبادت کریں ...)۔

ان آیات سے یہ حقیقت آشکارا ہوئی کہ شیطان بنی نوعِ انسان کو دھوکا دینے اور گمراہ کرنے کی خاطر اُنہیں ان کے قبیح سے قبیح اعمال بھی خوشنما و نظر فریب بنا کر دکھاتا ہے اور وہ پیچ پیچ انہیں حسین سمجھنے لگتے ہیں اور اس خوشنما دھوکے میں مارے جاتے ہیں۔ ہم نے شیطان کے اس طریقِ فریب کاری کے لیے "جمالیاتی فریب کاری" کی تعبیر اختیار کی ہے۔ شیطان کے اس طریقِ واردات (Modus operandi) میں یہ نفسیاتی حقیقت پنہاں ہے کہ وہ جانتا ہے کہ انسان بالطبع حسن پسند ہے اور قبح سے نفرت کرتا ہے، لہٰذا اس سے شرک و کفر، جرم و گناہ، ظلم و استحصال اور فتنہ و فساد اور فحشا و منکر ایسے قبیح کام کرانے کے لیے وہ انہیں خوشنما و نظر افروز بنا کر اُسے دکھاتا ہے اور یہ کام وہ عموماً وسوسہ اندازی سے کرتا ہے۔

۵۔ فرعون، ہامان، قارون، آزر اور نمرود :

یہ قرآنِ حکیم کی از بس اہم تلمیحات ہیں۔ حقیقت میں یہ عناصرِ خمسہ ہیئتِ اِجتماعیہ کے سرطان ہیں، جو ہر دور میں مختلف نام اور روپ بدل کر اپنی نمود دکھاتے رہتے ہیں۔ ان سے بکثرت چھوٹے سرطان پیدا ہوتے ہیں۔ یہ سب مل کر اللہ تعالیٰ کے بندوں کو ان کے اِلٰہ و ربّ سے جُدا کرتے اور اُنہیں ان کے حقوق، عزّتِ نفس، جمالیاتی ثروت، لذّت و آرزوئے حسن و زندگی سے محروم کرتے رہتے ہیں۔ بلاشُبہ، ان میں سے ہر ایک سرطان و شیطان ہے، لیکن وہ اپنی جداگانہ تاثیر و خصائص بھی رکھتے ہیں، جن کی طرف مجمل اشارات کیے جاتے ہیں۔

(ا) فرعون علامت ہے ایسے مستبد و مطلق العنان اور متکبر و سرکش آمر کی جو اپنے آپ کو اپنی رعایا کا اِلٰہ و ربّ سمجھتا اور اُسے جبر و کراہ کے ذریعے اور سبز باغ دکھا دکھا کر مجبور کرتا ہے کہ وہ اس کے قصیدے پڑھے اور اُسے اپنا محبوب و ممدوح قائدِ مطلق و مطاع اور حاکمِ اعلیٰ؛ نیز رازق ان داتا اور پروردگار سمجھے، اور اس کی تعظیم و اطاعت اس طرح کرے، جس طرح ربّ العالمین کی کرنی چاہیے۔ اس مقصد کے لیے وہ زمانے کے مزاج کے مطابق مختلف اصطلاحات وضع کرتا رہتا ہے۔

(ب) ہامان علامت ہے فرعونی افسر شاہی یا بیوروکریسی Bureaucracy کی، جو رعایا کی وفادار و دوست اور معاون و مددگار ہونے اور اس کے حقوق کا احترام و پاس اور نگہداشت کرنے کے بجائے فرعون کی معاون و مددگار رہو اور اسے خوش کرنے کی خاطر رعایا کے حقوق پامال کرتی اور اسے فرعون کے پنجۂ استبداد میں جکڑنے میں کوشاں رہتی ہو۔ ہامانیت تملّق و نفاق اور ضمیر فروشی و قوم دشمنی، نیز ہوسِ منصب و اقتدار کی علامت ہے۔

(ج) قارون علامت ہے سرمایہ دار و سود خور، سرمایہ کار و حرام خور، جابر و ظالم، ضمیر فروش و

قوم فروش اور بخیل و ابن الوقت طبقے کی؛ نیز استحصال و جلبِ منفعت، اکتناز و احتکار، تکاثر و مخافرت، تملق و نفاق اور فرعون پرستی و ہامان دوستی اس کی فطرتِ ثانیہ ہوتی ہے۔

(د) آزر علامت ہے مشرک و بت پرست اور حرام خور و فرقہ ساز مذہبی پیشوائیت کی، جو معاشرتی سرطانوں (= فرعونوں، ہامانوں اور قارونوں) کی معاون و طرفدار، نیز شرک و بت پرستی اور اکابر پرستی و قبر پرستی کی نقیب و علمبردار ہوتی ہے۔

(ہ) نمرود بھی فرعون کی طرح ظالم و جابر، مستبد و مطلق العنان حاکم کی علامت ہے جو مدعیِ خدائی ہوتا ہے۔

مقام ۲

حرفِ آخر: جواب میں

سنو! میں تم کو بتاتا ہوں کہ تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو اور کیا کرنے آئے ہو؟ کہاں جاؤ گے اور تمہاری منزلِ مقصود کون سی ہے؟ تم وہاں کیسے اور کیونکر جاؤ گے؟ تمہیں اس دُنیا میں کون، کیوں اور کیسے لایا تھا؟ تمہارا "اُس" سے اور اس دُنیا سے کیا رشتہ ہے؟ تمہارے سوال وجۂ بیقراریٔ دل ہیں تو ان کے جواب قُرّۃُ العین ہیں، بشرطیکہ بیتاب نہ ہونا اور انہیں صبر و تحمّل اور خلوصِ دل سے سُننا۔ حکمت کی باتیں، حُسن وحق کی باتیں ہوتی ہیں، انہیں حُسنِ قلب یا صدقِ دل سے سُنا جاتا ہے۔

تم اس کرۂ ارضی میں آنے سے پہلے عالمِ ارواح میں تھے، اپنی ہم جنس روحوں کے ساتھ زندگی کر رہے تھے۔ عالمِ ارواح میں آنے سے پہلے تم عالمِ حُسنِ ذات میں تھے، جو تمہارے خالقِ اَحسَن، ربِ رحمان ورحیم اور الٰہِ جمیل وجلیل کے علم وقدرت کا جہانِ حُسن ہے۔ تم اس جہانِ حُسن کی حقیقت و ماہیّت کا اِدراک نہیں کر سکتے، کیونکہ یہ تمہاری عقل ودانش سے وراء الوراء ہے۔ یہ زمان ومکان کی نسبت سے محیطِ بیکراں اور دھر کے حوالے سے قطرۂ محیط نما ہے۔ یہ لوحِ محفوظ ہے۔ اس عالمِ حُسنِ ذات میں تم اس "معلومہ" کی صورت میں تھے۔ زمانے کے برعکس دھر کی ابتدا ہے نہ انتہا، اس لیے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ تم وہاں کب سے تھے؟ تم اللہ تعالیٰ کی، جو الحسن والحق ہے، "معلومہ" تھے

اور ہو، اس لیے حسین و امر تھے اور ہو؛ نہ قبیح و باطل تھے اور نہ ہو۔ یہ اور بات ہے کہ تم اپنے عقائد و اعمالِ قبیحہ سے اپنے اندر کی دُنیا کو قبیح بنا لیتے ہو۔ سمجھنے کی خاطر تم اسے ایسی معلومہ صوری و متشکل سے تعبیر کر سکتے ہو جس میں جمال و جلال اور حیات و قیومیت کا رنگ و نور ہو اور وہ قائم بالحسن و حق ہو۔ ایجاز و اختصار کی خاطر اگر اس کے لیے "جمالیاتی معلومہ" کی تعبیر اختیار کر لو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اسے تم موضوعی کہہ سکتے ہو نہ معروضی، کیونکہ یہ قدیم و قائم بالذات اور علیم و قدیر کی معلومہ تھی اور اپنی ذات میں ایک عالم تھی۔ اس کی ماہیت تمہاری عقل و فکر سے ماوراء ہے، اس لیے مثال کے طور پر تم اسے "موضوعی۔ معروضی جمالیاتی معلومہ" سے تعبیر کر سکتے ہو۔

سنو! میں تمہیں تمہارے جہانِ اولین سے متعلق ایک راز کی بات بتاتا ہوں۔ وہ اصل میں تمہارے اِلٰہ و ربّ کا عالمِ حُسنِ ذات ہے۔ یاد رکھو! وہ ہمارے عالمِ خیالات و تصورات کی طرح کا عالمِ اعیان نہیں۔ وہ بے مثل و بے نظیر ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ خود کسی شے کے مثل نہیں اور وہ عالم الحسن والحق کی ذاتِ بے ہمتا و بے عدیل کے علم کا جہانِ حُسن و حق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا علم ہمارے علمِ قلیل و ناقص کی طرح کا نہیں، بلکہ کامل و حق ہے۔ لہٰذا نقص و قلت، عیب و قُبح، انحطاط و زوال اور فانیت و عدمیت سے منزّہ و وراء ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اللہ سُبحان ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ذاتِ حُسن جو مبدءِ صفاتِ حسنہ ہے، اپنی جملہ صفات بشمولِ علم و قدرت ہر طرح کے نقص و عیب، بطالت و قُبح، زوال و انحطاط اور فانیت و عدمیت سے منزّہ و وراء ہے۔ اس کے عالمِ حُسنِ ذات کو عالمِ ہُویت اور لازمان لامکان بھی کہتے ہو۔ وہ عالمِ دہر بھی ہے۔ اس کی ایک صفت جو تمہارے لیے ناقابلِ ادراک و فہم ہے، اس لیے معجزہ ہے، یہ ہے کہ اس کی ایک آن تمہارے شمارِ شب و روز کی رُو سے ایک ہزار سے پچاس ہزار برس تک کی مدت کو محیط ہوتی ہے؛ پھر یہی ہزاروں برس پہ ممتد آنِ دہر مختصر بھی اس قدر ہو جاتی ہے کہ آنِ زمانہ کے برابر بن جاتی ہے۔ یہی معراج النبیؐ کا رازِ حقیقت ہے۔ تمہاری محرومی و بدنصیبی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جو چیز تمہارے علمِ قلیل اور عقلِ نارسا میں نہیں آتی، اس کا انکار کر دیتے ہو

حالانکہ تم جانتے ہو کہ تم عالم الغیب نہیں ہو۔ اصل یہ ہے کہ تم تو عالم الشہادۃ بھی نہیں، اس لیے کہ تمہارا علم قلیل و محدود اور عقل نارسا ہے، اور دونوں اسیرِ زمان و مکان ہیں، نتیجۃً تم اطلاق و اضافیت کی حقیقت کا فہم و ادراک نہیں کر سکتے۔ تم حسن و نور، حیات و قومیت اور علم و قدرت کے جہانِ بے کیف و کم میں کب تک رہے؟ یہ راز نہ میں بتا سکتا ہوں اور نہ تم سمجھ سکتے ہو۔ وجہ یہ ہے کہ نہ تو تمہاری زبان میں اسے بیان کرنے کی استعداد ہے اور نہ افشا ہی اس راز کے مقدور میں ہے؛ نیز نہ اسے سمجھنے کی تم میں مقدرت ہی ہے۔

عالمِ حسنِ ذات یا دہر کی ہر آن اللہ تعالیٰ کی ایک شان ہے۔ ہر شان میں رنگِ دوام بھی ہے اور نمودِ ارتقا بھی۔ "وہی" جانتا ہے کہ تم وہاں کتنی آنات رہے اور تم نے "اُس" کی کتنی شیون دیکھیں۔ تم کیسے سمجھ سکتے ہو کہ ہر شان میں تم سفر بھی کرتے رہے، اور تم نے جو کچھ دیکھا ابدالآباد تک دیکھتے رہو گے۔ اس عالم میں سفر کرتے اور نظارے کرتے کرتے تم میں یہاں سے ہجرت کر کے دوسرے عالم میں جانے اور زندگی کرنے کی آرزو پیدا ہوئی۔ یہ جہان تم "لوحِ محفوظ" میں دیکھ چکے تھے۔ یہ آرزو دراصل تمہاری ذات کے ارتقا کی آرزو تھی۔ تمہارے ربِّ رحمٰن و رحیم اور اِلٰہِ جمیل و کریم نے تمہاری آرزو پوری کر دی اور تمہیں تمہاری پسند کے عالم میں بسایا اور تمہیں ایسی خلقت عطا کی، جو اس عالم کے لیے موزوں تھی۔ تم بہت خوش ہوئے اور "روح" کہلائے اور تمہارے اس نام پر تمہارا یہ جہانِ نو عالمِ ارواح کے نام سے موسوم و معروف ہوا۔

یہاں بھی تم سفر کرتے رہے۔ سمجھو تو زندگی خود سفر ہے، کیونکہ حرکت و تغیّر ملازمِ تقدیرِ حیات ہے۔ یہ بھی ایک راز ہے۔ اس جہانِ بے شب و روز میں تم سفر اور شیونِ اِلٰہی کا مشاہدہ کرتے رہے۔ "وہی" جانتا ہے تم یہاں کتنی آناتِ دہر سفر کرتے رہے۔ آخرِ کار، تم میں یہاں سے ہجرت کر کے عالمِ زمان و مکان میں، جو جہانِ شب و روز بھی ہے اور جہانِ حیات و ممات بھی، بسنے کی آرزو پیدا ہوئی۔ کیا تم جانتے ہو کہ تم میں سفر و تغیّر کی آرزو کیوں ہے؟ یہ اسرارِ حسن میں سے ہے، اور تم یہ راز کم جانتے ہو۔ سنو! میں تمہیں بتاتا ہوں، سفر و تغیّر ایک تو زندگی کی تقدیر ہے؛

دوسرے، تمہارا اِلٰہ جو الحُسن ہے، ہر آن تا زہ بتازہ اور نو بنو شان میں رہتا ہے اور تمہاری روح کو اس کی شیونِ نو بنو کے مشاہدے کی طلب و جستجو رہی ہے۔

بہرکیف، تمہارے اِلٰہ و ربّ نے تمہاری یہ آرزو بھی پوری کردی، لیکن ایسا کرنے سے پہلے اُس نے حکم دیا اور امتثالِ امر میں جملہ ارواحِ آدم اس کے حضور حاضر ہوگئیں۔ اس نے تمہاری یاد تازہ کرنے کی خاطر تمہیں وہ سب کچھ دکھایا جو تم عالمِ حُسن ذات میں دیکھ چکے تھے، لیکن وہاں سے جہانِ ارواح کے سفر کے دوران بھول چکے تھے۔ وہ تم پر مشہود بھی ہوا۔ جب تم نے اپنے اِلٰہ و ربّ کا، نیز اُس کے نورِ حُسن سے عالمِ امکان میں زمان و مکان کا مشاہدہ کر لیا تو اس نے تم سے پوچھا؟

"کیا میں تمہارا ربّ نہیں ہوں؟"

تم دیکھ چکے تھے کہ اُس کی شانِ ربوبیّت کیا ہے؟ تم نے معلوم کر لیا تھا کہ وہ اور صرف وہی تمہارا خالق و رازق، پروردگار و نشوو ارتقاء دینے والا، ہادی و مرشد، حافظ و ناصر، مولیٰ و وکیل اور مالک و حاکم ہے۔ تمہیں اس حقیقت کا مشاہدہ ہو چکا تھا کہ وہ الحسن و الحق ہے اور فقط وہی تمہارا اِلٰہ یعنی معبود و محبوب، مطلوب و مقصود اور ممدوح و مسجود ہے۔ وہ الحیّ و القیّوم، علیم و حکیم، سمیع و بصیر، سُبحان و صمد، اعظم و اکبر اور عزیز و قدیر ہے، نیز وہ رحمان و رحیم، جوّاد و کریم اور مستجیب الدعوٰت ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ الواحد و الاحد، لَاکَمِثْلِہٖ شَیءٌ اور وحدہٗ لاشریک ہے، یعنی وہ یکتا و یگانہ، بے عدیل و بے نظیر ہے، اور اس کی شانِ اُلُوہیّت و ربوبیّت میں اس کا کوئی شریک و سہیم نہیں اور نہ ہو ہی سکتا ہے۔ سو بندہ ہر حال میں اس کا بندہ و فقیر اور محتاج ہے اور ہمیشہ ایسا ہی رہتا ہے، اس دُنیا اور آخرت دونوں میں، خواہ وہ اس کا دوست و برگزیدہ کیوں نہ ہو۔ بندے کی معراج مقامِ عبودیت پر متمکن ہونا ہے۔ وہ نہ اپنا اور نہ دوسروں کا کارساز و حاجت روا ہو سکتا ہے نہ وکیل و مددگار۔ بندہ نہ عالم الغیب والشّہادۃ ہے نہ سمیع و بصیر۔ اُسے ایسا سمجھنا، اس سے فریاد کرنا، اس سے مدد اور مراد مانگنا شرک ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی رازق و ربّ نہیں اور نہ غیر اللہ دوسروں کو کچھ دے ہی سکتا ہے۔ یاد رکھو! اس کے نام کے سوا کسی اور کے نام

کی نذر و نیاز دینا، قربانی دینا، کسی آستانے پر چڑھاوے چڑھانا اور سر جھکانا شرک ہے اور شرک ایسا ظلمِ عظیم و گناہِ کبیرہ ہے کہ "وہ" اُسے کبھی معاف نہیں کرتا۔

یاد کرو! تمھیں اس بات کا بھی حق الیقین ہو گیا تھا کہ تم نے کرۂ ارضی میں انتہائی قلیل مدّت کے لیے زندگی کرنے جانا ہے، جو تمھاری امتحان گاہ ہے تمھیں معلوم تھا کہ اُس نے اپنی مخلوقات کو آزادیِ ارادہ واختیار کی امانت قبول کرنے کی دعوت دی تو سب ڈر گئے تھے کہ وہ اس آزادی کے بارِ گراں کے متحمل نہیں ہو سکیں گے اور اس کا استعمال اس طرح نہیں کر سکیں گے جس طرح کرنے کا حق ہے؛ لہٰذا سب نے، حتّٰی کہ پہاڑوں نے بھی اسے قبول کرنے سے معذرت کر لی، لیکن تم نے جلد بازی اور نادانی سے اپنے اوپر ظلم کیا اور اس امانت کو برضا و رغبت قبول کر لیا، اور اس کے عوض قدرت کے عالمگیر و ہمہ گیر قانونِ مکافاتِ عمل کا مستوجب ہونا منظور کر لیا۔ تم نے پھر یہ دیکھ بھی لیا کہ ہر قول و فعل کی تاثیر اور نتیجہ ہوتا ہے اور انسان کو نتائج بھگتنا پڑتے ہیں۔ علاوہ بریں ہر انسان، فرد ہو یا قوم، اپنے ایمان و عقائد اور قول و فعل کا ذمے دار اور اس کے سامنے جوابدہ ہے، اس لیے کہ وہی مالکِ یوم الدّین ہے۔ یاد رکھو: زندگی کی ہر ساعت، آنِ جزا و سزا ہے، اس لیے کہ وہ سریع الحساب بھی ہے، لیکن جزا و سزا کا آخری و فیصلہ کُن دن وہ ہے جو قیامت کا "یوم الدّین" ہے۔ چونکہ تم نے برضا و رغبت آزادیِ ارادہ و اختیار کے عوض اس امتحانِ زندگی سے گزرنا قبول کیا تھا، اسی لیے تمھیں اس دنیا میں فکر و نظر اور قول و فعل کی آزادی ہے، اور تم نے اُخروی زندگی کے مقابلے میں انتہائی قلیل مدّت کے لیے امتحان دینا ہے۔ اس کے بعد موت تمھیں دارالآخرت میں، جو الحیوان ہے، پہنچا دے گی۔ الحیوان میں زندگی ہے موت نہیں۔ وہاں تم نے ہمیشہ رہنا ہے۔ الحیوان کے دو بڑے حصّے ہیں: جنّت اور جہنم۔ جنّت اہلِ حُسن و سُرور کا حُسن المآب[2] اور ان کے لیے ان کے اِلٰہ و ربّ کا مہمان خانہ ہے، جو قُرّۃُ العین[3] ہے اور دید[4] و لِقاء[5]، ہم نظری[6] و ہمکلامی[7]، قرب[8] و حضوری[9] اور ہم رضائی[10] کا حُسنُ المقام ہے۔ بخلاف اس کے جہنم اہلِ نار کا شرّ المآب[11] اور آتشکدۂ خوف و حزن ہے۔ اہلِ نار وہاں "اُس" کی دید و آواز اور حیات و موت کی لذّت سے نا آشنا ہوں گے۔[12] شدّتِ عذاب سے وہ عالمِ سکرات میں ہوں گے۔ نہ زندہ ہوں گے

نہ مردہ۔[۱۴]

یاد رکھو: جو دُنیا میں لذّتِ حیات سے آشنا اور اہلِ حسن و نظر ہوگا، وہی جنّت میں لذّتِ زندگی اور دید و آوازِ "دوست" کی لذّت سے آشنا ہوگا۔ بخلاف اس کے جو شخص دُنیا میں لذّتِ زندگی سے ناآشنا اور اندھا اور بہرا ہوگا، وہ دوزخ میں بھی ایسا ہی ہوگا۔ تم اس حقیقت کے شاہد ہو کہ حُسنِ ایمان و عمل سے نفس حسین و مطمئن بنتا اور لذّتِ حیات سے آشنا ہوتا ہے اور کفر و شرک اور اعمالِ قبیحہ سے نفس اپنے فطری حُسن و اطمینان سے محروم ہو کر رہینِ خوف و حزن ہو جاتا اور لذّتِ زندگی سے ناآشنا رہتا ہے۔ علاوہ بریں، تم نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ اس ارضی دُنیا میں رہ کر تمہیں اپنی اندر کی دُنیا کی تشکیل و تعمیر اور تزئین و تحسین کرنی ہے، جس میں تم نے دُنیا اور الحیوان میں رہنا ہوگا؛ نیز تمہیں اپنی دنیا کے حُسن و قبح کے مطابق الحیوان میں حُسن المآب یا شرّ المآب میں رہنا ہوگا۔

یہ بات ذہن نشین کر لو کہ شرک ظُلم عظیم اور قبحِ محض ہے اور اس کے ہیولے میں ظُلمت آسا آتشِ سوزاں مضمر ہے، نیز حسرت و یاس، ناکامی و نامرادی، خوف و حزن کی اس آگ کا عذاب بے حد شدید و المناک اور مُقیم و سرمدی ہے، اور یہ کم ہوگا نہ اس سے نجات ہی ممکن ہے۔ یاد رکھو! شرک سب سے بڑا اور ناقابلِ عفو جُرم و گناہ ہے۔

اچھا اب بتاؤ کہ اس نے جب تم سے پوچھا تھا: "کیا میں تمہارا ربّ نہیں ہوں؟" تو تم نے کیا جواب دیا تھا؟ سنو! میں تمہیں بتاتا ہوں۔ تم سب نے پورے ایقان و اذعان کے ساتھ یک زبان ہو کر جواب دیا تھا:

"بلٰی ــــ شَہِدْنَا": ہاں، ہم (اس حقیقت کی شہادت دیتے ہیں (کہ تو ہمارا ربّ ہے)

(الاعراف ۷: ۱۷۲)۔

تم نے اپنی ذات کے حوالے سے اقرار کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ ہی تمہارا ربّ ہے۔ تمہارے اس اثباتِ توحیدِ ربوبیّت میں شرک کی نفی مضمر ہے۔ یہ تمہارا اس سے عہد و پیمان ہے، جسے "میثاقِ عبدیّت" سے تعبیر کر سکتے ہو۔ یہ تمہارے شعور، حجابِ شعور اور پاتالِ شعور میں اس طرح محفوظ ہے کہ زمانہ کبھی

اسے محو نہیں کر سکتا۔ تمہیں اپنا یہ عہد و پیمان اس لیے یاد نہیں آتا کہ تم اسے یاد کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ تمہیں اپنے باطن میں صحیفۂ فطرت کو کبھی دیکھنے اور پڑھنے کا خیال ہی نہیں آتا۔ اگر یہ عہد و پیمان تمہارے شعور کے پاتال اور حجاب سے سطحِ شعور پہ اپنی نمود دکھاتا بھی ہے تو تم اس سے صرفِ نظر کر لیتے ہو اور اسے درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھتے۔ یہی تمہاری ضلالت و شقاوت، کفر و الحاد، شرک و بت پرستی، ظلم و عدوان اور جرم و گناہ کی علتِ فاعلی ہے"۔

دفعتاً حُسن کی موجِ ندا پُراسرار سکوت میں بدل گئی۔ عالمِ جذب و مستی میں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میخانۂ حُسن کے ساقیِ جمیل و جلیل نے میرے ہاتھ سے اپنی رحیقِ مختوم کا جام لے لیا ہے۔ میرا قلم، جو کسی انجانی قوت کے زور سے اسرار و حقائق رقم کر رہا تھا، خود بخود رُک گیا۔ میں ابھی اس عالمِ حیرت میں تھا کہ برقِ آوازِ حُسن لہرائی اور دل کی گہرائیوں میں اترنے لگی:

"سنو اور یاد رکھو کہ ربِ رحیم و جمیل نے تمہارا امتحان لینے کے لیے زمان و مکان کی تخلیق کی؛ کیونکہ تم نے آزادیِ ارادہ و اختیار کے عوض امتحانِ زندگی سے گزرنا منظور کر لیا تھا۔ پھر اس نے تمہارے لیے زمین و آسمان کو حسین بنایا؛ اور تمہاری اس دُنیا کو جمیل و جلیل صور و اشکال، دلکش و نظر افروز مناظر اور دلآویز و مسحور کُن رنگ و نور کے نظاروں سے مزین اور بے شمار و لامتناہی اور معطر و لذت آفریں نعمتوں سے معمور کر دیا؛ نیز اُسے موت و حیات کے ہنگاموں کی جولانگاہ بنا دیا، جو دلآویز و دلچسپ بھی ہیں اور بصیرت افروز و عبرتناک بھی۔ اس نے اپنی رحمت سے تمہاری خاطر کائنات میں تسخیر پذیری کی استعداد اور تم میں اسے مسخر کرنے اور اس کی نعمتوں سے استفادہ و تمتع کرنے کی قوتِ علم و ہنر ودیعت کر دی۔

سنو! لیکن گوشِ حق نیوش سے! دیکھو اگر دیدۂ عبرت نگاہ سے! دیکھو اور سنو، یاد رکھنے اور عمل کرنے کے لیے۔ وہ شخص مسلسل خسارے میں ہے جو نہ سنتا نہ دیکھتا اور نہ حُسنِ عمل ہی کرتا ہے۔ سنو! نہ صرف تم بلکہ اس حُسنِ کائنات کی ہر جمیل و جلیل چیز اُس کی جمالیاتی تخلیقی فعلیت کی مرہونِ منت ہے اور یہی اس کے حُسنِ صوری و معنوی کی علتِ غائی ہے۔ یہی اس کے رنگ و بُو

حیات و نور اور جمال و جلال کا راز ہے، نیز اسی وجہ سے وہ دلکش و قُرّۃُ العین اور تمہارے جمالیاتی ذوق کی تسکین کا سامان ہے۔ یہ نکتہ ذہن نشین کر لینے کے قابل ہے کہ یہ کائنات اس نے یونہی بے مقصد نہیں بنا دی، بلکہ یہ تخلیق بالحق ہے، یعنی اس کی ہر چیز تمہارے لیے نعمت ہے اور افادہ وفیضان اور غرض و غایت رکھتی ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ تمہیں آزمایا جائے کہ تم حسنِ فکر و نظر، حسنِ ایمان و عمل، حسنِ قول و فعل اور آرزوئے حسن کے ساتھ حسین زندگی گزارتے ہو یا نہیں؟ امتحانِ زندگی میں سے کامیاب گزرتے ہو یا نہیں؟ تم اپنے عہد و پیمان کے مطابق مجھے اور صرف مجھے اپنا الٰہ و ربّ بناتے ہو یا نہیں؟ صرف میری عبادت کرتے ہو یا نہیں؟ میری دید و رضا اور قربِ حضوری کے لیے اہلِ عشق و وفا بنتے ہو یا نہیں؟ میرے پاس اہلِ حسن و سرور یا نفسِ مطمئنّہ بن کر آتے ہو یا نہیں؟ اپنی دنیا کو حسین بناتے ہو یا نہیں؟ اپنے نورِ ذات کے نشو و ارتقاء کی سعی کرتے ہو یا نہیں؟ الغرض، تم نے اس کے ساتھ جو عہد و پیمان کیا ہوا ہے اسے نبھاتے ہو یا نہیں؟ اور اس کی طلب و جستجو میں اس کے حسین راستے پر گامزن رہ کر اس تک پہنچتے ہو یا نہیں؟

تم پوچھتے ہو کہ اس کی ہر جمالیاتی تخلیق کی طرح کیا موت بھی حسین ہے؟ ہاں موت بھی حسین ہے، جو تمہیں اس عالمِ حیات و موت سے دارالآخرت یا الحیوان میں پہنچاتی ہے۔ موت اس کے لیے حسین ہے جو اہلِ حسن و سرور ہیں اور وہ انہیں جنّت میں پہنچاتی ہے، جو ان کے معروضِ حسن و عشق کا مقامِ بقاء ہے۔ لیکن موت سے انہیں خوف آتا ہے جو اہلِ نار و قبح کار ہیں اور جانتے ہیں کہ موت انہیں جہنم میں پہنچائے گی۔ وہاں اس پر یہ حقیقت منکشف ہوگی کہ موت بھی حسین ہے۔ وہ عذابِ النار سے نجات حاصل کرنے کے لیے موت کو ترسیں گے اور ان کی طلب و آرزو میں جان دیں گے، لیکن وہاں موت کی صورت دیکھ نہ سکیں گے۔ وہاں وہ لذّتِ موت و حیات سے آشنا نہ ہو سکیں گے۔ یاد رکھو! زندگی اُن کی ہے جو اہلِ حسن و سرور ہیں، اور وہی اس کی لذت سے لُطف اندوز ہوتے ہیں۔ وہی حقیقت میں زندہ ہوتے ہیں۔ بخلاف اس کے جو اہلِ نار ہیں، مردہ ہوتے ہیں نہ زندہ۔ وہ ہوشیار نظر آتے ہیں، مگر حقیقت میں باؤلے ہوتے ہیں، لیکن انہیں اپنی حالت کا بہت کم

شعور ہوتا ہے۔

سنو! میں تمہیں تمہاری ایک داستان سناتا ہوں، جو فلسفۂ حیات اور مہماتِ معارف کی آئینہ دار ہے۔ افسوس ہے تم پر کہ تم آئینۂ عصر میں اپنی داستانِ زندگی کی تصویر دیکھتے ہی نہیں۔ اُس نے تمہیں عقل ایسی نعمتِ عظمیٰ عطا کی ہے تاکہ تم غور و فکر کرو، حقائقِ حیات و کائنات کا ادراک کرو اور غرض و غایتِ زندگی کو سمجھو، لیکن تم انفس و آفاق میں تفکّر بالحق کرتے ہی نہیں۔ کیا یہ کفرانِ نعمت نہیں؟ یقیناً یہ کفرانِ نعمت ہے اور یہی تمہاری ضعیفی و پسماندگی، ذلت و مسکنت، محرومی و نامرادی اور "اُس" سے مہجوری و دوری کا بنیادی سبب ہے، لیکن تمہیں اس کی بھی خبر نہیں۔ تمہارے ظلم و جہل کا یہ حال ہے کہ تم لعل و گوہر کے بجائے سنگریزوں کو متاعِ گراں بہا سمجھتے ہو۔ تم چشمۂ حیواں سے منہ موڑ کر سراب کے پیچھے بھاگتے ہو۔ تمہارے ظلم و جہل کی انتہا یہ ہے کہ تم اپنے اِلٰہ و ربّ کو چھوڑ کر اس کے بندوں کو اپنا اِلٰہ و ربّ بناتے ہو اور اُن کی پرستش کرتے ہو۔ انہیں پکارتے ہو، اُن سے مرادیں مانگتے ہو؛ اُن کو اپنا کارساز و حاجت روا، رازق و مددگار، غوث و دستگیر اور والی و مشکل کشا سمجھتے ہو۔ تم اُن کا ذکر اس طرح کرتے ہو جس طرح ذکرِ الٰہی کرنا چاہیے۔ تم اُن سے محبّت اور اُن کی حمد و ثنا اس طرح کرتے ہو جس طرح "اُس" سے محبّت اور "اُس" کی حمد و ثنا کرنی چاہیے۔ تم ان کی نذر و نیاز دیتے اور ان کے مقبروں اور آستانوں پر چڑھاوے چڑھاتے ہو۔ انہیں سمیع و بصیر، حاضر و ناظر اور مجیب الدّعوات مانتے ہو۔ اس پر بھی تمہیں اصرار ہے کہ تم شرک نہیں کرتے۔ اس پر بھی تم اپنے آپ کو موحّد و متّقی اور زاہد و عابد سمجھتے ہو۔ تم ہی بتاؤ کہ اگر یہ نہیں تو پھر شرک کیا ہے؟ اگر تم مشرک نہیں تو پھر اور کون مشرک ہو سکتا ہے؟ یاد رکھو! جب تک تم تسلیم نہیں کرتے کہ یہ شرک ہے اور شرک کو شرک نہیں سمجھتے اور نہیں مانتے اور اس سے تائب نہیں ہوتے، تم مؤمن و موحّد نہیں بن سکتے اور نہ لذّتِ ایمان و زندگی سے بہرہ مند ہی ہو سکتے ہو۔ علاوہ بریں، اس اعترافِ حقیقت اور توبہ و انابت کے بغیر تمہاری نفسیاتی حالت نہیں بدل سکتی اور جب تک اپنی نفسیاتی حالت نہیں بدلو گے "وہ" تمہاری دنیوی حالت نہیں بدلے گا، کیونکہ یہ "اُس" کی سنّت ہے، جو بدلا نہیں کرتی۔

اپنی حالت بدلنا اور زندہ رہنا چاہتے ہو تو ذکر و فکر کو اپنا شعار بنا لو۔ اس کے حوالے سے اپنے نفس اور کائنات میں حکیمانہ غور و فکر کرو، تفکر بالحق کرو۔ اپنی داستانِ زندگی کو یاد کرو اور اس پر تدبر کرو۔ تمہیں تمہارے سوالوں کے جواب مل جائیں گے جو تمہیں پریشان کرتے ہیں۔

سنو! میں تمہیں تمہاری ایک داستان سناتا ہوں، جو انتہائی اہم، بصیرت افروز اور حکمت آموز ہے۔ اسے گوشِ نصیحت نیوش سے سنو! اس میں غور و فکر کرنے اور اس کے مطابق زندگی کرنے کے لیے سنو!

ربِ رحمان تمہارے لیے آسمان اور زمین کی تخلیق و تحسین کر چکا تو اُس نے ایک دن اپنے ملائکہ سے کہا: "میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔" ملائکہ کو وہ بتا چکا تھا کہ اُس نے زمان و مکان کی تخلیق تمہارے لیے کی ہے اور تمہاری تخلیق زمین کی مٹی سے ہوئی ہے، لہٰذا وہ تو یہ سمجھ گئے کہ اللہ تعالیٰ کرۂ ارض میں تمہیں خلیفہ بنانے والا ہے، لیکن وہ اس حقیقت سے نابلد تھے کہ تم خلافتِ ارضی کے کے سزاوار ہو۔ وجہ یہ تھی کہ وہ تمہارے جبلی خصائص سے تو ایک حد تک واقف، لیکن تمہاری قوتِ علم یا "سلطان" کی حقیقت سے انہیں آگاہی نہ تھی، کیونکہ استعدادِ علم جو اس نے تم میں ودیعت کی تھی، وہ ابھی قوت سے فعل میں نہیں آئی تھی اور اُس نے ملائکہ کو ابھی اس حقیقت سے آگاہ بھی نہیں کیا تھا۔ لہٰذا وہ اس کی بات سمجھ نہ سکے اور بجائے اس کے کہ وہ اس کے فہم و ادراک کی خاطر اس پر غور و فکر کرتے یا اس کی طرف رجوع کرتے، برملا بول اُٹھے: "کیا آپ کرۂ ارضی میں اسے خلیفہ بنانے والے ہیں، جو اس میں فساد و خونریزی کرے گا؟"

تُم نے دیکھا فرشتوں کے اس استفہامِ بیانیہ میں تمہارے لیے حکمت و معرفت کے بہت سے نکات مضمر ہیں۔ افسوس ہے تُم پر کہ تم نے بارہا اپنی یہ حکایت سُنی، لیکن کبھی اس پر غور و فکر نہ کیا اور نہ کوئی حکمت و معرفت کی بات سیکھی۔ یاد رکھو اللہ تعالیٰ کی ہر بات سچی اور اُس میں حکمت و مصلحت ہوتی ہے؛ نیز وہ انسب و احسن ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ عالم الغیب والشہادۃ، حکیم و قدیر اور سُبحان و قدّوس ہے، لہٰذا اس کی بات سمجھ میں آئے یا نہ آئے اسے ہر حال میں

سچ سمجھ کر تسلیم کرنا چاہیے کہ اسی میں تمہاری حسنہ وخیر اور کامیابی وفلاح کا راز مضمر ہے۔اس کی کسی بات میں شک نہیں کرنا چاہیے، چاہے وہ تمہاری سمجھ میں آئے یا نہ آئے، کیونکہ ایسا کرنا ظلم وجہل ہے۔اس کے ہر ارشاد کو پورے ایقان واذعان کے ساتھ ماننا ہی تمہارے حق میں احسن وانسب اور موجبِ خیر وحسنہ ہے اور یہی ایمان کا خاصّہ اور اس کا اصل الاصول ہے۔

کیا تم جانتے ہو کہ خلیفہ کسے کہتے ہیں اور اس کے فرائض کیا ہیں؟ یا بالفاظِ دیگر، خلافت کا مطلب اور اس کے وظائف کیا ہیں؟ سنو! میں تمہیں بتاتا ہوں۔تمہیں یہ حقیقت ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ تنہا اللہ تعالیٰ ہی تم سب کا خالق وپروردگار، آقا ومالک اور حاکم وبادشاہ ہے۔وہی کائنات کی کُل نعمتوں کا مالک ہے اور اس نے انہیں اپنے کُل بندوں کے استفادہ وتمتّع کے لیے پیدا کیا ہے۔کوئی فرد، جماعت یا قوم اس کی نعمتوں کی مالک نہیں اور نہ ہو ہی سکتی ہے۔سبھی افرادِ نسلِ انسانی ان کے امین ہیں، لہٰذا وہ ان سے مستفید ومتمتّع تو ہو سکتے ہیں، لیکن اپنی قوت وطاقت یا حیلہ سازی سے، چاہے وہ وضعی آئین وقوانین کے ذریعے سے ہو یا بذریعہ ظلم واستحصال، دوسرے افراد واقوام کو ان سے استفادہ وتمتّع کرنے میں مانع نہیں ہو سکتے اور نہ وہ احتکار واکتناز کرنے کے مجاز ہیں۔اس حقیقت کے پیشِ نظر اس نے تم کو اس دنیا میں خلیفہ بنایا کہ تم اس کے آئین وقوانین کے مطابق کُل بنی نوع انسان کو بلکہ دیگر مخلوقات کو بھی اس کی نعمتوں سے استفادہ وتمتّع کرنے کے یکساں مواقع فراہم کرو، لیکن کسی فرد، جماعت یا قوم کو اس امر کی اجازت نہ دو کہ وہ اس کی نعمتوں سے اس کے بندوں کو محروم رکھے اور انہیں ان سے متمتّع ہونے کا موقع نہ دے۔یاد رکھو! یہ ظلم وعدوان ہے۔یہی حقیقت میں غُلُوّ فی الدّین ہے۔

اگرچہ تم میں سے ہر فردِ بشر "اس" کی طرف سے خلیفہ ہے، کیونکہ وہ اس کی طرف سے اپنے آپ پر، اپنے خاندان اور ماتحتوں پر حکمرانی کرتا ہے، لیکن اصل میں خلیفہ اسے کہتے ہیں، جس کے ہاتھ میں زمامِ حکومت ہوتی ہے۔لیکن ہر حکمران اس کا خلیفہ نہیں ہوتا، جس طرح ہر بندہ اس کا بندہ نہیں ہوتا۔اس کا خلیفہ حقیقت میں وہ ہوتا ہے جو اس کے بندوں کو اپنے نہیں، اس کے

بندے سمجھتا ہے، اور ان پر اپنا حکم نہیں چلاتا، بلکہ اس کے آئین و احکام کے مطابق حکومت کرتا ہے۔ اس وجہ سے اس کی حکومت میں فرعون و ہامان اور قارون و آزر نہیں ہوتے اور نہ مظلوم ومحتاج اور محروم وغلام ہی ہوتے ہیں۔ ہر فرد مکرّم و آزاد اور صاحبِ ارادہ واختیار ہوتا ہے۔ اس کا خلیفہ عادل ومُحسن، متّقی وصالح، عالم وحکیم اور ربِّ کریم کی مخلوقات کیلیے باعثِ رحمت ہوتا ہے۔ یاد رکھو! جس معاشرے میں اسلامی حکومت یا خلافت ہوتی ہے، وہ عدل واحسان، امن و سلامتی، حسنہ وخیر، اخوّت ومحبّت اور حرّیت ومساوات کی جنّت ہوتا ہے۔ وہاں لوگ مُومن وصالح، موحِّد ومتّقی، جمیل وجلیل، مجاہد وصابر، محنتی وجفاکش، صاحبِ کردار واولوالعزم، نیز علم وحکمت، فن وہُنر اور سائنس وٹیکنالوجی کے شیدائی اور کائنات کی تسخیر کرنے والے ہوتے ہیں۔ وہ اہلِ حُسن وسُرور ہوتے ہیں؛ انہیں اپنے اِلٰہ و ربّ کی آرزو ہوتی ہے، اس لیے خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہتے ہیں۔

یاد رکھو! "اُس" کا خلیفہ وہ ہوتا ہے جو خود بھی رنگِ الٰہی سے مزیّن ہو اور اس کے بندوں کو بھی اس کے رنگ میں رنگنے کا حتی المقدور اہتمام کرتا ہو۔ وہ اپنی رعایا کے جان وایمان، مال و دولت، عزّت وناموس، معتقدات ونظریات، ثقافت وروایات، قومی دولت، پیداواری وسائل، اخلاقیات واقتصادیات؛ نیز جغرافیائی ونظریاتی اور ادبی وفنّی سرحدوں کا محافظ وذمے دار ہوتا ہے۔ رعایا کی کفالت بھی اس کی اہم ترین ذمے داری ہے، لہٰذا وہ ان کے رزقِ کریم، موزوں سکونت و لباس، صاف وپاکیزہ ماحول، صحت وتندرستی، ورزش وحلال بازی[16]، طمانیتِ نفس وتفریح، سیرو سیاحت اور ان کی جسمانی اور نفسیاتی نشوو ارتقاء کا بندوبست کرتا ہے۔ وہ چونکہ ربّ العالمین کا نائب ہوتا ہے، اس لیے وہ بنی نوع انسان کے علاوہ اس کی دیگر مخلوقات مثلاً حیوانات، نباتات اور جمادات کا بھی محافظ ومربّی ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ کُل عالم کے لیے باعثِ رحمت ہوتا ہے۔

یاد کرو! جب فرشتوں نے اللہ تعالیٰ سے تمہارے متعلق یہ کہا تھا کہ زمین میں فساد اور کشت وخون کرنا تمہارا شعار ہوگا تو ساتھ ہی اپنے متعلق یہ کہا تھا کہ "حالانکہ ہم آپ کی حمد وثنا کے ساتھ تسبیح اور اور آپ کی تقدیس کرتے رہتے ہیں"۔ غور کرو تو اُن کے اس کلام میں ان کے دل کی دو باتیں مضمر تھیں:

اولاً، چونکہ فساد انگیزی و خون ریزی تمہاری سرشت ہے، لہٰذا تم خلافتِ ارضی کے سزاوار نہیں۔ ثانیاً، خلافت کے سزاوار تو وہ ہیں جو اس کی حمد و ثنا اور تقدیس و تمجید کرنے کے خوگر ہیں، چونکہ ان کا یہ نظریہ غلط تھا، لہٰذا تمہارے ربّ کا ارشاد ہوا: میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔"

غور کرو! ربِّ علیم و حکیم کے اس مختصر جواب میں کس قدر اہم حقائق مضمر ہیں: اولاً، اس میں ملائکہ کے اس دعوے کی تردید مضمر ہے کہ آدمی متقی و صالح نہیں بلکہ محض مفسد و سفاک ہے، لہٰذا وہ خلافتِ ارضی کا سزاوار نہیں۔ ثانیاً، اس سے ان کے اس نظریے کا ابطال مقصود تھا کہ فقط اس کی حمد و ثنا اور تمجید و تقدیس کرنے والے ہی خلافت کے سزاوار ہیں؛ یعنی علم کی قوّت و توانائی کے بغیر زاہد و عابد خلیفہ ہو سکتا ہے۔ ثالثاً، اس جواب میں یہ اصل مضمر ہے کہ خلافت کی ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے علم الاشیاء ناگزیر ہے۔ اس سے دو نتائج مستنبط ہوئے: ایک یہ کہ خلافت کو علم متلزم ہے اور اہلِ علم ہی خلافت کے سزاوار ہیں اور انہیں ہی خلیفہ مقرر کرنا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ اس نے ہر فردِ بشر کو دُنیا میں خلیفہ بنایا ہے، لہٰذا علم حاصل کرنا ہر فرد پر فرض ہے۔ رابعاً، چونکہ اس نے تم میں علم کو بالقوہ ودیعت کیا تھا، جسے قوّت سے فعل میں لاکر تم اللہ تعالیٰ کی وحی و تنزیل کو پڑھ اور سمجھ سکتے تھے اور اس کی روشنی میں اپنی حسّی، قلبی اور نفسی قوّتوں کی نشوونما، اپنے اخلاق کی تہذیب و تحسین، اور اپنے نورِ حسنِ ذات کی تکمیل کر سکتے تھے، نیز اپنی حقیقی راہ و منزل کا سراغ لگا کر اُس تک پہنچ سکتے تھے، لہٰذا اُس نے دُنیا میں تمہیں خلیفہ مقرر کیا تھا۔ علاوہ بریں، علم کی قوّت و توانائی، رشد و ہدایت اور نور و حکمت کے ذریعے تم اس کے آئین و احکام کے مطابق خلافت کی بنیاد عدل و احسان پر رکھ کر اس کی ذمے داریوں سے عہدہ برآہ ہو سکتے تھے، اس لیے تم ہی خلافتِ ارضی کے سزاوار تھے۔ خامساً، اس کے جواب میں یہ حقیقت بھی مضمر ہے کہ علم کو زہد پر اور عالم کو زاہد پر تفوّق و فضیلت حاصل ہے۔ سادساً، چونکہ اس نے تمہیں دُنیا میں خلیفہ مقرر کیا ہے اور تم نے ہر حیثیت میں کاروبارِ خلافت چلانا اور اس میں حصّہ لینا ہے، اس لیے تم رہبانیّت و خانقاہیت کا مسلک اختیار کرنے کے مجاز نہیں۔ سابعاً، تم پر تحصیلِ علم ہی لازم نہیں، بلکہ

اس میں مسلسل ترقی کرتے اور قوت و توانائی حاصل کرتے رہنا بھی تم پر فرض ہے۔ وجہ یہ ہے کہ "سلطان"، جو علم کی قوّت و توانائی کی احسن تعبیر ہے، اس کے ذریعے ہی تم کائنات کی اشیاء کو مسخر کر کے ان سے استفادہ و تمتع کر سکتے ہو اور اس طرح اس کے شکر گزار بندے بن سکتے ہو۔ علم نورِ حکمت اور رشد و ہدایت بھی ہے، جس کی بدولت تم زندگی کے ہر گوشے میں ترقی کر سکتے، اسے امن و سلامتی کی جنّت بنا سکتے اور زندگی کے حسین و مستقیم راستے پر چل کر اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ سکتے ہو جو تمہارے معروضِ حسن و عشق کی ہم نظری و ہمکلامی، قرب و حضوری اور ہم رضائی کا مقام ہے جسے تم احسان و رضوان کے حُسن المقام سے تعبیر کر سکتے ہو۔ ثانیاً، علم اپنے نُور کے باعث معرفتِ دیدِ الٰہی کا ذریعہ بھی ہے اور معرفت و دید کی بدولت تمہارے قلب میں محبّتِ الٰہی کا شرارِ خفتہ فروزاں ہو کر برقِ عشق بنتا اور تمہیں اہلِ عشق و وفا بناتا ہے، جو اس کے دوست و مقرب اور منظورِ نظر و انعام یافتہ بندے ہیں۔ ان کے لیے ہی اُس نے جنّت بنائی ہے، جس کے حُسن و نعم کا کوئی متنفس تصوّر تک نہیں کر سکتا۔ بے مثال و قرّۃ العین حُسنِ جہاں تمہارا حسُنُ المآب ہے، جہاں تم اس کے اہلِ حُسن سرور بندوں کے ساتھ اس کے مہمان بن کر حُسن و عشق، لذّت و حظ اور کیف و سُرور کی حیاتِ جاوداں گزارو گے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ تم اس کی ہم نظری و ہمکلامی اور حضوری و رضوان کی رحیقِ مختوم کے نشے سے سدا سرشار رہو گے، لیکن اس رحیقِ مختوم کے حُسنِ تاثیر سے تمہارا ذوق و شوقِ دید فزوں تر ہوتا چلا جائے گا اور وہ تمہاری خاطر ہر آن اپنا نو بنو اور تازہ بتازہ جلوہ پیدا کرتا رہے گا۔[۱۷]

سنو! علم سرِّ خدائی ہے، سُلطان ہے، یعنی یہ قوّت و توانائی کا لامتناہی خزینہ ہے، لہٰذا وہی قوم دُنیا میں ترقی کرتی اور آزاد رہ سکتی اور خلافتِ ارضی کی سزاوار ہوتی ہے جو حاملِ "سلطان" ہوتی ہے اور جو اس اعتبار سے دوسری اقوام پر سبقت لے جاتی ہے، اُسی کو وہ ان کی قیادت تفویض کر دیتا ہے۔ یہ اس کی سُنّت ہے۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ جس نے علم کی حقیقت و اہمیت سمجھی، اس کی قوت و توانائی اور روشنی و ہدایت حاصل کی اور قدر کی، اسی کو جاہ و جلال اور عزّت و فضیلت ملی اور وہی خلافتِ ارضی کی سزاوار ہوئی۔ اس اصل الاصول کا اطلاق افراد پر بھی ہوتا ہے۔

یاد کرو، پھر ایسا ہوا کہ تمہارے ربِّ علیم وحکیم نے تمہیں اشیاء کے نام سکھا دیے، یعنی اشیائے کائنات کے خواص وصفات کا علم تم میں ودیعت کر دیا۔ پھر خلقتِ کائنات کی ان تمام چیزوں کو فرشتوں کے سامنے کر دیا کہ وہ ان کو دیکھ لیں اور ان سے کہا: "اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو ان چیزوں کے نام یعنی خواص وصفات بتاؤ؟" انہیں ان اشیاء کا علم ہوتا تو وہ ان کے نام بتاتے۔ وہ خجالت ودرماندگی سے سلطانِ عالم کے سامنے سرنگوں ہو گئے اور یک زبان ہو کر عرض کیا: "بیشک تیری ذات ہر نقص وعیب سے منزہ وپاک ہے۔ ہم تو اتنا ہی علم رکھتے ہیں جتنا آپ نے ہمیں دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علیم وحکیم صرف آپ ہیں!"

یاد ہے پھر اس نے تم سے کہا: "اے آدم! تم ان چیزوں کے نام یعنی خواص وصفات بتاؤ!" تم نے ان چیزوں کے نام بتا دیے تو اس نے ان سے کہا: "میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کے سارے حقائق جانتا ہوں جو تم سے مخفی ہیں۔ نیز میں وہ بھی جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو، اس کا بھی مجھے علم ہے۔ اب تم آدم کے سامنے سرِ تعظیم خم کرو!" سب ملائکہ سرنگوں ہو گئے، مگر ابلیس جو جنات میں سے تھا، سرنگوں نہ ہوا۔ اس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور تکبّر کیا۔ اس طرح وہ نافرمانوں میں شامل ہو گیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اس سے پوچھا: "کس بات نے تجھے سجدہ کرنے سے باز رکھا، جبکہ میں نے تجھے ایسا کرنے کا حکم دیا تھا؟" ابلیس کا جواب تھا: "اس بات نے کہ میں آدم سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور آدم کو مٹی سے۔"

حسد کی آگ نے اس کی عقل ودانش کو بھسم کر دیا تھا تو وہ فرشتوں کی طرح عجز وانکساری کی روش کیوں اختیار کرتا؟ اس نے تمہاری دشمنی میں فرشتہ خصلت رہنے کے بجائے شیطان بننے کو ترجیح دی، اور اِلٰہ وربّ کے قرب وحضوری پر دُوری ومہجوری اور خشوع وخضوع اور توبہ انابت کرنے کے بجائے سرکشی وعدوان کی راہ پسند کی تو ربِّ جلیل نے بھی اسے اپنی نظروں اور بلند مقام سے گرا دیا اور عالمِ ملکوت سے باہر نکال دیا اور اپنے آپ سے دُور کر دیا۔ اس پر اس کی آتشِ حسد وعداوت

اور بھڑک اُٹھی، چنانچہ اُس نے اپنے اس دعوے کو سچ ثابت کرنے کی خاطر کہ تم خلافتِ ارضی کی ذمے داریوں سے عہدہ برآنہ ہوسکو گے اور نہ اس کی حیاتیاتی فریب کاریوں اور وسوسہ اندازیوں سے بچ ہی سکو گے، بجز اللہ تعالیٰ کے سچّے بندوں کے، تمہاری دُنیا کو اپنی شیطنت کاریوں کی جولانگاہ بنانے اور تمہیں گمراہ کرنے اور تمہارے اِلٰہ و ربّ سے تمہیں دُور کر کے اپنا بندہ بنا کر دکھانے کی قیامت تک کے لیے مہلت مانگی۔ اس کی یہ درخواست ایک چیلنج تھی، جسے ربّ العالمین نے منظور کرلیا۔ یہاں سے تمہاری ارضی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ جو کچھ تم نے سُنا وہ اس داستانِ زندگی کا حرفِ آغاز تھا، جس میں حقائق و معارف کا ایک دفتر مضمر ہے۔ سنو! میں تمہیں چند ایک مُہمّاتِ معارف و حقائق سے آگاہ کرتا ہوں:

۱۔ فقط اور تنہا اللہ تعالیٰ ہی عالم الغیب والشّہادۃ ہے اور اس کی جُملہ مخلوقات، جن میں ملائکہ، جنّات اور بنی نوعِ انسان سب شامل ہیں، بہت کم علم رکھتے ہیں اور ان کا علم ہر حال میں علمِ الٰہی کے مقابلے میں قلیل و ناقص اور غیر معتبر ہے۔

۲۔ انسان کا علم محدود و قلیل ہے، لہٰذا اس کی عقلِ بُرہانی علمِ الٰہی کی روشنی کے بغیر سچّے نتائج کا استقرا، و استخراج کرنے کے لیے کافی ہے نہ قابلِ اعتماد۔

۳۔ عقلِ بُرہانی کے مقدّمے کی بنیاد صداقت و واقعیّت پہ مبنی ہونے کے باوجود ضروری نہیں کہ وہ اس سے صحیح نتیجہ اخذ کرے۔

۴۔ تکبّر نے جس طرح ابلیس کو مکرّم و مقرّب فرشتے سے ملعون و مردود شیطان بنا دیا، وہ فرشتہ خصائل انسان کو بھی اسی طرح شیطان بنا کر ذلیل و خوار کرتا ہے کہ تکبّر کا خاصّہ ہی یہ ہے۔

۵۔ تکبّر سے حسد و عداوت اور سرکشی و نافرمانی کے جذبات پرورش پاتے ہیں اور انسان کو بہرہ، اندھا، بےعقل و سنگدل، ظالم و جاہل اور سفّاک و عاقبت نااندیش بنا دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کا بلکہ اپنا بھی دشمن بن جاتا ہے، اگرچہ بہت کم اس کا شعور رکھتے ہیں۔

۶۔ انسان کے جمال و جلال، عظمت و سطوت، عزت و مرتبت، ترقی و خوشحالی اور آزادی و حکومت اور قیادت و سیادت کا راز "سلطان" یعنی علم الاشیاء کی قوتِ تسخیر میں مضمر ہے۔ "سلطان" ہی میں علمِ نافع کی حقیقت مضمر ہے، جس کے لیے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دعا مانگا کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ عِلْمًا نَافِعًا وَّعَمَلًا مُّتَقَبَّلًا وَّرِزْقًا طَيِّبًا

(جامع رزین)؛

۷۔ شیطان خلافتِ الٰہیہ اور علم کا حریفِ ازلی ہے!

۸۔ شیطان کا طریقِ واردات یہ ہے کہ وہ اپنی وسوسہ اندازی اور جمالیاتی فریب کاری کے ذریعے انسان کو اس کا ناصح و دوست بن کر اس کی قبیح سے قبیح خواہشات و نظریات اور معتقدات و اعمال کو مزین یعنی خوشنما و نظر فریب بنا کر دکھاتا ہے۔ اس طرح اُسے کافر و مشرک، ظالم و جاہل، مجرم و گناہگار اور محروم و نامراد بناتا ہے۔

سنو! "لَا اِكْرَاهَ فِی الدِّيْنِ" مثلاً سُنّتِ والٰہی اور آئینِ آزادی ہے لیکن کم اس کا شعور رکھتے ہیں۔ تمہیں یہ سُن کر خوشی ہو گی کہ تم اللہ تعالیٰ کے حسنُ العالم میں ابھی ایک زندہ و حسین حیاتیاتی جوہر تھے کہ اس نے تمہیں انتخاب کی آزادی سے نوازا ہوا تھا، اور اختیار دے رکھا تھا کہ اس کی مخلوقات میں سے جو مخلوق تم بننا چاہتے ہو، بتا دو وہ تمہیں وہی بنا دے گا۔ تم نے بشر بننے کی آرزو کی اور اُس نے تمہاری آرزو پوری کر دی اور تمہیں بشری روح بنا کر عالمِ ارواح میں منتقل کر دیا۔ اس عالم میں بھی تمہیں آزادیِ انتخاب حاصل تھی تا آنکہ وہ ساعتِ صفر آگئی جب اس نے تمہارے لیے عالمِ زمان و مکان کی تخلیق و تحسین کرنا تھی۔ کائنات کی چھوٹی بڑی ایک ایک چیز اس کے علمِ زندہ و تمام کی لوحِ محفوظ میں موجود و مشہود تھی۔ ہر چیز چونکہ ربِّ علیم و خبیر، جمیل و جلیل اور حیّ و قیوم کی علمی تخلیق تھی، اس لیے وہ زندہ و حسین اور ذی شعور تھی، لیکن تمہیں ان کی زندگی و شعور کی حقیقت کا علم نہیں۔ تمہیں تو اس حقیقت کا بھی علم و شعور نہیں کہ عالمِ حیوانی ہو یا انسانی، عالمِ جماداتی ہو یا نباتاتی، عالمِ سماوی ہو یا فضائی، الغرض عالمِ آفاقی ہو یا انفسی، سب عوالم کی مخلوقات زندگی و شعور رکھتی ہیں اور اپنے الٰہ و ربّ کی

حمد و ثنا، تمجید و تقدیس اور تہلیل و تکبیر میں مشغول، اُس کی یاد میں مست اور اس کی آرزو و جستجو میں بیقرار رہتی ہیں۔ حُسن و عشق کے حوالے سے دیکھو تو یہ بیقراری ہی کُل اشیائے کائنات کی گردشِ مدام کی وجہِ حقیقی ہے۔

چونکہ جملہ اشیائے کائنات نے ارادہ و اختیار اور فکر و عمل کی آزادی کی امانت کی ذمے داری قبول کرنے سے معذرت کر لی تھی، لہٰذا وہ قدرت کے طبیعی قوانین کے مطابق زندگی گزارنے کی مکلّف و پابند ہوگئیں، لیکن قانونِ مکافاتِ فکر و عمل سے آزاد ہوگئیں۔ وہ تمہاری معروضاتِ حُسن و محبت اور تمہارے حسّی و جمالیاتی ذوق کی تسکین کا سامان تھیں۔ علاوہ بریں، چونکہ تم ہی اہلِ ذوق و نظر اور حُسن کی وجدانی و اضطراری اور ارادی و شعوری طلب و جستجو رکھتے تھے اور تم ہی کُل اشیائے کائنات کے حُسن کی قدر کر سکتے اور ان کے جمال و جلال سے جمالیاتی لذّت و حظ اور سرور و سوز حاصل کر سکتے تھے، لہٰذا انھیں تمہارے لیے نعمتیں بنا کر مسخر کر دیا تاکہ تم سب عدل و احسان کے ساتھ ان سے استفادہ و تمتع کر سکو۔ ساتھ ہی اُس نے اس مقصد کی خاطر تم میں علم کی قوّت و توانائی اور روشنی و ہدایت بھی ودیعت کر دی تھی۔ تم میں سے کم ہیں جو اس کی نعمتوں کو یاد کرتے، ان پر غور و فکر کرتے اور اس کا شکر بجا لاتے ہیں۔ تم میں سے اکثر تو کفرانِ نعمت اور شکرِ الٰہی کے مفہوم سے بھی کم آشنا ہیں۔ یاد رکھو! علمِ نافع کی ایک بنیادی پہچان یہ ہے کہ وہ بنی نوعِ انسان کو فائدہ پہنچائے، باعثِ رحمتِ عوالم ہو اور اس کے ذریعے انسان کائنات کی تسخیر کر کے اس کی نعمتیں حاصل کرے تاکہ کُل افرادِ نسلِ انسانی اصولِ عدل و احسان کے مطابق ان سے استفادہ و تمتع کریں۔ کائنات اپنے کُل جمیل و جلیل اماکن و مناظر، دلکش و نظر افروز صور و اشکال، دلنشین و روح پرور نقوش و ارتسامات، حیرت انگیز و عبرتناک احوال و ظروف، بصیرت افروز و حکمت آموز تغیّرات و تحوّلات، خیال انگیز و فکر آفریں تصورات و اختلافات، عبرت انگیز و سبق آموز ازمنہ و اعصار اور نظر فریب و گریزپا آنات و ثانیوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے علم کی لوحِ محفوظ میں مستحضر تھی۔ وہ چاہتا تو چشم زدن میں اُسے تمہارے لیے موجودہ مادّی صورت میں ظہور پذیر کر سکتا تھا، لیکن اس کی حکمت کا فیصلہ یہ تھا کہ اس کی تخلیق اور تحسین و تکمیل اس کی

موزونیِ تقدیر کے مطابق بتدریج چھ مراحل میں کی جائے اور ہر مرحلہ ایک یوم میں مکمل ہو، جو تمہارے زمان و مکان کے حساب کی رُو سے پچاس ہزار سال کا تھا۔ اگرچہ ہوا ایسا ہی، لیکن اصل یہ ہے کہ کائنات کو اس "کا کُن" کہنا تھا کہ "وہ فیکون" ہو گئی؛ اور نعمتوں کے خزینوں اور زندگی کے چشموں اور رنگ و بُو کے طوفانوں سے معمور ہو گئی؛ نیز اس کے نوامیس کے مطابق جنہیں تم عموماً قوانینِ فطرت Natural laws سے تعبیر کرتے ہو، اس کی قیومیت و گردش کا نظام قائم ہو گیا اور اس کی ہر چیز جذبۂ زندگی سے سرشار آرزوئے حُسن لیے سرگرمِ عمل ہو گئی۔ بلاشبہ "وہ" اور فقط "وہ" ہی کائنات کا خالق و ربّ اور الٰہ ہے اور اس کی ہر چیز اسی کی حمد و ثنا کرتی اور اسی کی فرماں بردار ہے۔
لیکن اس کے سوا، رُوحِ کائنات کو اپنے حُسن کی داد پانے کے لیے اہلِ ذوق و نظر کی بھی طلب و جستجو تھی، اور وہ "تُم" تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ تخلیقِ کائنات کی غایت یہی یہ تھی اور ہے کہ وہ اپنے جمال و جلال اور رنگ و بو سے تمہارے جمالیاتی ذوق[19] کی تسکین کرے اور اپنی گوناگوں اور بے قیاس نعمتوں سے تمہیں محظوظ و مستفیض اور مستفید و متمتع کرے۔ وہ صدیوں تمہاری تلاش میں سرگرداں اور تمہارے انتظار میں لب بدعا رہی؛ اور تمہارے لیے اپنی آرائش و زیبائش کرتی رہی۔ آخر کار، وہ لمحۂ منتظر[20] آ ہی گیا، جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے شاہدِ مطلوب و منتظر آدم کو اپنے آئینِ تخلیق و تحسین کے مطابق جنّتِ ارضی میں پیدا کرنا تھا۔

سنو! یاد رکھنے کے لیے گوشِ حق نیوش سے سنو! تمہیں جنّتِ ارضی میں بسانے سے پہلے اس نے اپنے آئینِ "لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ" کے مطابق پھر تم سے پوچھا: تم دنیا میں ارادہ و اختیار اور فکر و عمل کی آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہتے ہو یا اس کے بغیر؟ وہ تم پر یہ حقیقت آشکار کر چکا تھا کہ اس آزادی کا مالک تنہا "وہ" ہے، جو تمہارا ربِّ علیم و حکیم، جمیل و جلیل، رحیم و کریم اور عزیز و قدیر ہے؛ اور یہ "آزادی" وہ تمہیں امانت کے طور پر تفویض کرے گا اور تمہیں اس میں خیانت نہیں کرنا ہوگی، بلکہ اس کا استعمال ہر حال میں اصولِ عدل و احسان کے مطابق کرنا ہوگا۔ اگر تم ایسا کرو گے تو تمہیں اس کا اجرِ عظیم ملے گا، اس دنیا میں بھی اور الحیوان کے حُسنُ العالم میں بھی، جسے جنّت کہتے ہیں اور جو

تمہارا حقیقی حسنُ المآب ہے۔ بخلاف اس کے اگر تم اس آزادی کا قبیح و ناجائز استعمال کرو گے تو تمہیں اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑے گا، اپنے جرم وگناہ اور ظلم وعدوان کی کیفیت وکمیت کے مطابق اس دنیائے ارضی میں بھی اور الحیوان کے قبیح وہولناک جہانِ دُود ونار میں بھی۔ تمہیں اس حقیقت سے بھی آگاہ کر دیا گیا تھا کہ ارادہ واختیار اور فکر وعمل کی آزادی اس کے قانونِ مجازات سے مشروط ہے۔ ساتھ ہی تمہیں اس حقیقت کا مشاہدہ کرا کے متنبّہ بھی کر دیا تھا کہ شیطان تمہارا حریف ہے اور اس نے تمہارے ساتھ دنیائے ارضی میں بھی اور تمہارے نفس میں بھی گردشِ خون کی طرح ہر دم رہنا ہے تاکہ وہ اپنی وسوسہ اندازیوں اور جمالیاتی فریب کاریوں کے ذریعے تمہیں اس آزادی کے غلط وناجائز استعمال کرنے پر اُکساتا رہے۔

یاد رکھو! تمہیں اپنی اِس جمالیاتی۔نفسیاتی حقیقت کا بھی شعور تھا کہ حُسن تمہاری روحِ آرزو بھی ہے اور تمہارے جمالیاتی ذوق کا سامانِ تسکین بھی؛ وہ وجہِ طمانیت ومسرّت اور قرّۃُ العین بھی ہے اور جمالیاتی ثروت[۲۱] بھی۔ علاوہ ازیں، وہ اس اعتبار سے تمہاری جمالیاتی کمزوری[۲۲] بھی ہے کہ شیطان اس سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی ہر ممکن کوشش کرے گا اور اپنی جمالیاتی فریب کاری و جعلسازی اور وسوسہ اندازی سے تمہاری ہر قبیح سے قبیح خواہش وتمنا، عقیدہ ونظریہ اور قول وفعل کو مزیّن کر کے دکھائے گا، نتیجۃً تمہارے اس نظر فریب وخوشنما دھوکے میں آجانے کا ہر آن امکان رہے گا، جس سے غفلت تمہاری گمراہ وسیاہ کاری، کفر شعاری وشرک کاری، مہجوری[۲۳] ومحرومی اور ہلاکت وبربادی کا موجب بن سکتی ہے۔ تمہیں اس حقیقت کا بھی حق الیقین تھا کہ اللہ تعالیٰ الحسن[۲۴] والحق ہے اور وہی تمہارا حقیقی اِلٰہ یعنی معبود ومحبوب اور مطلوب ومقصود ہے۔ جمالیاتی اصطلاح میں تمہارا حقیقی معروضِ حُسن وعشق تمنا وہ ہے، اس لیے اس کے بغیر تمہیں جمالیاتی ثروت کا ملنا محال ہے۔ علاوہ بریں، تمہیں اس حقیقت کا بھی اذعان وایقان تھا کہ "وہی" زندگی کا معنیٰ اور اس کا حُسن وسرور ہے۔ اس لیے اس کے بغیر زندگی اپنی معنویت اور حُسن وسرور سے محروم ہو کر بے کیف، لایعنی اور عذاب وبارِ گراں بن جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تمہیں بتا دیا تھا کہ تم نے دُنیائے ارضی میں اپنے ابنائے آدم کے ساتھ زندگی گزارنی ہے اور ان کی "جمالیاتی آزادی"[۲۵] کا احترام کرنا، تمہارے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا یہ ضروری ہے کہ وہ تمہاری "جمالیاتی آزادی" کا احترام و پاس کریں۔ اس کے فضل و کرم سے "تم آزادی کی ذمے داریوں اور ان کے نتائج و عواقب کا شعور رکھتے تھے۔ تم ایک طرف شیطان کی جمالیاتی فریب کاریوں اور وسوسہ اندازیوں کے مآل اور دوسری جانب قدرت کے قانونِ مجاوزات[۲۶] کی جزا و سزا کی نوعیت سے آگہی حاصل کر چکے تھے، لیکن اس کے باوجود تم نے اپنی جبلّی تعجیل پسندی کے سبب بغیر سوچے سمجھے ارادہ و اختیار اور فکر و عمل کی آزادی کا بارِ گراں اُٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ فیصلہ بلاشبہ تمہارے ظُلم و جہل کا اوّلین مظاہرہ تھا۔ جلد بازی و عاقبت نااندیشی انسان کو ظالم و جاہل بناتی ہے، لیکن وہ جانتا ہے پر مانتا نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی سُنّت "لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ" کے مطابق تمہیں اپنی امانتِ آزادی دے کرہ ارضی میں بسلانے کا فیصلہ کر لیا۔

جنّتِ ارضی میں تمہیں چشم زدن میں پیدا کرنا ربِّ جلیل کے لیے ایسا ہی سہل تھا جیسا "کُن" کہنا، لیکن وہ اپنی سُنّت بدلا نہیں کرتا۔ چنانچہ اُس نے تمہیں اپنے قانونِ نشو و ارتقا کے مطابق پیدا کیا، اور تمہاری تخلیق و تحسین کی تکمیل آسمانوں اور زمین کی طرح چھ ادوار[۲۷] میں کی؛ اور ہر زندہ شے کی طرح تمہاری آفرینش کا آغاز بھی پانی میں ہوا، اور کُل زندہ اشیا کی طرح تم بھی اپنے پیدائش و بقا اور نشو و ارتقا کے لیے پانی کے مرہونِ منت ہو۔ تم جس طرح بطنِ مادر میں پانی کے اندر تطورات و تحوّلات کے ادوار سے گزر کر تولد ہوتے ہو اور پانی کے بجائے خشکی پر زندگی کا آغاز کرتے ہو، اسی طرح اس بے نام عہد میں جب تمہارا نام و اِذکار نہ تھا اور تم شئے مذکور نہ تھے[۲۸] اور اس نے کرۂ ارضی میں تمہاری آفرینش کا آغاز کیا تھا، تم پر نشو و ارتقا کے دوران آدم بننے تک تطوّر و تحوّل کے چھ ادوار گزرے ہیں۔ علم نے آخر نے یہ حقیقت تسلیم کر لی جو اللہ تعالیٰ نے اپنے زندہ و طیّب کلامِ محفوظ و آخر قرآنِ کریم میں چودہ صدیاں پہلے بیان کی تھی۔

سنو آدم یعنی تم نے اپنی زوجہ کے ساتھ جنّت میں اپنی زندگی کا آغاز کیا تو تمہارا حریف ابلیس بھی وہاں آموجود ہوا۔ اس طرح تمہارے امتحانِ زندگی کی شروعات ہو گئی۔ ربِّ جلیل تمہیں متنبہ کر چکا تھا کہ ابلیس کی باتوں میں نہ آنا کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے اور تمہاری جمالیاتی کمزوری سے آگاہ ہے، اور اسی مہرے سے تمہیں بساطِ زندگی پر شہ ومات دینے کی بار بار کوشش کرتا رہے گا، تمہارے دمِ واپسیں تک۔ تمہاری جمالیاتی کمزوری دراصل تمہاری افضل ترین وما بہ الامتیاز خوبی ہے، اور وہ یہ ہے کہ تم طبعاً حسن پسند ہو اور حسن ہر رنگ روپ میں تمہارا طبعی معروضِ محبت، جانِ آرزو اور قرۃ العین ہے۔ چنانچہ ابلیس تمہاری اس آرزوئے حسن سے اس طرح ناجائز فائدہ اٹھانے کی سعیِ مسلسل کرتا رہے گا کہ ہر قبیح چیز تمہیں مزیّن کر کے دکھائے گا تاکہ تم اس کے خوشنما فریب میں آجاؤ۔ وہ تمہاری نفسانی خواہشات وتمنیات، عواطف وامیال، اوہام وظنون، تخیلات وتصورات، افکار ونظریات، معتقدات وایمانیات، رسوم ومناسک اور اقوال وافعال کو اپنی وسوسہ اندازی و جمالیاتی فریب کاری سے خوشنما ودیدہ زیب بنا کر دکھائے گا اور اس طرح تمہیں ظالم وجاہل، کافر ومشرک، مجرم وگناہگار اور اپنا بندہ بنانے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرے گا کہ تم علم وحکمت، عرفان ومعرفت اور وحی وتنزیل کا نور وہدایت رکھنے کے باوجود خلافتِ ارضی کے سزاوار نہیں ہو۔ وہ تمہارے پاس خرقۂ سالوس پہنے ہر صورت، ہر رنگ روپ اور ہر بھیس میں آئے گا؛ مثلاً ناصح ودوست، پیر وفقیر، شیخ ومرشد، معلّم واستاد، ہادی ورہنما، کارساز ومددگار، کاہن وبرہمن؛ نیز فرعون وہامان اور قارون و آزر اور امیر وسلطان کے بھیس میں؛ علاوہ بریں، وہ دانشور ومفکر، عالم وخطیب، ملّا ومولوی، اہلِ قلم وفنکار اور حکیم وفلسفی کی صورت میں بھی آئے گا۔ اس کا مقصد یہ بھی ہو گا کہ وہ تمہیں تمہارے الٰہ ورب سے دور کر کے اپنا بندہ بنا لے، یعنی اپنا مطیع وپیروکار، تاکہ تم انسان سے شیطان، محسن سے قبیح کار، حسین سے قبیح، صالح سے طالح اور نفسِ مطمئنہ سے اہلِ نار بن جاؤ۔

تم دونوں میاں بیوی جنّت میں زندگی کی ضروریات واحتیاجات سے بے نیاز آرام وراحت سے مطمئن وخوشحال زندگی گزار رہے تھے۔ تمہیں ہر طرح کی آزادی حاصل تھی، لیکن "اُس" نے تم دونوں

پر ایک قدغن لگادی تھی کہ اس باغِ جہان سے جو چاہو کھاؤ بجز اس درخت کے پھل کے، جو تمہارے لیے شجرِ ممنوعہ ہے، لہٰذا تم نہ تو اس کے قریب جانا اور نہ اس کی لذت سے آشنا ہونا۔ یہ اس کا پہلا حکمِ امتناعی تھا، جس سے مقصود تمہارا امتحان تھا۔ ابلیس کو یہ معلوم ہوا تو اس نے تم سے اس کی خلاف ورزی کرانے کا منصوبہ بنایا۔ وہ ناصح و دوست کے بھیس میں تمہارے پاس آیا اور قسمیں کھا کھا کر تمہیں یقین دلانے لگا کہ وہ تمہارا ناصح و خیر خواہ ہے تاکہ تمہیں اپنے اعتماد میں لے سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ تمہیں شجرِ ممنوعہ کا پھل کھانے کی ترغیب و تحریص دینے لگا۔ وہ آدم اور اس کی زوجہ دونوں کے جمالیاتی و جنسی جذبات کو تحریک دینے کی خاطر ایک کو دوسرے کے جنسی اعضاء دیکھنے پر اُکسانے لگا۔ یاد رکھو: شیطان نے ہمیشہ ہر زمان و مکان میں انسان کی جمالیاتی و جنسی کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھانے اور اُسے اللہ تعالیٰ کا نافرمان و گناہگار بنانے کی کوشش کی ہے۔ یہ حربہ اس کے کامیاب حربوں میں سے ہے، لیکن جہاں تک آدم اور اس کی زوجہ کا تعلق ہے، انہیں پہلے مرحلے میں اپنے رب کے اوّلیں حکمِ امتناعی کی خلاف ورزی کرنے کی جسارت نہ ہوئی۔ یہ دیکھ کر ابلیس نے شیطنت کا دوسرا حربہ آزمایا، جو تاویل و استدلال کا حربہ ہے، جسے تم "تلبیسِ تاویل و منطق"[۲۹] سے تعبیر کر سکتے ہو۔ یہ حربہ خطرناک، گمراہ کُن اور مُہلک ہونے کے باوجود ابلیس کی وسوسہ اندازی و جمالیاتی فریب کاری کی بدولت بے ضرر، حکیمانہ اور سود مند دکھائی دیتا ہے چنانچہ پہلے تو اس نے دونوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالا تاکہ ان کے ستر یعنی جنسی اسرار جو ان سے مخفی تھے، ان پر آشکارا کر دے، پھر ان سے کہا: "تمہارے رب نے اس شجر سے جو تمہیں روکا ہے تو محض اس لیے کہ کہیں ایسا نہ کہ تم اس کی لذت سے آشنا ہو کر فرشتے بن جاؤ یا بقائے دوام تمہیں حاصل ہو جائے۔" شیطان نے پھر آدم کو وسوسے میں ڈالا اور شجرِ ممنوعہ کی طرف اشارہ کر کے کہا: یہی ہے وہ شجرِ بقا جس سے بقائے دوام اور لازوال بادشاہت حاصل ہوتی ہے۔"

چنانچہ (آدم اور اس کی بیوی) دونوں شجرِ ممنوعہ کی لذتِ ثمر سے آشنا ہو گئے اور اس کے نتیجے میں ان پر جنسی اسرار اور ان کے ستر ایک دوسرے پر کُھل گئے، اور دونوں اپنے جنسی اعضاء کو جنّت

کے پتّوں سے ڈھانکنے لگے ۔ الغرض، انہوں نے فرمانِ الٰہی سے صرفِ نظر کیا تو جنّت کی زندگی کھودی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک لغزش، ایک لحظۂ غفلت اور ایک خطا انسان کو اس کی جنت سے دور بہت دور لے جاتی ہے۔ یہ المیہ زندگی کا ایک ایسا کھیل ہے، جسے وہ سدا کھیلتی رہتی ہے۔

شعورِ عُریانی سے انہیں احساسِ گناہ و ندامت ہوا تو ان کے ربّ نے انہیں پکارا: کیا میں نے تمہیں قربتِ شجرِ ممنوعہ سے منع نہیں کیا تھا؟ اور کیا میں نے تمہیں متنبہ نہیں کر دیا تھا کہ شیطان تمہارا کھُلا دشمن ہے؟

انہوں نے عرض کیا: "ہمارے ربّ! ہم نے خود اپنے آپ پر ظُلم کیا۔ اگر تو نے ہمارا قصور نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ہم خسارہ پانے والوں میں سے ہو جائیں گے"!

جانتے ہو زندگی کے خسارے کا مطلب کیا ہے؟ اس کا مطلب ہے جمالیاتی ثروت و حُسن و سرورِ زندگی، نیز "دوست" سے مہجوری و دوری۔

وہ دونوں اپنے کیے پر پشیمان ہوئے؛ اور عجز و انکساری، الحاح و زاری اور خشوع و خضوع سے توبہ کرنے لگے۔ سنو! اور یہ بات یاد رکھو کہ ان سے نافرمانی تو ہوئی، مگر بالارادہ نہیں ہوئی۔ انسان نے انتہائی سادگی سے مات کھائی تھی۔ شیطان عیّار ہے، سو بھیس بنا لیتا ہے۔ وہ دوست و ناصح، عالم و حکیم اور دانشور و خیر خواہ بن کر آیا تھا۔ وہ فرقۂ سالوس پہن کر انہیں دھوکہ دیتا تھا۔ اُس نے ان کی جمالیاتی جبلّی کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی اور حُکمِ الٰہی کی غلط تاویل اور اپنے گمراہ کن استدلال کے ذریعے آدم و حوا کو سبز باغ دکھائے تھے اور انہیں شجرِ ممنوعہ کا پھل کھانے پر اُکسایا اور مائل کیا تھا۔ تمہارا ربّ رحمٰن و رحیم، غفور و کریم اور توّاب و مستجیب الدعوات ہے۔ اُس نے ان کی توبہ قبول کی، انہیں برگزیدہ کیا اور ان پر (اپنی رحمتوں سے) لوٹ آیا، اور اُنہیں ہدایت بخشی اور فرمایا:

"تم دونوں دو فریق، (یعنی انسان اور شیطان) یہاں سے اکٹھے اُتر جاؤ۔ تم ایک دوسرے کے دشمن رہو گے۔ اب اگر میری طرف سے تمہارے پاس (یعنی تمہاری نسل کے پاس) کوئی ہدایت پہنچے تو

داس بارے میں میرا قانون یاد رکھو) جو کوئی میری اس ہدایت کی پیروی کرے گا وہ بھٹکے گا نہ بدبختی میں مبتلا ہوگا، اور جو کوئی میری یاد سے روگردانی کرے گا تو اس پر عرصۂ حیات تنگ ہو جائے گا اور قیامت کے روز ہم اسے اندھا اٹھائیں گے۔"

وہ کہے گا: "پروردگار! تو نے مجھے اندھا کر کے کیوں اُٹھایا؟ میں تو دنیا میں اچھا خاصا دیکھنے والا تھا۔"

ارشاد ہوگا: "ہاں اسی طرح ہونا تھا۔ ہماری نشانیاں تیرے سامنے آئیں مگر تو نے اُنھیں بھلا دیا۔ سو اسی طرح آج تو بھی بھلایا جا رہا ہے۔"

ہم حد سے گزرنے والے اور اپنے رب کی آیات نہ ماننے والے کو (دُنیا میں) ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں اور آخرت کا عذاب زیادہ سخت اور زیادہ دیرپا ہے۔"[۲۰]

میں بڑے غور سے اپنی عبرتناک داستان سن رہا تھا کہ دفعتاً سکوت چھا گیا۔ داستانِ دیاں میں ایسا حسنِ سحر تھا کہ دل چاہتا تھا کہ وہ آوازِ سدا شعلۂ حسن، قرۃ العین اور فردوسِ قلب و جان بنی رہی۔ سکوت صبر آزما اور روح بیقرار ہوگئی۔ میں اس عالمِ اضطراب و انتظار میں تھا کہ اللہ اللہ کر کے سکوت ٹوٹا؛ گوش و قلب میں برقِ حسن لہرائی اور آواز آئی:

جمالیاتی حسّ و جمالیاتی ذوق اور جمالیاتی اقدار:

تم نے اپنی کہانی سُنی اور غور کیا کہ اس میں ابدی و عالمگیر اقدار و حقائق مضمر ہیں۔ اے جویائے حق غور سے سنو اور یاد رکھو، جمالیاتی ذوق کے انداز و رنگ بدلتے ہیں، محاسن و حقائق نہیں بدلتے، اقدار نہیں بدلتیں۔ اقدار عالمِ دہر کی پیداوار ہیں، اس لیے اس کی طرح رنگِ ابدیت و ہمہ گیری سے مزیّن ہیں، اگرچہ اُن کی نمود و شیونِ دھر میں ہوتی ہے، جن کو تم آنات و اوقات اور اعصار و ازمنہ سے تعبیر کرتے ہو۔ اس حقیقت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھو کہ دہر کی طرح اقدار نہیں بدلتیں، ایّام کی طرح ان کے انداز بدلتے ہیں۔ اقدار کا رشتہ انسان کی جمالیاتی حسّ سے ہے؛ لہٰذا جس

طرح جمالیاتی حسن عالمگیر و وہبی اور ناقابلِ تغیّر و تبدّل ہے، اسی طرح اقدار بھی فطری، ابدی، عالمگیر اور ناقابلِ تغیّر و تبدل ہیں۔ جمالیاتی حسن وحدت یا اکائی ہے اور اس کی اصل سے برگ و بار نکلتے ہیں جو جمالیاتی ذوق کہلاتے ہیں۔ جمالیاتی ذوق میں کثرت پائی جاتی ہے، جو عبارت ہے اختلاف و تضاد، بوقلمونی و تنوّع اور تغیّر و تبدّل سے۔ چونکہ ذوق اپنے زمانے اور ماحول کی پیداوار ہوتا ہے، اس لیے ہر زمان و مکان کے ذوق میں اختلاف و تضاد پایا جاتا ہے اور ان کے بدلنے کے ساتھ ذوق بھی بدلتا رہتا ہے؛ اس کے نتیجے میں اس تبدیلی سے جمالیاتی قدر کی شیون یا مظاہر اور رنگ و انداز بدلتے رہتے ہیں۔ آگ ازل سے سوزاں ہے، سوزاں ہی رہے گی؛ باد و آب جاری و ساری ہیں، ایسے ہی رہیں گے۔ شہد کی شیرینی، زہر کی سمیّت، درندوں کی درندگی، حسن کی سرور انگیزی، الغرض اشیاء کی تاثیر اور انسان کی فطرت اور اس کے تقاضے وہی ہیں، جو ہر زمان و مکان میں تھے اور ہیں۔[۳۴] عدل و احسان، حق و صداقت، حسنہ و خیر، امن و سلامتی، علم و فضل، جود و سخا اور محبت و شفقت ازل سے اسی طرح معروف ہیں جس طرح ظلم و جور، باطل و کذب، سیئہ و شر، فتنہ و فساد، جہل و رزالت، بخل و قساوت اور عداوت و نفرت منکر ہیں۔ تمہاری آرزوئے حسن بھی وہی اور حسن بھی وہی ہے۔ ابلیس بھی وہی اور اس کی شیطنت بھی وہی ہے۔ اس کی وسوسہ اندازی بھی وہی اور جمالیاتی فریب کاری بھی وہی ہے۔ مختصر یہ کہ زمانے کے ساتھ جمال آرائی کے انداز و رنگ اور جمالیاتی ذوق کے مظاہر بدلتے ہیں۔ نہ تو جمالیاتی حسن بدلتی ہے اور نہ اقدار۔ یہ شیطان ہے جس نے افرادِ نسلِ انسانی کو گمراہ کرنے کی خاطر اپنی غلط تاویل اور گمراہ کن منطقی استدلال کی قدیم جمالیاتی فریب کاری سے اپنے متبعین فلسفیوں، دانش وروں اور اہلِ قلم و فن کے ذریعے یہ مشہور کر دیا ہے کہ اقدار مطلق نہیں اضافی ہیں،[۳۵] نیز یہ مستقل و پائیدار، ازلی و ابدی اور عالمگیر و ہمہ گیر نہیں، بلکہ عارضی و فانی، بے ثبات و گریزپا اور زمانی و مکانی ہیں۔

تمہیں حقائقِ من و تو کی طلب و جستجو ہے، اور ہر انسان کو ہونی چاہیے، اس لیے کہ اس کے بغیر اس کی ذات کا نشو و ارتقا ممکن نہیں؛ نیز اقوامِ عالم کی ترقی کا راز بھی تلاشِ حقائق میں مضمر ہے۔

کیا تمہیں معلوم نہیں کہ تم خود یعنی تمہاری ذات معارف و حقائق کی آئینہ دار ہے۔ تمہارا نفس جو تمہارے وجود اور اس کی مخفی قوتوں یا حسّی۔قلبی۔نفسی نظام سے عبارت ہے، آئینۂ خودنما و خدانما ہے۔ اس آئینے میں چشمِ قلب سے اس طرح دیکھو جس طرح تجربہ کار سائنس دان خوردبین و دوربین کے ذریعے انتہائی لطیف و دقیق اور دور دراز چیزوں کو دیکھنے اور ان کے حقائق دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے، جو ظاہری آنکھ سے نظر نہیں آتیں، اس لیے انہیں غیر مرئی کہتے ہیں۔ دیکھو گے تو اپنے آئینۂ نفس میں تمہیں عالمِ غیب و شہود کے عجائب و غرائب نظر آئیں گے۔ اس میں تم ایک عجیب و غریب اور انتہائی دقیق و لطیف خودکار نظام کو جاری و ساری دیکھو گے۔ یہ حیاتیاتی باطنی نظام ہے، جو بطورِ کُلّی تو نفس کا نظام ہے، لیکن یہ تین بڑے منفرد و خودکار نظاموں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ایک حواسِ خمسہ کا، دوسرا قلب کا اور تیسرا خود نفس کا نظام ہے چونکہ یہ تینوں نظام اپنا الگ الگ تشخّص اور منفرد ہستی و حیثیت رکھتے، نیز اپنے علیحدہ علیحدہ وظائف سرانجام دینے کے باوجود ایک دوسرے سے لاینفک طور پر مربوط ہیں، اور ایک دوسرے سے مل کر کام کرتے اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں؛ علاوہ ازیں، باہمی تعاون و تعامُل سے اپنے وظائف سرانجام دے سکتے ہیں، لٰہذا اس بنا پر اسے حسّی۔قلبی۔نفسی نظام سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس نظام کی جزئیات پر غور کرو تو تم پر بہت سے حقائق و معارف منکشف ہوں گے۔ اس وقت تمہاری خاطر چند بنیادی حقائق بیان کرتا ہوں۔ سنو!

حواشی و تشریحات

۱۔ آنِ دہر:

دہر کو عموماً لازمان بھی کہتے ہیں، جو درست نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ جو شے "ہست" ہو وہ نیست یا "لَا" نہیں ہو سکتی۔ اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ قدیم اور اوّل و آخر ہے اور وہی فاطرِ ہستی ہے اور خالقِ زمان و مکان ہے؛ لیکن وہ تھا تو سہی۔ وہ ازل سے "ہست" تو ہے اور جس "حالی"

میں تھا، وہی تو "دھر" ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کو ثبات و دوام مستلزم ہے کیونکہ وہ قیّوم یعنی قائم بالذّات ہے اور خالقِ موت و حیات ہے، لہٰذا وہ ہر قسم کے تغیّر و تبدّل اور خرابی و فساد سے منزّہ و ورا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ الحیّ یعنی زندہ بالذّات فعّال ہستی ہے، مُدبّرالامور ہے اور "کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ" (الرحمٰن ۵۵: ۲۹) ہے، یعنی ہر آن اپنی جمالیاتی تخلیقی فعلیّت میں اپنا جلوہ پیدا کرتا رہتا ہے۔ اس نے کے عالمِ شیون کو جس میں وہ جلوہ افروز رہتا ہے، "استمرار و دوام" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہ یاد رہے کہ وہ اپنے عالمِ شیون میں الظاہر بھی ہوتا ہے اور الباطن بھی، اس لیے عصرِ حاضر کی فلسفیانہ اصطلاح میں اس کے لیے "موضوعی۔ معروضی حقیقت کی تعبیر اختیار کی جا سکتی ہے، لیکن ہمارے نزدیک اللہ تعالیٰ کے حال کو "حالِ استمرار" سے تعبیر کر سکتے ہیں اور یہی قرآنِ مجید کا "دھر" ہے۔

دھر کی ہر آن کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ کے حوالے سے ہمارے زمانے کے حساب سے پچاس ہزار سال تک ممتد ہو سکتی ہے۔ اس میں ایک لطیف و بصیرت افروز نکتہ مضمر ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنی قدرتِ کاملہ سے کسی نفسِ طیّبہ کو ہمارے عالمِ زمان و مکان سے نکال کر اپنے عالمِ دھر میں لے جائے تو اس نفسِ طیّبہ کے حال کی آنِ زمانی اس رفع و عروج سے آنِ دھر میں بدل جاتی ہے اور یہ ہے معراج النبیؐ کی حقیقت۔ ربِّ جلیل نے اپنے حبیب و سیّدالمرسلین حضرت محمد مصطفیٰ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو اپنی "برقِ حُسن" (جسے بُراق کہتے ہیں) کے ذریعے طرفۃ العین میں اپنے عالمِ استمرار یا دھر میں بلایا، اپنی بادشاہت کی سیر کرائی، آیاتِ کبریٰ کا مشاہدہ کرایا اور ہزاروں برس اپنے "حالِ استمراری" میں اپنے پاس رکھا؛ اِلٰہ و عبد میں راز و نیاز کی باتیں ہوتی رہیں، اور جب آپؐ کو واپس اسی طرح دنیا میں بھیجا تو گردشِ زمانہ کی ابھی دو ایک ساعتیں ہی گزری تھیں۔

انسان اس دنیا اور عالمِ ارواح میں آنے سے پہلے عالمِ دھر میں رہ چکا ہے۔ وہ ابتدا میں اللہ تعالیٰ کے عالمِ ذات میں ایک "معلومہ" کی صورت میں موجود تھا جب "کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ" کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ یہ سلسلہ کب شروع ہوا تھا؟ اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ یہ ایسا

سرّ الاسرار ہے، جس کا جاننا کسی مخلوق کے مقدور ہی میں نہیں، لہٰذا عقلمندی یہی ہے کہ اسے سوچا ہی نہ جائے، ورنہ عقلِ نارسا کا گمراہ ہو جانا لابدی ہے۔ عقل اپنی حدِ ادراک سے ایک قدم آگے بڑھے تو اس کے ابلیس کے دامِ ہمہ رنگ زمین میں پھنس جانے کا دو بدست امکان ہوتا ہے۔ بہر حال انسان پہلے اپنے ربّ علیم وقدیر کے عالمِ ذات میں بصورتِ معلومہ تھا، پھر وہاں سے روحِ بشری کی صورت میں عالمِ ارواح میں آیا، اور اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ کتنی آناتِ دھر وہاں رہا۔ وہ ان دونوں عالموں میں موجود ہونے کے باوجود چونکہ کرۂ ارضی میں لبصورتِ بشر ظہور پذیر نہیں ہوا تھا، اس لیے اس کا ذکر نہ تھا یا قرآنِ مجید کی زبان میں وہ "شَيْئًا مَّذْكُورًا" نہ تھا: هَلْ أَتَىٰ عَلَى الْإِنسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُن شَيْئًا مَّذْكُورًا ۝ (الدھر ۷۶:۱) یقیناً انسان پر دھر یا زمانِ مطلق میں سے ایسا دور بھی آیا ہے جب وہ ایسی چیز نہ تھا جس کا ذکر ہوتا ہو۔

آنِ دھر میں اس نفس پر زمانے کے سینکڑوں اور ہزاروں برس پر ممتد ہوتی ہے جو عالمِ دھر میں پہنچ جائے۔ ایک مجرم و گناہگار اہلِ نار کی موت، چاہے بادی النظر میں فوری طور پر واقع ہو جائے (مثلاً دل کا دورہ پڑنے، گولی لگنے، پھانسی پانے یا کسی حادثے کا شکار ہو جانے سے)، لیکن اس کے عذابِ جان کنی کی مدّتِ آن اس کے جرم و گناہ کی کمیت و کیفیت کے لحاظ سے سینکڑوں اور ہزاروں برس پر حاوی ہو سکتی ہے۔ بخلاف اس کے ایک صالح و شہید اور صدیق کی تکلیفِ جان کنی آنِ زمانی کے برابر ہوتی ہے اور لذّتِ حیاتِ محض اور مسرّتِ نظّارۂ جنّت ہزاروں اور لاکھوں برس پر حاوی ہوتی ہے۔ ہمارے اس فلسفۂ آنِ دھر میں آغازِ آفرینش سے نہایتِ دُنیا تک کی نسلِ انسانی کے افراد کی موت و حیات اور جزا و سزا کے مسئلے کا حل موجود ہے، اور اولوالالباب سمجھ سکتے ہیں کہ اولادِ آدم کی جزا و سزا کی کمیّت میں بلحاظِ مدّتِ زمانہ کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ افرادِ نسلِ انسانی کی جزا و سزا کی میعاد زمانے کے ایّام و سال اور صدیوں کے حساب سے نہیں، دھر کے حساب سے ہوتی ہے۔

۲۔ حُسنُ المآب:

یہ قرآنی اصطلاح ازبس فکر انگیز و بصیرت افروز ہے (دیکھیے آلِ عمران ۳: ۱۴؛ صٓ ۳۸: ۲۵ بعد)۔ اس کے لغوی معنی ہیں، لوٹ کر آنے کی ایسی جگہ جو حسن ہی حسن ہو۔ اس سے مراد جنّت ہے، جو حسنِ محض اور قرّۃ العین ہے اور انسان کا حقیقی گھر ہے، لہٰذا جنّت کے بغیر انسان کو کسی اور جگہ قرار آسکتا ہے اور نہ اطمینان ہی مل سکتا ہے۔ قرآنِ مجید رُو سے یہ مطمئن نفوس کا گھر ہے (الفجر ۸۹: ۲۷)۔ مطمئن نفوس اللہ تعالیٰ کے انعام یافتہ بندے ہیں، جنہیں قرآنِ مجید نے چار جماعتوں میں تقسیم کیا ہے: انبیآء کرامؑ؛ صدّیقین؛ شُہدآء اور صالحین (النسآء ۴: ۶۹)۔ حسن المآب میں انسان کے لیے وہ سب کچھ ہوگا جو وہ چاہے گا اور اس کے علاوہ بھی اُس کے لیے بہت کچھ ہوگا، جو اس کے تصوّر سے بھی زیادہ حسین و دلکش اور محبوب و مرغوب ہوگا۔ وہاں ازدواجی زندگی کی جملہ لذّتیں اور مسرّتیں ہوں گی، حیاتِ جاوداں ہوگی۔ اہلِ حسن و سُرور کی صحبتیں ہوں گی۔ اہلِ جنّت احسان و رضوان کے حُسنُ المقام پر متمکّن ہوں گے۔ ہم نظری و ہمکلامی کی رحیقِ مختوم کے جام گردش میں رہیں گے اور وہ عالمِ کیف و سُرور میں اس طرح زندگی کریں گے کہ لذّتِ زندگی روز افزوں ہوتی رہے گی؛ ساقیِ ذوالجلال والاکرام ہر آن ایک نئی شان میں جلوہ پیدا کرتا رہے گا اور اہلِ جنّت کا نورِ حسن بھی اس کے ساتھ ارتقا کرتا رہے گا اور وہ دوستؐ کی ہم نظری و ہمکلامی کی خاطر اس کی بارگاہ میں ہمیشہ یہ دُعا مانگتے رہیں گے: رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا، اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ہ (التحریم ۶۶: ۸)؛ ہمارے نشوو ارتقا دینے والے آقا! ہمارے نور کی ہمارے لیے تکمیل کر دے اور ہمیں (غفلت و نسیان اور لغزش و خطا سے) بچائے رکھنا۔ بلاشبہ تو ہر شے پر قادر ہے۔

۳۔ قُرّۃُ العین:

یہ اصطلاحِ قرآنی بھی فکر انگیز و بصیرت افروز ہے۔ اس کے لغوی معنٰی ہیں: آنکھ کی ٹھنڈک۔ آنکھ میں نفس ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے قُرّۃ العین نفسِ کُلّ کے جمالیاتی حظ و سُرور کی

طمانیت انگیز و مسرّت آگیں اور کیف پرور و وجدان آفریں ٹھنڈک ہے جو جتنی شدید ہوتی ہے اتنی ہی سُرور انگیز و طمانیت آفریں ہوتی ہے۔ نفسِ کُلی سے مراد حواس، قلب اور نفس کا نظام ہے، لہٰذا قُرّۃُ العین کا مطلب حِسّی، قلبی، نفسی جمالیاتی ٹھنڈک ہوا۔

۴: دید :

اس سے مراد رویتِ الٰہی ہے۔ معتزلہ دیدِ "دوست" یا رویتِ الٰہی کے مُنکر ہیں اور ان کے انکار کا انحصار اس آیتِ قرآنی پر ہے: لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ... (الانعام ۶: ۱۰۴): اُسے یعنی اللہ تعالیٰ کو نظریں نہیں پاتیں، یعنی دیکھ نہیں سکتیں۔

اس میں قطعاً شک و شبہ نہیں کہ باصرہ یا ظاہری آنکھیں اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتیں، اس لیے کہ یہ اس کے مقدور ہی میں نہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ جو ربّ العالمین ہی نہیں، اِلٰہُ العالمین بھی ہے یعنی وہ جُملہ مخلوقات کا معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود بھی ہے، اُس نے اپنے تخلیقی شہکار انسان کو اپنی تجلّیاتِ حسن اور صورتِ حسن کی نعمتِ حُسنیٰ سے سرفراز کرنے کی خاطر اسے باطنی آنکھ یا چشمِ قلب بھی عطا کی ہے۔ وہ اپنی قدرتِ کاملہ سے اپنے جس بندے کی چشمِ قلب پر جب چاہے اپنا جلوۂ صوری پیدا کرتا ہے اور وہی اس کا مشاہدہ کرتی ہے۔ چنانچہ حدیثِ "احسان" اسی حقیقت پر دلالت کرتی ہے (بخاری، کتاب الایمان، ح ۱)۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اللہ جَلّ شانہٗ عموماً اپنے ان بندوں کو اپنے دیدار سے مشرّف کرتا ہے جنہیں وہ احسان و رضوان کے حُسنُ المقام پر متمکّن کرتا ہے، نیز وہ عموماً اپنے شاہد کے جمالیاتی ذوق (یا ذوقِ حسن) کی ارتقائی نوعیت کے مطابق صورت میں اپنا جلوہ پیدا کرتا ہے، اگرچہ یہ صورت اس کے حُسنِ تصوّر سے کہیں زیادہ حسین و دلکش ہوتی ہے۔ میں چند ایک اہلِ نظر بزرگوں کو جانتا ہوں، جن کا دعویٰ ہے کہ وہ "دوست" کے فیضانِ نظر سے اس کا مشاہدہ کر چکے ہیں۔ اگرچہ ذاتی مشاہدات و واردات حجت نہیں ہو سکتے، لیکن سچّے انسانوں کی بات کو بغیر دلیل کے جھٹلایا بھی تو نہیں جا سکتا۔ راقم بھی بارہا ایسے درائی تجربات سے گزر چکا اور "دوست" کی دیدِ صورت سے فیضیات ہو چکا ہے، لہٰذا اس سے مولانا

رومیؒ اور امیر خسروؒ کے تجربات و مشاہدات کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ مولانا رومؒ کا مندرجۂ ذیل قطعہ ان کے مشاہدۂ "دوست" پر دلالت کرتا ہے:

آدمی دید است باقی پوست است
دید آں باشد کہ دیدِ دوست است
جملہ تن را درگداز اندر بصر
در نظر رو، در نظر رو در نظر

میر خسروؒ کا یہ مشہور شعر بھی ان کے ذاتی مشاہدہ و تجربے کا آئینہ دار ہے:

خدا خود میرِ مجلس بود اندر لامکاں خسروؔ
محمدؐ شمعِ محفل بود شب جائیکہ من بودم

مولانا رومؒ کا فلسفۂ زندگی یہ ہے کہ حیاتِ انسانی کا غایت الغایات "دیدِ دوست" ہے، لیکن یہ احسان کے حُسنُ المقام کا دوسرا درجہ ہے۔ اس کا پہلا درجہ مشہودیت اور دوسرا درجہ شاہدیت کا ہے اس کا تیسرا بلند ترین درجہ ہم نظری و ہمکلامی کا ہے۔ احسان سے ارفع مقام رضوان کا ہے۔ اس کا پہلا مقام رضا یا خوشنودی کا ہے اور دوسرا یا ارفع مقام "ہم رضائی (باہم خوش ہونے) کا ہے۔ یہ درست ہے کہ "دیدِ دوست" نعمتِ حسنٰی و عظمٰی ہے اور اس سے محرومی بہت بڑی محرومی ہے، لیکن اس سے بڑی محرومی ہم نظری و ہمکلامی اور ہم رضائی کی نعمتوں سے محروم رہنا ہے۔ بہر حال، قیامت کے دن اصحاب النار کی محرومیوں کی طرف قرآنِ مجید نے بصیرت افروز و عبرتناک اشارات کیے ہیں:

وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ (آلِ عمران ۳: ۷۷): اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نہ تو اُن (اہلِ نار) سے کلام کرے گا اور نہ ان کی طرف نظر ہی کرے گا اور نہ ان کا تزکیہ ہی کرے گا؛ اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

چونکہ اللہ تعالیٰ ان اندھوں کے قلوب کو پاک و صاف کر کے انہیں حسین و منور نہیں بنائے گا لہٰذا وہ اندھے اور "دیدِ دوست" سے محروم ہی رہیں گے۔ علاوہ بریں، اس دن کی محرومی کا یہ عالم ہوگا

کہ وہ اپنے اِلٰہ و ربّ سے محجوب یعنی پردے یا اوٹ میں ہوں گے: كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَى قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ○ كَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ رَبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَمَحْجُوبُونَ ○ (المطففین ۸۳: ۱۴-۱۵)؛
ہرگز نہیں، بلکہ اس کے قلوب کو زنگ لگ گیا ہے ان کے اکتساب یا بدعملیوں کے نتیجے میں۔
ہرگز نہیں، بلاشبہ وہ اس دن اپنے رب سے محجوب یا پردے میں ہوں گے۔

ان کی یہ محرومی اصل میں ہم کلامی، دیدو ہم نظری اور رضوان و ہم رضائی کی محرومی ہوگی، اور یہی حقیقت میں سب سے بڑی اور اصل محرومی ہوگی، لہٰذا اس بنا پر میرا فلسفۂ حیات یہ ہے کہ حیاتِ انسانی کی غایت الغایات ہم نظری و ہمکلامی اور ہم رضائی یعنی باہم راضی و خرش ہونا ہے۔

۵۔ لِقَآء:

اس کے معنی ملاقات یا ملنے کے ہیں۔ اس سے مراد قیامت کے دن انسان کا اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوتا ہے۔ دنیا میں اہلِ نظر کو لقائے الٰہی بصورتِ مشاہدہ ہوتی ہے۔

۶۔ ہم نظری:

اس کے معنی ہیں: باہم ایک دوسرے کو دیکھنا۔ یہ اصطلاح ہم نے لفظ ہمکلامی کے قیاس پر وضع کی ہے۔ اس کا مطلب ہے معبود و عابد، شاہد و مشہود اور عاشق و محبوب کا ایک دوسرے کو پیار بھری نظروں سے دیکھنا۔ ہم نظری میں جو قُرّۃُ العین ہوتی ہے اس کی کیفیت و کمیّت سے وہی اہل مہر و وفا آشنا ہیں جو اس تجربے سے گزرے ہوں۔

۷۔ ہمکلامی:

اہلِ جنّت کا اپنے ربّ ذوالجلال والاکرام اور اِلٰہِ جمیل و کریم سے ہمکلام ہونا، ایسی سعادت و نعمت ہے جس کا تصوّر کرنا اس دُنیا میں محال ہے۔ اہلِ جذب و شوق جانتے ہیں کہ معروضِ حُسن و عشق کی آواز میں اُن کے لیے قُرّۃُ العین ہوتی ہے۔

۸۔ قُرب:

اس سے مراد تقرّبِ اِلٰہی ہے، جو اس کی محبت و دوستی کی علامت ہے قُربِ اِلٰہی

عارضی بھی ہوتا ہے اور دائمی بھی۔

(ا) عارضی قرب کی مثال یہ ہے: وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ... (البقرہ ۲:۱۸۶) (اور (اے نبی اکرمؐ) جب میرا کوئی بندہ میری نسبت آپ سے دریافت کرے (کہ کیونکر مجھ تک پہنچ سکتا ہے؟ تو آپ اسے بتا دیں کہ میں) تو اس کے پاس ہوں۔ وہ جب پکارتا ہے تو میں اس کی پکار سنتا ہوں اور اُسے قبول کرتا ہوں۔ پس اگر وہ واقعی میری طلب و آرزو رکھتے ہیں تو چاہیئے کہ میری پکار کا جواب دیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ حصولِ مقصد میں کامیاب ہوں۔

(ب) قربِ دائمی: یہ ولایت کا حُسن المقام ہے، جو اس کے مخلص و مؤمن اور سچے بندوں کو حاصل ہوتا ہے۔

۹: حضوری:

اہلِ جنت کو اپنے اِلٰہ و ربّ کا قُرب ہی نہیں، حضوری بھی نصیب ہوگی۔ اس حضوری کی حقیقت تو فقط اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، لیکن اِلٰہِ جمیل و ربِّ ذوالجلال والاکرام نے اپنے فضل سے اس بندۂ عاجز کو جن مشاہدات و تجربات سے گزارا ہے، ان کی بنا پر قیاس یہ چاہتا ہے کہ یہ حضوری قریب قریب اسی نوعیت کی ہونی چاہیے جس نوعیت کی اس دُنیا میں مقامِ احسان پر متمکّن اہلِ ذوق و نظر کو نصیب ہوتی ہے۔ یہ حضوری کبھی اِلٰہِ جمیل کے عالمِ حُسنِ ذات میں ہوتی ہے اور کبھی بندے کے عالمِ حُسنِ ذات میں۔ چونکہ حضوری کی سعادت رُوح کو نصیب ہوتی ہے، اس لیے خواب و نیم خوابی، جذب و مستی، وجد و حال اور استغراق و مراقبہ کی حالتوں میں ہوتی ہے، جن کے لیے تصوّف میں عموماً عالمِ سُکر کی تعبیر اختیار کرتے ہیں۔ میرا مشاہدہ ہے کہ جنت میں حضوری عالمِ بیداری میں بھی ہوتی ہے اور پھر اجتماعی نوعیت کی بھی ہوتی ہے۔ مشاہدہ حجت تو نہیں ہوتا لیکن اہلِ جذب و شوق کے سچے مشاہدات و تجربات کو محض قیاس و گمان کی بنا پر جھٹلایا بھی تو نہیں جا سکتا، لہٰذا اپنے مشاہدے کی تائید میں میر خسروؒ کے مشاہدے کو ان کے شعر کی صورت میں پیش کرنا بیجا نہ ہوگا:

خدا خود میرِ مجلس بود اندر لامکاں خسروؒ
محمدؐ شمعِ محفل بود شب جائیکہ من بودم

یہاں اس نکتے کی صراحت کردی جاتی ہے کہ جنّت "الحیوان" کا جہانِ حسن ہے، اس لیے قرۃ العین ہے، نیز اس میں حیاتِ محض ہے، موت نہیں، شباب ہے پیری نہیں۔ وہاں انسانی ہیولے میں صورتِ خرابی مضمر نہیں ہوگی، لہٰذا وہ انحطاط و اضمحلال، فساد و زوال اور کہولت و پیری سے منزہ ہوگا۔ زندگی کی طرح وہاں زمان و مکان کی نوعیت بھی مختلف ہوگی۔ زمانہ ہوگا، لیکن آنِ دہر یا ثباتِ دوام کے مانند۔ وہاں مکان اپنی بیکرانی کے باوجود بے فاصلہ بھی ہوگا۔

اصل یہ ہے کہ زمان و مکان کے تعینات ہمارے لیے ہیں، لیکن ان کا خالق ربِّ علیم و حکیم ان سے ورا الوراء ہے۔ وہ ہر عالم میں ایک طرف اپنے بندوں کی رگِ جان سے بھی قریب ہوتا ہے اور جہاں دو ہوں، تیسرا "وہ" ہوتا ہے اور دوسری جانب وہ ان سے اس قدر دور اور ورا الورا ہوتا ہے کہ انسان اس کا تصوّر تک نہیں کر سکتا۔ بہر حال، ذوق و شوقِ حضوری ہو تو وہ ہر رنگ میں کبھی خود اپنے اہلِ جذب و شوق کے پاس ہوتا ہے اور کبھی انہیں اپنے عالمِ حسنِ ذات میں لے آتا ہے۔ کبھی "وہ" اپنی شانِ صوری میں ان پر جلوہ پیدا کرتا ہے اور کبھی عالمِ بے کیف و کم میں جلوہ افروز ہوتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ عالمِ حضوری جُدا جُدا اور شانِ حضوری جُدا جُدا ہے۔

۱۰۔ ہم رضائی :

یہ اصطلاح بھی ہم نے ہمکلامی کے قیاس پر وضع کی ہے اور اس سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں سے اور بندوں کا اس سے راضی و خوش ہونا جس کے لیے قرآنِ مجید نے "رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً" کی تعبیر اختیار کی ہے (الفجر ۸۹ : ۲۸) قرآنِ مجید کی رُو سے یہ انسان کی عظیم کامیابی ہے : رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ۚ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (المآئدہ ۵ : ۱۱۹)۔

۱۱۔ شرّ المآب :

یہ فکر انگیز بصیرت افروز اور عبرت انگیز اصطلاح قرآنی ہے (صٓ ۳۸ : ۵۵)۔ شرّ ضد ہے

خیر کی، اور شر وہ چیز ہے جس سے ہر شخص کراہت اور نفرت کرتا ہو (المفردات، مادّہ ش ر ر)۔ شرّ المآب کے معنی ہیں ایسا گھر جو قبیح و مکروہ اور نفرت انگیز و ضرر رساں ہو۔ شرر (آگ کی چنگاری) کی رعایت سے اس کا مطلب آگ کا گھر بھی ہے۔ چنانچہ قرآنِ مجید نے اسے جہنّم کے مترادف کے طور پر استعمال کیا ہے اور اس امر کی نشاندہی بھی کر دی ہے کہ یہ الحیوان میں اشرار کا گھر ہے جو دنیا میں قبیح و مکروہ اور شر انگیز و آتش بکنار زندگی گزارتے تھے۔ وہ اس اعتبار سے بشری سمندر ہوتے ہیں۔ قدرت کا قانونِ مکافات یہ ہے کہ انسان اس دُنیا میں اپنے لیے جیسا گھر بنائے گا اس نوعیت کا گھر اسے الحیوان یا دارالآخرت میں ملے گا: حسن کور و کور ذوق، مجرم و گناہگار، مفسد و شریر، ظالم و جاہل اور مضطرب و اہلِ نار نفوس کا گھر جہنم یا شرّ المآب ہو گا؛ بخلاف اس کے اہلِ حسن و سُرور کا آخری گھر جنّت یا حُسنُ المآب ہو گا۔ شرّ المآب اور حُسنُ المآب کی تعبیرات میں یہ از بس اہم و فکر انگیز نکتہ مضمر ہے کہ اشرار اہلِ نار اور اخیار اہلِ حسن و سُرور ہوتے ہیں۔

۱۲۔ دید و کلامِ الٰہی سے محرومی:

حقیقت یہ ہے کہ بندے کی یہ اصل محرومی و نامرادی ہے۔ یہ بات قرآنِ مجید سے ثابت ہے۔ چنانچہ ربّ جلیل سورۂ آلِ عمران میں مجرموں اور گناہگاروں کی محرومی و نامرادی کی اس طرح نشاندہی کرتا ہے:۔۔۔ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ... (آل عمران ۳: ۷۷)؛ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اُن سے نہ کلام کرے گا اور نہ ان کی طرف نظر ہی کرے گا۔

سورۂ مُطفّفین میں ارشاد ہوتا ہے: كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ۝ (۸۳: ۱۵)؛ ہرگز نہیں، بالیقین اس روز یہ اپنے ربّ کی دید سے محروم رکھے جائیں گے۔

یہ راز اہلِ عشق و فا ہی جانتے ہیں کہ ہم نظری و ہمکلامی کی نعمتِ حسنیٰ و عظمیٰ کی حقیقت کیا اور انسان کے لیے اس کی اہمیت کیا ہے؟ اگر دید و کلامِ دوست قرّۃُ العین ہے اور یقیناً ہے تو پھر اس کی محرومی قلب و نگاہ کی آتشِ سوزاں نہیں تو اور کیا ہے؟

۱۳۔ نہ زندہ نہ مردہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جہنم کی آگ کا عذاب اتنا شدید ہوگا کہ زندگی اہلِ نار کے لیے ناقابلِ برداشت بن جائے گی۔ وہ موت چاہیں گے لیکن وہاں موت کہاں؟ وہ لذّتِ موت وحیات سے ناآشنا رہیں گے۔ موت فقدانِ احساس وشعور سے عبارت ہے اور زندگی کو احساس وشعور اور حیاتیاتی لذّت وسُرور سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ یہ یاد رہے کہ حیاتِ محض ایک جمیل وجلیل اور لذّت انگیز وسُرور آفریں نعمتِ عظمیٰ ہے۔

۱۴۔ نفسِ مُطمئنّہ:

دیکھیے مقامِ اوّل (حواشی)، حاشیہ (۲)، مطمئن نفس۔ یہاں اس امر کی مختصر سی صراحت کردی جاتی ہے کہ نفس سے مراد "انسانِ کُل" ہے۔ جب روحِ انسانی ربِّ حکیم کے امر (= نَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي : الحجر ۱۵: ۲۹) سے اپنے پیکرِ خاکی میں نفوذ کرجاتی ہے تو اس سے روح و بدن کے علاوہ ایک تیسری چیز پیدا ہوجاتی ہے، جسے "نفس" سے تعبیر کرتے ہیں۔ نفس ایک نامیاتی کُل ہونے کے باوصف دو اجزاء پر مشتمل ہے۔ وہ جزو جو بدن سے ملحق ومتصل ہے، اسے نفسِ امّارہ کہتے ہیں؛ اور دوسرے جُز، کو جو روح سے ملحق ومتصل ہے، نفسِ لوّامہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ نفس کے لیے SELF، EGO، خودی، انا، "میں"، من کی متعدد تعبیرات استعمال کی جاتی ہیں۔

۱۵۔ سُلطان:

یہ مفہوم لَا تَنفُذُونَ إِلَّا بِسُلْطَانٍ سے ماخوذ ہے (دیکھیے سورۂ رحمٰن ۵۵: ۳۳)۔

۱۶۔ جلال بازی:

اس سے مراد کھیلیں ہیں، مثلاً پہلوانی، کبڈی، تکہ بازی، تنکا بازی، نیزہ بازی، ہاکی، کرکٹ، فٹ بال، پنجہ آزمائی، وزن برداری (WEIGHT LIFTING)، گھڑ دوڑ، جمناسٹک، تیز دوڑ، اُچھل کود وغیرہ وغیرہ۔ اگر ہم بالخصوص قدیم میدانی کھیلوں کے محرکات پر غور کریں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے کہ ان کا اصل محرّک انسان کا جذبۂ اظہارِ جلال ہے۔ جلال حُسن کا عنصر ہے جو قدرت وتوانائی، شہ زوری وہیبت، حوصلہ وشجاعت اور قہاری وجبروت کی علامت ہے۔ انسان نے اپنے اس

جذبۂ اظہارِ جلال کی خاطر کھیل ایجاد کیے ہیں۔ اس سے امر کی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں ہم نے کھیلوں (SPORTS) کے لیے جلال بازی کی تعبیر اختیار کی ہے۔

۱۷۔ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ○ (الرحمن ۵۵ : ۲۹) کی طرف اشارہ ہے۔

۱۸۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (البقرہ ۲ : ۲۵۶) : دین میں جبر یا زبردستی نہیں۔ یہ اسلام کا اصل الاصول ہے اور انسان کے حقِ آزادی کا محافظ و ضامن اور اس حقیقت پہ دلالت کرتا ہے کہ ربّ العالمین نے انسان کو صاحبِ ارادہ و اختیار بنایا ہے، لہٰذا ایک تو اُسے اپنی پسند کا دین اختیار کرنے کا حق اور اختیار ہے، اور دوسرے اس آزادی و اختیار کی بنا پر وہ قدرت کے قانونِ مکافات کا مستوجب ہے۔

۱۹۔ جمالیاتی ذوق (انگریزی میں Aesthetic taste ۔ مغربی علمائے جمالیات جمالیاتی حِسّ Aesthetic sense اور جمالیاتی ذوق میں امتیاز نہیں کرتے اور دونوں اصطلاحات سے ایک ہی مفہوم لیتے ہیں۔ جمالیات میں سب سے پہلے ربِّ کریم نے راقم کو ان دونوں میں امتیاز کرنے کی بصیرت و توفیق دی (دیکھیے مصنّف کی کتاب "جمالیات قرآنِ حکیم کی روشنی میں"، طبع اول ۱۹۵۸ء مجلس ترقی ادب، لاہور اور طبع دوم نیشنل بُک فاؤنڈیشن، اسلام آباد)۔ جمالیاتی حِس وہبی و عالمگیر ہوتی ہے اور ہر فردِ بشر کو قدرت کی طرف سے ودیعت ہوتی ہے۔ اس حاسّہ کے ذریعے انسان حُسن اور خوبصورت چیزوں سے جمالیاتی سرور و سوز حاصل کرتا اور قُبح اور بدصورتوں سے نفرت کرتا ہے۔ علاوہ ازیں، اس کی بدولت وہ حُسن و قُبح اور خوب و ناخوب میں تمیز کرتا ہے۔ بخلاف اس کے جمالیاتی ذوق اکتسابی بھی ہوتا ہے اور دوسرے وہ ماحول، تعلیم و تربیت اور قومی و ثقافتی روایات، دینی عقائد و افکار اور مناسک و عبادات، نیز رسم و رواج اور ادب و فن اور تہذیب و تمدّن کی پیداوار ہوتا ہے۔ یہ نیچے کو ورثے میں بھی ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جمالیاتی ذوق میں اختلاف و تضاد اور بوقلمونی و تنوع پایا جاتا ہے۔ بخلاف اس کے جمالیاتی حِس میں عالمگیر وحدت پائی جاتی ہے۔

۲۰۔ لمحۂ منتظر (انگریزی میں Zero hour

۲۱۔ جمالیاتی ثروت :

قرآنِ مجید نے اس جمالیاتی اصطلاح کے لیے جامع و معنی خیز مصطلحۂ "حسنہ" استعمال کی ہے۔ اس کا مطلب ہے ہر قسم کی مادی و نفسی چیز، جو حسین، طمانیت آفرین، سرور انگیز اور لذت آفرین ہو۔

۲۲۔ جمالیاتی کمزوری :

انگریزی میں (Aesthetic weakness). اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی جمالیاتی حس و ذوق کی بدولت حُسن پسند ہے اور حسین وخوبصورت چیزوں سے طبعی و اضطراری طور سے محبت کرتا ہے اور اس کے بغیر وہ طمانیت و مسرت اور جمالیاتی حظ حاصل نہیں کرسکتا۔ یہ اس کی ایک مابہ الامتیاز خصوصیت ہے، جس کے لیے ہم نے جمالیاتی کمزوری کی تعبیر اختیار کی ہے۔ انسان کی اس جمالیاتی کمزوری سے شیطان ناجائز فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتا ہے اور اسے اس کی ہر بُری خواہش، سیئہ، بدی اور بدعملی کو خوشنما و دلکش بناکر دکھاتا ہے اور اس طرح اُسے اپنے دامِ تزویر میں پھنسانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے لیے ہم نے جمالیاتی فریب کی اصطلاح وضع کی ہے۔

۲۳۔ مہجوری سے یہاں مراد بندے کی اپنے حقیقی معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود یا اپنے معروضِ حسن وعشق سے دوری و مہجوری ہے۔

۲۴۔ الحُسن :

الحق کے قیاس پر الحسن کی اصطلاح وضع کی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حُسنِ محض ہے۔ یہ اصطلاح اس آیت قرآنی کی آئینہ دار اور علامت ہے: وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا (الاعراف ۷: ۱۸۰) (اور اللہ ہی کے لیے حسین نام وصفات ہیں اور اسے ان کے ساتھ پکارو۔

۲۵۔ جمالیاتی آزادی :

(Aesthetic freedom): اسے حُسنِ آزادی سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں۔ جمالیاتی نقطۂ نظر سے اس کا معنیٰ ہے ایسی آزادی جو معروفِ حسین ہو اور لوگ اسے پسندیدہ نظروں سے

دیکھیں شرعاً اس سے مراد ایسی آزادی ہے جس کا استعمال حدود اللہ کے اندر اور جائز ہو، حرام و منکر نہ ہو۔ اس کی ضد و نقیض قبیح آزادی ہے، یعنی ایسی آزادی جو حدود اللہ سے تجاوز کر جائے؛ بالفاظِ دیگر غُلُوٌ فِی الدِّین کی آزادی۔ یہ جمالیاتی نقطۂ نظر سے قبیح و نفرت انگیز اور شرعاً ناجائز و حرام ہوتی ہے۔ علاوہ بریں ایسی آزادی جو محض برائے نام ہو، یعنی جس پر غیر فطری یا غیر اسلامی قیود عاید کر دی جائیں اور اُسے جزوی طور پر سلب کر لیا جائے، قبیح و ناقص اور ناگوار و ناپسندیدہ ہوتی ہے۔ یہ جمالیاتی آزادی نہیں ہوتی۔ اسے قبیح آزادی کہتے ہیں۔

۲۶۔ قانونِ مجازات:

یہ قدرت کے قانونِ مکافات کا مترادف ہے، جو زندگی کے ہر گوشے میں جاری و ساری ہے۔ اگرچہ بنی نوع انسان کو اس دنیا میں بھی قانونِ مجازات کے مطابق جزا و سزا ملتی رہتی ہے، لیکن جزا و سزا کا اصل دن قیامت کا دن ہے، جسے قرآنِ مجید "یَوْمِ الدِّیْن" سے تعبیر کرتا ہے۔

۲۷۔ پیدائشِ انسان کے چھ ادوار:

انسان کی پیدائش یعنی اس کی تخلیق و تحسین و صورت گری بھی آسمانوں اور زمین کی پیدائش کی طرح چھ ادوار (اصطلاحِ قرآنی میں ایّام) میں ہوئی ہے۔ دیکھیں تو انسان بھی اپنی ذات میں ایک کائنات ہے۔ اپنی ابتدائی تخلیق کی طرح انسان اب بھی بطنِ مادر میں انہیں چھ تخلیقی و تحسینی اور ارتقائی ادوار سے گزرتا ہے اور یہ صورتِ حال اب سائنس کے مشاہدہ و تجربے میں ہے اور ایک مسلّمہ حقیقت ہے، لہٰذا پہلے اسے قرآنِ مجید کی زبان میں بیان کرتے ہیں: وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝ (المؤمنون ۲۳: ۱۲ تا ۱۴):

اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصے یا جوہر سے پیدا کیا (یعنی زندگی کی ابتدا مٹی کے خلاصے سے ہوئی) پھر ہم نے اُسے نُطفہ بنایا ایک ٹھہر جانے اور جائے پانے کی جگہ میں۔ پھر نُطفے (منی کی بوند) کو لوتھڑے

کی شکل دی۔ پھر اس لوتھڑے کو بوٹی بنا دیا۔ پھر اس میں ہڈیوں کا ڈھانچا پیدا کیا۔ پھر اس ڈھانچے پر گوشت چڑھایا۔ پھر اُسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کھڑا کیا تو کیا ہی بابرکت ہے اللہ تعالیٰ سب ہنرو روں میں سب سے بہتر ہنرور۔

اس آیت میں انسان کی پیدائش کے چھ مراتبِ تطور یا ارتقائی مراحل کا ذکر کیا گیا ہے:

(ا) نُطفہ کی حالت جب وہ "قرارِ مکین" میں ہوتا ہے۔

(ب) علقہ یا گوشت کے لوتھڑے کی حالت

(ج) مُضغہ یا گوشت کی بوٹی کی حالت

(د) عظاماً یا ہڈیوں کے ڈھانچے کی حالت

(ہ) لَحماً یعنی گوشت سازی کی حالت

(و) تخلیقِ آخر کی حالت

اللہ تعالیٰ کے قابلِ ستائش و بابرکت اور احسن الخالقین ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ اُس نے انسان کا قوام ایسا مناسب و معتدل اور موزوں بنایا ہے کہ اس کا قدوقامت کا حسین ترین اور باطنی ہیولیٰ بھی حسین ترین ہے: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ٥ (التین ۹۵: ۴): بلاشبہ ہم نے انسان کو حسین ترین ساخت پر پیدا کیا ہے۔

قرآنِ مجید نے سورۂ انفطار میں خود ہی ربِّ ذوالجلال والاکرام کی اس جمالیاتی تخلیقی فعلیت کی طرف فکر انگیز و بصیرت افروز ارشادات بھی کر دیے ہیں:

یٰٓاَیُّھَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِیْمِ ٥ الَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ٥ فِیْٓ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ٥ (الانفطار ۸۲: ۶ تا ۸): اے انسان! کس چیز نے تجھے تیرے ربِ کریم کے بارے میں دھوکے میں ڈال دیا؟ جس نے تیرا خاکہ بنایا، پھر تیرا تسویہ کیا یعنی تیرے اعضاء و جوارح میں ہم آہنگیوں کی ہم آہنگی پیدا کی اور پھر ان میں اعتدال پیدا کر کے تجھے موزوں بنایا۔ پھر جس تشکل و صورت میں چاہا تجھے مُتشکّل و مُصوّر کر دیا۔

انسان ایک حسین تقویم میں نمودار ہوگیا تو ربِ جمیل وجلیل نے اس میں اپنی روح میں سے پھونکا تو اس میں حِسّی، قلبی، نفسی نظام قائم ہوگیا اور وہ مکمل بشر بن گیا:

اَلَّذِیْٓ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ o ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ o ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ o (السجدہ ۳۲: ۷-۹) : (وہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب والشہادۃ اور عزیز ورحیم ہے) جس نے جو چیز تخلیق کی اسے حسین ترین بنایا، اور اس نے انسان کی تخلیق کا آغاز مٹی سے کیا۔ پھر اس نے اس کی نسل حقیر پانی کے جوہر سے چلائی۔ پھر اس کو راست قامت بنایا اور اس کے اندر اپنی روح سے پھونکا (یعنی اپنی روح پھونک دی، جس کا اعجاز ہے کہ) ہم نے تمہارے کان، آنکھیں اور قلوب بنا دیئے۔ تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو۔

سورۂ انفطار کی محوّلہ بالا آیات میں تخلیق وتحسینِ انسانی کے جن چار مرحلوں کا ذکر ہے، وہ یہ ہیں:

(ا) خاکہ سازی: جسے انگریزی میں Sketching کہتے ہیں؛ یعنی کسی چیز کا خاکہ یا Sketch بنانا۔

(ب) تسویہ: اس خاکے کے اعضاء وجوارح میں ہم آہنگیوں کی ہم آہنگی Harmony of harmonies پیدا کرنا۔

(ج) تعدیل: خاکے یعنی ہیولے میں اس طرح اعتدال پیدا کرنا کہ تصویر ظاہری وباطنی ہر اعتبار سے موزوں بن جائے۔

(د) صورت گری: مجوزہ چیزوں کے قد وقامت اور صوری ومعنوی خصائص کی رعایت سے ایسی صورت بنانا کہ وہ حسین ترین ہو۔

تخلیقی وحُسن کاری کے ان چار مرحلوں کے بعد پانچواں مرحلہ نفخِ روح اور تخلیقِ نظامِ باطنی کا ہے، جس کا ذکر سورۂ سجدہ کی محوّلہ بالا آیات میں کیا گیا ہے۔ باطنی نظام سے مراد انسان کا حسی، قلبی۔

نفسی نظام ہے جسے قرآنِ حکیم نے اپنے اِیجازِ بلاغت سے سمع، ابصار اور افئِدہ سے تعبیر کیا ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں اس ازبس فکر انگیز و بصیرت افروز اصل کی نشاندہی کی گئی ہے کہ جمالیاتی مشاہدے (Aesthetic experience) میں حواسِ خمسہ میں فقط سامعہ و باصرہ حواس ہی ازبس اہم حصّہ لیتے ہیں، لہٰذا باقی تینوں حواس (لامسہ، ذائقہ اور شامّہ) سے صرفِ نظر کیا گیا ہے۔ یہ جمالیاتی حقیقت جس کی طرف قرآنِ حکیم نے پہلی صدی ہجری/ساتویں صدی عیسوی کے اوائل میں اشارہ کیا تھا، اس کا سراغ حکمائے جمالیات نے تقریباً چودہ سو برس بعد عصرِ حاضر میں لگایا ہے۔ علاوہ بریں، زیرِ نظر آیتِ قرآنی میں یہ اصل بھی مضمر ہے کہ جمالیاتی مشاہدہ و تجربے، نیز تحصیل و ہنر کے لیے سامعہ و باصرہ کے ساتھ نظامِ قلب کا تعاون بھی ناگزیر ہے۔ کیا یہ حقیقت جو علم و فن کی اصل ہے، قرآنِ مجید کے من جانب اللہ ہونے کی روشن دلیل نہیں ہے؟ بہرحال یہ تو تھا جملہ معترضہ۔ اپنی تخلیق کے اس پانچویں مرحلے کے بعد بچہ بطنِ مادر میں مکمل بشر بن جاتا ہے تو احسن الخالقین اُسے ظلمتکدۂ رحم سے رنگ و نور کی حسین دنیا میں لے آتا ہے، جسے پیدائش کہتے ہیں، لیکن قرآنِ مجید نے اس کے لیے انتہائی فکر انگیز و بصیرت افروز اور بلیغ و موزوں تعبیر اختیار کی ہے اور وہ ہے "تخلیقِ آخر"، اور یہ تخلیقِ انسانی کا چھٹا مرحلہ ہے۔

اہلِ ذوق کے لیے اس اصل کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے کہ فنکار کی فنّی تخلیق بھی "تخلیقِ آخر" ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ اسے اپنے ذہن کی دُنیا سے باہر کی دُنیا میں لاتا ہے تو وہ "شئے مذکور" بنتی ہے اور اس کے لیے انگریزی میں Recreation کی تعبیر اختیار کی جاتی ہے۔

قرآنِ حکیم پر تدبّر بالحق کرنے سے اس اصل کا بھی سراغ ملتا ہے کہ ربِّ علیم و قدیر نے اپنی ناقابلِ تغیّر و تبدّل سنّتِ حسنہ کے مطابق انسان کی پیدائشِ اوّل میں چھ مراحل یا مدارج میں پایۂ تکمیل کو پہنچائی ہے اور وہ مفصلہ ذیل ہیں:

اوّل، ماء یا پانی: وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۚ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ ۝ (الانبیآء ۲۱: ۳۰):
اور ہم نے پانی سے کُل جاندار یا ذی حیات چیزیں پیدا کیں۔ آیا (اس حقیقت پر) یہ یقین نہیں رکھتے؟

دوم۔ صَلْصَالٍ حَمَاٍ مسنون: سڑی ہوئی بدبودار کیچڑ: وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ٥ (الحجر ۱۵: ۲۶، ۲۸، ۳۳): اور ہم نے انسان کو خمیر اُٹھے ہوئے بدبودار گارے سے بنا یا جو سوکھ کر بجنے لگتا ہے۔

سوم۔ صَلْصَالٍ کَالْفَخَّار: ٹھیکری کے مانند بجنے والی مٹی: خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ (الرحمٰن ۵۵: ۱۴): اُس نے انسان کو ٹھیکری کے مانند بجنے والی گارے کی مٹی سے بنایا۔

آفرینش کے یہ تینوں مرحلے پانی کے ہیں۔ سمندر یا دریا میں ساحل سے پہلے سڑی ہوئی بدبودار کیچڑ (= حَمَاٍ مسنون) ہوتی ہے اور اس کے بعد ساحل کے قریب و متصل ٹھیکری کے مانند بجنے والی گارے کی خشک مٹی ہوتی ہے۔ پانی سے نقلِ مکانی کر کے آبی مخلوق ساحل کی طرف بڑھی تو اسے پہلے کیچڑ میں ٹھہرنا پڑا اور اپنے آپ کو اس نئے ماحول کے مطابق ڈھالنے یا ADJUST کرنے کے بعد وہ ساحل کی طرف آگے بڑھی تو اس نے پہلے اُسے اور زیادہ سخت ٹھیکری کے مانند خشک گارے کی مٹی کا ماحول ملا۔ وہاں صدیوں زندگی گزارنے کے بعد اس میں ساحل پہ اترنے کی استعداد و ہمت پیدا ہوئی۔ اب یہ آبی مخلوق عالمِ آب سے نقلِ مکانی کر کے عالمِ گِل میں آئی تو اس کی پیدائش کا چوتھا مرحلہ شروع ہوا۔

چہارم۔ طین یا بَرّ، خشکی، مٹی: اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ٥ (الصّٰفّٰت ۳۷: ۱۱): بلاشبہ ہم نے انہیں (یعنی بنی نوع انسان کو) چپک جانے والی لیس دار مٹی سے پیدا کیا۔

اس کے بعد یہ مخلوقِ بری اس دلدل نما زمین سے آگے بڑھی تو اسے زیادہ خشک زمین ملی جسے قرآنِ مجید نے محض طین سے تعبیر کیا ہے: وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ٥ (المؤمنون ۲۳: ۱۲) اور بلاشبہ ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصے یا جوہر سے پیدا کیا (یعنی اس میں بری ماحول کی خصوصیات پیدا کر دیں)۔

اس کے بعد انسان مکمل طور پر مخلوق بن گیا: هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ (الانعام ۶: ۲): رب وہی ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔

پنجم۔ تسویہ یا راست قامتی کا مرحلہ: زمین پر آکر انسان کو اللہ تعالیٰ نے راست قامت بنایا اور اس نے صورتِ بشر اختیار کر لی اور دو پاؤں پہ چلنے لگا: اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ٥ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِىْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ٥ (ص ۳۸: ۷۱: ۷۲): (یاد کرو) جب تیرے رب نے فرشتوں سے فرمایا: میں مٹی سے بشر پیدا کرنے والا ہوں، لہٰذا جب میں اسے کامل کر دوں (اور راست ہو جائے) اور میں اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اُس کے آگے سجدے میں گر جاؤ۔

انسان راست قامت ہو کر چلنے پھرنے لگا تو اب اللہ تعالیٰ نے اس میں اپنی روح پھونک دی تو اس میں حسّی۔قلبی۔نفسی نظام قائم اور جاری وساری ہو گیا۔ اس کے اندر حواس اور عقل وخرد کے چراغ روشن ہو گئے (السجدہ ۳۲: ۷تا۹)۔

ششم۔ حسّی۔قلبی۔نفسی نظام کا قیام: اس مرحلے پہ انسان کو حسّی وقلبی قوتیں ودیعت ہوئیں اور وہ صاحبِ عقل وفہم اور صاحبِ ارادہ واختیار مخلوق بن گیا اور دیگر خشکی وآبی مخلوقات سے متمیز ہو گیا۔

احسن الخالقین کی جمالیاتی تخلیقی فعلیّت کے مفصلۂ بالا چھ ارتقائی مرحلوں سے گزرنے کے بعد انسان صاحبِ ارادہ واختیار اور دانا وبینا آدم بنا تو دُنیا اس کے لیے امتحان گاہ بنی اور وہ عائلی وقبائلی زندگی گزارنے کے قابل بنا۔

۲۸۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا ٥ (الدھر ۷۶: ۱)۔ بلاشبہ انسان پہ دھر میں سے ایک دور ایسا بھی آیا ہے کہ وہ ایسی چیز نہ تھا کہ جس کا ذکر اذکار ہوتا ہو۔

۲۹۔ تلبیس، تاویل ومنطق: Logical fallacy and misinterpretation

۳۰۔ ربِّ علیم نے قصۂ آدم کا ذکر قرآنِ مجید میں مختلف مقامات پہ کیا ہے، مثلاً دیکھیے البقرہ ۲: ۳۰تا۳۷؛ آلِ عمران ۳: ۳۳، ۵۹؛ الاعراف ۷: ۱۱، ۱۹، ۲۶، ۲۷، ۳۱، ۳۵، ۱۷۲؛ بنی اسرائیل

۱۷ : ۶۱ ؛ الکہف ۱۸ : ۵۰ ؛ طٰہٰ ۲۰ : ۱۱۵ تا ۱۱۷، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۴۔

۳۱۔ جمالیاتی حس : Aesthetic sense

۳۲۔ جمالیاتی ذوق : Aesthetic taste

۳۳۔ جمالیاتی اقدار : Aesthetic values

۳۴۔ زمان و مکان : Time and space

۳۵۔ مطلق اقدار : Absolute values

۳۶۔ اضافی اقدار : Relative values

مقام ۳

حسی۔ قلبی۔ نفسی نظام[1]

(۱) جمالیاتی حسی نظام:

حواسِ خمسہ (= سامعہ، باصرہ، ذائقہ، شامّہ اور لامسہ) پر مشتمل اس نظام کی اہمیت قریب قریب اتنی ہے جتنی کسی رشکِ فردوسِ بریں کے کُل ابوابِ خمسہ کی ہو۔ اس ظاہری نظامِ حسی کے بغیر دوسرے دونوں نظام (قلبی اور نفسی) اپنی غیر معمولی اہمیت رکھنے کے باوجود بیکار و لایعنی ہیں۔ لہٰذا یہ نظام نہ ہوتا تو انسان بہرا، گونگا، اندھا، بے حس و بے علم، بے عقل و بے شعور اور بے ذوق و جاہل ہوتا؛ نیز وہ جمالیاتی عواطف و امیال، جذبات و انفعالات، جمالیاتی ذوق و حظ، جمالیاتی لذّت و مسرّت، سوز و سرور، جذب و شوق اور آرزوئے حسن سے محروم ہوتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ نہ تو اس میں کائنات کی تسخیر کرنے کی قوّتِ علم و حکمت ہوتی اور نہ وہ مسجودِ ملائک اور خلیفۂ ارض بنتا۔ مختصر یہ کہ وہ انسان نہ ہوتا بلکہ بصورتِ بشر حیوان یا اس سے بدتر کوئی قبیح وارذل مخلوق ہوتا۔

نظامِ حسی سے متعلق تین لطیف و اہم نکات یاد رکھنے کے قابل ہیں: اوّلاً، جہاں تک جمالیاتی مشاہدہ و تجربہ کا، نیز علم و حکمت، ادب و فن اور ہنر (خصوصاً جدید سائنسی ہنر جسے ٹیکنالوجی کہتے ہیں)، کے اکتساب کا تعلق ہے، حواسِ خمسہ میں سے سامعہ اور باصرہ ہی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ ثانیاً،

یہ اللہ تعالیٰ کا آخری زندہ و محفوظ کلام قرآنِ حکیم ہے، جس نے سب سے پہلے اس حقیقت کی طرف بصیرت افروز اشارہ کیا، جسے تقریباً تیرہ صدیاں بعد علمائے جمالیات نے تحقیق و تجربے کے بعد تسلیم کیا۔ کیا یہ حقیقت و واقعیّت قرآنِ مجید کی حقانیّت اور من جانب اللہ ہونے کی دلیل نہیں؟ یہ یقیناً اس حقیقت کی دلیل بھی ہے اور ثبوت بھی۔ یہ اور بات ہے کہ اکثر لوگ اپنے اپنے ظلم و جہل اور حق کوری و عصبیّت کے باعث اسے تسلیم نہیں کرتے۔ ثالثاً، ہر حاسّہ کا تعلق بیک وقت اپنے نظام سے بھی ہے اور نظامِ قلبی نفسی سے بھی۔

۱۔ سامعہ سننے کا ایک انتہائی دقیق و حیرت انگیز نظام ہے، جو صوت و سکوت دونوں کو سنتا ہے، لیکن سکوتِ مطلق کہاں ہے؟ سکوت سے مراد شور و غوغا کا فقدان ہے نہ کہ آواز کا فقدان۔ ہماری دُنیا جس طرح کُرۂ ہوا ہے اُسی طرح کُرۂ آواز بھی ہے، لہٰذا اس سے ہوا مفقود ہوتی ہے نہ آواز۔ وجہ یہ ہے کہ ہوا چند ساعت کے لیے مفقود ہو جائے تو اشیائے کائنات کا نظامِ تنفّس درہم برہم ہو جائے اور زندگی مفقود ہو جائے۔ لیکن ہم پھر بھی محاورۃً کہتے ہیں کہ ہوا بند ہو گئی ہے یا ہوا نہیں ہے۔ اسی طرح ہم محاورۃً کہتے ہیں کہ خاموشی ہے، سکوت ہے، آواز نہیں ہے، اس سے فقدانِ آواز مراد نہیں ہوتی۔ اس کی ایک دلیل یہ ہے کہ ہوا اور آواز لازم و ملزوم ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہوا خود آواز پیدا بھی کرتی ہے اور اُسے آناً فاناً اقصائے عالم میں پہنچا بھی دیتی ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ سکوت میں آواز نہ ہوتی تو سامعہ کو ادراکِ سکوت کیسے ہوتا، اس لیے کہ اس کا وظیفہ محض آواز سُننا ہے۔ وہ سکوت کو سنتی ہے۔ اس لیے کہ اس میں آواز کی رمق ہوتی ہے۔ بے صوت سکوت یا سکوتِ مطلق اس لیے ممکن نہیں کہ کائنات کی ہر شے زبان رکھتی ہے۔ چنانچہ جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید میں فرماتا ہے، کائنات کی ہر شے اپنے ربّ کی تسبیح پڑھتی ہے، لیکن انسان اس کی ماہیت کا فہم و ادراک نہیں رکھتا[۲]۔ ہم اپنے اس موقف کی تائید میں اللہ تعالیٰ کے کلمۂ کُنْ سے بھی استشہاد کرسکتے ہیں۔ "کُنْ" الحُسن والحق اور الحیّ والقیّوم کا کلمہ ہے جس میں حُسن زندگی، ثباتِ دوام اور روحِ آواز ہے، لہٰذا یہ اس کا اعجاز ہے کہ کائنات کے اندر اور باہر تخلیق و تعمیر اور تحسین و تزئین کا عمل

جاری ہے، اور موت و تخریب اسی عمل کے لوازمات ہیں۔ چونکہ "دوست" کے کلمۂ کُن میں اس کا حُسنِ آواز مضمر بھی ہے اور جلوہ افروز بھی اور اس سے کائنات معمور و منور ہے۔ اس لیے سامعہ کو اس کی طلب و جستجو رہتی ہے۔ علاوہ بریں، چونکہ کرۂ ارضی کے جماداتی، نباتاتی اور حیوانی ہر عالم کی اشیآء کے علاوہ اجرامِ فلکی کی اشیآء بھی "دوست" کی حمد و ثنا کرتی رہتی ہیں، جس کے حُسنِ آواز کی لذتِ مشاہدہ سے سامعہ اپنے نظامِ تحصیل کی بدولت آشنا ہے، لٰہذا اُسے اس کی آرزو رہتی ہے جو حُسن بلا شبہ صوت و سکوت کی کسی تشکل و صورت اور حال و ظروف میں ہو، سامعہ کے جمالیاتی ذوق و شوق کی تسکین کرتا ہے اور اُسے اس کی طبعًا خواہش ہوتی ہے، لیکن سچ یہ ہے کہ سامعہ کو اصل میں حُسنِ آوازِ "دوست" کی آرزو و جستجو ہوتی ہے، جس کے مشاہدے سے اُسے "جمالیاتی ثروت" ملتی ہے۔ جانتے ہو "جمالیاتی ثروت" کسے کہتے ہیں؟ اس کا مطلب ہے طمانیت و سکینت، سوز و ساز، نیز "حسنۂ سرمدی" اور "نور و سلطان"۔
اب تم پوچھو گے کہ حسنۂ سرمدی اور نور و سلطان کا مطلب کیا ہے؟ سنو!

(ا) حسنۂ سرمدی کا مطلب ہے دُنیوی و اُخروی حسنہ؛ اور حسنہ سے مراد ہے ربِّ ذو الجلال و الاکرام کی ہر وہ نعمتِ حُسنیٰ و عُظمیٰ جو لذّت آفریں و مسرّت انگیز، راحتِ جسم و جان اور قُرّۃ العین اور معروضِ حُسن و محبّت ہو، نیز وہ باعثِ رحمت و امن و سلامتی ہو۔ علاوہ بریں جمالیاتی سوز و ساز اور کیف و سرور کا سامان اور انعام و اکرام اور فوزِ عظیم ہو۔ فوزِ عظیم کا مطلب ہے "حُسن المآب" میں "احسان و رضوان کے حُسن المقام" پر متمکن ہونا۔ سنو! حُسن المآب قرآنِ حکیم کی فکر انگیز و بصیرت افروز اور وسیع المطالب اصطلاح ہے۔ اوّلاً اس سے مراد جنّت ہے اور وہ اصلاً حُسن ہے۔ ثانیاً، حُسنِ مجسّم جنت ہی انسان کا حقیقی گھر ہے، اور فقط اسی میں وہ آرام و راحت اور طمانیت و مسرّت سے حیاتِ محض بسر کر سکتا ہے۔ ثالثاً چونکہ حُسن ہی لذّت و حلاوت، راحت و سکینت، طمانیت و مسرّت، سوز و ساز، کیف و سرور اور حیرت و مستی کا سرچشمہ ہے۔ لٰہذا حُسن المآب میں اہلِ جنّت کو یہ بھی اور ان سے افضل و اعلیٰ اور بھی غیر مترقبہ نعمتیں میسر آئیں گی اور ان سب کے لیے "جمالیاتی ثروت" کی تعبیر اختیار کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ تم معلوم کر چکے ہو احسان و رضوان کے حُسن المقام کا مطلب حقیقی معروضِ حُسن و عشق (= اِلٰہ) کی دید و لقاء،

ہم نظری و ہمکلامی، قربِ خوشنودی اور ہم رضائی کا حسین مقام ہے۔

(ب) نور و سلطان: نور سے مراد علم کی روشنی ہے۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ وہ رُشد و ہدایت ہے، یعنی انسان اس روشنی کے ذریعے اپنی کامیابی کی منزلِ مقصود اور اس کی راہِ مستقیم کو دیکھ اور پہچان سکتا اور اس کا سراغ لگا سکتا ہے؛ نیز اس راہ پر چل کر وہ اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ سکتا ہے، جو اس کے معروضِ حسن و عشق کی جائے بقا، جنّت ہے۔ دوسرے نور میں قوتِ فرقان ہوتی ہے، جس کی بدولت انسان حُسن و قُبح، حق و باطل، ایمان و کفر، توحید و شرک، عدل و ظُلم، حسنہ و سیّئہ، خیر و شر، معروف منکر، خوب و زشت، حلال و حرام، پاک و ناپاک اور سود و زیاں میں تمیز کر سکتا ہے۔ تیسرے، اس روشنی کے ذریعے انسان اپنے نفس اور اِلٰہ و ربّ کی معرفت حاصل کر سکتا ہے۔ چوتھے، اس روشنی کے طفیل وہ اشیائے کائنات اور ان کے خواص و حقائق کو دریافت کرتا ہے۔ پانچویں انسان کی حیرت انگیز ایجادات و اختراعات؛ ثقافتی، علمی، ادبی اور فنّی کارنامے اور اس کی ہمہ گیر و محیّر العقول ترقی کے کمالات سب نورِ علم کے مرہونِ منّت ہیں۔ "سلطان" سے علم کی وہ قوتِ قاہرہ و جلیلہ مراد ہے، جس کے ذریعے انسان اشیائے کائنات کو مسخّر کر کے ان سے استفادہ و تمتّع کر سکتا اور کر رہا ہے۔ علاوہ بریں، "سلطان" ہی کے ذریعے قومیں اپنی آزادی اور اپنی ملکی و نظریاتی سرحدوں کا تحفظ اور دشمن و متحارب قوتوں کا مقابلہ کر سکتی؛ نیز انہیں شکست دے سکتی اور فتح و مغلوب کر سکتی ہیں۔ علاوہ بریں، وہ عسکری و اقتصادی، علمی و ثقافتی اور فنّی و تکنیکی بالادستی حاصل کر کے دوسری قوموں کی قیادت کر سکتی ہیں۔

کیا تم اس رازِ حقیقت سے واقف ہو کہ سامعہ اپنے اندر کی آواز بھی سنتی ہے، یعنی اپنے حسّی۔ قلبی۔ نفسی نظام کی آواز؟ اس آواز میں آرزوئے "دوست" مضمر ہوتی ہے۔ یہ آواز کبھی "دوست" کی حمد و ثنا ہوتی ہے اور کبھی اس کی آرزوئے دید و وصال۔ کبھی یہ نالۂ فراق ہوتی ہے اور کبھی آہِ استغفار و توبہ، کبھی یہ حسنۂ سرمدی کی دُعا ہوتی ہے اور کبھی راز و نیاز کی حکایت۔

کبھی تُو نے اپنی یہ آواز سُننے کی کوشش کی ہے؟ نہیں کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تم نہیں جانتے کہ تم کون ہو اور تمہاری غایتِ حیات کیا ہے؟

سنو! تمہارے جمالیاتی باطنی نظام میں ایک اور حسین و شیریں روحِ آوازہ اپنا جلوہ پیدا کرتی رہتی ہے۔ تم نے کبھی اس کا "جمالیاتی سمعی مشاہدہ بالحق" کیا ہے؟ نہیں کیا ہے۔ تبھی تم "دوست" نا آشنا ہو۔ "دوست" کی رحمتِ بے پایاں کا یہ عالم ہے کہ وہ ہر رنگ میں تم پر اپنا جلوہ پیدا کرتا رہتا ہے۔ تم ہی غافل و زیاں کار ہو، ورنہ اس کا جمالیاتی مشاہدہ کر کے اپنی زندگی کو جمالیاتی ثروت سے معمور کر سکتے ہو۔

غور سے سنو! یہ بڑے راز کی بات ہے۔ "دوست" کی آوازہ سنو، پہچانو اور اپنے اندر اس کا ذوق و شوق پیدا کرو۔ پھر اس آوازہ کے مضمرات سمجھنے کی خاطر اس پر حکیمانہ تدبر کرو اور مسلسل کرتے رہو۔ "دوست" کی کرم نوازی سے تمہارا اس کی آوازہ سے رابطہ قائم ہو جائے گا۔ تم جو پوچھو گے، جواب ملے گا۔ علم و حکمت اور خیر و حسنہ سے جو چاہو گے ملے گا۔ "دوست" کے حُسن آوازہ کے رابطے کی بدولت تم اس کے تلمیذ و شاہد اور دوست و مقرّب بن سکتے ہو۔ تم "دوست" کے آخری و محفوظ اور زندہ و ناطق کلام کے تلمیذ بن کر وہ سب کچھ سیکھ سکتے ہو، جس کے سیکھنے کی تم پر سچّی طلب و جستجو اور قابلیّت و ہمّت ہوگی۔ اس طرح تم دانائے راز، راہ دانِ منزلِ "دوست" اور کلیمِ قرآن بن سکتے ہو۔ الغرض، آرزوئے حُسنِ "دوست" تمہیں صاحبِ حُسن و سُرور بنا کر احسان و رضوان کے حُسنُ المقام پر متمکّن کر سکتی ہے۔

کیا تم نے کبھی محسوس یا غور کیا ہے کہ ربِّ جمیل و جلیل نے تمہیں ذوقِ حُسن ودیعت کیا ہے؟ اصل یہ ہے کہ ذوقِ حُسن ہی کی بدولت تمہیں ہر زمان و مکان میں حُسن کی آرزو و جستجو رہی ہے؛ اور تم ہر شے، ہر شکل و صورت، ہر قد و قامت اور ہر انداز و رنگ میں جلوۂ حُسن چاہتے ہو۔ کاش تم یہ حقیقت جاننے اور سمجھنے کی کوشش کرتے کہ تمہارے جملہ حواس کو حُسن کی طلب و جستجو رہتی ہے۔ الحُسن نے تمہیں صاحبِ ذوق و نظر ہی نہیں، خالق و حُسن کار بھی بنایا ہے۔ خالق اصل میں حُسن کار ہوتا ہے۔ چنانچہ تم نے اپنے ذوقِ سمع اور جذبۂ حُسن کاری کی تسکین کی خاطر فنِ غناء ایجاد کیا، جسے موسیقی کہتے ہیں۔ غور و فکر کرو تو تمہیں یاد آئے گا کہ اس فنِ غناء کی موجد اصل میں روحِ احسن الخالقین ہے۔ تم طیور کو چہچہاتے سنتے تھے اور تمہیں ان کے نغموں میں ایک حسین جانفزا اور معلوم و آشنا آہنگ کا

احساس ہوتا تھا۔ تمہیں نسیم سحر گاہی کے خرام اور چشموں، دریاؤں اور ندی نالوں کی روانی میں ایک مانوس و ہم آہنگ آواز سنائی دیتی تھی اور سازِ دل کو اس طرح چھیڑتی تھی کہ اس میں مسرت و طرب کے چشمے پھوٹ پڑتے تھے اور تم مسحور ہو جاتے تھے۔ تم اپنے ہم جنس کسی صنفِ جمیلہ یا صنفِ جلیلہ کی سریلی آواز سنتے تھے تو وجد و حال میں آجاتے تھے۔ اس سے تمہارے ذوقِ سمع کا نشو و ارتقاء ہوا اور تم میں خوش الحان بننے اور اس شے کو معلوم کرنے اور سمجھنے کا داعیہ پیدا ہوا، جس سے آواز حسین و شیریں اور سرور انگیز و کیف پرور بنتی ہے۔ تم خوش الحان بننے کی کوشش اور اس شے کی تلاش و جستجو کرتے رہے، کرتے رہے، حتٰی کہ تم پر یہ حقیقت منکشف ہوگئی کہ یہ "روحِ غناء" ہے، جو آواز میں جمال و جلال، سوز و ساز اور کیف و سرور پیدا کرتی ہے۔ جانتے ہو! روحِ غناء کیا ہے؟ یہ حقیقت میں شانِ حسن ہے، جسے تم سُر سے تعبیر کرتے ہو۔

مدتِ مدید کے بعد تم نے یہ راز معلوم کر لیا تو تمہیں اپنی آواز حسین بنانے کی خاطر اس میں سُر پیدا کرنے کا شوق چرایا اور تم صدیوں اس کوشش میں لگے رہے۔ انجام کار، تم میں تخلیقی استعداد قوت سے فعل میں آگئی، اور تم نے صدیوں کے مشاہدہ و تجربہ اور سعی و ریاض کے بعد آواز میں روحِ غناء یا سُر پیدا کرنے کا علم و ہنر سیکھ لیا اور اس میں ترقی کرتے جا رہے ہو۔

یاد رکھو! علم و حکمت اور ہنر و فن میں عظمت و کمال حاصل کرنے کا اصل الاصول یہ ہے کہ انہیں لحد سے مہد تک مسلسل سیکھتے رہو، کیونکہ ان کے نشو و ارتقاء کے لیے سعیِ لامتناہی ناگزیر ہے۔ سیکھنا چھوڑ دو گے تو نشو و ارتقاء رُک جائے گا۔ عالم وہ ہے جو عمر بھر طالبِ علم رہتا ہے۔ عظمت و کمال کا زینہ محنتِ مسلسل ہے۔ کمال و محنت لازم و ملزوم ہیں۔ تمہاری انفرادی و اجتماعی ترقی تمہاری محنت کی مرہونِ منت ہے، کیونکہ وہ اس سے وابستہ ہے۔ کمال متناہیت کا نام نہیں، بلکہ ارتقائے لامتناہی کے اس درجے سے عبارت، جو درجۂ بالا کا نقطۂ آغاز ہوتا ہے۔ یہ مدارج طے کرتے کرتے تم آخرکار اس ارفع و اعلیٰ مقام پہ پہنچ جاتے ہو جو عظمت و بقائے دوام کا مقام ہے۔ تم نے پڑھا اور سنا تو ہے، لیکن کبھی غور بھی کیا کہ ہر زمان و مکان میں قومیں اس وقت تک ترقی کرتی رہیں جب تک سعی و جہد،

محنت ومشقت کرتی اور علم و ہنر سیکھتی رہیں، لیکن جونہی انہوں نے محنت چھوڑی اور علم و ہنر اور تحقیق و تفتیش اور اختراع و ایجاد سے صرفِ نظر کیا، ان کی رجعتِ قہقری شروع ہوگئی، اس کے نتیجے میں ذلّت و مسکنت ان کا مقدّر بن گئی۔ اسی اُصول کی رہین فرد کی زندگی بھی ہے۔

بات فنِ غناء یا موسیقی کی ہورہی تھی، جو حقیقت میں صوتی صورتگری وحُسن کاری کا فن ہے۔ جمالیاتی فن یا آرٹ وہبی۔ اکتسابی ہوتا ہے۔ چنانچہ جس طرح موزونیِ طبع وہبی ہوتی ہے اور اس کے بغیر کوئی شخص شاعر نہیں بن سکتا، چاہے فنِ شعر کا عالم بے عدیل ہی کیوں نہ ہو، اسی طرح قدرت کے عطا کردہ حُسنِ آواز کے بغیر کوئی شخص مغنّی نہیں بن سکتا، چاہے وہ اس فن کا عالمِ بے بدل کیوں نہ ہو۔ لیکن یاد رکھو! فن میں کمال بغیر اکتساب کے ممکن نہیں اور اکتساب محنّت ومشقّت اور ریاض و مزاولت چاہتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ کمال کو اکتساب و محنت مستلزم ہیں۔

یاد رکھو! تم نے فنِ غناء کو اپنے جمالیاتی ذوقِ سمع کی تسکین اور اس سے جمالیاتی حظ و طرب اور سرور و سوز حاصل کرنے کے لیے ایجاد کیا تھا، لیکن شیطان نے تمہاری جمالیاتی کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور تمہیں اس فنِ جمیل کو قبیح یا شیطانی مقاصد کے لیے استعمال کرنے پہ مائل و آمادہ کرلیا۔

تم نے توراتِ مقدّس اور قرآنِ مجید میں پڑھا ہے کہ ربِّ جمیل نے اپنے بندے اور رسول حضرت داؤد علیہ اسلام کو ایسا حُسنِ لحن دیا تھا کہ اس کی تاثیر سے انسان تو انسان، دام و دد، شجر و حجر اور کوہ و کمر بھی وجد و حال میں آجاتے تھے۔ اس سے پتا چلا کہ ہر عالم کی مخلوق آواز سنتی اور ذوقِ سمع رکھتی ہے۔ یہ یاد رہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اللہ جَلّ شانہٗ کی حمد و ثنا کے الہامی بول گاتے تھے۔ چونکہ یہ بول ایک تو روحِ کائنات کے اِلٰہ و ربّ کے ہوتے تھے اور دوسرے لحنِ داؤدیؑ میں بھی حُسنِ اِلٰہ کا جلوہ ہوتا تھا، اس لیے آپؑ کے حسین و مقدّس نغمات سُن کر ربِّ جمیل و جلیل کی مخلوقات وجد و حال میں آجاتی تھیں۔ ایک تو اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور جمال سے محبّت رکھتا ہے، دوسرے اُس نے انسان کو حُسنِ آواز اور ذوقِ سمع ودیعت کیا ہے، اور تیسرے اُسے غناء کا علم و فن سکھایا ہے، اس لیے یہ اس کی نعمتوں میں سے ایک حسین نعمت ہے، بشرطیکہ اس کا استعمال ہر نعمت کی طرح جائز

طریقے سے کیا جائے۔ ماحول، لحن اور بول پاکیزہ و حسین ہوں تو غنائیت اثر میں سرور و سوز اور کیف و مستی کی جمالیاتی ٹھنڈک بن جاتی ہے۔

یاد رکھو! ہر چیز اپنے الٰہ۔الحسن کی محبت میں مبتلا ہے، اس کی طلب و جستجو میں رہتی اور اس کی حمد و ثنا میں نغمہ سنج رہتی ہے۔ تم بھی طبعاً حسن کی محبت اور اس کی آوازہ رکھتے ہو۔ تم بھی اس کی حمد و ثنا میں نواسنج رہا کرو۔ لوگوں کے لیے تمہارا کلام و بیان حسین ہو۔ تمہاری زبان و قلم سے جو بات نکلے حسین ہو، ہر بول فردوسِ گوش اور ہر تحریر جنتِ نگاہ ہو۔ حسن سے کلام طیب و شیریں اور بلیغ و مطہر بنتا اور اس میں تاثیرِ احیاء و انقلاب انگیزی پیدا ہوتی ہے۔

یاد رکھو! حسنِ کلام خاصہ ہے حسنِ خُلق کا، لٰہذا صاحبِ حسنِ خُلق بننا چاہتے ہو تو اپنے اندر ذوقِ سمع و تکلم پیدا کرو۔ سننا اور بولنا سیکھو۔ سنو تو حسنِ کلام اور بولو تو حسین بول۔ اہلِ قلم ہو تو جو کچھ لکھو حسین لکھو، فنکار ہو تو جو کچھ تخلیق کرو حسین ہو اور خطیب و مقرر ہو تو تمہاری خطابت و تقریر میں حسن ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ تمہاری آرزوئے حسن زندہ و حرکی اور آزاد و توانا ہو۔ اس کا اِحیاء و تزکیہ کرو اور کرتے رہا کرو۔ خیال رکھو: تمہاری آرزوئے حسن کہیں تمہاری نفسانی خواہشات تلے دب نہ جائے اور اسیرِ تلبیسِ ابلیس نہ ہو جائے، نیز تمہارا جمالیاتی ذوق بگڑ نہ جائے اور کہیں تم کور ذوق و حسن کور نہ بن جاؤ۔ یاد رکھو! ایسا شخص الحسن کی نظر میں اندھا، بہرا، گونگا اور چوپاؤں سے بد تر ہوتا ہے۔

۲۔باصرہ:

کیا تمہیں علم ہے کہ باصرہ بھی سامعہ کی طرح اپنے الٰہ۔الحسن کی محبت میں مبتلا ہے اور اس کی طلب و جستجو میں رہتی ہے؟ نہیں، تم اس حقیقت سے بھی نابلد ہو، اسی لیے شاہدِ "دوست" نہیں بنے اور لذتِ "دیدِ دوست" سے آشنا نہ ہوئے۔ لذتِ دیدِ "دوست" سے آشنا ہوتے تو احسان و رضوان کے حسن المقام پر متمکن ہونے کی آرزو و جستجو اور سعی و جہد کرتے؛ تمہارا علم و ہنر، مال و دولت، فکر و نظر، قلم و زبان، آل اولاد، حیات و ممات، الغرض سب کچھ "دوست" کے لیے ہوتا۔ الغرض تم جو کچھ

کرتے اسی کی رضا کے لیے کرتے اور وہ ہر وقت تمہاری فکر و نظر میں ہوتا۔ یاد رکھو! جو اس کا شاہد و ذاکر ہوتا ہے اس کا منظورِ نظر بھی ہوتا ہے۔ "دوست" کا منظورِ نظر بننے کی آرزو ہے تو اس سے شاہد و ذاکر بنو اور مقامِ شاہدیت پر متمکن ہونے کی مساعیِ جمیلہ کرو، دیکھنا سیکھو، اپنے اندر حسنِ نظر اور شوقِ نظر پیدا کرو۔ اس کے بغیر بات نہیں بنتی۔

یہ سچ ہے کہ نظر خوب سے خوب تر کی طلب و جستجو میں رہتی ہے، اسی طرح یہ بھی سچ ہے کہ اُسے دراصل اپنے اِلٰہ۔ الحُسن کے تازہ بتازہ اور نو بنو جلوے کی آرزو و جستجو ہوتی ہے، اگرچہ یہ بھی سچ ہے کہ ہر حسین چیز جمالیاتی ذوق کی تسکین کرتی، جمالیاتی حظ و سرور دیتی اور قرۃ العین ہوتی ہے۔

"دوست" الظاہر بھی ہے اور الباطن بھی۔ وہ آفاق و انفس کے بے قیاس و بے شمار عالموں میں ہر آن اپنا تازہ بتازہ اور نو بنو جلوۂ حسن پیدا کرتا رہتا ہے اور اسی میں اس کی جمالیاتی تخلیقی فعلیت کا راز مضمر ہے۔ کبھی تم نے اپنا معروضِ حسن و عشق دیکھا ہے؟ دیکھتے کیا؟ تم نے اسے دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ تم کوشش کیا کرتے؟ تم نے تو اپنی آرزوئے حسن کو اپنی نفسانی خواہشات کے بارِ گراں کے نیچے اس طرح دبا دیا، جیسے کوئی دانۂ روئیدہ کو سنگِ گراں کے نیچے دبا دے۔ تمہاری آرزو تو شیطان کے دامِ خوشنما و نظر فریب کی اسیر ہے اور یہ تمہاری حسن کورِی و کور ذوقی کا ایک بنیادی سبب ہے۔

سمع کی طرح نظر بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتِ عظمیٰ اور امانت ہے۔ اس نعمت سے بھرپور استفادہ و تمتع کرو، لیکن احسن طریقے سے، اور اس کی حفاظت و صیانت بھی تمہاری ذمے داری ہے۔ اس میں خیانت نہ کرنا، ورنہ ذوق و حسنِ نظر سے محروم ہو جاؤ گے اور یہ بہت بڑی محرومی ہے۔ یہ ایسا خسارہ ہے جس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ یاد رکھو! جو شخص حسن کور و کور ذوق ہو، وہ حقیقی عالم و حکیم ہو سکتا ہے نہ سچا ادیب و فنکار۔ وہ کبھی صالح، شہید یا صدیق نہیں ہو سکتا۔

سنو! نظر بھی سامعہ کی طرح ذریعۂ علم و حکمت ہے؛ اور علم میں کائنات کو مسخر کرنے کی قوت (= سلطان) مضمر ہے اور حکمت خیرِ کثیر ہے۔

باصرہ یا ظاہری آنکھ کی طرح قلب کی آنکھ بھی ہوتی ہے۔ یہ روشن ہو اور حسنِ نظر کے ساتھ ذوق و شوقِ

نظر بھی ہو تو "دیدِ دوست" میسر آسکتی ہے ورنہ نہیں۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ چشمِ قلب کا نور سیارتقائی ہے اور اس میں اِرتقا کے لامتناہی امکانات ہیں؛ نیز یہ نور درجہ بدرجہ اِرتقا کرتا ہے، اور ہر درجۂ ارتقار کو کمال و اِتمام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے کمال اپنے نقطۂ متناہیت پر نہیں بلکہ کمالِ نور کے نقطۂ آغاز پہ دلالت کرتا ہے۔ اہلِ نظر بنتا ہے تو اپنے نور کی تکمیل کے لیے مسلسل سعی و جہد کرتے رہو اور اپنے ربِّ رحمٰن و رحیم سے یہ دعا مانگتے رہا کرو: رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا، اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (التحریم ۶۶: ۸): اے نشو و اِرتقاد دینے والے آقا! ہمارے نور کی ہمارے لیے تکمیل کر دے؛ اور ہمیں (گناہوں سے) محفوظ رکھیو، تو بلاشبہ ہر چیز پہ قدرت رکھنے والا ہے۔ نورِ چشمِ قلب راہ و منزل کو دیکھنے اور پہچاننے کے لیے ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر انسان کا گمراہ ہو جانا یقینی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کی بدولت ہی انسان اپنے حریفِ پیدائشی شیطان کی جمالیاتی فریب کاریوں اور جعلسازیوں کو دیکھ اور پہچان سکتا اور ان سے بچ سکتا ہے، اور ان سے بچنا گویا عذابُ النّار سے بچنا ہے۔ دل کو آگ لگ جائے تو اُسے کون بُجھا سکتا ہے، بجز رحمتِ الٰہی کے؟ چشمِ قلب کا نور ماورائی مشاہدات کے لیے ناگزیر ہے۔ اپنی باطنی آنکھ کھولو! ذوق و شوقِ دید اور حسنِ نظر پیدا کرو اور اپنے نور کی نشو و نما اور تکمیل کرو؛ پھر اس جہان سے ماوراء "دوست" کے عالمِ حسن و مصر اور دیگر عوالم کا مشاہدہ کرو اور جمالیاتی ثروت سے اپنا دامنِ زندگی بھر لو۔ یہ بات ذہن نشین کر لو کہ جس طرح "سلطان" کے ذریعے تسخیرِ کائنات ممکن ہے اسی طرح "جلالِ بصیرت"[۹] سے لامکان کی تسخیر ممکن ہے۔ جلالِ بصیرت" سے نورِ چشمِ قلب کی قوّتِ تسخیر مراد ہے۔ اس سے قلوب کی تسخین بھی ممکن ہے، اور نفسیاتی انقلاب بھی لایا جا سکتا ہے، جسے تم تقدیر کا بدلنا اور فیضانِ نظر کہتے ہو۔

ایک بات اور یاد رکھو! تزکیۂ نفس سے جمالیاتی حس زندہ و فعّال ہوتی ہے اور اس سے باصرہ میں ذوقِ نظر اور شوقِ حسن پیدا ہوتا ہے؛ انسان پہلے "مقامِ مشہودیت" پہ فائز ہوتا ہے اور پھر اپنے نورِ چشمِ قلب کے اِرتقاد و کمال، آرزوئے حسن اور "دیدِ دوست" کی طلب و جستجو کی بدولت، نیز بفضلِ الٰہی "مقامِ شاہدیت" پہ متمکن ہو جاتا ہے۔ نورِ باطنی ارتقاد اور درجہ بدرجہ اپنی تکمیل کرتا ہے تو

"دوست" اپنے شاہد و پرستار کے درجات بلند سے بلند تر کرتا جاتا ہے اور آخرِ کار اُسے عبدیت کے اس ارفع و احسن مقام پر متمکن کر دیتا ہے، جو اس کی ہم نظری و ہمکلامی، قُرب و حضوری اور لقاء و ہم رضائی کا حُسن المقام ہے، جسے تم مقامِ احسان و رضوان سے تعبیر کر سکتے ہو۔ یہ تمکن ہی کمال و فوزِ عظیم ہے۔ یہی مقصودِ حیاتِ انسانی، غایتِ دینِ اسلام اور مشیّتِ "دوست" ہے۔

سنو! گوشِ حق نیوش اور دیدۂ عبرت نگاہ ہوں تو انسان مومن و صالح، موحّد و متّقی، صادق و امین اور اہلِ درد و صاحبِ حُسن و سُرور بنتا ہے۔ یاد رکھو! اقوام ہوں یا افراد جو زندگی کے ہنگاموں کو نہیں دیکھتے جس طرح دیکھنے کا حق ہے اور ان سے عبرت حاصل نہیں کرتے جس طرح عبرت حاصل کرنے کا حق ہے تو پھر زمانہ ان سے عبرت حاصل کرتا ہے اور وہ اہلِ دنیا کے لیے عبرت کا سامان بن جاتے ہیں۔

اس زندگی میں آنکھیں کھولو۔ "دوست" اور اس کی حسین و دلکش تخلیقات کا حُسن دیکھو اور اس کے جمالیاتی مشاہدے سے جمالیاتی طمانیت و مسرّت اور سرور و سوز حاصل کرو۔ یاد رکھو: جو شخص اس زندگی میں آنکھیں نہیں کھولتا، اس کی آنکھیں موت کھولتی ہے، اُسے اس کے ایمان بالباطل، ظُلم و جہل، کُفر و شرک اور جرم و گناہ کے بھیانک نتائج اور جہنم میں اس کا شرّ المآب دکھانے کے لیے۔ تمہاری نظر عذابِ جہنم کے روح فرسا و زہرہ گداز نظّارہ و منظر کی حریف نہ ہو سکے گی۔ دیکھو گے تو پچھتاؤ گے کہ تم نے کیوں اس زندگی میں آنکھیں نہ کھولیں اور کیوں زمانے کو دیدۂ عبرت نگاہ سے نہ دیکھا اور سبق حاصل نہ کیا۔ غور سے سنو! دیکھو گے تو مادّی و روحانی اور دُنیوی و اُخروی ہر لحاظ سے فائدے میں رہو گے اور کامیاب و بامراد ہو گے۔ دیکھو گے نہیں تو خسارے میں رہو گے۔ زیاں کار و اہلِ نار بنو گے اور ناکام و نامراد رہو گے۔

لیکن دیکھو گے تو اپنے اِلٰہ و ربّ کے منظورِ نظر اور زمانے کے محبوب بنو گے۔ سنو! کائنات کی ہر چیز میں اس کے خواص و صفات یا اسم اور تقدیر مرقوم ہوتی ہے، اور اس میں اس کی تسخیر کا راز پنہاں ہوتا ہے۔ ان اسماء کو پڑھو اور اشیائے کائنات کو مسخر کرو اور ان سے سب حسبِ ضرورت اور

اور عدل واحسان کے اصولِ قرآنی کے مطابق استفادہ و تمتع کرو۔ اپنے نفس کو بھی دیکھو اور اس کی لوحِ اسم وتقدیر بھی پڑھو! اُسے اپنا مطیع ومنقاد بناؤ تاکہ شیطان کی وسوسہ اندازیوں اور جمالیاتی فریب کاریوں کے شر سے محفوظ رہ سکو۔

حسنِ دنیا دیکھنے کی چیز ہے۔ اسے بار بار دیکھو، اور ہر رنگ میں دیکھو، اور اس کے جمالیاتی مشاہدہ بالحق سے جمالیاتی سرور وسوز حاصل کرو۔ لیکن حسنِ "دوست" بے مثل و بے عدیل اور سب سے زیادہ قابلِ دید ہے۔ دیکھو گے تو دیکھتے رہ جاؤ گے۔ اس کی دید رحیقِ مختوم ہے، جس کے نشے میں لذت وحلاوت اور کیف وسرور تو ہے، خمار نہیں ہے۔ الحسن کو دیکھو گے تو جمالیاتی ثروت کا خزانہ پاؤ گے، جس کے عوض تمہیں فردوسِ بریں میں اپنے اِلٰہ ورب کی دید ولقاء، ہم نظری وہمکلامی اور حضوری ورضوان کی بیمثال نعمتِ عظمٰی ملے گی۔ تم صاحبِ ارادہ واختیار ہو، فیصلہ کرنا تمہارا کام ہے کہ تم نعمتِ عظمٰی وابدی حاصل کرنا چاہتے ہو یا عذابِ اکبر ومقیم۔ تم صاحبِ عقل ہو، عقل سے کام لو اور دیکھنا سیکھو! "دوست" اور اس کی مخلوقات کا جمالیاتی مشاہدہ بالحق کرو اور اہلِ ذوق نظر بن جاؤ۔

تم نے غور کیا کہ کیوں تم ذرّے کو ہمیشہ حقیر وناچیز سمجھتے رہے ہو؟ اس لیے کہ تم نے کبھی اس کے اندر جھانکنے اور اس کی لوحِ اسم وتقدیر پڑھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ تم سے یہ حقیقت مستور رہی کہ ذرّہ جوہری توانائی کا خزینہ ہے، جس سے تعمیر وتخریب کے ہزاروں کام لیے جاسکتے ہیں۔ اب تم نے ذرّے کا جگر چیرا اور اس کی لوحِ اسم وتقدیر پڑھی تو تم پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ اس میں تسخیرِ کائنات، تعمیرِ جہانِ نو اور تخریبِ کائنات کی قیامت خیز توانائی مضمر ہے۔ جن اقوام نے اپنے مشاہدہ وتجربے سے اس حقیقت کا سراغ لگایا اور توانائی حاصل کر لی وہ اہلِ سُلطان" بن گئیں، اور اقوامِ عالم کی قیادت وتقدیر ان کے ہاتھ آگئی۔

ابھی تم نے صرف ذرّے کا باطن دیکھا ہے اور وہ کچھ حاصل کیا ہے جس کی بدولت اجرامِ فلکی پر کمندیں ڈال رہے ہو۔ ابھی تم نے بہت کچھ دیکھنا ہے۔ ربِّ جلیل کی تخلیقات بے شمار

ہیں۔ جلدی کرو تاکہ پیچھے نہ رہ جاؤ۔ جو کوئی کسی کی پیروی و تقلید کرتا ہے، ہمیشہ اس سے پیچھے ہی رہتا ہے۔ آگے بڑھو اور ہر چیز کا مشاہدہ بالحق کرو، اس کی لوحِ اسم و تقدیر پڑھو، اور اس میں مضمر قوت و توانائی کے خزینوں کا سراغ لگاؤ اور ان کو تسخیرِ کائنات کے کام میں لاؤ، اور "اربابِ سلطان" بن جاؤ۔ اربابِ سلطان ہی کو قوموں کی قیادت ملتی ہے۔ اس کے ساتھ "اہلِ جلالِ بصیرت" بھی بنو کہ اس سے تم اس عالمِ زمان و مکان سے ورا عالمِ حسنُ الدّہر میں پہنچ سکتے ہو جو تمہارے معروضِ حسن و عشق ربِّ جلیل کا عالم ہے، اور یہاں پہنچنے والے اپنے بندوں کو وہ اپنے فضل سے احسان و رضوان کے حُسن المقام پر متمکن کر دیتا ہے۔ یہی تمہاری اور تمہارے الٰہ و ربّ کی آرزو اور غایتِ دین ہے۔ یہ کتنی حسین آرزو اور غایت ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جمالیاتی مشاہدے اور تحصیلِ علم و فن (بشمول سائنس و ٹیکنالوجی) میں سامعہ و باصرہ ہی اہم ترین کردار ادا کرتے ہیں اور اسی لیے علمائے جمالیات بالخصوص (غالباً قرآنِ حکیم کے تتبع میں) فقط انہیں سے بحث کرتے اور بقیّہ حواس سے صرفِ نظر کرتے ہیں، لیکن میں تمہاری معلومات میں اضافے کی خاطر بقیّہ حواس سے متعلق بھی چند اہم باتیں بتاتا ہوں۔

۳۔ ذائقہ :

تم نے کبھی اس حقیقت پر غور کیا کہ ایک طرف اللہ تعالیٰ نے اشیائے کائنات کو حسنِ صورت عطا کیا تو دوسری جانب انسان کو جمالیاتی حِس اور ذوقِ سمع و بصر ودیعت کر دیا۔ اسی طرح اُس نے ان اشیاء کو لذت و تاثیر اور انسان کو قوّتِ ذائقہ ودیعت کر دی۔ کیوں؟ اس لیے کہ تم اپنے ربِّ رحیم و کریم کی نعمتوں سے لذّت و حظ حاصل کرو اور تمتّع و استفادہ کرو، پھر اس کا شکر کرو جیسا کہ شکر کرنے کا حق ہے۔ جانتے ہو شکریہ ادا کرنے کا مطلب کیا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم دل و جان سے اس کے فضل و کرم اور احسان و امتنان کا احساس کرو اور اس کے لیے اپنا قلب جذباتِ تشکّر و ممنونیّت سے معمور رکھو اور اس کا اظہار اس کے حضور عجز و انکسار اور

محبت و عقیدت کے ساتھ کرو اور ہمیشہ کرتے رہو۔ دوسرے ان نعمتوں سے خود بھی تمتع کرو اور دوسروں کو بھی ان سے استفادہ و تمتع کرنے کے مواقع فراہم کرو اور انھیں ان نعمتوں سے محروم کرنے یا رکھنے کی بالواسطہ یا بلاواسطہ کوشش نہ کرو، کیونکہ ایسا کرنا کفرانِ نعمت ہے اور یہ ظلم و جرم اور گناہِ کبیرہ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ایسا کرنا نہ صرف سنتِ پیغمبرؐ و رحمۃ للعالمینؐ کی ضد و نقیض ہے، بلکہ یہ فرعونی و قارونی اور آزری و ہامانی ہے۔

کیا تمھیں اس حقیقت کا احساس و شعور ہے کہ تمہارے حاسۂ ذائقہ کو صرف لذت و حظ کی نہیں بلکہ حُسنِ لذت و حظ کی آرزو رہتی ہے؟ حسین اشیاء کی پہچان اور ان کی ما بہ الامتیاز خصوصیت یہ ہے کہ وہ صوری و معنوی طور سے طیّب و مطہر، جمیل و جلیل یا خوشگوار و نظر افروز ہوتی ہیں؛ لہٰذا ایک تو وہ جسمانی و معنوی طور پر صحت بخش و جان پرور اور مقوّی ہوتی ہیں، دوسرے مفرّح و خوشگوار اور لذیذ ہوتی ہیں۔ تمہاری طبیعت کا تقاضا اور ذائقہ کی آرزو یہ ہے کہ تم ہمیشہ حسین و طیب چیزیں کھاؤ اور پیو۔ تم طبعاً جانتے اور پہچانتے ہو کہ طیّب و حسین چیزیں کون سی ہیں اور قبیح و خبیث کون سی؟ علاوہ بریں، تمہاری جمالیاتی حس اور حسِ ذائقہ طیّب و خبیث میں تمیز کر سکتی ہیں۔ لیکن اگر تمہارا نظامِ ذائقہ بگڑ گیا ہو یا تم حُسن کور و ذوق ہو گئے ہو تو تم طیّب و خبیث میں تمیز کرنے میں دھوکا بھی کھا سکتے ہو۔ علاوہ بریں، معاشرتی روایت و عادتِ قبیحہ کے باعث، نیز شیطان کی وسوسہ اندازی و جمالیاتی فریب کاری کے سبب خبیث کو طیّب بھی سمجھ سکتے ہو، لہٰذا اس صورت میں بالخصوص تمھیں اللہ تعالیٰ کے زندہ محفوظ کلام "الفرقان" کے اوامر و نواہی پر کاملاً بھروسہ کرنا چاہیے۔ تقوے کا تقاضا یہ ہے کہ احوال و ظروف خواہ کچھ ہوں، تمھیں بہر صورت "الفرقان" سے معلوم کرنا چاہیے کہ طیب و حلال چیزیں کون سی ہیں اور خبیث و حرام کون سی؟ اس سلسلے میں محسنِ اعظم، صاحبِ جمال و جلال اور اللہ تعالیٰ کے آخری سچے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا اُسوۂ حسنہ بھی تمہاری بہترین رہنمائی کر سکتا ہے۔ علاوہ ازیں اپنے اندر کے "فرقان" سے بھی کام لو، جو ربِّ رحیم نے تمھیں ودیعت کیا ہے۔

اس اصل الاصول کو ہمیشہ یاد اور پیشِ نظر رکھو کہ شریعت کی رُو سے طیّب چیزیں حلال اور خبیث

چیزیں حرام ہیں، اور حرام انسان کی خودی کو سنگدر سرشت یا اہلِ نار بناتی ہے۔ آگ کے عذاب اور محرومیِ جاوید سے بچنا اور اہلِ حُسن و سرور بننا چاہتے ہو تو حلال و طیّب کھاؤ؛ خبیث و نجس اور حرام نہ کھاؤ نہ پیؤ اور ان سے پرہیز اور احتراز کرو۔ مردار نہ کھاؤ کہ اس سے قلب مردہ ہوتا ہے اور درندگی پیدا ہوتی ہے خنزیر و سگ، حشرات الارض اور درندے کھاؤ گے تو تم میں بھی ان کی طرح کے خصائص پیدا ہو جائیں گے مسکرات کھاؤ اور پیؤ گے تو اپنی جسمانی و روحانی صحت کو نقصان گے۔ پیٹ بھرے رکھو گے تو معدے کے ساتھ عقل کا نظام کا بھی بگڑ جائے گا۔ عقل کو سلیم و فعّال رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ کم کھاؤ اور پیٹ کو خالی بھی رکھو۔ طیّب غذا کھانے میں بھی اعتدال تندرستی اور صحتِ قلب و نفس کے لیے سُود مند ہے۔

یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مُسکرات یا منشّیات شرعاً خبیث و حرام ہیں، اور ان سے پرہیز و احتراز فرض ہے۔ یاد رکھو! جو چیز، ماکولات سے ہو یا مشروبات سے، انسان کو اس کی ذات اور اس کے اِلٰہ و رب سے غافل کر دے، وہ نجس و خبیث اور شرِّ کثیر ہے، اس لیے شرعاً حرام ہے۔ علاوہ بریں، نشۂ مسکرات سے انسان کے حسّی۔ قلبی۔ نفسی نظام میں فساد پیدا ہوتا ہے۔ اس کے دو بنیادی اسباب ہیں۔ اوّلاً، اس سے اس کے جمالیاتی باطنی نظام کی مدّبر و منتظم عقل ایک تو سلیم نہیں رہتی اور دوسرے ماؤف ہو جاتی ہے، لہٰذا وہ اپنا وظیفہ احسن طریق سے سرانجام نہیں دے پاتی۔ ثانیاً، نشۂ مُسکرات سے ایک تو نفسِ لوّامہ اور ضمیر دونوں مضمحل و ناتوان ہو تے جاتے ہیں اور اس کے نتیجے میں اُن کی آواز بے اثر ہوتی جاتی ہے؛ دوسرے نفسِ امّارہ حالتِ نشہ میں بہک کر سرکش و بیباک ہو جاتا ہے۔ نفسِ حیوانی کی رعایت سے لذّتِ جنسی کے بعد لذّتِ شُرب و اکل شدید ترین ہے۔ وجہ یہ ہے کہ لذّتِ جنسی میں تولید و تناسل کا اور لذّتِ شُرب و اکل میں مولودہ نسل کی نشوونما اور ارتقا کا راز مضمر ہے، لہٰذا دونوں کی غیر معمولی اہمیّت سے متعلق دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ اگر ان دونوں کو زندگی کے حسین و قبیح ہنگاموں کے بنیادی محرّکات و عوامل میں شمار کریں تو بیجا نہ ہو گا۔ حسین ہنگامے مودّت و شفقت، ہمدردی و غمگساری، ایثار و قربانی، عدل و احسان جنہ و خیر

خیرات وصدقات اور انفاق بالعفو ایسے اعمالِ حسنہ اور ان کے مظاہر پہ دلالت کرتے ہیں بخلاف اس کے قبیح ہنگاموں کا مطلب ہے، حسد وبغض، رقابت وعداوت، قساوت وشقاوت، بُخل وتکاثر، ظلم واستحصال، جرم وگناہ، جبر وتشدد، فحشا ومُنکر، حرام کاری وحرام خوری، عصمت فروشی وضمیر فروشی ایسے قبیح اعمال اور ان کی گرم بازاری۔

سنو! تمہیں اپنے حُسنِ خُلق وعمل سے حسین ہنگاموں میں بھرپور حصّہ لینا چاہیئے اور قبیح ہنگاموں سے نہ صرف محترز رہنا، بلکہ ان کی آگ بجھانے کی خاطر زبان وقلم، اثر ونفوذ اور جان ومال سے باہم مل کر سعی وجہد کرنی چاہیے۔ یاد رکھو! لذت حقیقت میں وہ ہے جس میں تاثیرِ حُسن ہو۔ جانتے ہو تاثیرِ حُسن کیا ہے؟ یہ طمانیت وحیات اور نور وسرور کی جمالیاتی ٹھنڈک ہے۔ ایسی لذت طیب وحسین اور اور حلال چیزوں سے ملتی ہے۔ حُسن کا ثمرہ اگر جمالیاتی ٹھنڈک اور جمالیاتی ثروت ہے تو قُبح کا حاصل خوف وغم اور کرب والم کی آگ کا عذاب ہے۔ اب انتخاب تم نے کرنا ہے اور اس کی ذمے داری تمہاری ہے، کیونکہ تم صاحبِ ارادہ واختیار ہو تمہیں انتخاب کی آزادی ہے۔ پھر تم صاحبِ عقل وشعور بھی ہو، فکر ونظر، جمالیاتی حسّ وذوق، ضمیر ونفسِ لوامہ اور قوتِ ذائقہ وحافظہ بھی رکھتے ہو۔ انتخاب کی آزادی تمہارے ربِّ جلیل واِلٰہِ جمیل کی امانت ہے۔ اس امانت میں خیانت نہ کرنا، کروگے تو پچھتاؤگے اور اپنی آگ میں جلوگے۔ اس آگ کو جمالیاتی ٹھنڈک ہی بجھاسکتی ہے، یعنی حُسنِ توبہ وانابت، حُسنِ الحاح وزاری اور حُسنِ فکر وعمل کی جمالیاتی ٹھنڈک۔ احوال وظروف کیسے ہی ہوں، تمہیں یہ حقیقت یاد رکھنی چاہیے کہ تمہارے نظامِ زندگی کی ایک ایک چیز کو آرزوئے حُسن ہے اور اس کی تشفی کرنا تمہاری ذمے داری ہے۔ اس ذمے داری سے عہدہ برآ نہ ہوگے تو گھاٹے میں رہوگے۔

اس میں شک نہیں کہ جمالیاتی مشاہدے اور تحصیلِ علم وفن میں ذائقے کے کردار کی اہمیت سامعہ وباصرہ سے بہت کم ہے، پھر بھی یہ قابلِ ذکر اور ربِّ کریم کی گراں قدر نعمت ہے۔ طِبّ وادویّہ سازی میں اس کی اہمیت سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا۔ علاوہ بریں، غذا کو مرغوب وخوشگوار

اور لذت آفرین و زود ہضم بنانے میں ذائقے کی اہمیت سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ بچہ ماں کی چھاتی کا دودھ پینے میں از بس لذت و حظ محسوس کرتا اور اس کا فطری طور سے ذوق و شوق رکھتا ہے؛ اس کی بڑی وجہ ذائقۂ سینۂ مادر ہے۔ یاد رکھو! جو مائیں بیماری یا کسی ناگزیر وجہ کے بغیر محض فیشن کے طور سے یا اپنے آرام کی خاطر اپنے بچوں کو اپنے دودھ اور ذائقۂ سینہ سے محروم رکھتی ہیں، وہ ان سے انصاف نہیں کرتیں، بلکہ ان پر ظلم کرتی ہیں اور اس کے لیے انہیں عدالتِ ربّی میں جوابدہ ہونا پڑے گا۔

سامعہ، باصرہ اور ذائقہ کی طرح شامّہ بھی جمالیاتی حسّی نظام کا جزو ہے اور جمالیاتی مشاہدے میں اس کی حیثیت اس سے کہیں زیادہ ہے جو عام طور سے سمجھی جاتی ہے۔ اب میں اس سے کلام کروں گا۔

۴۔ شامّہ:

تم نے کبھی غور کیا اور دیکھا ہے کہ ربِّ ذُوالجلال والاکرام نے تمہاری دنیا کو تمہارے لیے عالمِ رنگ و بو بنایا ہے۔ ہر چیز رنگ و صورت کی طرح بو باس بھی رکھتی ہے، جس کے مشاہدے کے لیے اس نے تمہیں دیگر حسّی نظاموں کی طرح ایک حیرت انگیز نظام ودیعت کیا ہے، جسے شامّہ سے تعبیر کرتے ہو، اور یہ نظام بھی دیگر نظاموں کی طرح حسن کی آرزو رکھتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، شامّہ کو حُسنِ شمیمہ یا خوشبو کی طلب و جستجو ہوتی ہے۔ خوشبو سے اس کے ذوقِ شمیم کی تسکین بھی ہوتی ہے اور کیفِ روح پرور اور سرورِ جانفزا بھی ملتا ہے۔ خوشبو شامّہ کی معروضِ حُسن و محبّت ہے۔ وجہ یہ ہے کہ خوشبو تمہارے اِلٰہ۔ الحُسن کی طیبِ نَفَس ہے، اسی لیے فرحت انگیز و راحت افزا، سرور انگیز و جانفزا اور کیف پرور سحر انگیز ہوتی ہے۔ شمیمِ چمن ہو یا نسیمِ کوہ و صحرا، نکہتِ بادِ بہاری ہو یا بوئے گُل و لالہ، بوئے مشک و عنبر ہو یا بوئے اثمار و فواکہات سب میں شامّہ "نَفَسِ دوست" ہوتی ہے، جو اس کی یاد دلاتی ہے۔ تم

دیکھتے نہیں، سنتے نہیں سوچتے نہیں، ورنہ ہر جلوۂ حسن تمہیں تمہارے معروضِ حسن وعشق کی یاد دلاتا اور اس کا پیام دیتا ہے۔ انسان ہی بہرا، اندھا، گونگا، غافل ومتکبر اور بے حس وبے شعور بن جائے تو اس کا کیا علاج؟ اس سے پہلے کہ تمہارا مرض، مرضِ لادوا بنے اور اور تم اس کا مداوا بھی نہ کرسکو، حسنِ "دوست" کا ہر رنگ میں مشاہدہ کرو اور اس کا پیامِ محبت ورحمت سنو اور سمجھو اور اس کے حضور نذرانۂ دل وجان پیش کرو۔

سنو! حسن کی طرح قبح کی بھی بو باس ہوتی ہے، لیکن تاثیرِ قبح کے باعث اس میں تعفن ہوتا ہے، جو انسان کو کور ذوق وحسن کور بنا دیتا ہے۔ قبح ہر رنگ میں غارت گرِ حسن اور رہزنِ نور ہوتا ہے، لہٰذا وہ حواس وقلب کے حسن ونور کو سلب کرلیتا ہے۔ نور و رنگ حسن ہی کی صفات ہیں۔ حسن میں نور ہوتا ہے، جس طرح بدن میں روح ہوتی ہے، اور نور ہی قوت وتوانائی کا مخزن اور محسوس ونامحسوس کے مشاہدے کا ذریعہ ہے۔ حواس وقلب اپنے نورِ حسن ہی کی بدولت جمالیاتی مشاہدہ کرتے ہیں۔ الحسن کی ہر تخلیق میں نورِ حسن ہوتا ہے، جو اس کی روحِ حیات ہے اور اسی کے ذریعے وہ اپنے اِلٰہ یا معروضِ حسن وعشق کے جلوۂ حسن کا مشاہدہ کرتی اور اس کی حمد وثنا کی تسبیح و تہلیل اور تمجید وتقدیس کرتی ہے۔

اپنے معبود ومحبوب اور مطلوب ومقصود کے شاہد ومنظورِ نظر اور دوست ومحبوب بننا چاہتے ہو تو حسنِ یقین وعمل سے اپنے حسی، قلبی، نفسی نظام میں اپنے نورِ حسن کا نشو وارتقا کرو اور اس کی تکمیل مسلسل کرتے رہو۔ پھر جلوۂ "دوست" دیکھو اور ہر رنگ میں دیکھو کہ یہ دیکھنے اور بار بار دیکھنے کی چیز ہے۔

خوشبو سے متعلق ایک اور پتے کی بات سنو اور عمل کرو۔ خوشبو سونگھا اور لگایا کرو۔ اس سے تغذیۂ روح ہوتا ہے اور اسے فرحت و راحت اور کیف وسرور ملتا ہے۔ علاوہ بریں اس سے ذوق میں لطافت ونظافت پیدا ہوتی ہے۔ خوشبو طرح طرح کی لگایا اور سونگھا کرو۔ اس سے جمالیاتی ذوق اور فکر وتخیل میں لطافت ونظافت کے ساتھ بوقلمونی و وسعت پیدا ہوتی ہے،

اور جمالیاتی و جنسی جذبات و احساسات کو تحریک ہوتی ہے ؛ نیز اس سے اشیاء کی دلکشی و جاذبیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ خوشبو سے حسی قلبی نظام کا نورِ حسن تیز ہوتا ہے، جس کی بدولت انسان میں مختلف رنگوں اور سُروں میں امتیاز کرنے کی قوّت فعّال ہو جاتی ہے، علاوہ بریں، اس سے انسان کی قوّتِ فرقان فعّال و حرکی بنتی ہے۔ بشرطیکہ باطنی و خارجی ماحول مطہر و طیّب ہو۔

یاد رکھو! تم پر حقوقُ اللہ اور حقوقُ العباد کی طرح حقوقُ النفس بھی ہیں، جنہیں ادا کرنا بھی تم پر لازم ہے۔ تمہارے نفس کے ایک ایک جُزو کو حُسن کی آرزو ہے، جسے پورا کرنا تم پر واجب ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ تمہاری فطرت کا تقاضا، دین کا مقصود اور "دوست" کی مشیّت ہے۔

۵- لامِسہ :

تُم نے کبھی غور کیا کہ تمہارے جسم کے ایک ایک عضو و جارحہ، ایک ایک رگ و پے، ایک ایک جُزو و ریشہ اور خون کے ایک ایک قطرے اور ان میں اَن گنت خلیوں میں زندگی ہے؛ اس لیے تم کسی کو چھوتے ہو یا کوئی تمہیں چھوتا ہے تو تمہیں اس لمس کا احساس ہوتا ہے۔ یہ لمس خوشگوار و لذّت انگیز، راحت فزا و سُرور انگیز بھی ہوتا ہے اور ناگوار و خوفناک اور درد انگیز و غم آفرین بھی۔ اس احساسِ لمس کی قوّت کو تم لامسہ کہتے ہو۔ یہ بڑے کام کی چیز ہے۔ سمجھو تو یہ تمہارے ربِ ذوالجلال والاکرام کی نعمتِ عُظمیٰ ہے۔ لامِسہ بھی دیگر حواس کی طرح ایک زندہ و حسّاس عضو ہے اور اسے بھی آرزوئے حُسن ودیعت کی گئی ہے۔ ایک حکیمانہ نکتہ بتاتا ہوں، غور سے سنو اور حرزِ جان بنالو۔ لمس حسین ہو تو قرّۃ العین ہوتا ہے، اور قبیح ہو تو درد و کرب دیتا ہے۔ جنسی نوعیت کا لمسِ قبیح لذّت و حلاوت تو دیتا ہے، لیکن اس میں خوف و حزن کی ملونی ہوتی ہے۔

بدن کو چوٹ لگے، زخم آئے، کسی مرض میں مبتلا ہو کر بیمار و سقیم ہو جائے اور اُسے بخار آئے تو اس بیماری سے نجات حاصل کرنے کی خاطر تمہارا نفس چلاتا اور فریاد کرتا ہے، جسے تم

"درد" سے تعبیر کرتے ہو۔ یہ "درد" بڑی نعمت ہے۔ درد ہو تو تم اپنے مرض سے آگاہ ہوتے ہو اور اضطراری و شعوری طور پر اس سے نجات حاصل کرنے کی خاطر علاج کراتے ہو اور شفا پاتے ہو۔ درد نہ ہوتا تو تم بے خبری میں مارے جاتے۔

بیماری کو لمسِ شیطانی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جانتے ہو کیوں؟ لو سنو! بیماری صحت کی ضد و نقیض ہے اور صحت حسن کی ایک صورت ہے، لہٰذا بیماری قبح کی ایک صورت ہوئی۔ شیطان انسان کو جسمانی و نفسیاتی طور سے قبیح دیکھنے کی طلب و جستجو رکھتا ہے، لہٰذا اسے جسمانی و نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا کرنے کی سعی و جہد میں لگا رہتا ہے۔ وہ اپنی وسوسہ اندازی اور جمالیاتی فریب کاری سے اس کی نفسانی خواہشات کو اس کا اِلٰہ یعنی معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود یا تمہاری جمالیاتی اصطلاح میں معروضِ حسن و محبت بنا دیتا ہے، اور اس طرح اُسے شرک و بت پرستی، فحشاء و منکر، ظلم و عدوان اور جرم و گناہ کی ترغیب دیتا ہے؛ اس میں قبیح و مضرِ صحت عادات پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے او[illegible]سے حرام خوری و بسیار خوری اور منشیات اور نا و نوش کی ترغیب و تحریص دیتا ہے۔ الغرض، آدمی کی جسمانی و نفسیاتی صحت کو نقصان پہنچانے اور اسے ہر اعتبار سے مریض و سقیم بنانے کی خاطر شیطان اس کے جسم اور نفس پر مسلسل حملے کرتا رہتا ہے، اس کے اس کامیاب حملے کو لمسِ شیطان کہتے ہیں۔

سنو! تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں: لمسِ شیطان ہی سے آدمی فرعون، ہامان، قارون اور آذر و نمرود بنتا ہے؛ ہر روپ میں وہ بظاہر ہوشیار و عیّار اور زیرک و دانشور ہوتا ہے، لیکن حقیقت میں باؤلا ہوتا ہے۔ یاد رکھو! دولت و طاقت اور شہرت و عزت کا نشہ لمسِ شیطان کی تاثیر سے آدمی کو باؤلا بنا دیتا ہے۔ ہر متکبّر و سرکش اور ظالم و مجرم باؤلا ہوتا ہے کیونکہ اس کا نفس لمسِ شیطان سے متاثر ہوتا ہے۔

شیطان کے جمالیاتی فریب کا دائرۂ کُل عالمِ انسانی کو محیط ہے۔ وہ چھوٹے بڑے فرعونوں، ہامانوں، قارونوں، آذروں اور نمرودوں کے ذریعے لوگوں کو ایسے حال و ماحول میں زندگی کرنے پر

مجبور کرتا اور قانع بناتا ہے جو نجس و ناپاک اور صحتِ جسمانی و نفسیاتی کے لیے مضر ہو۔ اس اعتبار سے بھی بیماری کی علتِ فاعلی لمسِ شیطان ہے چونکہ انسان طبعاً و عقلاً جانتا ہے کہ شیطان اس کا دشمن ہے اور اس کا لمس ہر حال میں مضرت رساں ہے۔ اس لیے وہ اس سے نفرت کرتا، خوف کھاتا اور گریزاں و ترساں رہتا ہے۔ چنانچہ جونہی لامسہ لمسِ شیطان کو محسوس کرتا ہے، انسان کو اس سے آگاہ و متنبہ کرنے کی خاطر روتا، چیختا اور فریاد کرتا ہے۔ افسوس ہے ابنِ آدم پر! وہ دردِ جسمانی محسوس کرتا ہے تو مضطرب و بیقرار ہو جاتا ہے اور بیماری سے جلد سے جلد نجات حاصل کرنے کی خاطر پرہیز کرتا اور علاج کراتا ہے، لیکن نفس کی بیماری اور اس کے درد و کرب کو خاطر ہی میں نہیں لاتا، لہٰذا اُسے نہ اس بیماری سے شفا پانے کی فکر ہوتی ہے اور نہ وہ علاج ہی کراتا اور نہ پرہیز ہی کرتا ہے۔

کبھی سوچا ہے تم کتنے ظالم و جاہل ہو؟ جسم کے سرطان سے تو تم خوف بداماں رہتے ہو۔ کسی کو یہ بیماری لاحق ہو جائے تو وہ خوف سے نیم جاں ہو جاتا ہے۔ اس موذی بیماری کا علاج دریافت کرنے کی خاطر ہزاروں ماہرینِ تحقیق و تجربے میں شب و روز مشغول رہتے ہیں اور اس پر تم اربوں روپے سالانہ خرچ کر رہے ہو، لیکن رُوح کے سرطان کی تم خبر ہی نہیں لیتے تمہیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ شرک روح کا سرطان ہے۔ جو جانتے بھی ہیں، مانتے نہیں۔ تمہارے ظلم و جہل کی انتہا یہ ہے کہ تم شرک کو شرک اور روح کا سرطان ہی نہیں مانتے۔ شرک کرتے ہو اور مُشرک ہونے کے باوجود اپنے آپ کو توحید پرست کہتے ہو۔ عبادت غیر اللہ کی کرتے ہو؛ نذر و نیاز غیر اللہ کی دیتے ہو، حاجات و امداد کے لیے غیر اللہ کو پکارتے ہو، رزق اور مرادیں غیر اللہ سے مانگتے ہو؛ سجدے غیر اللہ کو کرتے ہو؛ حمد و ثنا اور اطاعت غیر اللہ کی کرتے ہو، الٰہ اپنی خواہشات کو بناتے ہو اور پھر کہتے ہو کہ تم مؤمن و موحّد ہو۔ سوچو! اگر یہ شرک نہیں تو پھر شرک کسے کہتے ہیں؟

یاد رکھو! موت کے بعد جہنم کی آگ میں جسم و نفس کا ہر مرض اپنے اپنے وقت پر دُور جائے گا، لیکن شرک روح کا سرطان ہے، جو جہنم کی آگ میں دیگر بیماریوں کی طرح بھسم ہونے کے بجائے

اور بڑھے گا۔ وجہ یہ ہے کہ یہ اصل کے اعتبار سے ناری مرض ہے جو آگ میں نشو و ارتقا کرتا ہے اور اس کے ساتھ اس کی اذیتیں افزوں ہوتی جاتی ہیں۔ اسی لیے قرآنِ مجید کا ارشاد ہے کہ فقط شرک ہی ناقابلِ معافی گناہ اور ظُلمِ عظیم ہے۔ یہ بظاہر جملہ معترضہ ہے، لیکن حقیقت میں ہمارے موضوعِ سخن کی روح ہے۔ یہ زندگی کا مفہوم اور اسلام کی رُوح ہے۔

بات یہ ہو رہی تھی کہ لامسہ کو بھی حُسن کی طلب و جستجو رہتی ہے، لیکن یہ نکتہ یاد رکھو کہ لمس حسین و طیّب یا شرعی زبان میں حلال و جائز ہونا چاہیے۔ لمس ایسا ہو تو اس سے جمالیاتی حظ و سُرور ملتا ہے اور یہ قُرّۃُ العین ہوتا ہے، ورنہ بصورتِ دیگر، اس سے لذّت و حلاوت تو ملتی ہے مگر اس میں نورِ طمانیت و مسرّت کی ٹھنڈک نہیں ہوتی بلکہ خوف و حزن کی آمیزش ہوتی ہے نظر کا لمس حسین یا شرعاً جائز و حلال ہو تو قُرّۃُ العین ہوتا ہے۔ جمالیاتی محبّت کا لمس حسین و محبّت آفرین ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے نفرت کی نظر کا لمس قبیح ہوتا ہے اور نفرت و عداوت پیدا کرتا ہے۔ محبت کی نظر سے دیکھو گے تو دنیا اور زندگی تمہیں حسین دکھائی دے گی۔ نفرت کی نظر سے دیکھو گے تو انہیں قبیح پاؤ گے۔ یاد رکھو! بات حُسن و محبّت سے بنتی ہے۔

سنو اور کان لگا کر سنو! تمہیں ایک راز کی بات بتاتا ہوں جو سِرِّ جمالِ کلام ہے۔ اسے روح میں جذب کر کے زندگی کرو گے تو ابدی و سرمدی اور دُنیوی و اُخروی حسنہ و خیر پاؤ گے؛ عزت و عظمت اور کامیابی و کامرانی پاؤ گے؛ خُلدِ بریں کی حیاتِ ابدی پاؤ گے؛ حُسن اور اس کا نورِ حرکی و ارتقائی پاؤ گے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنا ربّ ذوالجلال والاکرام اور الٰہِ جمیل و کریم پاؤ گے۔ تُم ہی بتاؤ، جسے یہ سب کچھ مل جائے اسے اور کیا چاہیے؟ بات یہ ہے کہ قرآنِ مجید ربّ العالمین کا کلام ہے جو رحمٰن و رحیم، علیم و حکیم، حیّ و قیوم، الحسن والحق اور قدوس و طاہر ہے، اس لیے یہ رحمت و ہدایت، نور و حُسن، زندہ و زندۂ جاوید، حسین و حق اور مُطہر و مقدّس ہے۔ لہٰذا اُسے وہی نظر و فکر چھو سکتی ہے، جو حسین و منور، زندہ و مُطہر اور سچّی ہو۔ اس کے لمس سے رُشد و ہدایت، علم و حکمت، حُسن و نُور، سُرور و سوز، حیات و قوّت، عزّت و قیادت، طمانیت و سکینت اور شفا ملتی ہے۔ کاش، انسان یہ حقیقت سمجھتا اور

اس پہ یقین کرتا اور قرآنِ مجید سے اس طرح جُٹ جاتا اور اُسے اس مضبوطی سے تھام لیتا کہ دُنیا کی کوئی طاقت، کوئی خواہش اور طمع و ترغیب اُسے اس سے جدا نہ کر سکتی۔ اس سے دل و جان سے رابطہ قائم رکھو۔ وہ تمہیں عالم و حکیم، صاحبِ جمال و جلال، صاحبِ حُسن و سُرور، امام الصالحین اور وارثِ جنّت بنا دے گا؛ نیز تمہیں احسان و رضوان کے حسَن المقام پہ متمکن کر دے گا۔ جنّت میں تم ایک ایسے عالمِ حُسن و سُرور میں زندگی کرو گے جس کا نور و سُرور ہمیشہ حالِ ارتقاء میں رہے گا۔

سنو! جسم کے ہر عضو و جارحہ کا لمس حسین یا شرعًا جائز ہونا چاہیے، کیونکہ صاحبِ حُسن و سُرور بننے کے لیے یہ ناگزیر ہے۔ ہر ناجائز لمس شیطان کی تحریک کا نتیجہ ہوتا ہے، اس لیے قبیح اور شرعًا ناجائز ہوتا ہے۔ یہ زنا کی ایک قسم ہے۔ اس سے آدمی اہلِ نار بنتا ہے۔ لہٰذا اس سے اس طرح گریزاں و ترساں رہو اور بچو جس طرح تم سانپ اور بچھو کے ڈسنے سے ڈرتے اور بچتے ہو۔

تمہارے لامسہ کو حُسن کی آرزو ہے جو لافانی و جاودانی ہے۔ موت کے بعد بھی تمہیں آرزوئے حُسنِ لمس رہے گی۔ یاد رکھو! اگر اس دُنیا میں یہ آرزو پوری کرتے رہو گے تو الحیوان میں بھی تم اپنی آرزوئے حُسن پوری کرو گے۔ اگر تمہارا لامسہ یہاں لمسِ حُسن کو ترستا رہے گا تو وہاں بھی تشنہ کام و نامراد ہی رہے گا۔ حُسن کے بغیر تم نور و سُرور سے محروم اور خوف و حزن کی آتشِ تاریک و سوزاں میں جلتے رہو گے۔ سب سے بڑی محرومی و نامرادی، جس کا احساس اس قدر روح فرسا و اذیت ناک ہوگا کہ تم اس وقت اس کا تصوّر تک نہیں کر سکتے، یہ ہوگی کہ تمہارا اِلٰہ یا معدنِ حُسن و عشق تم پہ نہ اپنا جلوہ پیدا کرے گا اور تُم سے کلام ہی کرے گا۔

میری گفتگو پہ غور کرو گے تو یقینًا تم اس نتیجے پہ پہنچو گے کہ تمہارے حواسِ خمسہ جو تمہارے قلب و نفس کے عوامل ہیں، تمہارے نظامِ زندگی میں دائمی و غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں؛ لہٰذا ایک تو اُنہیں شیطان کی جمالیاتی فریب کاریوں سے محفوظ رکھنے کی حتی المقدور سعی و جہد کرتے رہو، اور دوسرے ان کی آرزوئے حُسن کو ہمیشہ فعّال و حرکی رکھو۔ تیسرے ان کی آرزوئے حُسن کی تشفّی کرنے میں تساہُل و تغافُل روا رکھو نہ تجمّل و عدوان، بلکہ حُسنِ عمل میں جلدی کیا کرو۔ وجہ یہ ہے کہ تاخیر ہوئی تو ہو سکتا

ہے کہ شیطان اپنی وسوسہ اندازی سے تمہیں وہ کام نہ کرنے دے۔ یاد رکھو! حسنہ و خیر کے کاموں میں عجلت اور سیئہ و شر کے کاموں میں تاخیر اولیٰ ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ تاخیر و تامّل کے سبب تمہارا ضمیر اور نفسِ لوّامہ تمہیں بُرا کام کرنے سے باز رکھنے میں کامیاب ہوجائیں۔

نظامِ حسّی پر گفتگو تو اور بھی ہوسکتی ہے، لیکن اس وقت تمہارے فکر و عمل کے لیے اتنی ہی کافی ہے۔ ایک بات اور یاد رکھنے کے قابل ہے۔ علم بغیر عمل کے اس شجر کے مانند ہے جو بار آور ہونے کی استعداد رکھنے کے باوجود بے ثمر ہو۔ بے عمل عالم اس سپاہی کی طرح ہے جو رزم گاہ میں تیغ در نیام ہو؛ لہٰذا جو سنو اس پر عمل کرو۔

اب میں تمہیں ایک ایسے لطیفۂ غیبی سے متعلق کچھ بتاؤں گا، جو تمہارے زندگی میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ جانتے ہو وہ کیا چیز ہے؟ وہ قلب ہے، جو سلیم یا حسین ہو تو نفس کے سب نظام درست کار ہوتے ہیں۔ وہ سلیم یا حسین نہ رہے اور بگڑ جائے تو سب نظام بگڑ جاتے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی سلسلۂ کلام منقطع ہوگیا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرا چراغِ سامعہ بے نور ہوگیا اور رحیقِ علم و حکمت کا نشہ خمار میں بدل گیا۔ لیکن مجھے یاد ہے کہ میں اس عالمِ اضطراب میں بھی نوائے سروش پر غور و فکر کرتا رہا۔ وقت گزرتا گیا اور میری سوچ کا سفر جاری رہا۔ اتنے میں اور حُسنُ المقام آیا اور دفعتاً نغمۂ حُسن سے میری شمعِ سمع روشن ہوگئی اور آوازِ سروش مجھ سے مخاطب ہوئی۔

حواشی و تشریحات

۱۔ حسّی۔قلبی۔نفسی نظام :

اسے انگریزی میں System of sense-mind-soul سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ آخری تین الفاظ کے مابین خطِ عطف (—) اس امر کی علامت ہے کہ یہ تینوں نظام لاینفک طور سے مربوط و لاینفک ہیں اور تعامل و تفاعل ہی سے اپنے اپنے فطری وظائف سرانجام دے

سکتے ہیں۔

۲۔ تسبیح :

دیکھیے الاسراء ۱۷: ۴۴؛ النور ۲۴: ۴۱؛ الحشر ۵۹: ۲۴ و بمواضع کثیرہ۔

۳۔ چوپاؤں سے بدتر :

دیکھیے الاعراف ۷: ۱۷۹؛ الاسراء ۱۷: ۷۲؛ الفرقان ۲۵: ۴۴۔

۴۔ مقامِ شاہدیت :

یہ احسان کا ارفع و اعلیٰ حسنُ المقام ہے اور احسان دراصل اہلِ جذب و شوق کے لیے ان کے الٰہ کا مقامِ لقاء (Rendezvous of divine beloved) ہے۔ اس کے ابتدائی مدارج دو ہیں: پہلا درجہ مشہودیت کا ہے۔ اس مقام پر بندے کو پہلے حسنِ ظن، پھر حسنِ خیال و احساس اور بعدازاں حسنِ ایمان و اذعان ہوتا ہے کہ اس کا "دوست" (= الٰہ اور جمالیاتی اصطلاح میں معروضِ حسن و محبت) اسے دیکھ رہا ہے۔ اس سے ارفع و اعلیٰ درجہ شاہدیت کا ہے۔ اس حسنُ المقام پر متمکن ہونے سے پہلے اہلِ جذب و شوق کو پہلے حسنِ ظن، پھر حسنِ خیال اور پھر احساس ہوتا ہے کہ جیسے وہ اپنے الٰہ کو دیکھ رہا ہے۔ بعدازاں جب فیضانِ "دوست" سے اہلِ جذب و شوق کے نورِ حسن کی تکمیل ہو جائے تو "دوست" اسے اپنا شاہد بنا کر شاہدیت کے حسنُ المقام پر متمکن کر دیتا ہے، اور اُسے دیدِ "دوست" میسّر آجاتی ہے، اور "دوست" کی تصویر اس کے قلبِ منور پر اس طرح مرتسم ہو جاتی ہے کہ "جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی۔"

۵۔ خوب سے خوب تر کی جستجو :

اصل یہ ہے کہ انسان اس وقت سے خوب سے خوب تر کی طلب و جستجو میں ہے، جب وہ ابھی اپنے الٰہِ جمیل و ربِ رحیم کے عالمِ حسنِ ذات میں تھا؛ جہاں سے طلب و جستجو اُسے عالمِ ارواح میں لائی اور وہاں سے اس جہانِ حیات و ممات میں لاتی ہے۔ اس

طلب و جستجو کا عالم و محرّکِ حقیقی "دوست" کا مظہرِ نو بنو میں شیوۂ جلوہ آرائی ہے بالفاظِ دیگر الحُسن، جو انسان کا حقیقی معروضِ حُسن و عشق ہے "تازہ بتازہ اور نو بنو شان میں مسلسل اپنی نمود دکھاتا رہتا ہے۔ یہ فکر انگیز و بصیرت افروز حقیقت جس میں فلسفۂ حیات و کائنات مضمر ہے، قرآنِ حکیم نے اپنے معجز نما ایجازِ بلاغت سے پانچ الفاظ میں بیان کر دی ہے: كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِى شَأْنٍ ٥ (الرحمٰن ۵۵ : ۲۹)۔ اس سے مستنبط ہوا کہ خوب سے خوب تر کی جستجو دراصل حُسنِ "دوست" کے تازہ بتازہ اور نو بنو مظاہر کے جمالیاتی مشاہدے AESTHETIC EXPERIENCE کی آرزو و جستجو ہے۔

۶۔ الظاہر والباطن :

فلسفے کی زبان میں کہیں گے Reality is objective-subjective یعنی حقیقت معروضی، موضوعی ہے۔ چودہ سو برس پہلے کا یہ ارشادِ قرآنی کہ "هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ٥ (الحدید ۵۷ : ۳) وہ یعنی اللہ تعالیٰ اوّل و آخر اور ظاہر و باطن ہے اور وہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے"۔ ایسی رقیق و بصیرت افروز حقیقت کا اظہار ہے، جس سے عرب کا "اُمّی" حاملِ قرآنِ عظیم کیا، کوئی پڑھا لکھا شخص بھی واقف نہ تھا۔ کیا اہلِ عقلِ سلیم کے لیے یہ آیۂ حکیمانہ و بصیرت افروز قرآنِ مجید کے من جانب اللہ ہونے کی دلیل نہیں ہے؟

۷۔ جمالیاتی تخلیقی فعلیت :

Aesthetic creative activity ۔ میرا نظریۂ فن یہ ہے کہ فن اصل میں تخلیق و حُسن کاری (تحسین) سے عبارت ہے اور فنکار کے اس دُہرے عمل کے لیے میں نے جمالیاتی تخلیقی فعلیت کی تعبیر اختیار کی ہے۔ میرے اس نظریۂ فن کی اساس اس آیتِ قرآنی پر ہے:

اَلَّذِیْٓ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ (السجدة ۳۲ : ۷) (وہ رب جو عالم الغیب والشہادۃ ہے) اس نے ہر اس چیز کو حسین بنایا جو اس نے تخلیق کی۔

اس نصِ قرآنی سے فن کا یہ اصل الاصول مستنبط ہوا کہ فن عبارت ہے جمالیاتی تخلیقی فعلیت سے اور فنی تخلیقات کو ہر حال میں حسین ہونا چاہیے؛ لہٰذا جس فنکار کی فنی تخلیقات حسین نہیں، اس کا فن نہ فن ہے اور نہ وہ خود ہی فنکار ہے۔ فنکار کا حسن کار ہونا ناگزیر ہے۔

۸۔ حسن کوری :

(Beauty blindness) جس طرح رنگ کوری (COLOUR-BLINDNESS) بصری بیماری ہے، اسی طرح حسن کوری قلبی بیماری ہے۔ چنانچہ اس بیماری کے سبب حسن کور نہ تو حسن و قبح میں امتیاز کرسکتا اور نہ جمالیاتی اقدار کی تشخیص و تعیین ہی کرسکتا ہے۔ یہ جمالیاتی۔ نفسیاتی مرض از بس مضرت رساں ہے، لیکن انسان اپنے ظلم و جہل کے باعث اس کی طرف توجہ ہی نہیں دیتا اور نہ اسے مضرت رساں ہی سمجھتا ہے، بلکہ اسے اس کا شعور ہی نہیں ہوتا۔ حسن کور ہمیشہ کور ذوق ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کی جمالیاتی حس مردہ ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حسن کوری و کور ذوقی لازم و ملزوم ہیں۔

۹۔ جلالِ بصیرت :

اس اصطلاح کو جامع و واضح طور سے سمجھنے کے لیے یہ اصل ہمارے پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ جلال بھی جمال کی طرح حسن کا عنصرِ ذاتی۔ صفاتی ہے اور حسن کی حیرت انگیز و محیر العقول قوت و توانائی کا مظہر ہے، جس کے لیے قرآنِ مجید نے "سلطان" کی تعبیر اختیار کی ہے۔ نور بھی حسن کا ذاتی۔ صفاتی عنصر ہے، لیکن اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اصل کی حیثیت

رکھتا ہے۔ بصیرت کیا ہے ؟ یہ حُسنِ قلب کا نور ہے۔ جس طرح سورج میں اپنے جمال کی بہ نسبت جلال بہت زیادہ ہوتا ہے اور وہ قوت و توانائی کا حیرت انگیز خزینہ ہے، اسی طرح چشمِ قلب میں نور کے ساتھ جلال اس قدر افزوں ہو جائے کہ آفتاب بن جائے تو اس کے نور و توانائی کے خزینے کے لیے ہم نے جلالِ بصیرت کی تعبیر اختیار کی ہے۔ جلال بصیرت دراصل "سُلطانِ باطنی" ہے، جس میں ارض و سمٰوات کے حدود میں نفوذ کر کے عالمِ الحیوان، عالمِ ارواح، عالمِ ملکوت اور عالمِ حُسنِ ذات تک رسائی حاصل کر لینے کی استعداد ہوتی ہے۔

اہل ذوق و شوق کے لیے اس حقیقت میں نکتہ مضمر ہے کہ جلال بصیرت یا سُلطانِ باطنی ہی دیدِ "دوست" اور جمالیاتی۔ ورائی مشاہدات کا ذریعہ ہے۔

۱۰۔ انگریزی میں کہتے ہیں: One who follows, always remains behind

مقام ۴

(ب) قلب کا جمالیاتی نظام

اے جویائے حسن! جانتے ہو تمہارے سینے میں ایک اعجوبۂ روزگار شے ہے، جسے قلب سے تعبیر کرتے ہو۔ یہ متعدد عناصرِ ترکیبی سے مرکب ہے اور ہر عنصر ایک نامیاتی کُل ہے اور ہر ایک حُسن کا آرزومند ہے۔ قلب کے دو بڑے اجزا ہیں: ایک کو دل اور دوسرے کو دماغ کہتے ہیں۔ دونوں عجیب و غریب چیزیں ہیں اور ان کے اپنے اپنے حیرت انگیز نظام ہیں۔ یہ نظام ایک دوسرے سے علیحدہ اور خود کار بھی ہیں اور لاینفک طور سے مربوط و معاون بھی ہیں۔ دونوں لازم و ملزوم اور جویانِ حسن ہیں۔ دل حسین جذبات و احساسات اور انفعالات و تاثرات چاہتا ہے اور دماغ کو حسین تخیلات و تصورات اور افکار و نظریات کی طلب و آرزو ہے اور قلب کو اپنی کُلّی حیثیت میں حُسنِ اعتقاد و یقین کی طلب و جستجو رہتی ہے۔ جانتے ہو کیوں؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ وہ اور اس کے جُملہ اجزا نورِ حُسن سے منوّر و مسرور رہنا چاہتے ہیں۔

کیا تم جانتے ہو کہ تمہارا اِلٰہ الظاہر و الباطن ہے؟ اگر جانتے ہو تو کیا اس کا مفہوم بھی سمجھتے ہو؟ سنو! اِس کائنات اور اس کی ہر چیز کے دو رُخ ہیں: ایک ظاہری اور دوسرا باطنی، جنہیں تم خارجی و داخلی اور فلسفے کی زبان میں موضوعی و معروضی کہتے ہو۔ یہ حقیقت ایک لمحہ کے لیے بھی ذہن سے اوجھل نہ ہونے پائے کہ تمہارا اِلٰہ جو الحسن والحق ہے، قادرِ مطلق ہے اور ہر شے پر

قدرت رکھتا ہے اور اس کی کُنہ و قدرت کا تمہاری عقل احاطہ نہیں کر سکتی ؛ لہٰذا تم اس حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتے کہ وہ کیسے بیک وقت ظاہر بھی ہے اور باطن بھی ؛ وہ کیسے انسان کے سینے میں بھی ہے اور اس کے باہر بھی ؟ وہ کیسے آسمانوں اور زمین کے ورا الورا بھی ہے اور کائنات کی ہر بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی شے کے اندر بھی ہے ؟ نیز اس کے نورِ حسن ہی سے کائنات کی ہر چیز حسین و مشہود اور منور ہے ۔ اگر تمہیں اس حقیقت کا شعور و ایقان ہوتا کہ تمہاری باطنی دُنیا میں تمہارا معروضِ حسن و عشق رہتا ہے تو تم اس کے شاہد و دوست اور مقرب و منظورِ نظر ہوتے ؛ اس کی دید سے جمالیاتی ثروت حاصل کرتے اور دولتِ دُنیا سے تہی دست ہونے کے باوجود تونگر و غنی ہوتے ؛ صاحبِ حسن و سرور ہوتے اور فقر میں بادشاہی کرتے ۔

یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حسنِ جذبات و احساسات اور حسنِ افکار و معتقدات ہی کی بدولت قلب میں سعادت، محبت اور رحمت پیدا ہوتی ہے اور ایسے ہی قلب سے محبت و رحمت اور حسنِ ضمیر کے چشمے پھوٹتے اور گلستانِ زندگی کو سرسبز و شاداب کرتے اور اسے برگ و بار لانے کے قابل بناتے ہیں ۔ غور سے سنو ! تم پر سرِّ رحمۃ للعالمین آشکارا کرتا ہوں ۔ تمہارے قلب کی آرزوئے حسن میں تمہاری یہ آرزو بھی مضمر ہے کہ تم پر تمہارا ربِّ رحمان و رحیم رحمت کرے اور تم اس کی کل مخلوقات کے لیے رحمت بن جاؤ ۔ ربِّ رحمان و رحیم کی سنت یہ ہے کہ جو دنیا والوں کے لیے رحمت بنتے ہیں وہ ان پر رحم کرتا اور ان سے احسان و محبت کرتا ہے ۔ جو شخص اہلِ دُنیا سے محبت کرتا ہے ، مالکِ دُنیا اس سے محبت کرتا ہے اور اُسے اپنا دوست و محبوب بنا لیتا ہے ۔ اُس نے جنت اپنے دوستوں ہی کے لیے بنائی ہے ۔ بخلاف اس کے جو لوگ اہلِ دُنیا پر ظلم اور ان کا استحصال کرتے ہیں وہ ظالم ان کے دشمن ہوتے ہیں اور ربِّ ذوالجلال ان ظالموں کا دشمن بن جاتا ہے ، جن کے لیے اس نے جہنم بنا رکھا ہے ، جس میں وہ لذتِ حیات سے آشنا ہوں گے نہ لذتِ موت سے ۔

یاد رکھو ! آرزوئے حسن خواہشاتِ نفسانی کے بوجھ تلے دب جائے تو قلب میں قساوت و شقاوت

پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسے ہی قلب سے ظلم و شر، فتنہ و فساد کے سوتے پھوٹتے اور مزرعِ زندگی کو تباہ و برباد کرتے ہیں۔ ظلمِ قلب کے نورِ حُسن کے فقدان پر دلالت کرتا ہے۔

یہ حُسن کا سرِّ اعظم، معرفت کا سلطانِ سرّ اور حقیقت کا سِرّ الاسرار ہے کہ تمہارا اِلٰہ اَلحسن ہے اور حُسن ہی اُسے پسند ہے۔ وہ حُسن ہی سے محبّت کرتا ہے، اور تمہارا قلبِ حسین اس کا حُسن المآب ہے۔ اس کا گھر حسین بناؤ اور اسے اپنا مہمان بناؤ تاکہ وہ تمہیں اپنی جنّت میں جو تمہارا حُسن المآب ہے، اپنا مہمان بنائے۔ جانتے ہو قلب کیسے حسین بنایا جاتا ہے؟ اس کی تحسین آٹھ چیزوں سے کی جاتی ہے، جنہیں لوازمِ ثمانیہ سے تعبیر کر سکتے ہیں، اور وہ یہ ہیں: (۱) حُسنِ یقین (۲) حُسنِ عمل (۳) حُسنِ قول (۴) رزقِ حسنہ (۵) حُسنِ ذکر و فکر (۶) آرزوئے حُسن (۷) محبت و رحمت اور (۸) حُسنِ دعا و گریہ۔

اب ان لوازم کی تشریح کرتا ہوں، سنو!

۱۔ حُسنِ یقین سے مراد ایمان بالحق ہے اور ایمان کی روح "حُسنِ یقینِ یکتائی" ہے۔ اس دُنیا میں ہر چیز کا جوڑا ہے یعنی ہر شے اپنا زوج رکھتی ہے، اس لیے کوئی چیز یکتا نہیں۔ یکتا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی چیز کے مثل نہیں اور نہ کوئی شے اس کے مثل ہے۔ وہ ذات و صفات ہر لحاظ سے بے نظیر و بے عدیل اور یکتا و یگانہ ہے۔ اس حقیقت کے لیے ہم نے "حُسنِ یکتائی" کی تعبیر اختیار کی ہے، اور اس حقیقت پر بصمیمِ قلب یقین رکھنا اور اسے اپنا جُزوِ زندگی بنانا توحید ہے۔

یاد رکھو! ایمان بالحق ہو تو حُسنِ یقین ہے، اگر ایمان بالباطل ہو تو محض یقین بلکہ یقینِ قبیح ہے۔ چونکہ حُسن میں طمانیت انگیزی کی تاثیر ہے، لہٰذا حُسنِ یقین سے دل کو قوّت کے ساتھ طمانیت بھی ملتی ہے۔ بخلاف اس کے ایمان بالباطل سے یقین کی قوّت تو ملتی ہے، مگر فقدانِ حُسن کے سبب اطمینان نہیں ملتا۔ دیکھو! ایمان جُزوِ زندگی نہ بنے تو معتبر نہیں ہوتا۔ اسے یوں سمجھو کہ حیاتِ زندگی جب تک ایمان کے سانچے میں ڈھل نہ جائے، اس میں نہ تو ایمان کی قوّت اور نہ ایمان ہی میں زندگی کی حرکت و جلالت پیدا ہوتی ہے۔ یہ تو تم شاید جانتے ہو کہ توحید روحِ ایمان ہے، لیکن مانتے نہیں۔

دلیل یہ ہے کہ تم توحید کو جزءِ زندگی نہیں بناتے اور اس کے مطابق عمل نہیں کرتے۔ تم کہتے تو ہو کہ اللہ ایک ہے اور وہی تمہارا رب اور اِلٰہ ہے؛ لیکن اس کے باوجود تم نے اپنے متعدد رب اور اِلٰہ بنا رکھے ہیں۔ یہ حقیقت ہے مگر تم اسے تسلیم نہیں کرتے۔ وجہ یہ ہے کہ شیطان نے اپنی وسوسہ اندازی اور جمالیاتی فریب کاری سے تمہارے حسّی قلبی نفسی نظام کو بگاڑ دیا ہے۔ تم حُسن کور و کور ذوق بن گئے ہو۔ تمہاری عقل اپنے نورِ حُسن سے محروم ہو گئی ہے اور تمہارا قلب اندھا ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تم پر میری بات ناگوار گزری ہے۔ گوش اگر حق نیوش نہ ہوں تو ان پر سچّی بات ناگوار ہی گزرتی ہے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تم اللہ تعالیٰ کے بندوں کو اپنا ناجی، رازق و کارساز، غوث و دستگیر، حاجت روا و مشکل کُشا، حافظ و ناصر اور سمیع الدعوات و مجیب الدعوات نہیں مانتے؟ کیا تم انہیں پکارتے نہیں ہو؟ کیا تم نہیں مانتے اور کہتے کہ فلاں فلاں غیر اللہ تمہاری مرادیں پوری کرتا ہے اور فلاں فلاں مزار و آستانے اور معبد و درگاہ پر منتّیں ماننے اور چڑھاوے چڑھانے سے مرادیں ملتی اور حاجتیں پوری ہوتی ہیں؟ اگر یہ سچ ہے اور یقیناً سچ ہے تو پھر بتاؤ کہ یہ شرک و بُت پرستی نہیں تو اور کیا ہے؟ کیا تُم نے شیطان کو اپنا رب نہیں بنایا ہوا؟ میں جانتا ہوں کہ یہ بات تم نہیں مانو گے؛ لیکن حق و باطل کا اصل معیار عمل ہے۔ اگر تمہیں یقین ہو کہ فقط اور تنہا اللہ تعالیٰ ہی تمہارا رازق و پروردگار ہے تو کبھی ہو سکتا ہے کہ تم شیطان کے امتثالِ امر میں کسبِ حرام کرو، رشوت لو، چیزوں میں آمیزش کرو، کم تولو، کم ماپو، بدعہدی و خیانت کرو، جھوٹ بولو، جعلسازی و لوسر بازی کرو، سود خوری و سود کاری کرو، قمار بازی کرو، سمگلنگ اور چور بازاری کرو، احتکار و کتناز کرو، ظلم و استحصال کرو، فرعونی، ہامانی، قارونی اور آزری کرو، چوری اور رہزنی کرو، عصمت و عزّتِ نفس بیچو، نطق و قلم فروشی کرو۔ مختصر یہ کہ حرام و ناجائز وسائل و ذرائع سے مال و دولت حاصل کرو؛ نیز بخل، اسراف و تبذیر کرو، ٹیکسوں کی چوری کرو۔ لیکن زکوٰۃ دو، نہ انفاق بالعفو پر عمل ہی کرو۔

تم کہتے ہو کہ ہمارا اِلٰہ یا معبود و محبوب اور مطلوب مقصود فقط ایک اللہ تعالیٰ ہے، لیکن تم خود آگاہ ہوتے تو تمہیں اس حقیقت کا علم ہوتا کہ تُم نے اپنی خواہش کو اپنا اِلٰہ بنا رکھا ہے۔ کیا یہ

واقعہ نہیں کہ تمہاری ہر اچھی بُری خواہش تمہیں محبوب ہوتی ہے اور اُسے پوری کرنے میں کوشاں رہتے ہو اور کبھی تو اپنی اس کوشش میں اپنی عزت و آبرو اور جان و ایمان تک کو داؤ پر لگا دیتے ہو۔ جانتے ہو ظالم و جاہل، مشرک و بت پرست اور مجرم و گناہگار کون ہوتے ہیں؟ وہ جو اپنی خواہشات کے پجاری ہوتے ہیں۔ یہی شیطان کے بندے ہوتے ہیں۔ کیا اب بھی تم نہیں مانو گے کہ تم اللہ وحدہٗ لاشریک کی نہیں، اپنے نفس شیطان کی پرستش و اطاعت کرتے ہو؟

خواہش کے بے شمار معروضات ہیں، لیکن ان میں سے نمایاں اور اہم ترین یہ ہیں: زر، زنؔ زمین اور قوت؛ نیز نام و نمود، تعصبات و افکار اور معتقدات و نظریات۔ تم روز دیکھتے ہو، اگرچہ بیگانہ وار ہی سہی کہ لوگ ان معروضاتِ خواہش کے دالہ و شیدا ہیں اور ان پر جان دیتے ہیں اور ان کے پیچھے دیوانہ وار بھاگ رہے ہیں۔ یہ سب دیکھنے اور کرنے کے باوجود تم یہ سچی بات تسلیم نہیں کرتے کہ تم نے اپنی خواہش کو اپنا اِلٰہ بنایا ہوا ہے، لہٰذا تم مشرک ہو، موحّد نہیں ہو۔ اصل یہ ہے کہ یہی تمہاری اخلاقی و معاشرتی بیماریوں اور برائیوں کی علت ہے۔ اسی وجہ سے تمہارے معاشرے کے ہر گوشے میں فتنہ و فساد برپا ہے، تم فرعونوں، ہامانوں، قارونوں اور آزروں کے محکوم و غلام ہو؛ اور آتشِ خوف و حزن میں جل رہے ہو، لیکن بہت کم اس کا شعور رکھتے ہو۔

سوچو تو سہی! تم امیر و سردار ہوئے تو کیا؟ مشہور و معروف ہوئے تو کیا؟ تمہیں نام و نمود اور عیش و عشرت حاصل ہوا تو کیا؛ حقیقت میں تو تم انسان نہیں دام و دد ہو، ظالم و جاہل اور مجرم و گناہگار ہو؛ محرومِ طمانیت و سکینت ہو؛ مفلس و تہی دست اور نامراد و ناکام ہو۔ دوستؔ سے مہجور و دور اور اہلِ نار ہو۔ کاش سمجھتے کہ تم کتنے زیاں کار ہو اور کس قدر خسارے میں جا رہے ہو! جب حشر کے دن آنکھ کھلے گی تو پتا چلے گا، لیکن اس وقت تم سے نہ تلافیِ مافات ہو سکے گی اور نہ دل کو لگی خوف و حزن اور حسرت و پشیمانی کی آگ ہی بجھ سکے گی۔

یاد رکھو! تمہاری بیماریوں اور سیاہ کاریوں کا سبب تم میں حسنِ یقین کا فقدان ہے۔ حسنِ یقین پیدا کرو تاکہ تم میں زندگی و پختگی، عزم و ہمت، طمانیت و سکینت اور جمال و جلال پیدا ہو۔ اس طرح

تم اپنے موضوعی معروضی شیطان کا مقابلہ کر سکو گے اور اس کے وسوسوں، جمالیاتی دھوکوں اور جعلسازیوں سے محفوظ رہ سکو گے، نیز نہ صرف وقت کے فرعونوں، ہامانوں، قارونوں اور آزروں کے ظلم و استحصال سے نجات حاصل کر سکو گے، بلکہ ان کا استیصال بھی کر سکو گے۔

اپنے آپ کو ڈھونڈنے والے! میری بات مان لو! نہ مانو گے تو پچھتاؤ گے۔ آگ میں جلو گے، تڑپو گے اور فریاد کرو گے، لیکن جو حق بات "یہاں" نہیں سنتا اور مانتا، اس کی کوئی فریاد و التجا الحق "وہاں" نہیں سنے گا۔ یہ اس کا فیصلہ ہے جو اٹل ہے۔

۲۔ حُسنِ عمل :

سنو! تمہیں ایک راز کی بات بتاتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تم اسے جانتے ہو گو مانتے نہیں۔ پھر بھی اس اُمید پر کہ شاید اُتر جائے تیرے دل میں میری بات، تمہاری یادداشت تازہ کیے دیتا ہوں۔ بات اہم اور غور طلب ہے، غور سے سُننا۔ دل کو لگے تو مان لینا، عمل کرنے لیے۔ بات محض ماننے سے نہیں بلکہ عمل کرنے سے بنتی ہے۔ ضد سے کام نہ لینا۔ ضد اور عصبیت ہو تو آدمی حق بات قبول نہیں کرتا۔ یہ تاریخِ اُمم کی بڑی عبرتناک حقیقت ہے کہ لوگ جانتے ہیں پر مانتے نہیں۔

بات یہ ہے کہ انسان ایک دُنیا میں نہیں دو دُنیاؤں میں رہتا ہے: ایک اپنے اِلٰہ و ربّ کی دُنیائے آفریدہ میں اس کی مخلوقات کے ساتھ؛ دوسرے اپنی بنائی ہوئی دنیا میں "اپنے" اور اپنے اِلٰہ و ربّ کے ساتھ؛ لیکن بہت کم اس حقیقت کا شعور رکھتے ہیں کہ تمہاری اپنی دنیا میں تمہارے ساتھ تمہارا معروضِ حُسن و عشق بھی رہتا ہے۔

تم نے کبھی سوچا اور جانا ہے کہ وہ تمہارے ساتھ کیوں رہتا ہے؟ سنو! وہ تمہارے ساتھ اس لیے رہتا ہے کہ تمہیں احساسِ تنہائی نہ ہو، تم اس سے دوستی کرو، اس کے مقرب و شاہد اور منظورِ نظر بنو اور جمالیاتی ثروت سے اپنا ظرفِ زندگی معمور کر لو؛ نیز اس کی رفاقت و قیادت میں اطمینان

سے سفرِ زندگی کرو۔ علاوہ بریں، اس کے حُسن و نور سے اپنی زندگی کو حسین و منوّر اور مطمئن و مسرور بناؤ؛ اپنے نورِ حُسن کی تکمیل کرو اور صاحبِ دید و نظر اور اہلِ حسن و سرور بن جاؤ۔ علاوہ بریں، اس کے قرب کی برکت سے اپنے موضوعی، معروضی شیطان کی جمالیاتی وسوسہ اندازیوں اور جمالیاتی فریب کاریوں سے محفوظ رہو، اور اپنے اِلٰہ و ربّ کو چھوڑ کر اُس کے بندے نہ بن جاؤ۔

کیا تم جانتے ہو کہ تمہارا اِلٰہ تو "الحُسن" اور حُسن پسند ہے اور اس نے تمہیں بھی حُسن پسند بنایا ہے، لہٰذا اُس کے اور اپنے لیے اپنی دُنیا کو حسین بناؤ۔ ساتھ ہی اپنی خارجی دنیا کو بھی حسین بناؤ، بلکہ اپنے ہم جنسوں کی خارجی اور داخلی دُنیا کو بھی حسین بناؤ۔ یہ ہے حُسنِ عمل اور اس کا اصل الاُصول۔

سُنو! تمہیں حکمت کی ایک بات بتاؤں۔ حُسنِ عمل کے دو عوامل و محرّکات ہیں: محبّت اور رحمت؛ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اہلِ محبّت ہی اربابِ رحمت ہوتے ہیں۔ محبّت کی نظر سے دیکھنے والوں ہی کو دُنیا حسین دکھائی دیتی ہے۔ دل کو نورِ محبّت سے منوّر کرو کہ اس میں حُسنِ درد و غم پیدا ہو: اپنے ربِّ جمیل و جلیل کی حسین مخلوقات کا درد و غم۔ جس میں حُسنِ درد و غم پیدا ہو: اپنے ربِّ جمیل و جلیل کی حسین مخلوقات کا درد و غم۔ جس دل میں حُسنِ درد و غم ہو، اس میں خوف و حزن کی ظلمت آسا آگ نہیں ہوتی۔ وجہ یہ ہے کہ حُسنِ درد و غم سے قلب میں طمانیت و مسرّت اور جمالیاتی سرور و سوز کی ٹھنڈک ہوتی ہے جو آتشِ خوف و حزن کو ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ اپنا بھلا چاہتے ہو تو اپنے دل میں حُسنِ درد و غم پیدا کرو۔ اسی مقصد کے لیے تمہارے ربِّ رحیم و کریم نے تمہیں آرزوئے حُسن ودیعت کی ہے۔

آرزوئے حُسن کی تکمیل کے لیے حُسنِ عمل ناگزیر ہے؛ اور حُسنِ عمل کے لیے اپنے دل میں آرزوئے حُسن کو زندہ و فعّال اور شمعِ محبّت کو فروزاں رکھو۔ پھر اس دل میں حسنہ و خیر، عدل و احسان اور محبّت و رحمت کے چشمے اُبلیں گے اور گلشنِ ہستی کو سیراب کریں گے۔ یاد رکھو! دوسروں کی کشتِ حیات سیراب کرو گے تو اس کے اثر سے تمہاری مزرعِ زندگی بھی سرسبز و شاداب اور بار آور ہو گی۔ یہ قدرت کا قانونِ مکافاتِ عمل ہے۔

جانتے ہو حُسنِ عمل کا معیار یا اس کی پہچان کیا ہے؟ سنو! میں تمہیں بتاتا ہوں۔ حُسنِ عمل کا معیار

دُہرا ہے ؛ موضوعی اور معروضی ۔ اس کی موضوعی پہچان یہ ہے کہ سلیم الطبع انسان فطرۃً حسنِ عمل کو جانتا اور پہچانتا ہے، اور اسے اپنی طرف منسوب کرنے میں خوشی اور اپنی عزّت محسوس کرتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، انسان کی جمالیاتی حِس، عقلِ سلیم، ضمیر اور نفسِ لوّامہ سبھی حسنِ عمل کو جانتے اور پہچانتے ہیں؛ کیونکہ اس سے قلب پر حسین وخوشگوار اور طمانیّت آفریں وسرور انگیز اثرات مرتب ہوتے ہیں؛ دوسروں کو اس سے فائدہ پہنچتا ہے اور صالح معاشرہ اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ بخلاف اس کے عملِ قبیح سے انسان فطرۃً نفرت کرتا اور جانتا پہچانتا ہے کہ وہ شرعاً، عقلاً اور اخلاقاً ناجائز، بُرا اور مضرت رساں قول یا فعل ہے ؛ نیز اس کی طبعِ سلیم اس عمل کو اپنی طرف منسوب کرنے سے اِبا کرتی ہے۔ علاوہ ازیں، ضمیر فوراً انسان کو اس کی حقیقت سے آگاہ اور اس کے نتائج سے متنبّہ کرتا اور نفسِ لوّامہ اس پر اُسے ملامت کرتا ہے۔ حسنِ عمل کی معروضی پہچان یہ ہے کہ اس سے زندگی کے ہر گوشے میں صلح وآشتی، توافق وہم آہنگی اور امن وسلامتی پیدا ہوتی ہے، اس کا نقیض یہ ہوا کہ جس قول وفعل سے زندگی کے کسی گوشے میں برہمی وناآہنگی، تضاد وتخالف، فتنہ وفساد اور منافرت ومخاصمت پیدا ہوں، وہ عملِ قبیح ہے۔ عملِ صالح، صلاح، حسنہ، خیر، نیکی، عدل واحسان، محبّت وشفقت، ایثار وقربانی، رحمت اور معروف سب حسنِ عمل ہی کی تعبیریں ہیں، جبکہ اس کی ضد اور نقیض کے لیے سیئہ، شر، بدی، فتنہ وفساد، ظلم و استحصال، کُشت وخون، خرابی وبرہمی، تضاد وتخالف، جرم وگناہ اور فحشا ومنکر کی تعبیریں اختیار کی جاتی ہیں۔

عمل کے اثرات کی نوعیت موضوعی ومعروضی ہے، لہٰذا حسنِ عمل کے اثرات سے انسان کی اپنی زندگی اور معاشرتی زندگی دونوں میں توازن پیدا ہوتا ہے۔ توازنِ شخصیت کے جمال وجلال پر دلالت کرتا ہے۔ مؤمن کی ایک پہچان یہ ہے کہ اس کی شخصیت میں توازن یا جمال وجلال ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق وباطل ہو تو فولاد ہے مؤمن (علامہ اقبال: ضربِ کلیم)

یاد رکھو! متوازن شخصیت کے حامل افراد ہی اپنے معاشرے میں توازن پیدا کرکے اُسے برقرار رکھ سکتے

ہیں، معاشرتی توازن اس بنیادی حقیقت کا آئینہ دار ہوتا ہے کہ اس کی زمامِ حکومت افرادِ صالحہ کے ہاتھوں میں ہے، فرعونوں، ہامانوں، قارونوں اور آزروں کے ہاتھ میں نہیں۔ اس کے نتیجے میں وہاں سب کے ساتھ عدل و احسان ہوتا ہے، لیکن کسی کے ساتھ ظلم روا نہیں رکھا جاتا۔ وہاں سب افراد آزاد و مکرم ہوتے ہیں، محکوم و غلام اور ذلیل و مسکین نہیں ہوتے۔ الغرض وہ معاشرہ امن و سلامتی، اخوت و مساوات اور محبت و یگانگت کا بہشت ہوتا ہے، فتنہ و فساد، تشتت و افتراق اور خوف و حزن کا جہنم نہیں ہوتا۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ وہاں لوگ ایک دوسرے کی آرزوئے حسن کی تسکین و تکمیل کرنے میں متفکر و کوشاں رہتے ہیں، لہٰذا وہ ایک دوسرے کے لیے رحمت ہوتے ہیں اور ان کی رحمت کا دائرہ دیگر مخلوقات کو بھی محیط ہوتا ہے۔

حسنِ عمل دراصل آرزوئے حسن کی تسکین و تکمیل کرنے سے عبارت ہے، چاہے یہ آرزوئے حسن اپنی ہو یا دوسروں کی۔ یہ نکتہ از بس اہم اور یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جو لوگ دوسروں کی آرزوئے حسن کو پورا کرتے ہیں وہ درحقیقت اپنی آرزوئے حسن کو پورا کرتے ہیں۔ یہ قدرت کا قانونِ مجازات (= قانونِ مکافاتِ عمل) ہے جو اس کی شانِ رحیمی و کریمی پر دال ہے۔ تم اس حقیقت سے آگاہ ہوتے اور اس پر تمہارا ایمان بھی ہوتا تو تم دوسروں کی آرزوئے حسن کو پورا کرنے کے لیے اپنی جان و توانائی اور مال و دولت کو صرف کرتے۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتے؟ اس لیے کہ شیطان کی جمالیاتی وسوسہ اندازی اور جمالیاتی فریب کاری تمہیں ایسا کرنے ہی نہیں دیتی اور اس حقیقت پر ایمان لانے ہی نہیں دیتی۔ تم تو اس حقیقت سے بھی نابلد ہو کہ جو آدمی دوسروں پر ظلم کرتا ہے وہ اصل میں اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے۔ ایک تو وہ اُسے نورِ حسن اور اطمینان سے محروم کر کے آتشِ خوف و حزن کے عذاب میں مبتلا کرتا ہے؛ دوسرے اُسے اپنے الٰہ و ربّ سے دور کرتا اور اس کا مقہور و مغضوب بناتا ہے، اور تیسرے اُسے اپنے ظلم کے بارِ گراں تلے دبا کر اُسے نحیف و نزار بناتا اور اس کے نشو و ارتقاء کو روک دیتا ہے۔

سنو! قاتل دوسرے کا صرف جسم ہلاک کرتا اور صرف ایک بار کرتا ہے، لیکن وہ اس فعل سے اپنی روح کو ہلاک کرتا ہے اور بار بار کرتا ہے، اس دُنیا اور آخرت دونوں میں۔ جس طرح

کُشتگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زماں از غیب جانِ دیگر است

اسی طرح قاتلوں کے لیے ہر زماں از غیب مرگِ دیگر است

جس طرح شہید کے لیے آنِ شہادت کیف و سرور کی آنِ جاودانی بن جاتی ہے، اسی طرح قاتل کی موت کا ہر لمحہ ہلاکتِ مکرّر و مسلسل کا لمحۂ سرمدی بن جاتا ہے۔ ہر مجرم و گناہگار کے ساتھ اس کے جرم و گناہ کی نوعیت کے مطابق ایسا ہی ماجرا ہوتا ہے۔ چور دوسروں کا مال و دولت اور اپنی جمالیاتی ثروت چراتا ہے۔ نقب زن دوسروں کی دیواروں اور تجوریوں میں اور اپنے قلب میں نقب لگاتا ہے۔ دوسروں کو فریب دینے والا اپنے نفس کو دھوکا دیتا ہے۔ دوسروں سے جھوٹ بولنے والا اپنے آپ سے جھوٹ بولتا ہے۔ دوسروں کا نقصان کرنے والا اپنی ذات کا نقصان کرتا ہے۔ دوسروں سے حسد و بُغض اور عداوت رکھنے والا، اپنے آپ کو آتشِ حسد و بُغض میں جلاتا اور اپنے آپ سے عداوت رکھتا ہے۔ بُخل سے دولت بڑھ بھی جائے تو کیا ہوا؟ اس سے جمالیاتی ثروت گھٹتی اور مسلسل گھٹتی رہتی ہے۔ منافق دوسروں سے پہلے اپنے ساتھ نفاق کرتا ہے اور اس کے منفی اثرات اس کے قلب پر دیرپا ہوتے ہیں اور اس کی شخصیّت کو پارہ پارہ کر دیتے ہیں۔ نفاق کو صدق کا نقیض کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ قول و فعل میں ہم آہنگی صدق پر دلالت کرتی ہے اور صدق پیش شرط ہے حُسنِ عمل کی۔ صدق حقیقت میں حُسنِ قلب ہے اور ایسے ہی قلب سے حسنہ و خیر، عدل و احسان اور محبّت و رحمت کے چشمے جاری ہوتے اور کشتِ حیات کو شاداب و بارآور کرتے ہیں۔

جانتے ہو "محسن" کسے کہتے ہیں؟ وہ شخص جو حُسنِ عمل کا عادی اور احسان پیشہ ہو۔ حسین، مثالی یا اسلامی معاشرے کی پہچان یہ ہے کہ اس کے افراد محسن ہوتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے لیے بلکہ کُل مخلوقات کے لیے رحمت ہوتے ہیں۔ اس میں فرعون و ہامان ہوتے ہیں نہ قارون و آزر۔

مختصر یہ کہ وہ امن و سلامتی، آزادی و مساوات، اخوت و محبت اور عدل و احسان کی جنت ہوتا ہے۔
یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ زنا ایک قبیح فعل ہے جو شرعاً حرام اور گناہ کبیرہ ہے لیکن یہ اور بات ہے کہ انسان جانتا ہے پر مانتا نہیں۔ جانتے ہو کیوں؟ اس کا سبب بھی یہ ہے کہ شیطان اپنی وسوسہ اندازی و جمالیاتی فریب کاری سے اس گھناؤنے فعل کو خوشنما و نظر افروز بنا کر دکھاتا ہے، لیکن اس کے بھیانک اور دور رس نتائج و عواقب کو تمہاری چشمِ بصیرت سے مستور رکھتا ہے۔ اگر یہ کہوں کہ وہ تمہارے جنسی جذبات کی آگ کو شعلہ فگن کر کے تمہاری چشمِ قلب کو اندھا کر دیتا ہے تو احسن و انسب ہوگا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ زانی عارضی و فانی جنسی لذت کی خاطر اپنے حواس و قلب اور نفس سب کو حسن و طمانیت سے محروم کر کے پلید و قبیح اور آتش بداماں بنا دیتا ہے۔ وہ اپنی نسل ضائع کرتا ہے اور اُسے طوائفوں اور بدکاری عورتوں کو تفویض کر دیتا ہے، جو اس کی بیٹیوں کو اپنی طرح جسم فروش و حرام کار بنا لیتی ہیں، اور یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ سنو اور گوشِ ہوش سے سنو! یہ کتنی شرمناک و عبرت انگیز بات ہے کہ طوائفوں کے پاس جو زانی آتے ہیں کون جانتا ہے کہ ان میں اُن کے باپ، بھائی، ماموں، چچا وغیرہ محرم بھی ہوں۔ ایسا ہوتا رہتا ہے، آدمی اپنے اوپر یہ ظلم کرتا رہتا ہے، لیکن تم یہ جانتے ہوئے بھی اس گھناؤنے فعل سے باز نہیں آتے، اس لیے کہ تم ظالم جاہل ہو، لیکن تمہاری شقاوت کی انتہا یہ ہے کہ تم یہ حقیقت تسلیم نہیں کرتے اور اپنے آپ کو دانشور سمجھتے ہو۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ ہر زمان و مکان میں حکومت و اقتدار، مال و دولت، عزت و شہرت اور شان و شوکت کے نشے میں سرشار فرعون و ہامان اور قارون و آزر، جو اپنے آپ کو بڑا اور دوسروں کو چھوٹا سمجھتے ہیں، سب سے زیادہ اپنی نسل کے دشمن اور قاتل ہوتے ہیں، لیکن بہت کم اس کا شعور رکھتے ہیں۔

یاد رکھو! ہر قبیح فعل رہزنِ ایمان و آگہی اور غارتگرِ طمانیت و سکینت ہوتا ہے۔ جمالیاتی ذوق بگڑ جائے تو آدمی حسن کور ہو جاتا ہے اور حسن کور سے حسنِ عمل کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ حسنہ و خیر اور حیات و طمانیت کی آرزو ہے تو محسن بنو اور عدل و احسان کو اپنا شعار بناؤ، اس لیے کہ

حسنِ عمل ہی سے جمالیاتی ثروت ملتی ہے۔ لہٰذا جو شخص محسن نہیں وہ جمالیاتی ثروت سے محروم اور اہلِ نار میں سے ہوگا۔ اصل یہ ہے کہ جمالیاتی ثروت سے محرومی ہی حقیقت میں محرومی ہے۔

کیا تم نہیں جانتے کہ تمہارا معبود و معروضِ حسن و عشق، جو شہنشاہِ اوّل و آخر اور جس کی آرزو تمہیں بیقرار رکھتی ہے، تمہارا مہمان ہے اور تمہارا قلبِ حسین اس کا حُسنُ المآب ہے اور اس کی میزبانی کی خاطر تمہیں جمالیاتی ثروت کی حاجت ہے؟ یاد رکھو! حُسنِ عمل ہی کے ذریعے تم اپنا دل حسین و منوّر اور جمالیاتی ثروت سے معمور بنا سکتے ہو۔ اس سلسلے میں تمہیں ایک انمول بات بتاتا ہوں، جس کی قدر و قیمت کا اندازہ اس امر سے لگا سکتے ہو کہ اگر تمہیں اس کے عوض قارون کا خزانہ اور سکندرِ اعظم کی سلطنت بھی دینا پڑے تو وہ پھر بھی ارزاں ہوگی۔ بات یہ ہے کہ جو شخص اپنے اِلٰہ و ربّ کو اس دنیا میں اپنا مہمان بنائے گا اور اس کی میزبانی کی خاطر اپنے دل کو حسین و منوّر بنائے گا، اس کا اِلٰہ اپنی جنّت میں اُسے اپنا مہمان بنائے گا۔

۲۔ حسنِ قول :

یہ تم جانتے ہو کہ کلمہ زبان سے نکلے تو ملفوظی اور قلم سے نکلے تو مکتوبی ہوتا ہے، لیکن بہت کم اس راز سے آشنا ہیں کہ کلمے میں "کُن فیکون"، انقلاب آفرینی اور جمالیاتی۔ نفسیاتی لمحات پیدا کرنے کی تاثیر ہوتی ہے۔ سنو! کلمے میں حُسن ہو تو اس میں اِحیاء و تعمیر، تالیف و اصلاح، تزکیہ و تحسین، محبت آفرینی و عشق انگیزی، طمانیت انگیزی و سُرور آفرینی، سحر انگیزی و اعجازِ مسیحائی، سبق آموزی و عبرت انگیزی، نیز جمالیاتی اور جمالیاتی۔ نفسیاتی لمحات پیدا کرنے کی تاثیر ہوتی ہے۔ بخلاف اس کے اگر کلمہ قبیح ہو تو اس میں تخریب و تہلیک، تخویف و تحزن، تضلیل و تقبیح، فساد و فتنہ انگیزی نفرت و عداوت انگیزی، نیز تقبیحی۔ نفسیاتی لمحات پیدا کرنے کی تاثیر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں حُسنِ قول کو از بس اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید میں فرماتا ہے: قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (البقرہ ۲ : ۸۳) : لوگوں سے حُسن و خوبی کی بات کہو۔ اس ارشادِ الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ زبان و قلم

سے جو کچھ کہو حسین کہو۔ عام بول چال میں وعظ و نصیحت، تقریر و خطابت، تعلیم و تدریس، تالیف و تصنیف اور ادب و فن میں تمہارا کلام و بیان حسین ہونا چاہیئے۔

غور سے سنو! میں تمہیں پتے کی بات بتاتا ہوں۔ میں جانتا ہوں، تم جانتے ہو پر مانتے نہیں۔ بات یہ ہے کہ حسنِ کلام کا احسن و مثالی نمونہ قرآنِ مجید ہے، جو الحسن والحق کا زندہ و ناطق، حسین و بلیغ اور ہر عیب و سقم، تحریف و نقص سے منزّہ اور سچا کلام ہے۔ یہ پاک و مطہر، علیم و حکیم، نور و ہدایت، موعظت و ذکر اور رشد و شفا ہے۔ جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہے، قرآنِ مجید نے اپنے اس حسنِ تاثیر سے کروڑوں، اربوں بلکہ بے شمار افرادِ نسلِ انسانی کو زندگی بخشی، ان کی نفسیاتی بیماریوں کو شفا دی، ان کا تزکیہ نفس، تحسینِ قلب اور تہذیب و تحسینِ اخلاق کی؛ ان کے حسی قلبی نفسی نظام کو نورِ ایمان سے منوّر و فعّال کیا؛ انہیں ان کی حقیقی منزلِ مقصود اور اس کی راہِ مستقیم دکھائی؛ انہیں ان کے الٰہ و ربّ سے ملایا اور اس کی شمعِ محبت ان کے سینوں میں فروزاں کی اور ان کی جمالیاتی حس اور آرزوئے حسن کو زندہ و فعّال کیا۔ اس سے دو نتائج مستنبط ہوئے: ایک یہ کہ قرآنِ مجید ادب کا بے نظیر و مثالی شاہکار ہے اور دوسرا یہ کہ ادب کو حسن مستلزم ہے، لہٰذا ہر ادب پارے کا حسین ہونا ناگزیر ہے۔ اس کی ضد یہ ہوئی کہ جو ادبی و فنی تخلیق حسین نہیں، وہ ادب کے زُمرے میں شامل نہیں ہو سکتی۔ بحقیقت میں حسن ہی رُوحِ ادب و فن ہے۔

سنو اور اس حقیقت کو تسلیم کرو کہ تمہاری تخلیقی فکر کی گمراہی اور ادب و فن، نیز ثقافت کی حسن و صداقت سے محرومی اور زبوں حالی کی علتِ غائی یہ ہے کہ تمہاری آرزوئے حسن تمہاری قبیح خواہشات کے نیچے دب کر دم توڑ رہی ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ تم کور ذوق و حسن و کور ہو گئے ہو، اس لیے تم ادب و ثقافت بلکہ زندگی کے کسی گوشے میں بھی حسن و قبح میں تمیز نہیں کرتے۔ آرزوئے حسن مُردہ ہو جائے یا فعّال و حرکی نہ رہے تو جمالیاتی حس بھی جمود و تعطّل کا شکار ہو جاتی ہے، اور نتیجۃً پہلے آدمی کور ذوق اور پھر حسن کور ہو جاتا ہے۔ ایسے افراد پر مشتمل قوم کے ادب و فن اور ثقافت کا حسن سے محروم اور قبیح ہونا لازمی ہو جاتا ہے۔

اس گفتگو سے جمالیاتی تنقید کا یہ اصل الاصول معلوم ہوا کہ ادب وفن کو حسن مستلزم ہے، لہٰذا ہر ادبی وفنی تخلیق کے لیے حسین ہونا ناگزیر ہے؛ نیز ادب وفن میں تخلیقی فعلیت جمالیاتی ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جمالیاتی تخلیقی فعلیت ہی سے حسین یا حقیقی ادب وفن معرضِ ظہور میں آتا ہے۔ اس اصول کی رُو سے ادب وفن کا معیار حسن ہے، اور اس معیار پر ادبی وفنی تخلیقات کو جانچنا اور ان کی جمالیاتی اقدار کی تعیین کرنی چاہیے اور ان کے اعلیٰ وادنیٰ، خوب وناخوب، حسین وقبیح ہونے پر حکم لگانا چاہیئے۔ یاد رکھو! جب تک حسن کو اپنے ادب وفن اور ثقافت کا معیار نہیں بناؤ گے، تم اعلیٰ و ارفع اور حسین معیاری ادب وفن تخلیق نہیں کر سکو گے اور نہ اپنی ثقافت کو حسین ہی بنا سکو گے۔ یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حسن میں نور وتوانائی اور حیات وقیومیت ہوتی ہے اور ان صفات کی بدولت ادب وفن نشو وارتقاء کرتا اور اسے ثبات ودوام حاصل ہوتا ہے۔

کیا تم جانتے ہو کہ تمہاری ادبی وفنی تخلیقات کیوں حشرات الارض کی طرح پیدا ہوتی اور نابود ہو جاتی ہیں؟ اوّل تو تم یہ راز جانتے نہیں، اگر جانتے بھی ہو تو مانتے نہیں۔ بات چونکہ حسن وحق کی ہے، اس لیے کہنا پڑتی ہے۔ مانو گے تو سچے ادیب وحسن کار بنو گے اور سچا ادب وفن تخلیق کرو گے، جو جمیل وجلیل، مؤثر ومعیاری اور زندۂ جاوید ہوگا۔ اس طرح ادب وفن کی جمالیاتی ثروت میں اضافہ کرو گے اور قدرت کے قانونِ مکافات کی رُو سے تمہیں دُنیوی واُخروی جمالیاتی ثروت حاصل ہوگی۔ اگر نہیں مانو گے تو اپنی تخلیقی توانائی ضائع کرو گے اور اپنی قبح کاری سے لوگوں کو اپنی طرح کور ذوق بناؤ گے اور ان کے اخلاق وثقافت میں فساد وخرابی پیدا کرو گے۔ قدرت کے قانونِ مجازات کی رُو سے اپنی سیّئات میں اضافہ کرو گے۔ یاد رکھو! حسن کاری کا نتیجہ مثبت اور قبح کاری کا منفی ہوتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، حسن کاری سے تزکیۂ قلب ونفس ہوتا ہے اور قبح کاری سے قلب سیاہ اور نفس آتش بداماں بنتا ہے۔

سُنو! صاحبِ حسن وسرور بننا چاہتے ہو تو اپنی آرزوئے حسن کو زندہ کرو اور فعّال بناؤ اور "حسنِ دوست" کی باتیں کرو۔ اس کی حمد وثنا، تحمید وتقدیس اور تہلیل وتکبیر کرو۔ اس کی نعمتوں کا ذکر

کرو۔اس کے نام کا چرچا کرو۔اس کے دین کی تبلیغ کرو۔ توحید جو روحِ دین و ایمان ہے،اس کی موعظت و تشہیر کرو۔شرک کے خلاف بولو اور زبان و قلم سے جہاد کرو۔لوگوں کو معروف یا حُسنِ عمل کی تلقین کرو اور حکم دو اور منکر یا قبیح کاری سے منع کرو۔آپس میں ایک دوسرے کو حق و صداقت اور صبر و استقامت کی نصیحت و وصیّت کرو اور اس کے لیے زبان و قلم اور ہر ممکن ذریعۂ ابلاغ سے کام لو۔اس سے نہ صرف دوسروں کے قلوب حسین ہوں گے، بلکہ تمہارا اپنا قلب بھی حسین ہوگا۔

یاد رکھو! اپنا قلب حسین بنانے کا احسن و مجرّب نسخہ یہ ہے کہ اپنے جملہ وسائل کے ساتھ دوسروں کے قلوب حسین بنانے کی سعی و جہد کرو۔یہ قدرت کا قانونِ مُجازات بھی ہے اور فضلِ ربّی بھی۔یہ نکتہ ہمیشہ یاد رکھو! جو لوگ دوسروں کو جمالیاتی ثروت دیتے ہیں، ربِّ کریم انہیں اس سے کہیں زیادہ جمالیاتی ثروت دیتا ہے۔

سنو! حُسنِ قول کا احسن و مثالی نمونہ اگر اللہ تعالیٰ کا محفوظ و مَصئون کلام قرآنِ مجید ہے تو قبیح و شرانگیز قول کے نمونے ہمیں ان حُسن کور و حق ناشناس فلاسفہ کے کلام میں ملتے ہیں جو اپنے آپ کو سیکولر کہتے ہیں۔یاد رکھو! شیطان اپنی وسوسہ اندازی و جمالیاتی فریب کاری سے کسی مُنکرِ حُسن کی آرزوئے حُسن کو اس کی خواہشات کے بارِ گراں کے نیچے دبا کر اور اس کی عقلِ فعّال کو نورِ حُسن سے محروم کرکے اندھا بنا دیتا ہے تو اس کے اندر اپنی روحِ شیطنت القا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ایسے منکرین کی عقل شیطان کی طرح عیّار و بُرہانی بن جاتی ہے اور وہ اولادِ آدم کے دشمن بن جاتے ہیں اور اس حقیقت کا انہیں شعور نہیں ہوتا۔بہرحال، وہ تمہیں گمراہ کرکے تمہیں اپنے معروضِ حُسن و محبّت سے دور و مہجور کرنے کی خاطر شیطان کے منہاجِ استدلال یا تلبیسِ ابلیس سے کام لیتے ہیں۔چنانچہ تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل اور نو آموزانِ علم و فن کے لیے ان کا کلام بالخصوص غارتگرِ ایمان و آگہی، رہزنِ تمکین و ہوش اور خانہ براندازِ گلشنِ دل ہوتا ہے؛ اگرچہ ان کے کلام کا زہر ہلاہل پیر و جوان اور مرد و زن سب کے قلوب میں سرایت کر دینے کی تاثیر رکھتا ہے۔شیطان اس پر ہی بس نہیں کرتا بلکہ ان کے کلام کو اپنی جمالیاتی فریب کاری و جعلسازی سے مزیّن کرکے دکھاتا اور ہر ممکن طریقے

سے اس کا چرچا کرتا ہے ؛ پھر ہر وادیِ علم و فکر میں طائرِ عقلِ انسانی کو پھنسانے کی خاطر اُن کے کلام کا دامِ ہمہ رنگ زمین بچھاتا ہے۔

کارل مارکسؒ کو تم جانتے ہی ہو کہ اس یہودی نژاد فلسفی نے "سرمایہ" نامی شہرۂ آفاق کتاب لکھ کر ایک ایسا عالمگیر مگر قبیح و شرانگیز انقلاب برپا کر دیا ہے، جس کے دُوررس و ہلاکت آفرین نتائج و عواقب سے نصف کے قریب اہلِ دُنیا حسن کو روحِ حق کور بن گئے ہیں ؛ اُن میں آرزوئے حُسن بے جان ہوگئی ہے اور وہ خدا آگاہ رہے ہیں نہ خود آگاہ۔ یاد رکھو! جو شخص اپنے اِلٰہ و رب کو بُھلا دیتا ہے وہ خود فراموش ہو جاتا ہے، جو اس کے کلمۂ کُن کی آوازِ رُوح پرور اور آوازِ خلق میں اس کی نوائے دلنشیں نہیں سنتا وہ بہرا ہو جاتا ہے۔ جانتے ہو مارکس دُنیا میں ایسا زبردست نفسیاتی۔ معاشرتی انقلاب لانے میں کیوں کامیاب ہوگیا؟ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس کے کلامِ قبیح و باطل میں حُسن و حق کی آمیزش بھی ہے۔ اس کی یہ بات سچ ہے کہ فرعونوں، ہامانوں، قارونوں اور آزروں نے ہر زمانے میں بنی نوع انسان کو اپنا محکوم و غلام بنا کر ان کا استحصال کیا اور وسائلِ پیداوار پر ناجائز قبضہ جما کر انہیں محروم و مفلوک الحال اور اپنا محتاج و دست نگر بنایا ہے۔ دین و مذہب کے نام پر بیگناہ انسانوں کو ہلاک و برباد، ذلیل و خوار اور جلاوطن کرنا ان کا شعار اور عورتوں کو کنیزیں اور ہوس کا نشانہ بنانا ان کا مشغلہ رہا ہے۔ دُنیا میں مفلسی و بیماری، محکومی و غلامی، ظُلم و استحصال، جہل و ناخواندگی، فتنہ و فساد، فحاشی و تعیّشات، جرم و عدوان، قتل و غارت، جنگ و جدل، شرک و بُت پرستی، بھوک، پیاس، بے گھری، بیگار، دست نگری، ذلّت و مسکنت، سود خواری و سود کاری، عداوت و مخاصمت، اکتناز و احتکار اور بخل و ناانصافی کی بنیادی وجوہ فرعونی و ہامانی اور قارونی و آزری ہیں، اور یہ شیطنت کے عناصرِ اربعہ ہیں۔ جب تک دُنیا میں شیطنت کے یہ عناصرِ اربعہ رہیں گے دُنیا جہنم بنی رہے گی۔ دنیا کو جنّت بنانا ہے تو ان عناصر کا استیصال ناگزیر ہے۔

سنو! بات ہر حال میں سچّی اور انصاف کی کہنی چاہیئے۔ مارکس کی یہ بات تو سچّی تھی، اور ہے؛ لیکن شیطان نے اپنی شکست و ناکامی کی بات سُنی تو اس نے اس کمہارت پر عمل کیا: سارا دھن جاتا

دیکھیے تو آدھا دیجیے بانٹ۔ چنانچہ اس نے مارکس کو "لا" کے ساتھ "اِلاّ" کے استیصال کا بھی مشورہ دیا۔ اس نے اپنے ابلیسی استدلال کے ذریعے مارکس کو قائل کر لیا کہ جب تک دنیا میں اللہ کا نام اور اس کا دین رہے گا، اس میں فرعون و آزر اور ہامان و قارون پیدا ہوتے رہیں گے؛ اور یہ شیطان رہیں گے تو دنیا میں دین و مذہب کے نام پر ظلم و استحصال ہوتا رہے گا اور بنی نوع انسان کنگال، بے گھر، بھوکے اور پیاسے رہیں گے۔ مارکس اور اس کے مُتّبعین شیطان کے اس استدلال سے بساطِ فکر پر مات کھا گئے۔ انہوں نے آئین و قوانین کے ذریعے خدا اور دین کو اپنے نظامِ زندگی سے خارج کر دیا اور اللہ تعالیٰ کے مقدّس نام کو شجرِ ممنوعہ قرار دے دیا۔

سنو! تمہیں پتے کی بات بتاؤں۔ مارکسیت یا اشتمالیت و اشتراکیت کے ماننے والوں نے شیطان کے جمالیاتی فریب میں آکر ایسا تو کر لیا، لیکن یہ بھول گئے کہ خدا ہی تو زندگی کا معنیٰ ہے اور اس کے بغیر زندگی بے معنی و لایعنی ہو جاتی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ جَلَّ شانہٗ ہی زندگی کا حُسن و نور اور طمانیت و سُرور ہے۔ وہ نہ رہے تو زندگی ان سے محروم ہو کر آتش بجاں ہو جاتی ہے اور آدمی شیطان بن کر اللہ تعالیٰ کا مغضوب و ملعون ہو جاتا ہے۔

یاد رکھو! جو شخص "آج" اپنے اِلٰہ و ربّ کو جانتا اور مانتا نہیں، "کل" مالکِ یوم الدّین اس سے اس طرح صرفِ نظر کرے گا کہ اس کی طرف دیکھے گا، نہ اس پر اپنا جلوہ ہی پیدا کرے گا؛ نیز نہ اس کی چیخ و پکار ہی سُنے گا اور اُسے آتشِ دوزخ میں جلنے، مرنے اور مر مر کے جینے کے لیے چھوڑ دے گا۔

یہ درست ہے کہ اشتراکی دہریوں نے اللہ تعالیٰ کو اپنے نظامِ زندگی سے نکال دیا، لیکن اُسے اپنے حِسّی۔ قلبی۔ نفسی نظام سے نکال نہیں سکے اور نہ نکال ہی سکتے ہیں، کیونکہ ایسا کرنا ان کے مقدور ہی میں نہیں۔ کیا تم جانتے ہو کہ انسان تو شیطان کو بھی اپنے حِسّی۔ قلبی۔ نفسی نظام سے باہر نہیں نکال سکتا؟ قلبِ انسانی اِلٰہِ جمیل و جلیل کا حُسنُ المآب ہے، بشرطیکہ وہ حسین ہو اور انسان کی آرزوئے اِلٰہ زندہ و فعّال ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ شیطان کا شرّ المآب ہوتا ہے۔

ایسے ہی انسان سے متعلق کہتے ہیں کہ اس میں شیطان کی روح حلول کر گئی ہے۔
اختراکی دھریے یہ بات تسلیم کریں یا نہ کریں، حقیقت یہ ہے کہ وہ تصورِ الٰہی کو اپنے دل و دماغ سے نکال نہیں سکتے۔ خوف و خطر، کرب والم اور مصائب و شدائد میں انہیں اضطراری طور سے خدایاد آجاتا ہے اور اس سے بے ساختہ فریاد و التجا اور اِستمداد کرنے لگتے ہیں۔
تم نے فرائڈ کا نام تو سنا ہوگا۔ کارل مارکس کی طرح اس کے اندر بھی روحِ شیطانی حلول کر گئی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنے تیغ کلام کے ذریعے انسان کی جمالیاتی حِس اور آرزوئے حُسن کو بے جان اور اُسے کور ذوق و حُسن کور بنانے، نیز اسے انسانیت کے ارفع و احسن مقام سے پھسلا کر لوزنیت اور شیطنت کے تحت الثرای میں گرانے کی کوشش کی ہے، جو انتہائی ناپاک و شرمناک، اخلاق کُش و انسانیت سوز، رہزنِ ایمان و آگہی اور غارتگرِ تمکین و ہوش ہے۔ فرائڈ نے قریب قریب ایسا ہی کردار ادا کیا ہے جیسا ابلیس نے آدمؑ و حوّا کو جنّت سے نکلوانے اور اسیرِ رنج و محن بنانے کی خاطر ادا کیا تھا۔ اُس نے اولادِ آدم کو اپنی شیطانی دلائل و براہین سے ہر جنسی شجرِ ممنوعہ سے لذت یاب ہونے کی ترغیب دی اور اس زور سے مطلق جنسی آزادی کا نعرہ بلند کیا کہ روحِ انسانیت کانپ اٹھی۔
فرائڈ انسان کو یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ زندگی کی تمام لذتیں اور ہنگامے "جنسی شجر" کے مرہونِ منت ہیں، جسے اہلِ ادیان نے "شجرِ ممنوعہ" قرار دے کر شخصی آزادی کو سلب کر لیا ہے اور یہ انسان پر ظلمِ عظیم ہے۔ وہ مطلق جنسی آزادی کا نقیب و علمبردار ہے، لہٰذا نکاح یا شادی کے ادارے کو شخصی آزادی کے منافی قرار دیتا ہے۔ وہ اس سلسلے میں حلال و حرام اور جائز و ناجائز میں امتیاز کرنے کا قائل نہیں، بلکہ شخصی آزادی کے نام پر اس عقیدے کی سخت مخالفت کرتا ہے۔ اس کا یہ قول جتنا مشہور ہے اتنا شرمناک و انسانیت سوز بھی ہے کہ محبت چاہے ماں کی ممتا ہو یا پدری شفقت، بہن بھائی کی الفت ہو یا مقدس رشتوں کی باہمی مودّت، جنسی جذبے سے عبارت ہے۔
فرائڈ کے اس ابلیسی قول نے مقدس انسانی رشتوں کی جس طرح تذلیل کی ہے، اُسے دیکھ کر تو ایک بار روحِ ابلیس بھی کانپ اُٹھی ہو گی۔

اس دور کے دو اور مفکر و اہلِ قلم، جن میں ابلیس کی روح کارفرما تھی، برٹرنڈ رسل[۳] اور سارترے[۴] ہیں۔ یہ بھی فرائڈ کی طرح "مطلق آزادی" کے نقیب اور خدا، دین اور انسانیت کے دشمن ہیں۔ ان کے کلام میں بھی "شیطانی روح" اپنی نمود رکھتی ہے، جس میں تقبیحی۔ نفسیاتی لمحہ پیدا کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے ان کا کلام قبیح و شر انگیز کلام کا نمونہ ہے، لیکن یہ شیطان اور اس کے متبعین ہیں جو اپنی جمالیاتی فریب کاری سے اُسے مقبول کرنے کی خاطر عالمگیر پیمانے پر اس کی تشہیر کرتے ہیں۔

یاد رکھو! ایسا کلام یا لٹریچر عقرب واقعی سے زیادہ مہلک اور مسلّح رہزن سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ناگ اور بچھو جسم کو ڈستے اور رگ و پے میں زہر گھولتے ہیں اور اس سے آدمی مرے بھی تو ایک بار ہی مرتا ہے۔ بخلاف اس کے قبیح کلام قلب و روح کو بار بار ڈستا رہتا ہے اور اس کا زہر ان میں اس طرح سرائیت کر جاتا ہے کہ آدمی اس کے اثرات کو اس دُنیا اور آخرت میں مسلسل محسوس کرتا اور بار بار جان کنی کی اذیتوں میں مبتلا ہوتا ہے، لیکن نہ مرتا ہے نہ لذّتِ زندگی سے آشنا ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح قبیح کلام رہزن سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ رہزن تو مال و دولت لوٹتا ہے اور یہ محض دنیوی ضیاع ہے، لیکن قبیح کلام جمالیاتی ثروت لوٹتا ہے اور اس طرح لوٹتا ہے کہ آدمی کو اپنے اس ناقابلِ تلافی ضیاع کا شعور تک نہیں ہوتا۔ کاش! تم سمجھ سکتے کہ جمالیاتی ثروت کا زیاں ہی زیانِ حقیقی ہے۔ اس لیے کہ اس کے بغیر جنّت نہیں ملتی؛ "دوست" نہیں ملتا، کچھ بھی نہیں ملتا۔

میری مانو! قبیح کلام سے اس طرح ڈرو جس طرح تم سانپ، بچھو اور رہزن سفّاک سے ڈرتے ہو۔ اس سے دور رہو اور اسے ہاتھ لگاؤ نہ دیکھو کہ اس کے لمس نظر سے نفس میں زہر سرائیت کر جاتا ہے، لیکن حسین و پاکیزہ کلام سے محبّت رکھو! اسے پڑھو، سنو اور اپنی زندگی میں جذب کر لو تاکہ اس کے مطابق زندگی کر سکو۔ جیسا کہ میں پہلے بھی تمہیں اس حقیقت سے آگاہ کر چکا ہوں، حسین و مطہر کلام کا احسن و اکمل نمونہ قرآنِ مجید ہے۔ یہ تمہارا بہترین رفیق و دوست،

ہمسفرو رہنما، معلّم و مُرشد اور طبیب و حکیم ہے۔ اس سے محبت کرو؛ اُسے صدق و خلوص سے پڑھو اور حسنِ عقل کے ساتھ چلتے پھرتے، اُٹھتے، بیٹھتے، لیٹتے اور کروٹیں بدلتے اس پر تدبر بالحق کرو اور ہمیشہ کرتے رہو۔ اس طرح اس کے اعجازِ اثر سے تمہارا بیمار و مردہ قلب بھلا چنگا، زندہ اور سیئات کے اثرات سے پاک و صاف ہو جائے گا۔ علاوہ بریں اس میں نورِ حسن پیدا ہو جائے گا اور پھر اس نورِ حسن کا سلسلۂ ارتقاء شروع ہو جائے گا۔

اس سلسلے میں ایک اور پتے کی بات بتاتا ہوں، جو سُنی سنائی نہیں، خود میرے مشاہدہ و تجربے کی بات ہے، اور وہ یہ ہے کہ قرآنِ حکیم ایک بے مثال و زندہ معلّم و مُرشد، مزکّی و مربّی اور طبیب و ہادی ہے؛ لیکن اُن کے لیے جو سچے اور مُخلص طالبِ علم ہوتے ہیں۔ مُخلص طالبِ علم وہ ہوتا ہے جو خالی الذہن ہو کر پورے اعتماد اور ایقان و اذعان اور ذوق و شوق کے ساتھ قرآنِ حکیم کا تلمیذ بنے اور اس کی ہر بات کو تسلیم کرنے اور اس پر عمل کرنے کا داعیہ رکھتا ہو۔ اگر تم اپنی نفسیاتی بیماریوں کا درماں اور نورِ باطنی کا ارتقاء چاہتے ہو؛ نیز اگر تم علم و حکمت اور عرفان و معرفت کی آرزو رکھتے ہو تو قرآنِ مجید کو اپنا مُعلّم و ہادی اور مرشد و طبیب بنالو، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قرآنِ مجید کو مضبوطی سے تھام لو وہ تمہیں راہِ راست پر چلا کر تمہاری منزلِ مقصود پر پہنچا دے گا۔ میں تم پر یہ راز بھی آشکارا کیے دیتا ہوں کہ اگر سچے فنکار کی تخلیقات میں اس کی روح نمود رکھتی ہے تو کلامِ الٰہی (= قرآنِ مجید) میں اللہ تعالیٰ کی روح کار فرما ہوتی ہے۔ یہ خود تمہارا اِلٰہ و ربّ ہے، جو اپنے کلام کے پردے میں تم سے کلام کرتا، تمہاری سیئات کو دُور کرتا، تمہارے نورِ باطنی کا نشوو ارتقاء کرتا اور تمہارا رفیق و ہمسفر اور محافظ و ہادی بنتا ہے۔

۴۔ رزقِ حسنہ :

کیا تم جانتے ہو کہ رزقِ حسنہ کی تمہاری زندگی میں کیا اہمیت ہے؟ میں جانتا ہوں کہ تم نہیں جانتے، لیکن تمہارا دعویٰ ہے کہ تم جانتے ہو۔ یہی تمہاری بھول ہے جو تمہیں ہلاکت و بربادی کی طرف

لے جا رہی ہے۔ تم اپنے آپ کو ترقی یافتہ سمجھتے ہو اور اس زعم میں مبتلا ہو کر تم نے علم و حکمت میں بہت ترقی کر لی ہے۔ اصل یہ ہے کہ تم نے علم و حکمت میں نہیں، سائنسی معلومات اور ٹیکنالوجی میں ترقی کی ہے، اور کر رہے ہو۔ یہ درست ہے کہ سائنسی معلومات اور ٹیکنالوجی بھی علم کے اہم اجزاء ہیں، لیکن علم تو اصل میں اس "فرقان" سے عبارت ہے، جس کے ذریعے انسان حسن و قبح، حق و باطل، حسنہ و سیئہ، خیر و شر، خوب و زشت اور حرام و حلال میں تمیز کرتا۔ اپنے آپ اور اپنے اِلٰہ و ربّ کو پہچانتا، اس کے احکام کو جانتا اور اس کے کلام پاک کے مطالب و معانی کو سمجھتا اور اس کے پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے اُسوۂ حسنہ کو معلوم کرتا ہے تاکہ اس کے مطابق زندگی کرے۔ اگر یہ سچ ہے اور یقیناً سچ ہے کیونکہ اس کو غلط ثابت کرنے کی تمہارے پاس کوئی منطقی دلیل نہیں تو پھر تمہیں تسلیم کرنا ہو گا کہ علم میں تم نے ترقیِ معکوس کی ہے۔ اس کا ایک بیّن ثبوت یہ ہے کہ تم میں رزقِ حسنہ اور رزقِ سیئہ میں تمیز کرنے کی صلاحیت قریب قریب مفقود ہو چکی ہے۔

کیا تم اس حقیقت سے کم آشنا نہیں کہ رزقِ سیئہ قلب و نفس کے لیے اسی طرح مضرت رساں مہلک ہے جس طرح مسموم غذا جسم کے لیے ہوتی ہے؟ تمہاری کم نصیبی کا ایک بنیادی سبب یہ ہے کہ تم اگر حسن و حق کو جانتے بھی ہو تو مانتے نہیں۔ تمہاری یاد دہانی کے لیے بتا دوں کہ رزقِ حسنہ کو شریعت میں رزقِ حلال اور رزقِ سیئہ کو رزقِ حرام کہتے ہیں۔

یاد رکھو! حُسن جس شے اور صورت میں ہو گا، اثر پیدا کرے گا، لہٰذا رزقِ حسنہ سے حواس، قلب اور نفس پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں، ایک تو وہ حُسن آفرین و جانفزا اور دوسرے قُبح ربا دماحیِ اثراتِ قبیحہ ہوتے ہیں۔ جمالیات کی اصطلاح میں اسے تحسینِ قلب اور مصلحۂ قرآنی میں تزکیۂ قلب کہتے ہیں۔ تزکیۂ قلب احسن و اکمل اور جامع و مانع اصطلاح ہے۔ اس میں تصفیہ و تحسین کے علاوہ اِحیاء اور نشو و ارتقاء کرنے کے قابل بنانے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

رزقِ حسنہ ایک تو وہ ہوتا ہے جو تاثیراً طیب اور شرعاً حلال ہو اور دوسرے اسے

حسین یا جائز و حلال طریقے سے حاصل کیا جائے۔ بخلاف اس کے ظلم و استحصال، اکتناز و احتکار، سود و سود کاری، فریب و دجل، عیاری و جعلسازی، کذب و خیانت، قمار بازی و رشوت ستانی نیز چوری، ڈکیتی، رہزنی، سمگلنگ، تجارتی بددیانتی (مثلاً کم تولنا، کم ماپنا، چیزوں میں ملاوٹ کرنا، ناجائز جلبِ منفعت، سودے کے مطابق چیزیں نہ دینا یا کم معیاری چیزیں دینا وغیرہ وغیرہ) سے حاصل کیا مال و دولت رزقِ سیئہ اور حرام ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں، وہ مال و دولت بھی رزقِ سیئہ اور حرام ہے جو زکوٰۃ، محصولات اور سرکاری واجبات ادا نہ کرنے سے بچایا جائے؛ نیز جو رزقِ طیب نہ ہو اور حرام ہو، مثلاً لحمِ خنزیر، مردار اور دیگر شرعاً حرام جانوروں کا گوشت، خون وغیرہ وغیرہ۔ وہ گوشت جس پر اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا ہو اور ذبیحہ نہ ہو حرام ہے۔ اس کے علاوہ، غیر اللہ کے نام کے ماکولات و مشروبات بھی حرام ہیں۔

یاد رکھو! رزقِ حرام سے قلب و نفس مختلف قسم کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں، جو مہلک بھی ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں، قلبی و نفسیاتی بیماریوں کی گرمی سے ان کے اندر آتش گیر مادہ پیدا ہو جاتا ہے، جو سیلاب کی صورت اختیار کر لے تو کشتِ حیات کو ویران کر دیتا ہے۔ مختصر یہ کہ رزقِ قبیحہ و حرام قلب کو اس کے نورِ حسن اور زندگی سے محروم کر کے قبیح و تاریک، مریض و نیم جان اور آتشِ بداماں بنا دیتا ہے۔

کیا تم جانتے ہو کہ رزقِ حسنہ کی بہترین قسم کون سی ہے؟ سنو! محنت و مشقت سے کمایا ہوا رزق۔ وجہ یہ ہے کہ محنت و مشقت (جسمانی ہو یا ذہنی) کی گرمی سے رزق میں روحِ حسن پیدا ہوتی ہے، جس کی بدولت قلب و نفس کا تزکیہ ہوتا ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ عہدِ رسالت مآبؐ میں اسلامی معاشرہ مثالی تھا۔ جانتے ہو کہ اس کی وجوہ و علل کیا تھیں؟ جمالیاتی۔ معاشی نقطۂ نظر سے اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کسبِ حلال کرتے اور فقط رزقِ حسنہ یا رزقِ حلال کھاتے اور کسبِ حرام و اکلِ حرام کے قریب بھی نہ جاتے تھے۔ اس کا نتیجہ تھا کہ عہدِ نبویؐ اور خلافتِ راشدہ

کے دور میں طبقات پیدا ہوئے نہ فرقے، کیونکہ معاشرے میں اسلام کے جمالیاتی معاشی قانونِ عدل و احسان پر سختی سے عمل ہوتا تھا، لہٰذا اس میں فرعونوں، ہامانوں، قارونوں اور آزروں کے بننے کی قطعاً گنجائش نہ تھی۔ خلافتِ راشدہ کے بعد اسلامی معاشرے میں ملوکیت پیدا ہوئی اور دولت کی ریل پیل ہوئی تو مسلمانوں میں ہوسِ تکاثر پیدا ہوئی اور اس کی تسکین کی خاطر اکتناز و احتکار، سلب و نہب اور استحصال و جلبِ منفعت کے جواز کے لیے شرعی حیلوں کی طلب و جستجو کا آغاز ہوا۔ اس کے نتیجے میں رزقِ قبیحہ اور حلال و حرام میں امتیاز کا معیار گرتے گرتے انتہا کو پہنچ گیا۔ یہ صورتِ حال معاشرے کے ان سرطانوں کے پیدا ہونے کے لیے ازبس سازگار تھی جنہیں قرآنِ حکیم نے تاریخ کے حوالے سے فرعون و ہامان اور قارون و آزر کے ناموں سے موسوم کیا ہے۔ ان معاشرتی سرطانوں نے عدل و احسان اور مواخات و رحمت کی بنیادوں پر استوار اسلام کے معاشی نظام کا استیصال شروع کر دیا اور اس کی جگہ انہوں نے ظلم و استحصال، جلبِ منفعت اور سلب و نہب کی اساساتِ باطلہ پر سرمایہ دارانہ نظام کو قائم کر دیا۔ ایسے غیر فطری نظام میں جس کی بنیاد ظلم پر استوار ہو، تضادات و اختلافات، تشتت و افتراق اور ذہنی انتشار و طبقاتی کشمکش، نیز فتنہ و فساد کا پیدا ہونا، ایک فطری عمل ہے، جسے تاریخی عمل سے بھی تعبیر کر سکتے ہو۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ افرادِ معاشرہ میں آرزوئے حسن و حیات برائے نام رہ جاتی ہے اور ان کی ثقافتِ حسن و زندگی اور امن و سلامتی سے محروم ہو جاتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ رزقِ حسنہ اور نفس کے جمالیاتی اِرتقاء کا آپس میں گہرا تعلق ہے، اور جمالیاتی اِرتقاء سے مراد نورِ ذاتِ انسانی کا اِرتقاء ہے۔ شاید تم اس راز سے آشنا نہیں کہ انسان کے حسی، قلبی، نفسی نظام کا ہر جزء، اپنا ایک نظام رکھتا ہے، جس کے حسنِ کارکردگی کا انحصار اس کے نور پر ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ نور میں روشنی و توانائی اور حرارت و قوت ہوتی ہے جو نفس کے نظامِ کلی کے اندر ہر نظام کی فعالیت و حسنِ کارکردگی کی ایک پیش شرط ہے؛ اور خود نور کے نشو و ارتقاء کی پیش شرط رزقِ حسنہ ہے۔

۵ - حسنِ ذکر و فکر :

یہ تزکیۂ قلب کا ازبس مُؤثّر ذریعہ ہے۔ اس کا مطلب ہے اپنے اِلٰہ و ربّ کی یادِ مدامؒ اس کی حمد و ثنا، تحمید و تہلیل اور تکبیر و تسبیح؛ نیز اس کے حوالے سے اپنے نفس اور آفاق میں مسلسل تدبّر بالحق کرنا۔ ایسا کرو تو سہی، تمہیں نہ صرف اپنے سوالوں کے جواب مل جائیں گے، بلکہ تم پر اور بھی حقائق منکشف ہوں گے اور ہوتے رہیں گے۔ حُسنِ ذکر و فکر سے آئینۂ قلب مُصفّا ہو کر آفاق نما بلکہ دہر نما بن جاتا ہے، جس میں خود چشمِ قلب وہ کچھ دیکھ سکتی ہے جس کا تم قیاس تک نہیں کر سکتے۔ اس آئینۂ قلب میں عالمِ زمان و مکان کے حقائق کے علاوہ دہر و لامکان کے حقائق بھی اپنا جلوہ پیدا کرتے ہیں، لیکن ان کے لیے جن میں آرزوئے حسن غایت درجہ فعّال و حرکی ہوتی ہے۔

اگر تم یادِ الٰہی کی حقیقت و اہمیت سے آگاہ ہوتے تو تمہاری بات نہ بن گئی ہوتی؟ تُم اپنے معروضِ حسن و عشق کے دوست و مقرّب، شاہد و منظورِ نظر، صاحبِ حسن و سرور اور اہلِ جذب و شوق نہ ہوتے؟ یہ ہے اس کی حقیقت و اہمیت۔ "دوست" کی یاد میں اہلِ جذب و شوق کے لیے قُرّۃُ العین ہوتی ہے؛[۵] اور اس کا مطلب ایسی طمانیت انگیز و سرور آفرین اور روح پرور و وجد انگیز ٹھنڈک ہے، جو جس قدر شدید ہو اتنی ہی زیادہ طمانیت و مسرّت، کیف و سرور اور حیرت و مستی دیتی ہے۔ تم اس کی توجیہہ معلوم کرنا چاہتے ہو تو سنو! اللہ تعالیٰ الحسن ہے، اس لیے اس کی یاد میں تاثیرِ برقِ حسن ہے۔ دوسرے یہ اہلِ ذکر کے لیے اپنے حقیقی معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود یا معروضِ حسن و عشق کی یاد ہوتی ہے، اس لیے اس میں عشق کا سوز و ساز، جذب و مستی اور ذوق و شوق ہوتا ہے۔ تیسرے، اہلِ جذب و شوق جب اُسے "یاد کرتے ہیں تو "وہ" بھی انہیں یاد کرتا ہے۔ ذرا سوچو تو سہی کہ ربِّ ذوالجلال والاکرام کا اپنے بندوں کو یاد کرنا کتنی بڑی بات ہے۔ یہ وہ بات ہے جس سے زندگی بنتی ہے،

بات بنتی ہے، دنیا اور آخرت بنتی ہے۔ "دوست" ملتا ہے اور جسے دوست مل جائے وہی تو مثالی انسان ہوتا ہے۔ "دوست" کا ملنا ہی مقصودِ حیات، غایتِ دین اور رضائے "دوست" ہے۔ "دوست" مل جائے تو سب کچھ مل جاتا ہے۔ "دوست" کو یاد تو کرو! اس کی آرزو تو کرو! اس کی تلاش میں سعی و جہد تو کرو۔ اس کا پہلا فائدہ یہ ہے کہ جمالیاتی ثروت ملتی ہے، جو بہائے جنّت الفردوس ہے؛ نیز اس سے سینے میں لگی ہوئی آتشِ خوف و حزن سرد پڑجاتی ہے اور آتشکدۂ دل گلزار بن جاتا ہے۔

غور سے سنو! میں تمہیں ایک اور راز کی بات بتاتا ہوں۔ بندہ جب اپنے اِلٰہ و ربّ کو یاد کرتا ہے تو وہ بھی اپنے بندے کو یاد کرتا ہے اور اس یادِ باہمی میں تاثیرِ برقِ حسن ہوتی ہے، جس سے نہ صرف سیّئات دُور ہوجاتی ہیں بلکہ حسنات میں تبدیل ہوجاتی ہیں، اور حسنات میں معتدبہ اضافہ اس پر مستزاد ہوتا ہے۔

یادِ الٰہی کی تاثیرِ برقِ حسن تزکیۂ قلب و نفس کا بہترین ذریعہ ہے۔ تزکیہ کی اہمیت اس سے بہت زیادہ ہے جو عام طور سے سمجھی جاتی ہے۔ اس سے حسّی، قلبی اور نفسی قوتیں نشوونما اور ارتقاء کرنے لگتی ہیں اور اس میں انسان کی ذات کی تکمیل کا راز مضمر ہے۔ علاوہ بریں، تزکیہ سے نہ صرف انسان کا باطنی نظام منوّر ہوجاتا ہے، بلکہ اس کے نور کی تکمیل و ترقی کا سلسلہ بھی شروع ہوجاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ تکمیل نقطۂ کمال پہ دلالت کرتی ہے، لیکن کمال متناہیت سے عبارت نہیں، بلکہ کمالِ نو کا نقطۂ آغاز ہوتا ہے، اور یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ بہرحال، یادِ "دوست" حرزِ جاں بن جائے تو قلبِ ذاکر "دوست" کا حسن المآب بن جاتا ہے اور "وہ" اس میں بس جاتا ہے۔ "دوست" زندگی میں آجائے تو بات بن جاتی ہے، اور وہ اپنے بندے کو اپنی جنّت کا وارث اور اس کا حسن المآب بنا دیتا ہے، جہاں وہ اسے اپنا مہمان بنا کر رکھے گا۔ کیا اس سے بڑھ کر کوئی اور نعمتِ عظمیٰ ہوسکتی ہے؟ سنو! جنّت ہی میں تمہیں اپنے "دوست" کی ہم نظری و ہمکلامی اور حضوری و ہم رضائی کی رحیقِ مختوم ملے گی، جس کی لذت و مستی اور

کیف و سرور کا کوئی متنفس یہاں تصور تک نہیں کر سکتا۔

۶۔ آرزوئے حسن :

میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ جو تمہارا ربّ رحمٰن و رحیم ہے، الحسن والحق ہے، اُس نے تمہارا اِلٰہ یا معروضِ حسن و عشق بننے کی خاطر تمہیں اپنی آرزو ودیعت کی ہے اور یہ امر تمہارے حسن سے محبت کرنے اور خوب سے خوب تر کی طلب و جستجو میں رہنے کی علتِ غائی ہے، لیکن تمہارا المیہ یہ ہے کہ تمہارا حریفِ قدیم۔ پیدائشی اپنی وسوسہ اندازی اور جمالیاتی فریب کاری کے ذریعے زشت کو خوب اور قبیح کو خوشنما و نظر فریب بنا کر دکھاتا رہتا ہے اور تم اس کے اس جمالیاتی دھوکے میں اکثر وہ کچھ کرتے رہتے ہو، جسے کفر و شرک، جرم و گناہ، ظلم و استحصال، سیئہ و شر اور فحشا و منکر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک تو تمہارے قلب کا نورِ حسن سلب ہو تا جاتا ہے، دوسرے تمہاری آرزوئے حسن ضعیف و مضمحل ہوتی جاتی ہے اور اگر یہ سلسلہ جاری رہے تو وہ تمہارے نفسِ امارہ کی خواہشات کے تلے دب کر رہ جاتی ہے۔ تیسرے، تمہاری جمالیاتی حس فعال نہیں رہتی اور تمہارا جمالیاتی ذوق بگڑ جاتا ہے۔ چوتھے، تم کور ذوق و حسن و کور بن جاتے ہو۔ قرآنِ مجید کی الہامی زبان میں تم اندھے، بہرے اور گونگے حیوان بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے حیوان بن جاتے ہو۔

یاد رکھو! شیطان ہمیشہ اور ہر وقت اس تاک میں رہتا ہے کہ اسے تمہیں سبز باغ دکھانے کا موقع مل جائے اور اس طرح آرزوئے حسن کو تمہارے دل سے نکال دے یا اسے بے جان بنا دے۔ چونکہ وہ ایسا نہیں کر سکتا، لہٰذا وہ اُسے تمہاری نفسانی خواہشات کے تلے دبا دیتا ہے۔ آرزوئے حسن اس بارِ گراں کے نیچے سسکتی، تڑپتی اور آزاد ہونے کے لیے مچلتی اور کوشش کرتی رہتی ہے؛ نیز اپنی رہائی کے لیے جمالیاتی۔ نفسیاتی لمحے کی منتظر رہتی ہے۔

جانتے ہو جمالیاتی۔ نفسیاتی لمحہ کب اور کیسے آتا ہے اور اس کی اہمیت کیا ہے؟ سنو! میں

تمہیں بتاتا ہوں۔ یہ لمحہ ایسی صورتِ حال میں آتا ہے جب ایک طرف آرزوئے حُسن زندانِ ہوائے نفس سے آزاد ہونے کے لیے سخت مضطرب وبیقرار ہو اور دوسری جانب برقِ حُسن نظامِ باطنی میں دفعتاً اس طرح گرے کہ زندانِ ہوائے نفس کو تہس نہس اور آرزوئے حُسن کو آزاد کردے۔ آرزوئے حُسن کی آزادی کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگا سکتے ہو کہ اس سے جمالیاتی حِس زندہ وفعّال ہوجاتی ہے اور انسان صاحبِ ذوق وحُسن شناس بنتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جمالیاتی۔ نفسیاتی لمحے کے وقوع پذیر ہونے سے خواہشاتِ نفسانی کا حصار منہدم ہوتا ہے تو قلب۔ سے ان کے اثراتِ قبیحہ وتاریکی بھی محو ہوجاتے ہیں اور وہ اپنی فطری حسین ومنیر حالت پر لوٹ آتا ہے اور ساتھ ہی حسّی قلبی۔ نفسی نظام اپنے فطری وظائف احسن طریق سے سرانجام دینے لگتا ہے۔ علاوہ بریں، آرزوئے حُسن آزاد ہوجائے تو انسان میں حُسنِ عمل کا داعیہ پیدا ہوتا ہے، جو عادل ومحسن اور اہلِ درد ورحمت بننے کی پیش شرط ہے۔ اصل یہ ہے کہ جمالیاتی۔ نفسیاتی لمحے کا وقوع پذیر ہونا اور آرزوئے حُسن کا آزاد ہونا تزکیۂ قلب کے آغازِ عمل پہ دلالت کرتا ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حیاتِ انسانی میں جمالیاتی۔ نفسیاتی لمحے کے وقوع پذیر ہونے سے نفس میں حسین یا جمالیاتی انقلاب آتا ہے، جس سے آرزوئے حُسن وحیات زندہ وفعّال ہوجاتی ہے اور یہ پیش شرط ہے قوم کے جمالیاتی۔ مادّی انقلاب کی۔

۷۔ محبّت ورحمت :

یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حُسن کا خاصّہ محبّت اور محبّت کا خاصّہ رحمت ہے، اس لیے محبّت ورحمت میں تاثیرِ تحسین وتزکیہ پائی جاتی ہے۔ رحمت کی بنیاد محبّت ہے اور اس سے مراد جنسی محبّت نہیں، جمالیاتی محبّت ہے، جو اس اعتبار سے آفاقی وہمہ گیر ہے کہ اس سے مراد محبّتِ الٰہی بھی ہے اور اس کے حوالے سے اس کی جملہ جمیل وجلیل مخلوقات کی محبّت بھی ہے۔

کیا تم جانتے ہو کہ رحمت کسے کہتے ہیں؟ جمالیاتی محبت قوت سے فعل میں آئے اور احسان و ایثار اور قربانی کی صورت اختیار کرے تو اُسے "رحمت" سے تعبیر کرتے ہیں۔

جیسا کہ تم جانتے ہو محبت ضد و نقیض ہے نفرت کی اور نفرت قلب کی خطرناک بیماری ہے، جس سے حسد و بغض اور عداوت و مخاصمت ایسے مہلک امراض اسے لاحق ہو جاتے ہیں۔ یہ نفسیاتی امراض حسن رُبا، قبح آفریں اور ہلاکت دا آفریں ہوتے ہیں۔ قلب حسن و نور اور زندگی و سعادت سے محروم ہو جائے تو اصطلاحِ قرآنی میں قلب پر مُہر (ختم) اور چھاپ (طبع) لگنا کہتے ہیں۔ قلب، زمین کی طرح مرتا ہے، لہٰذا جس طرح بارانِ رحمت سے مردہ زمین زندہ ہو جاتی ہے، اسی طرح جمالیاتی۔ نفسیاتی لمحہ کی وقوع پذیری سے اس میں زندگی، قوتِ نشوونما اور نورِ حسن پیدا ہو جاتا ہے؛ اسی لیے ربِ رحمٰن و رحیم کی مغفرت اپنے بندوں کی موت تک ان کی توبہ کی منتظر رہتی ہے۔ دُعا بھی جمالیاتی۔ نفسیاتی لمحہ پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے، بشرطیکہ خشوع و خضوع اور پورے ایقان و اعتماد کے ساتھ مانگی جائے۔ توبہ میں قلب کا اپنی فطری حسین حالت پر لوٹ آنے کی آرزو کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے توبہ آرزوئے حسن ہی کی ایک ایسی صورت کا نام ہے جس میں حسین بننے کے داعیہ و عزم کے ساتھ دُعا و عہد بھی پائے جاتے ہیں۔ داعیہ و عزم انسان کے اندر پیدا ہوتے ہیں اور دُعا، عہد وہ اللہ تعالیٰ سے کرتا ہے۔ توبہ میں خلوص و صدق ہو تو اسے توبۃ النصوح کہتے ہیں۔

محبت کی تاثیر میں جمالیاتی سوز پایا جاتا ہے، جس سے قلب کے امراض کو شفا ہوتی ہے اور اس کا احیاء و تحسین اور تزکیہ ہوتا ہے۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تزکیہ میں تصفیہ و تحسین کے ساتھ نشوو ارتقاء کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے، جس سے حقیقت میں نورِ قلب کا ارتقاء مراد ہوتی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ دُعا سکھائی ہے:

رَبَّنَآ اَتۡمِمۡ لَنَا نُوۡرَنَا وَاغۡفِرۡ لَنَا ۚ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ○ (التحریم ۶۶:۸): اے ہمارے پروردگار! ہمارے نور کی ہمارے لیے تکمیل کر دے اور ہماری حفاظت فرما۔ بلاشبہ تو ہر چیز پر قادر ہے۔

جانتے ہو جمالیاتی سوز کا مطلب کیا ہے؟ میں بتاتا ہوں۔ جمالیاتی محبت میں الحسن جو انسان کا حقیقی معروضِ حسن و عشق ہے، اس کا اور اس کی حسین مخلوقات کا غم ہوتا ہے۔ علاوہ بریں، اس میں تب و تابِ جاودانی اور درد و سوزِ آرزو مندی پایا جاتا ہے۔ ان میں حسن کی آمیزش ہونے کی بنا پر اُن کے لیے جمالیاتی سوز کی تعبیر اختیار کی ہے۔ حسن قرۃ العین ہے، اس لیے جمالیاتی سوز میں جمالیاتی ٹھنڈک پائی جاتی ہے، جو دل کو لگی آتشِ خوف و حزن کو ٹھنڈا اور اُسے طمانیت و سرور کی ٹھنڈک سے سرشار کر دیتی ہے۔

محبت کا ردِ عمل بھی محبت ہوتا ہے۔ محبت کرو تو محبت ملتی ہے اور اس کا دائرہ جتنا وسیع ہوگا اسی قدر محبت ملے گی۔ محبت آفاقی ہو جائے تو ذاتِ انسانی میں بھی آفاقیت پیدا ہو جاتی ہے اور نورِ محبت سے معمور و منیر ہو جاتی ہے۔ آفاقی محبت کی بدولت انسان خود بھی آفاقی و لافانی ہو جاتا ہے۔ اس میں جمالیاتی سوز و سرور ملتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اہلِ عشق کو اُن کا معروضِ حسن و عشق ملتا ہے۔ ظاہر ہے جن خوش نصیبوں کو ربّ و الٰہ مل جائے انہیں سب کچھ مل جاتا ہے۔

کائنات احسن الخالقین کی جمالیاتی تخلیقی فعلیت کا شہکار ہے۔ وہ جمیل و جلیل، دلکش و سرور انگیز اور نظر افروز و روح پرور تصاویر کا مسحور کُن مرقع ہے، لیکن اُن کے لیے جو اُسے محبت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ محبت ہو تو کائنات انسان کے لیے جمالیاتی ثروت کا خزینہ ہے۔ یہ امر اس حقیقت پہ دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ربِّ جمیل و جلیل اور رحمٰن و رحیم ہے۔ اس کی رحمت تو ہر چیز کو محیط ہے، لیکن تم ہی ظالم و جاہل اور غافل و زیاں کار ہو کہ جمالیاتی ثروت کے اس لامتناہی خزینے سے اپنا ظرفِ زندگی بھرتے نہیں بلکہ محروم رہتے ہو۔ وجہ یہ ہے کہ تمہارے دل میں جمالیاتی محبت کی شمع فروزاں نہیں۔ اس کے نور ہی سے تم حسن کا مشاہدہ کر سکتے ہو۔ جمالیاتی۔ ورائی مشاہدات جنہیں تم روحانی مشاہدات سے تعبیر کرتے ہو، اسی نور کے مرہونِ منت ہوتے ہیں۔ آرزوئے حسن زندہ و حرکی ہو تو محبت کی شمعِ خاموش فروزاں ہوتی ہے اور اس کے نور سے جذب و شوق پیدا ہوتا ہے۔ ایسے ہی اہلِ جذب و شوق ہر عالم کے لیے رحمت بنتے ہیں۔

تم مجھ سے بہت سوال پوچھتے ہو، میں بھی تم سے ایک سوال پوچھتا ہوں۔ سوچ کر جواب دینا۔ بغیر سوچے سمجھے جواب دو گے تو وہ درست نہ ہوگا۔ اس لیے کہ سوال جتنا آسان ہے اس کے جواب کے متعلق تم اتنی ہی زیادہ غلط فہمی میں مبتلا ہو۔ سوال یہ ہے کہ کیا تم اپنے آپ سے محبت کرتے ہو؟ اس سے یہ ضمنی سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا تمہیں اپنے اہل و عیال، معاشرے قوم و ملک، دین و ملت اور رب والد سے محبت ہے؟ میں جانتا ہوں کہ تم ان دونوں سوالوں کا جواب اثبات میں دو گے تمہیں میرا پہلا سوال تو بڑا ہی عجیب بلکہ مضحکہ خیز لگا ہوگا۔ وجہ یہ یہ ہے کہ تم شیطان کی وسوسہ اندازی و جمالیاتی فریب کاری کے باعث اس غلط فہمی کے شکار ہو کہ تم اپنے آپ سے محبت کرتے ہو۔ تم اپنے آپ سے کہتے ہو کہ کیا دنیا میں کوئی ایسا شخص بھی ہوگا جسے اپنے آپ سے پیار نہ ہو؟ اسی لیے یہ سوال تمہیں مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ تم میں سے بہت کم ہیں جو اپنے آپ سے سچی محبت کرتے ہیں۔ اپنے آپ سے سچی محبت کرنے والوں کی ایک نشانی یہ ہوتی ہے کہ وہ مؤمن و موحد، محسن و صالح اور صادق و امین ہوتے ہیں۔ وہ عباد الرحمٰن ہوتے ہیں، عباد الشیطان نہیں ہوتے۔ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں سے سچا سودا کرتے ہیں۔ وہ کسبِ حلال کرتے ہیں اور حلال روزی سے اپنی اور اپنے اہل و عیال کی پرورش کرتے ہیں۔ وہ کسبِ حرام سے اپنی اور اپنے اہل و عیال کی خودی کو حُسن، زندگی اور طمانیت کی ٹھنڈک سے محروم نہیں کرتے۔ یاد رکھو! یہ محرومی انسان کو اہلِ نار بناتی ہے، اس دُنیا اور آخرت دونوں میں۔ اب تم ہی بتاؤ کہ دُنیا میں کتنے لوگ ہیں جو مؤمن و موحد بھی ہیں اور صادق و صالح اور محسن و امین بھی، اور رزقِ حلال پر انحصار کرتے ہیں؟

کیا دُنیا میں فرعون و ہامان اور قارون و آزر نہیں؟ کیا مجرم و گناہگار نہیں؟ کیا فحشا و منکر کی گرم بازاری نہیں؟ کیا تم بنی نوعِ انسان اور مخلوقات کی ہلاکت و بربادی کے لیے طرح طرح کے ایٹمی بم اور آلات تیار نہیں کر رہے؟ اگر ان سوالوں کا جواب اثبات میں ہے اور یقیناً ہے تو پھر تم کیسے دعویٰ کر سکتے ہو کہ تمہیں اپنے آپ سے پیار ہے؟ یاد رکھو! کافر و مشرک، ظالم و مجرم

اور مفسد و سیاہ کار کبھی اپنا، اپنے اہل و عیال، ملک و قوم اور دین و ملت کا دوست نہیں ہوتا۔ زندگی کا کوئی گوشہ ہو، اس میں توازن و ہم آہنگی اور امن و سلامتی میں خرابی اور تضاد و تخالف اور فتنہ فساد پیدا کرنے والے نہ صرف اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوقات کے بلکہ خود اپنے بھی دشمن ہوتے ہیں۔ اگر تم لوگوں سے عدل و احسان نہیں کرتے، بلکہ ان پر مظالم توڑتے اور ان کا استحصال کرتے ہو؛ اگر تم فرعونی و ہامانی اور قارونی و آذری کرتے ہو تو سمجھ لو کہ تم اپنے دشمن ہو اور جو شخص اپنا دشمن ہو، وہ اپنے اہل و عیال، ملک و قوم، دین و ملت، اور کُل عوالم کا؛ نیز اللہ اور اس کے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سب کا دشمن ہوتا ہے۔ یہ پتے کی بات ہے، یاد رکھو کہ جو شخص دُنیوی و اُخروی حسنہ کا طلبگار نہیں، جسے عذاب النّار کا خوف نہیں اور اپنے آپ کو اس سے بچانے کی کوشش نہیں کرتا، یقیناً وہ اپنے آپ کا دوست نہیں، بلکہ دشمن ہے۔ وہ بشر کی صورت میں شیطان ہوتا ہے۔ اب تو تمہیں یقین ہو گیا ہوگا کہ تم اپنے دوست نہیں، دشمن ہو۔ تم کسی کے بھی دوست نہیں۔ اپنے آپ سے محبت کرنا سیکھو! اپنے آپ سے محبت کرو، پھر تم اپنے اہل و عیال اور دوسروں سے محبت کر سکو گے، اور اللہ تعالیٰ کے بندے بن سکو گے۔ انسان صرف ایک ہستی کا بندہ بن سکتا ہے، رحمٰن کا یا شیطان کا۔ اب فیصلہ تم نے کرنا ہے کہ تم کس کے بندے بننا چاہتے ہو؟ ظاہر ہے اگر تمہیں اپنے آپ سے سچی محبت ہے تو تم بندۂ رحمٰن بنو گے اور جنّتِ نعیم کی ابدی و خالص زندگی حاصل کرنے کی طلب و جستجو اور سعی و جہد کرو گے۔ بخلاف اس کے اگر تم بندۂ شیطان بنو گے تو تمہیں جہنم میں رہنا ہوگا جہاں عذاب النّار کی شدت سے تم نہ زندوں میں ہو گے نہ مُردوں میں[۸]

یہ بات جتنی مشہور ہے اتنی سچی بھی ہے کہ جو شخص اہلِ زمین پر رحم کرتا ہے، صاحبِ عرشِ بریں اس پر رحم کرتا ہے[۹]۔ برخلاف اس کے جو فرعون و ہامان اور قارون و آذر لوگوں پر ظلم اور ان کا استحصال کرتے ہیں، ربِّ جلیل اُن کے لیے جبّار و قہّار اور ذوانتقام بن جاتا ہے۔ یہ سُنّتِ الٰہی ہے، قدرت کا قانونِ مُجازات ہے۔ یاد رکھو! ظُلم میں قبح کی ظلمت ہوتی ہے، اسی لیے

ظُلم کو اندھیر کہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ظُلم سب سے پہلے ظالم کی دُنیا کو تاریک کرتا ہے اور اس کا حسّی، قلبی، نفسی نظامِ حُسن کی روشنی، توانائی اور زندگی سے محروم ہو کر جمود و تعطل کا شکار ہو جاتا ہے۔ ظالم حُسن کور و کورِ ذوق، اندھا، بہرا اور گونگا بن جاتا ہے۔ یاد رکھو! یہ نورِ حُسن ہے، جس کے ذریعے تم حُسن کا سمعی و بصری بلکہ ہر قسم کا حسّی، قلبی اور نفسی مشاہدہ کرتے ہو۔ اس ضمن میں یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ انسان کے باطنی یا حسّی، قلبی، نفسی نظام میں قلب کی حیثیت مُنیری اور حواس و نفس کی مُستنیری ہوتی ہے۔ چنانچہ قلب مُنیر ہو تو اُس کے نُور سے حواس کسبِ نور کرتے اور منوّر و مُنیر بنتے ہیں۔ یہ نورِ حُسن ہے جو ذوقِ سمع و نظر پیدا کرتا اور انسان کو صاحبِ ذوق و شوق بناتا ہے۔ اس سے حیاتِ انسانی میں قلبِ مُنیر کی غیر معمولی اہمیت کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہو۔ بہر حال، یہ بات یاد رکھو کہ تنویرِ قلب کا ذریعہ تزکیہ ہے، جس کا ایک مؤثر ذریعہ محبّت و رحمت ہے۔

سنو! میں تمھیں رحمۃ للعالمینی کا سرِّ نہانی بتاتا ہوں اور وہ ہے اپنے اندر ربّ العالمین کا خُلقِ ربوبیّت و رحمت پیدا کرنا اور ہر گوشۂ حیات میں اس کا عملاً اظہار کرنا۔ جُملہ افرادِ نسلِ انسانی کے لیے رحمت بننا تمہارا بنیادی فریضۂ آدمیّت ہے، لیکن تُم خلیفۃُ الارض ہو، لہٰذا کُل عوالم کی ربوبیّت کا انتظام کرنا بھی تمہارے فرائضِ منصبی میں شامل ہے۔ کاش تم لوحِ عصر پڑھتے اور اس پر تدبّر بالحق کرتے تو تم پر یہ حقیقت منکشف ہوتی کہ جو قوم عالمِ انسانی کے لیے رحمت ہوتی ہے وہ حیوانی، نباتاتی اور جماداتی عوالم کے لیے بھی رحمت ہوتی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ عالم الگ الگ ہونے کے باوجود لاینفک طور سے مربوط ہیں۔ مثال کے طور پر تم جنگلات لگاتے اور ان کی حفاظت کرتے ہو تو بیک وقت فضا و زمین یعنی جمادات، نباتات، حیوانات اور بنی نوعِ انسان کی ربوبیّت کرتے اور ان کے لیے رحمت بنتے ہو۔ غور کرو تو جنگل جنّت ہے۔ ان میں انواع و اقسام کے چوپائے، طیور، آبی جانور اور حشرات الارض رہتے ہیں۔ ان میں سے طرح طرح کے پھل، جڑی بوٹیاں، اناج،

جانور، لکڑی اور گوشت حاصل کرتے ہو۔ یہ زمین کو آندھیوں اور سیلابوں سے محفوظ رکھتے اور زرخیز بناتے ہیں۔ ان کی بدولت بارش ہوتی ہے، جس سے زندگی کے ہنگامے وابستہ ہیں۔ تمہیں متمدن و مہذب بنانے، تم میں جمالیاتی ذوق کا نشوو ارتقاء کرنے اور تمہاری ثقافتی، اقتصادی اور سیاسی و عسکری زندگی میں جمال و جلال پیدا کرنے میں جنگلات نے جو عظیم کردار ادا کیا ہے اس کی اہمیت اس سے بہت زیادہ ہے، جو سمجھتے ہو۔ تاریخ شاہد ہے کہ جن قوموں نے جنگلات کی حفاظت اور نشوونما کا مناسب انتظام نہ کیا، ان کی معیشت پر اس کے منفی اثرات مرتب ہوئے اور جنگلات کی بربادی کے ساتھ ان کی معیشت بھی تباہی سے نہ بچ سکی اور وہ ثقافتی اور عسکری ہر لحاظ سے کمزور اور پس ماندہ ہو گئیں۔ اس طرح زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے کے قابل نہ رہیں تو سیلِ زمانہ انہیں خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے گیا۔ ترقی یافتہ اقوام بالخصوص سِرِ رحمۃ للعالمینی سے آگاہ ہوئی ہیں تو جنگلوں، سمندروں، دریاؤں، پہاڑوں، صحراؤں، اراضی اور فضاؤں کے تحفظ اور ان کی مخلوقات کی ربوبیّت کے نظام کی ضرورت پر زور دینے لگی ہیں۔

تم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہو۔ کیا تم نے اُمتّی ہونے کی حیثیت سے یہ بات معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ اپنے نبی، سیّد المرسلین اور رحمۃ للعالمینؐ کا اُسوۂ حسنہ یا سُنّتِ حسنہ کا خلاصہ رحمۃ للعالمینی ہے۔ آپؐ کو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجنے کی علتِ غائی یہ ہے کہ آپؐ کے تتبّع میں تم سب انسان کُل جہانوں کے لیے رحمت بن جاؤ۔ اگر تم اپنے اِلٰہ و ربّ کی مخلوقات کے لیے رحمت بننا چاہتے ہو تو یہ بات رکھو کہ خُلقِ عظیم ہر حال میں رحمۃ للعالمینی کی پیش شرط ہے۔ اس کا مطلب واضح ہے کہ وہی شخص دوسروں کے لیے رحمت بن سکتا ہے جس کے اخلاق حسین و عظیم ہیں۔ بدکردار شخص تو اپنے لیے بھی رحمت نہیں ہوتا وہ دوسروں کے لیے رحمت کیسے بن سکتا ہے؟ صاحبِ خُلقِ عظیم بننے کے لیے تزکیۂ قلب ناگزیر ہے؛ لہٰذا ایک طرف اپنے خُلق کی تحسین و ترفیع کرنے اور دوسری جانب اپنے اندر محبّت کی شمعِ خاموش کو فروزاں کرنے کی سعی و جہد کرو؛ دوسروں کا غم کھانا، ان کا درد محسوس کرنا، اُن سے ہمدردی و غمگساری اور عدل و احسان کرنا سیکھو! اپنی

نجالت و قساوت کو دُور کرنے اور ظرفِ دل کو کُشادہ کرنے کی خاطر اپنے اِلٰہ و رب کی راہ میں یعنی اس کی مخلوقات کی فلاح و بہبود اور نشوو ارتقاء کی خاطر مال و دولت خرچ کرنا، ایثار و قربانی کرنا اور دوسروں کے کام آنا سیکھو۔ الغرض، پہلے اپنے دل میں اور پھر دوسروں کے دلوں میں حُسن و زندگی، طمانیت، وحسنہ اور حُسنِ انقلاب کی آرزو کو زندہ و فعّال کرنے کی سعی و جہد کرو اور ہر زمان و مکان کے مثالی انسان و رحمۃ للعالمینؐ کے اُسوۂ حسنہ کے مطابق کرو۔

۸۔ توبہ و دُعا:

کاش تمہیں اس حقیقت کا علم الیقین ہوتا کہ تمہارا اِلٰہ و رب رحمان و رحیم اور غفور و توّاب ہے اور توبہ و دُعا کو مستجاب کرتا ہے[۱۰۰] بشرطیکہ یہ توبۃ النصوح اور وہ دعائے جمیلہ ہو[۱۰۱]۔ توبہ ایک تو انسان کی اپنی عبدیّت اور اللہ تعالیٰ کی شانِ الوہیت و ربوبیت کے شعور و ایقان پر، اور دوسرے اس کے شعورِ جُرم و گناہ، ایقانِ قانونِ مجازات، احساسِ انفعال و ندامت، استدعائے رحمت و مغفرتِ الٰہی، جذبہ و عزمِ احسان وحسنہ اور آرزوئے حُسن پر دلالت کرتی ہے۔ آرزوئے حُسن سے مراد ایک تو قلب کے اپنی فطری حسین حالت پر لوٹ آنے اور دوسرے نورِ حُسن کی طلب و استدعا ہے۔ توبہ میں خوف و رجا اور حُسنِ نیّت و عزیمت ہو تو اسے اصلاحِ قرآنی میں توبۃ النصوح کہتے ہیں چونکہ اس میں حُسن و صدق اور خلوص ہوتا ہے، اس لیے ربِّ توّاب و رحیم کو بڑی ہی محبوب ہے اور اس کی مغفرت خود اس کی طلبگار و منتظر رہتی ہے۔

میں تمہیں ایک راز کی بات بتاتا ہوں۔ توبہ و دُعا میں جمالیاتی۔ نفسیاتی انقلاب انگیزی کی تاثیر ہوتی ہے چنانچہ ان کی بدولت قلب میں وہ لمحۂ حسین وقوع پذیر ہوتا ہے جس میں اس کی آرزوئے حُسن و زندگی کا چشمۂ خشک دفعتاً قلب کی گہرائیوں میں سے اُبل کر نفسانی خواہشات کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں قلب زندہ و فعّال ہو کر اپنی حسین حالت حالت پر لوٹ آتا ہے؛ اس کی کایا پلٹ اور تقدیر بدل جاتی ہے۔ یہ بات بھی ذہن نشین کرنے کے

قابل ہے کہ دُعا بشمول توبہ عبادت کی روح ہے اور ربِّ جمیل و رحیم کو بے حد محبوب ہے، اس لیے اس سے وہ بات بھی بن جاتی ہے جو کسی اور طرح بنتی نہ ہو۔ جہاں تدبیر ناکام ہو جائے وہاں دُعا کی کامیابی کا امکان باقی رہتا ہے۔ یہ رازِ تقدیر دانائے راز ہی جانتا ہے کہ حُسنِ دُعا میں "صدائے کُن" بن جانے کی استعداد مضمر ہوتی ہے، اس اعتبار سے اسے تقدیر ساز کہنا بجا نہ ہو گا۔

حرفِ آخر یہ کہ تزکیۂ قلب کا انتہائی مؤثر ذریعہ توبۃ النصوح اور حسنِ دعا ہے۔

حواشی و تشریحات

۱۔ کارل مارکس (KARL MARX) ۔ [۱۸۱۸ - ۱۸۸۳ء] ؛ جرمنی نژاد یہودی اشتراکی جس نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "سرمایہ" لکھ کر روس، چین اور دیگر اشتراکی ملکوں میں فرعونی، ہامانی، قارونی، آزری نظام کا اِستیصال کر دیا، اور بندگانِ خدا کو ان کی محکومی و غلامی، ظلم و استیصال اور پنجۂ استبداد سے نجات دلا کر شیطان کے بندے بنا دیا اور انہیں ان کے اِلٰہ و ربّ سے دُور کر کے بیگانہ بنا دیا۔ اس طرح ان کی زندگی کو حسن و نور اور اطمینان و سُرور سے محروم کر دیا۔

۲۔ فرائڈ (۱۸۵۶ - ۱۹۴۰ء) (Sigmund Freud) آسٹریا کا یہودی طبیب۔ اس نام کا صحیح تلفظ فرائٹ FROIT ہے۔

۳۔ برٹرنڈ رسل ((Bertrand Russel)) ۔ زمانۂ حال کا مشہور برطانوی فلسفی جو عقلیت و دہریت کا نقیب و علمبردار تھا۔

۴۔ سارتر، ژاں پال۔ زمانۂ حال کا سیکولر فلسفی اور وجودیت (Existentialism) کا نقیب و علمبردار۔

۵۔ ذکر و طمانیت: اس کے لیے دیکھیے الرعد ۱۳: ۲۸۔

۶۔ رحیقِ مختوم: دیکھیے المطففین ۸۳: ۲۵ تا ۲۷۔

۷۔ جمالیاتی۔نفسیاتی لمحہ: (Aesthetic-psychological moment) ۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حیاتِ انسانی میں جمالیاتی۔نفسیاتی لمحے کے وقوع پذیر ہونے سے نفس میں حسین یا جمالیاتی انقلاب آتا ہے جس سے آرزوئے حسن و حیات زندہ و فعّال ہو جاتی ہے اور یہ پیش شرط (PRE-REQUISITE) ہے، قوم کے جمالیاتی۔مادّی انقلاب کی۔ اس حقیقت کی طرف قرآنِ مجید نے سورۂ انفال ۸: ۵۳ اور سورۂ رعد ۱۳: ۱۱ میں عبرت آموز و بصیرت افروز اشارے کیے ہیں۔

۸۔ قرآنِ مجید میں عذاب کی یہ کیفیت اس طرح بیان ہوئی ہے: ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ہ (الاعلیٰ ۸۷: ۱۳): (جو بڑی آگ میں ڈالا جائے گا، وہ اس کے عذاب کی شدّت سے) نہ اس میں مرے گا اور نہ زندگی ہی کرے گا۔

۹۔ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے: انما یرحم اللہ من عباد الرحما (طبرانی ابن جریر بسندِ صحیح) "اللہ تعالیٰ ان پر رحم کرتا ہے جو اس کے بندوں کے لیے رحمت رکھتے ہیں۔" اس سے ملتی جلتی ایک اور حدیث کے الفاظ ہیں: الرحمن تبارک وتعالیٰ ارحموا من الارضِ یرحمکم مَنْ فِی السَّمَآءِ (امام احمد نے مسند میں، ترمذی اور ابو داؤد نے صحیح میں اور حاکم نے مستدرک میں ابن عمرؓ سے روایت کی ہے۔

۱۰۔ دیکھیے التوبۃ ۹: ۱۰۴؛ الشوریٰ ۴۲: ۲۵۔

۱۱۔ توبۃ النصوح کے لیے دیکھیے التحریم ۶۶: ۸۔

مقام ۵

(ج) نفس کا جمالیاتی نظام

نفس : سب سے پہلے تمہیں اس حقیقت سے آگاہ کر دینا چاہتا ہوں کہ نفس عبارت ہے حواس و قلب اور روح و بدن سے۔ نفس ایک "کُل" ہے جو اصلاً روح ہے۔ اور اسے ہی انا، خودی، "میں"، شخصیت اور انگریزی میں Self, Ego اور Personality وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اب اس اجمال کی تفصیل سنو۔ روحِ بشر سفر کرتے کرتے جب اس منزل پر پہنچ جاتی ہے جہاں اُس نے بشر بن کر اس کرۂ ارضی میں امتحان دینے کے لیے پیدا ہونا ہوتا ہے تو احسن الخالقین اُسے صُلبِ پدری سے رحمِ پدری میں منتقل کر دیتا ہے۔ اس مقامِ استقرار پہ اس کی تخلیقِ بدنی، حُسن کاری، نشو و ارتقاء اور صورتگری کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ ربِّ جلیل کے اس جمالیاتی تخلیقی عمل کو قرآنِ مجید "خلق" سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ عمل پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتا ہے تو ربِّ حیّ و قیّوم روح کے اس پیکرِ خاکی میں اپنی روح سے پھونکتا ہے تو اس کے اعجاز سے اس میں حِسّی، قلبی، نفسی نظام قائم ہو کر اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔ اس کا یہ عمل اصطلاحِ قرآنی میں "امر" کہلاتا ہے۔ "خلق و امر" سے روح و بدن یک جان ہو جاتے ہیں اور اس مرکب کے لیے "نفس" کی تعبیر اختیار کی جاتی ہے۔

یہ بات ذہن نشین کرنے کے قابل ہے کہ نفس کا نظام کُلّی حواس اور قلب کے نظاموں پر مشتمل ہوتا ہے، لیکن انفرادی حیثیت میں اس کا اپنا نظام بھی ہے، جو دیگر نظاموں کی طرح انتہائی دقیق و لطیف اور محیّر العقول ہے۔ نفس اپنی ذات میں ایک وحدتِ کُلّی ہونے کے باوجود دو منفرد و متضاد اجزاء

کا مرکب ہے: ایک کو نفسِ امّارہ اور دوسرے کو نفسِ لوّامہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے اس لطیف نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ نفس جو اصلاً روح ہے، اُسے اپنی مطلق حیثیت میں اپنے معروضِ حسن و عشق کی آرزو ودیعت ہوتی ہے، لیکن بدن کے اتصالِ لاینفک کے سبب اس میں حسّی خواہشات پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ نفس کا وہ حصّہ جو بدن کے ساتھ مُتّصل و یک جان ہے، خالقِ خواہشات ہے اور اسے نفسِ امّارہ کہتے ہیں۔ نفسِ امّارہ دراصل "روحِ بدن" ہے۔ اس بنا پر ایک تو اس میں طبعاً و حاجتاً مادّی یا حسّی خواہشات پیدا ہوتی رہتی ہیں، چاہے وہ حسین و جائز ہوں یا قبیح و ناجائز؛ دوسرے اس میں شیطان حلول یا سرائیت کر جاتا ہے اور تلبیسِ ابلیس سے نفسِ امّارہ کو اپنا ہمنوا بنا لیتا ہے۔ شیطان اپنی وسوسہ اندازی اور جمالیاتی فریب کاری سے نفسانی خواہشات کو خوشنما و دلکش بنا کر دکھاتا رہتا ہے اور نفسِ امّارہ نفسِ کُلّی کو ان کی تشفی کرنے پر اُکساتا رہتا ہے۔ بخلاف اس کے نفس کا جُزوِ ثانی، جس میں روح کارفرما ہوتی ہے، نفسِ امّارہ کی خود فریبی و فریب کاری پر اُسے ملامت کرتا رہتا ہے، اس بنا پر اسے نفسِ لوّامہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

روح اور بدن کے اتصال کے سبب حسّی تبلبی نظام قائم اور سرگرمِ عمل ہو جاتا ہے تو روح کو، جو جوہرِ حُسن و حیات ہے، حسّی اور قلبی حاجات و مقتضیات اور عواطف و امیال لاحق ہو جاتی ہیں۔ اس طرح روح کی ایک اضافی حیثیت ہو جاتی ہے، جو اس کا جزوِ لاینفک بن جاتی ہے۔ روح کی مُطلق اور اضافی حیثیتوں کے امتزاج سے ایک عجیب و غریب، محیّر العقول اور منفرد و متشخص چیز معرضِ وجود میں آتی ہے، جسے "نفس" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نفس کا رابطہ بیک وقت روح اور بدن سے استوار ہوتا ہے، لیکن اصلاً روح ہونے کے باعث اُسے حُسن کی آرزو و جستجو رہتی ہے۔ چونکہ نفس ہی حسّی۔ قلبی نظام کو قابو میں رکھتا ہے، لہٰذا موضوعی۔ معروضی شیطان اُسے ورغلانے اور دھوکا دینے کی خاطر اس کی خواہشات کو مزیّن کر کے دکھاتا رہتا ہے۔ جملہ معترضہ کے طور پر یہاں اس لطیف و اہم نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ جھوٹے عقائد و نظریات، افکار و خیالات، امیال و عصبیات اور مطامع و تمنیات اپنی باطلیت کی وجہ سے محض خواہشات ہی ہوتی ہیں، جس

طرح جوہری کی صیرفیِ نگاہ سچّے اور جھوٹے جواہر میں تمیز کر لیتی ہے۔ اُسی طرح اہلِ حُسنِ نظر اپنی جمالیاتی حِس، عقلِ سلیم اور قوّتِ فرقان کی بدولت حسین و قبیح یا جائز و ناجائز خواہشات میں امتیاز کر لیتے ہیں۔

تم "نفس کُشی" کی مشہور صوفیانہ اصطلاح سے تو واقف ہو۔ اس سے متعلق تم نے صوفیہ کے احوال و کوائف میں پڑھا ہو گا کہ انہوں نے نفس کُشی یا اپنا نفس مارنے کی خاطر کیا کیا جتن نہیں کیے؟ انہوں نے اپنے جسم و نفس کو صبر آزما و شکیب رُبا اذیتیں دیں، شب و روز مجاہدے کیے، ریاضتیں کیں، منصب و امارت، جاہ و جلال، گھر بار، ملک و وطن، اعزّہ و اقارب اور احباب و رفقاء کو چھوڑا، کوہ و صحرا، غار و خانقاہ میں خلوت گزینی و چلّہ کشی کی، تجرّد و فقر و فاقہ کی زندگی بسر کی، لیکن ان کا کوئی تجربہ کامیاب نہ ہوا۔ اس کی وجہِ حقیقی یہ ہے کہ نفس موت سے پہلے نہیں مرتا، لہٰذا وہ تا دمِ واپسیں زندہ رہتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ نفس کی حاجات و خواہشات کا سلسلہ صرف موت کے ساتھ منقطع ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ نفس خواہشات کا چشمہ ہے، جو کبھی خشک نہیں ہوتا؛ البتّہ ریاضت و مجاہدے کے زور سے اس کے دہانے کو عارضی طور سے بند کیا جا سکتا ہے، لیکن اس بند کے ٹوٹ جانے کا ہر وقت امکان رہتا ہے۔ اسی خوف و خطر کے پیشِ نظر رہبان و مرتاض خلوت گزین رہتے ہیں؛ لیکن نفس کو پھر بھی مار نہیں سکتے۔ بات یہ ہے کہ خواہشات کو دبا دینے سے وہ معدوم نہیں ہوتیں، بلکہ جمع ہوتی رہتی ہیں۔ ان میں کچھ شعور میں رہتی ہیں، کچھ حجابِ شعور میں چلی جاتی ہیں اور کچھ پاتالِ شعور میں روپوش ہو جاتی ہیں، اور سب تقبیجی۔ نفسیاتی لمحے کی منتظر رہتی ہیں۔ یہ لمحہ وقوع پذیر ہو جائے تو خواہشات باہم مل کر تند و تیز سیل کی صورت اختیار کر کے اپنے غیر فطری بند کو توڑ دیتی ہیں۔ یہ صورتِ حال انسان کو سیاہ کار و شیطان بنا دینے کے لیے کافی ہوتی ہے؛ لہٰذا نفس کُشی کے بجائے نفسِ امّارہ کو اپنا مطیع و منقاد بنانے کی کوشش کرو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خواہشات پیدا تو ہوتی ہیں، لیکن نفسِ امّارہ شیطان کے ساتھ مل کر انہیں خوشنما و دلکش بنا کر نہ دکھائے۔ نفسِ امّارہ کو اپنا مطیع و

منقاد بنانے کے لیے نفسِ لوّامہ کا زندہ و توانا اور قلب کا حسین و منیر ہونا ناگزیر ہے۔

حواشی و تشریحات

۱۔ حجابِ شعور : یہ اصطلاح ہم نے تحت الشعور (Subconsciousness) کے مترادف کے طور پر وضع کی ہے کہ یہ اس سے احسن ہے۔

۲۔ پاتالِ شعور : یہ مترادف ہے لاشعور (Unconsciousness) کا، اور احسن و اکمل تعبیر ہے۔

۳۔ تقبیحی ۔نفسیاتی لمحہ : یہ ضد ہے جمالیاتی ۔نفسیاتی لمحے کی۔ صحبتِ طالح یا قبیح و شر انگیز ماحول میں دفعتاً قلب میں ایک ایسی قبیح صورتِ حال پیدا ہو جانے کا احتمال ہوتا ہے، جو ایک آن میں قطب کو چور، صالح کو طالح اور نیکوکار کو مجرم و گناہگار بنا دیتی ہے۔ اس آن کے لیے ہم نے تقبیحی ۔نفسیاتی لمحے کی تعبیر اختیار کی ہے۔

مقام ۶

وجدان، عقل اور فرقان

وجدان، عقل اور فرقان انسان کے نظامِ باطنی کے تین اہم ترین ملکات ہیں اور اسی ترتیب سے ان کی اہمیت ہے۔ ان سے گفتگو تو ہو چکی ہے، بطورِ استدراک چند ضروری نکات کی صراحت کر دی جاتی ہے۔

وجدان ایک ایسا ملکہ ہے، جس کا تعلق نفسِ حیوانی سے ہے اور ہر متنفّس کو ودیعت کیا گیا ہے تاکہ وہ نفسِ حیوانی کی احتیاجات و مقتضیات کو پورا کر سکے؛ نیز اپنی ذات کی صیانت اور نسل کی افزائش و بقا کا اہتمام کرنے کے قابل بن جائے۔ یہ مستقل نوعیّت کا اِلہام موضوعی ہے جو نفسِ حیوانی کو قدرت کی طرف سے ودیعت ہوتا ہے۔ قرآنِ حکیم نے اس کے لیے "ہدایت" کی تعبیر اختیار کی ہے۔ یہ وجدان ہے جو دام و دد، طیور اور آبی جانوروں کو پیدائش سے موت تک اپنی غذا حاصل کرنے، اپنے جنسی اور دیگر جبلّی تقاضے پورا کرنے، اپنے دشمنوں کو پہچاننے اور ان سے اپنی ذات و نسل کو بچانے اور رہنے سہنے کے طور طریقے سکھاتا ہے۔ وجدان ہی انسان کے بچے کو بتاتا ہے کہ اس کی غذا ماں کی چھاتیوں میں ہے اور انہیں چوسنا ایسا مشکل کام اُسے اس طرح سکھاتا ہے کہ وہ اس کے لیے آسان ہی نہیں لذّت آفرین بھی بن جاتا ہے۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جو مائیں اپنے بچوں کو اپنا دودھ نہیں پلاتیں، وہ اُن پر ظلم کرتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس طرح ایک تو انہیں اُن کی موزوں و متناسب قدرتی غذا سے اور دوسرے انہیں چھاتی چوسنے کی تسکین آفرین لذّت سے محروم و ناآشنا رکھتی ہیں، جو اُن کا پیدائشی

حق ہے۔ یہ دوگونہ محرومی بچے کی شخصیت پر منفی اثرات مرتب کرتی ہے۔ ایک تو اس سے بچے کی جسمانی نشوونما کامل و احسن طور پر نہیں ہو پاتی؛ دوسرے اس جذبے کی تشفی نہیں ہو پاتی، جس نے جنسی جذبہ بنا ہوتا ہے۔ اس سے اس میں جنسی تشنگی کا دائمی صورت اختیار کرنے کا امکان ہوتا ہے۔ علاوہ بریں، اس جنسی تشنگی میں افراط و تفریط پیدا ہو جانے کے امکان سے بھی صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔

وجدان یا اس فطری ہدایت کو قرآنِ حکیم نے نحل یا شہد کی مکھی کے لیے "وحی" سے تعبیر کیا ہے۔ میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ نحل شہد بنانے اور اسے محفوظ رکھنے میں جو ماہرانہ سائنسی تکنیک استعمال کرتی ہے وہ معجزنما ہے۔ پھولوں سے رس چوسنا اور اس قدر لذیذ و شیریں، مقوّی، اکسیر اور خوشبودار و شفا بخش مشروب تیار کرنا، جو ایک مدّت تک خراب نہ ہو، ایسا حیرت انگیز کارنامہ ہے، جسے دنیائے قدیم و جدید کے بڑے سے بڑے دوا سازی کے متمول ادارے سرانجام نہیں دے سکے۔ نحل کا دوسرا محیّر العقول کارنامہ ایسا دقیق و خانہ دار چھتّا تیار کرنا ہے، جس میں شہد اس کے رقبے کے حساب سے بہت زیادہ مقدار میں جمع بھی ہو جاتا ہے اور ہر قسم کے جراثیم، گرد و غبار، خرابی و فساد اور تعفّن وغیرہ سے محفوظ بھی رہتا ہے؛ نیز سیّال ہونے کے باوجود ضائع نہیں ہو پاتا۔ ماہرانہ رائے کے مطابق جدید اور مستقبل کی سائنسی ٹیکنالوجی صدیوں میں بھی اس قسم کا چھتّا تیار نہیں کر سکے گی۔

اگرچہ ہر نامیاتی وجود میں وجدان کا حواس سے غیر منفک رابطہ استوار ہوتا ہے اور وجودِ انسانی میں عقل سے بھی اس کا رابطہ قائم ہو جاتا ہے، لیکن اصل میں وہ ایک آزاد و مستقل اور منفرد و مشخّص ملکہ ہے۔ یہ نہ خود ارتقائی ہے اور نہ کسی اور ملکے کی ارتقائی صورت ہے۔ یہ نظریہ کہ وجدان ترقی کر کے عقل بن جاتا ہے اسی طرح غلط ہے جس طرح یہ نظریہ کہ عقل ترقی کر کے وجدان بن جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انسان کے حسّی، قلبی، نفسی نظام میں وجدان بنیادی حیثیت رکھتا ہے، لیکن عقل کی حیثیت اس سے افضل و اعلیٰ ہے اور یہ انسان و حیوان میں ما بہ الامتیاز ہے۔

(ب) عقل ایک منفرد و مشخص ملکہ ہے جو ہر انسان کو قدرت کی طرف سے ودیعت ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ وہبی ہے، لیکن یہ اس لحاظ سے وہبی۔ اکتسابی ہے کہ سمع و تکلم، تعلیم و تعلم، تفکر و تدبر، مطالعہ و مشاہدہ اور تعقل و تجربے سے اس کا نشو و ارتقا ہوتا ہے۔ الفارابی کا یہ نظریہ کہ عقل ترقی کر کے اپنے منتہائے کمال کو پہنچ جاتی ہے تو اس کا رابطہ "عقلِ کُل" (= ناموس اکبر یعنی حضرت جبریل علیہ السلام) سے ہو جاتا ہے اور اس پر وحی ہونے لگتی ہے، ایک باطل مفروضہ ہے۔ دلیل یہ ہے کہ اس نظریے کی رُو سے وحی کو اکتسابی ماننا لازم آتا ہے، حالانکہ اسلام کی رُو سے وحی خالصتاً وہبی تھی اور اس کا سلسلہ جو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا تھا، ربِّ حکیم نے اپنے ہر زمان و مکان کے پیغمبرِ اعظم و آخر، رحمۃ للعالمین اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کے ساتھ ہمیشہ کے لیے منقطع کر دیا۔ اہلِ حُسن و نظر کے لیے رحمۃ للعالمینی ختمِ نبوت کی برہانِ قاطع ہے اور دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

یہاں اِس لطیف و اہم نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ عقل اپنی ماہیت میں نورِ حُسن ہے اور زندہ ملکہ ہے اور اُسے بھی آرزوئے حُسن ودیعت کی گئی ہے؛ نیز اِرتقائے عقل سے مراد اس کے نورِ حُسن کا اِرتقاء ہے۔ جانتے ہو عقلِ سلیم کسے کہتے ہیں؟ اپنی پیدائشی حالت میں حسین و حُسن پسند، ملکوتی و منیر، فعّال و حرکی اور ترقی پذیر ہوتی ہے، نیز اس کی آرزوئے حُسن زندہ و فعّال ہوتی ہے، اسے عقلِ سلیم کہتے ہیں۔ اگر قلب اپنی کسی بیماری یا علّت کے باعث سلیم نہ رہے تو عقل بھی سلیم نہیں رہتی اور اس کے نظامِ کار میں فساد پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر وہ شیطان کی پیروکار بن جائے تو اس کی طرح عیّار و طاغوتی اور دُشمنِ ایمان و آگہی بن جاتی ہے؛ اور اگر انسان اس سے کام لینا چھوڑ دے تو قدرت کے قانونِ مجازاتِ تکفیر (= قانونِ کفرانِ نعمت) کی رُو سے اس میں جمود و تعطّل پیدا ہو جاتا ہے، نتیجۃً اس کے نورِ حُسن کا نشو و ارتقا رُک جاتا ہے، اور وہ مضمحل و مجہول اور اُس کی آرزوئے حُسن نحیف و نزار ہو جاتی ہے۔

عقلِ سلیم کا خاصہ آرزو و جستجوئے حُسن ہے، جس کے حوالے سے اس کے اہم ترین وظائف

یہ ہیں: اوّل، انفس و آفاق میں تفکّر و بالحق کرنا تاکہ وہ علم وحکمت، عرفان ومعرفت اور فن و ٹیکنالوجی حاصل کرے اور اپنے آپ کو حسین ومنیر رکھنے اور اپنا نشوو ارتقا کرنے کی خاطر تزکیہ قلب کرے۔ دوسرے اشیاء کی جمالیاتی اقدار یا صفات وخواص کو دریافت کرنا، تیسرے، حُسن وقبح، خوب وزشت، معروف ومُنکر، حلال وحرام، حق وباطل، خیر وشر، حسنہ وسیئہ اور سود وزیاں میں امتیاز کرنا، چوتھے، انسان کو خسارے سے بچانے کی خاطر اُسے شرک وبت پرستی، جرم وگناہ، فحشآء ومُنکر، ظلم واستحصال، بخل وکسبِ حرام، اکتناز واحتکار، فتنہ وفساد، سیئہ وشر اور کذب وتکذیب سے روکنا، پانچویں، اپنے اِلٰہ یعنی معبود ومحبوب اور مطلوب ومقصود کی راہِ مستقیم کو معلوم کرنا، جو انسان کو اس کے حُسن مآب میں لے جاتی ہے۔ حُسن مآب الحُسن واِلٰہ کی جائے لقاء ہے، جسے جنّت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چھٹے، زندگی کے ہر گوشے میں انسان کی رہنمائی کرنا۔ مختصر یہ کہ عقل اس اعتبار سے نعمتِ عظمٰی ہے کہ ایک طرف وہ انسان کو کائنات کی تسخیر کرنے اور اس کی لاتعداد نعمتوں سے متمتّع ہونے، آرام وراحت اور اطمینان سے حسین زندگی گزارنے اور دوسری جانب اسے اس کے اِلٰہ ورب سے ملانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ انسان کی یہی حقیقی کامیابی ہے جسے حاصل کرنے والا حقیقت میں مردِ کامل، مثالی انسان، وارثِ جنّت اور ربِّ جمیل وجلیل کا انعام یافتہ بندہ و دوست ہوتا ہے۔

ربِّ رحیم وکریم کی ہر چیز نعمتِ حُسنیٰ ہے، لیکن کسی نعمت کے غلط استعمال کا نتیجہ انتہائی مضرّت رساں، دوررس اور ہلاکت آفرین بھی ہوسکتا ہے۔ عقلِ سلیم نعمتِ حُسنیٰ وعُظمیٰ ہے اور اس کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ انسان وحیوان کے مابین مابہ الامتیاز اور وجہ شرف وعلوِ انسانی ہے۔ لیکن اگر عقل کسی وجہ سے سلیم یعنی حسین ومنیر اور صالح وحُسن طلب نہ رہے تو حریفِ آدم کی طرح انسان کو انسانیت کے ارفع واحسن مقام سے گرا کر حیوانیت کے تحت الثریٰ میں پہنچا دیتی ہے۔ یہ تیغ صفت ہے۔ آدمی کے اپنے قبضے میں ہو تو اس کی حافظ وناصر اور موجبِ فتح ونصرت ہوتی ہے، لیکن قبضۂ عدوئے انسان میں چلی جائے

تو اپنے ہی مالک کی دشمنِ جان اور موجبِ ہلاکت و شکست بن جاتی ہے۔ عقل انسان کی دوست و ناصح، محافظ و مددگار اور ہادی و مزکّی ہے، لیکن اس کی قدر نہ کی جائے اور اُسے شیطان کے قبضۂ اختیار میں جانے دیا جائے تو وہ بھی اس کی طرح دشمن، نیز خسرانِ مبین اور محرومی و ناکامیِ سرمدی کا موجب بن جاتی ہے۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عقلِ سلیم انسان کو عالم و حکیم، صالح و محسن، صاحبِ حسنِ سیرت اور ولی اللہ بناتی ہے، لیکن اگر کسی وجہ سے سلیم نہ رہے اور طاغوتی بن جائے تو وہ انسان کو بھی طاغوت اور اللہ تعالیٰ کا مقہور و مغضوب اور ملعون و اہلِ نار بنا دیتی ہے۔

عقل کا وظیفہ تفکّر و تدبّر اور اجتہاد ہے، لیکن جو فرد یا قوم اُس سے یہ کام لینا چھوڑ دے تو وہ قانونِ تکفیرِ نعمت کے مطابق نہ صرف مجہول و کاہل ہو کر اپنا وظیفہ ادا کرنے کے قابل نہیں رہتی، بلکہ خود ہی اس پر اجتہاد کے دروازے بند کر کے اُسے مقلّد بنا دیتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ قوم کورانہ تقلید ہی میں اپنی دُنیوی و اُخروی فلاح و نجات کو مضمر سمجھنے لگتی ہے اور اسے اپنا مذہب بنا لیتی ہے اور پھر مذہب کو دین سمجھنے لگتی ہے۔ اس میں آرزوئے حُسن رہتی ہے نہ خوب سے خوب تر کی طلب و جستجو، حتّٰی کہ اس میں تفکّر و اجتہاد اور اقدام کی جرأت مفقود ہو جاتی ہے اور وہ فکر و عمل کی جدّت و ندرت سے ترساں و گریزاں رہنے لگتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ یہ صورتِ حال، اس کے جمود و تعطّل، زوال و انحطاط، ذلّت و مسکنت اور پس ماندگی و محکومی کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

اس وقت دُنیا میں سرمایہ داری اور اشتراکی نظام رائج ہیں اور یہ دونوں عقلِ طاغوتی کی ایجاد ہیں اور اس کی جمالیاتی فریب کاریوں کی بدولت چل رہے ہیں۔ اگرچہ یہ دونوں انسانی حقوق کی ضمانت فراہم کرنے کے دعویدار ہیں، لیکن عملاً دونوں نے افرادِ نسلِ انسانی کو محکوم و غلام بنا کر انہیں ان کے بہت سے حقوق سے محروم کر رکھا ہے۔ نظامِ سرمایہ داری میں اگرچہ افراد کو بظاہر فکر و عمل یا اکتساب کی آزادی ہوتی ہے، لیکن عملاً وہ سرمایہ کاروں (مثلاً جاگیرداروں، زمینداروں، نیز کارخانوں، صنعتی و کاروباری اداروں، بینکوں وغیرہ کے مالکوں اور حصّہ داروں کے

محکوم ہوتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ وسائلِ پیداوار اور گردشِ دولت پر سرمایہ کار افراد کی اجارہ داری ہوتی ہے، لہٰذا وہ روزگار کی طلب و ضرورت رکھنے والے افراد کی احتیاج سے ناجائز فائدہ اُٹھانے اور ان کا استحصال کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔

جہاں تک اشتراکی یا اشتمالی نظام کا تعلق ہے، اس میں افراد فکر و عمل یا اکتساب کی آزادی سے محروم بھی ہوتے ہیں اور معاشی و سیاسی اور ثقافتی لحاظ سے برسرِ اقتدار جماعت کے محکوم و غلام بھی۔ اُن سے وہ کام لیا جاتا ہے جو حُکّام چاہیں؛ انہیں کھانے، پینے، پہننے اور رہنے کو وہ کچھ دیا جاتا ہے جو اُن کے "آقا" چاہیں۔ مختصر یہ کہ عوام حکمران جماعت کے پاس اپنے ارادہ و اختیار کی آزادی ایسی نعمتِ عظمیٰ جو شرفِ انسانیت اور انسان و حیوان میں مابہ الامتیاز ہے، بیچ کر نفسِ حیوانی کی ضروریات کو پورا کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس پر بھی عقلِ طاغوتی نے بنی نوعِ انسان کو اپنی جمالیاتی فریب کاریوں یا فریب کار دلائل و براہین سے اس قدر ظالم و جاہل اور فریب خوردہ بنا دیا ہے کہ ان میں سے ایک طبقہ سرمایہ دارانہ نظام کے حق میں ہے اور دوسرا اشتراکی نظام کے۔ لیکن تیسرا طبقہ جو عقلِ سلیم رکھتا ہے اور جسے قرآن حکیم کی اصطلاح میں اولی الالباب کہتے ہیں، اس حسین نظام کی طلب و جستجو میں ہے، جس کا اصل الاُصول آرزوئے حُسن ہے، اور وہ اسلام ہے۔ نظامِ اسلام میں افراد کو فکر و عمل اور اکتساب کی آزادی بھی ہوتی ہے اور ان کی مادّی و روحانی زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کی ذمے داری خلافت پر ہوتی ہے، جس میں خود افراد بھی شریک ہوتے ہیں۔ یہاں اس اہم نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ خلافت ایسی طرزِ حکومت سے عبارت ہے، جس کا حاکمِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ ہوتا ہے اور خلیفہ یا حکمران مجلسِ شوریٰ کی مشاورت سے احکامِ الٰہی پر عمل درآمد کرانے اور رعایا کی مادّی و روحانی ضروریات اور تاریخی عمل کی مقتضیاتِ نو بنو پورا کرنے کا ذمے دار و جوابدہ ہوتا ہے۔

جمالیات کی زبان میں خلافت کی تعریف اس طرح کر سکتے ہیں: "خلافت ایسی حسین حکومت سے عبارت ہے، جس کا حکمران خلیفہ صاحبِ جمال و جلال ہو اور ربِّ ذوالجلال والاکرام کے حُسنِ کلام اور اس کے صاحبِ خُلقِ عظیم و رحمۃ للعالمین صَلَّی اللہ علیہ وسلّم کے اُسوۂ حسنہ کے

مطابق اپنے اصحابِ حُسن وسُرور کی مشاورت سے ملک وقوم کا ایسا حسین انتظام کرے کہ رعایا کو اپنے اِلٰہ و ربّ سے رشتہ استوار رکھنے اور حسین ومطمئن زندگی گزارنے کے مواقع اور سہولتیں میسر ہوں اور اسے ایسا کرنے کی مسلسل تحریک وتشویق بھی ملتی رہے۔ حسین زندگی سے مراد ایسی زندگی ہے جس میں افراد کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں، جو اُن کے ربِّ رحیم کی طرف سے انہیں عطا کیے گئے ہیں۔ الغرض، خلافت رعایا کے دلوں میں مضمر آرزوئے حُسن کو قوت سے فعل میں لاتے، اسے حرکی بنانے اور پھر اس کو احسن طریق سے پورا کرنے کی ذمے دار اور اس میں تغافل وتساہُل اور کوتاہی وناکامی کی صورت میں اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے سامنے جوابدہ بھی ہوتی ہے۔ یہ مبالغہ نہیں حقیقت ہے کہ ایسی حسین حکومت وہی اہلِ حُسن و سُرور قائم کرسکتے ہیں، جن کی عقلِ سلیم یعنی زندہ وحرکی اور حسین ومنیر ہوتی ہے۔

عقل وعشق :

یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عقلِ سلیم حریفِ عشق نہیں، اگرچہ بعض فلاسفہ، مفکرین اور شعراء ایسا سمجھتے ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ بڑے انسانوں کی غلطی بھی بڑی ہوتی ہے۔ علّامہ اقبال اور برگساں بلاشبہ عظیم فلسفی ومفکّر ہیں، لیکن ایک طرف وہ وجدان کو (جسے علّامہ اقبال "عشق" سے تعبیر کرتا ہے) درایت وروایت کے بغیر ہی عقل کی ارتقائی صورت کہتے ہیں اور دوسری طرف ان دونوں کو بغیر کسی دلیل وبرہان کے متخالف ومتخاصم سمجھتے ہیں۔ کسی نظریے کی اساس محض ظنّی مفروضے پر رکھی جائے تو فکری تضادات کی نمود اس کا منطقی نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ نکتہ صراحت طلب ہے۔ اگر عقل اپنی فطری حالت میں ہو، یعنی زندہ وحرکی اور حسین ومنیر ہو تو اس میں آرزوئے حُسن بھی اسی نسبت سے زندہ وفعّال ہوتی ہے۔ دلیل یہ ہے کہ روزِ "شہود والست" جب ربِّ جمیل وجلیل نے نفوسِ انسانی کو اپنے حضور حاضر کرکے ان پر جلوہ پیدا کیا تھا تو اس کے حُسنِ بےمثال کے مشاہدے سے ان کے اندر اس کی محبت ذرّۂ منیر کی صورت مضمر ہوگئی اور اس میں عشق کا نیّرِ اعظم بننے کی استعداد پیدا ہوگئی۔ نیز ان میں اس کی

اُلوہیت و ربوبیت کا ایقان و اِذعان بصورتِ دوام جذب ہوگیا۔ چنانچہ انہوں نے برملا اس حقیقت کا اقرار و اعتراف کیا تھا اور شہادت دی تھی۔ عقل میں حیات و فعالیت اور حُسن و نور کے عناصر کیفیت و کمیت میں جس قدر زیادہ ہوتے ہیں، اسی قدر اس کی لوحِ محفوظ (= حافظے) میں اپنے اِلٰہ یا معروضِ حُسن و عشق کے مشاہدے اور اپنے اعتراف و اقرار کے نقوش نمایاں ہوتے ہیں اور اسی نسبت سے اُس کی آرزوئے حُسن زندہ و فعّال ہوتی ہے۔ جیسا کہ میں تمہیں بتا چکا ہوں، محبت و عشق اور جذب و شوق کا مبدءِ دل اور عقل کا مصدر و منبع دماغ ہے، اگرچہ دل و دماغ قلب یا فواد ہی کے دو اجزائے لاینفک ہیں۔ بہرحال، عقل میں حسن و زندگی کی قوّت جتنی زیادہ ہوگی، اسی قدر اس کے نور میں بھی اپنے اِرتقاء و تنویر کی قوّت ہوگی۔ عقلِ حسین و منیر کی تنویر و ضو فشانی سے دل میں مضمر ذرّۂ محبّتِ اِلٰہی کو بھی تب و تواں ملتی ہے جو اُسے ذرّے سے آفتابِ عشق بنانے میں ازبس اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس حقیقت کی باندازِ دیگر بھی تصریح کی جاسکتی ہے۔ عقلِ سلیم میں زندگی کی تب و تواں اور فعالیت اور حُسن کا جمال و جلال اور نور جس قدر زیادہ ہوں گے، اُسی قدر اُس کی آرزوئے حُسن و محبت بھی شدید ہوگی اور اس کے نتیجے میں ذرّۂ محبّت تاُثیرِ برقِ حُسن سے آفتابِ عشق بن جاتا ہے۔ اس گفتگو سے یہ مستنبط ہوا کہ عقلِ سلیم حریفِ عشق نہیں، بلکہ اس کی ہمنوا و معاون ہے۔

یہاں اس نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ عقل جب سلیم نہیں رہتی تو وہ اپنے حسن و نور اور حیات و فعالیّت سے جس قدر محروم ہوتی ہے اسی قدر وہ شیطان کی ہمنوا و متبع اور معاون بن جاتی ہے، اور اُتنی قوّت سے دل کی آرزوئے حُسن و محبّت کی شمعِ فروزاں کو بجھانے کی سعی و جہد کرتی ہے۔ لیکن وہ ایسا کر نہیں سکتی۔ وہ شمعِ محبّت کی روشنی کو خواہشات کے اندھیروں میں چھپا تو سکتی ہے، لیکن اُسے بُجھا نہیں سکتی۔ وجہ یہ ہے کہ انسان کی فطرت بدل نہیں سکتی، اس لیے اسلام یا آرزوئے حُسن کبھی فنا و معدوم نہیں ہوسکتی۔ بالفاظِ دیگر، روزِ شہودِ الست سے محبّتِ الٰہی کا جو تیرِ نیمکش قلبِ انسانی میں پیوست ہوگیا ہے، اسے نکالنا نہ عقلِ طاغوتی

کی مقدرت میں ہے نہ نکلنا اس کے مقدور میں ہے۔

اس میں قطعی کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ عقل ربِ رحیم و کریم کی نعمتِ عظمٰی اور وجہِ شرفِ انسانیت ہے؛ نیز یہ انسان و حیوان میں مابہ الامتیاز ہے۔ علاوہ بریں عقل ہی کی بدولت اُسے ارادہ و اختیار ایسی نعمتِ غیر مترقبہ ملی ہے، جس کی بنا پر وہ شرعی احکام کا مکلف، اور قدرت کے قانونِ مجازات یا قانونِ مکافاتِ عمل کا مستوجب ہے۔ یہ خیر و شر، حق و باطل، ایمان و کفر، توحید و شرک، عدل و ظلم، حسنہ و سیئہ، معروف و منکر، نیک و بد، خوب و ناخوب اور سود و زیاں میں امتیاز کرنے اور موضوعی بمعروضی شیطان کی جالیاتی فریب کاریوں کو سمجھنے اور ان سے بچنے کا ایک حیرت انگیز و خودکار اور زندہ و پائندہ نظام موضوعی ہے۔ اس کی ایک اذلبس اہم نوعیت کی خوبی یہ ہے کہ انسان اس کے ذریعے جو اس کی معاونت سے علم و حکمت اور فن و ہنرِ سائنسی (= جدید ٹیکنالوجی) حاصل کرتا، محیرالعقول ایجادات و اختراعات کرتا اور تسخیرِ زمان و مکان کر رہا ہے۔

وحی و عقل کی مثال آفتاب و چشمِ بینا کی سی ہے۔ اس لحاظ سے یہ دونوں مشاہدے کی پیش شرط ہیں۔ وحی بلا شبہ نور و ہدایت ہے، لیکن اس سے مستفیض و مستفید اُولوالالباب یا اربابِ عقلِ سلیم ہی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید کو عقلِ سلیم سمجھنے پر خود اللہ جل شانہٗ نے بہت زور دیا ہے، اور ان لوگوں کو نجس، اندھا اور حیوانوں سے بدتر قرار دیا ہے[۱] جو عقل سے کام نہیں لیتے[۲]۔ اس سلسلے میں اس اذلبس اہم نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ ربِ حی و قیوم کی آخری زندہ و محفوظ وحی و تنزیل (= قرآنِ حکیم) کو اس کے صحیح تناظر میں جامع طور پر سمجھنے، اس پر ایمان لانے اور عمل کرنے کے لیے دو چیزیں ناگزیر ہیں: ایک تقویٰ اور دوسری عقلِ سلیم۔ ان دونوں کی مجملاً تشریح کی جاتی ہے:

(ا) تقویٰ: اس کی غایت الغایات کے اعتبار سے اس کے لیے آرزوئے حسن کی تعبیر اختیار کر سکتے ہیں۔ یہ پہلو دار اور وسیع المعانی مصطلحۂ قرآنی ہے۔ ایجابی طور سے تقویٰ

تلاشِ حُسن وحق، طلبِ حسنۂ دنیوی واخروی اور محبت وخشیتِ الٰہی پر دلالت کرتا ہے، اور سلبی لحاظ سے اس میں سیّئہ وشر، جرم وگناہ، آتشِ خوف وحزن، ظلم وفساد سے پرہیز و احتراز اور خشیتِ الٰہی کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ خشیتِ الٰہی درحقیقت محبتِ الٰہی کی اصل ہی سے پیدا ہوتی ہے۔

تقویٰ اگر آرزوئے حسن وحق ہے تو عقل اس آرزو کو پورا کرنے کا ایک ایسا اہم و بے عدیل نظامِ قلبی ہے، جس کے بغیر اس آرزو کی تکمیل ہو نہیں سکتی۔ وجہ یہ ہے کہ ربّ ذوالجلال والاکرام کی وحی وتنزیل، جو نور وہدایت ہے، حقیقت میں اس آرزو کے اتمام کا واحد یقینی ذریعہ ہے، جس سے عقلِ سلیم کے بغیر مستفید ہونا محال ہے؛ مثال کے طور پر جس طرح چشمِ بینا کے بغیر سورج کی روشنی سے استفادہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ نور کو نور ہی دیکھ سکتا ہے، لہٰذا وحی وتنزیل کو، جو نور ہے، نورِ عقل ہی سے دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ جس طرح وحی وتنزیل اعتبار ہے ربّ العالمین کی الوہیت وربوبیت کا، اسی طرح عقلِ سلیم اعتبار ہے وحی وتنزیل کے نور وہدایت کا۔ اس سے اس امر کی توجیہ ہو جاتی ہے کہ کیوں ربِّ علیم وحکیم نے قرآنِ مجید میں عقل سے کام لینے پر اس قدر زور دیا ہے؛ اور اُسے اللہ تعالیٰ کی جنّت کے حصول کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ اُس نے اہلِ عقلِ سلیم کی پہچان یہ بتائی ہے کہ اُٹھتے، بیٹھتے، لیٹتے، کروٹیں بدلتے کائنات میں حکیمانہ غور وفکر کرنا ان کا شعارِ زندگی ہوتا ہے؛[۳] ساتھ ہی اس حقیقت کی بھی نشاندہی کر دی ہے کہ اُن کے تفکّر بالحق کا نتیجہ لازماً یہ نکلتا ہے کہ ان میں اس حقیقت نفس الامری کا ایقان واذعان پیدا ہو جاتا ہے کہ کائنات خودرو ہے نہ تخلیق بالباطل، بلکہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق بالحق ہے؛ یعنی یہ اس کی جمالیاتی اقدار کی حامل ایسی سچی تخلیق ہے جو حکیمانہ غرض وغایت رکھتی ہے، جس میں رازِ حیاتِ انسانی مضمر ہے اور اس راز کی تفسیر وحی وتنزیل ہے، جس کے فہم وادراک اور تفہیم وابلاغ کے لیے ربِّ رحیم نے انسان کو عقلِ سلیم ودیعت کی ہے۔ چونکہ عقلِ سلیم فہیم و فہوم اور مجتہد ہے، اس لیے ختمِ نبوّت کے بعد وحی وتنزیل اور اسوۂ حسنہ کے اِفہام وتفہیم

کی ذمے داری کے بارِ گراں کی متحمل عقلِ سلیم ہی ہو سکتی ہے۔

عقل و اجتہاد:

عقل جو قلب کی ایک ازبس لطیف و نورانی قوت ہے، اس اعتبار سے ارتقائی ہے کہ اس کے نور میں نشو و ارتقاء کی استعداد بالقوہ موجود ہوتی ہے، جو والدین، اساتذہ اور معاشرے کی تعلیم و تربیت، حسی مشاہدات و تجربات اور خود اپنے حکیمانہ تفکر و تدبر، عبرت پذیری اور تخلیقی فعلیت کے ذریعے قوت سے فعل میں آتی ہے۔ عقلِ سلیم کا نور اپنی تکمیل کر لیتا ہے تو اس میں زندگی کے نو بنو تقاضوں اور ان سے پیدا شدہ مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے اور ان کے بارے میں اپنی صواب دید کے مطابق رائے دینے کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس قابلیت کو قوت و صلاحیتِ اجتہاد سے اور ایسی رائے کو اجتہاد سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ شریعت رو سے اجتہاد کی تعریف، آسان لفظوں میں اس طرح بھی کر سکتے ہیں کہ اہلِ عقلِ سلیم یا اجتہاد کا اپنی صوابِ دید کے مطابق ان امور کا فیصلہ کرنا یا ان کے متعلق حکم لگانا یا رائے اور فتویٰ دینا، جن کے متعلق کتاب و سنت خاموش ہوں۔

اجتہاد کی ضرورت روزِ آفرینش سے لے کر آج تک افراد و اقوام کو ہر زمان و مکان میں پیش آتی رہی ہے اور قیامت تک پیش آتی رہے گی۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اجتہاد کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے اور اس کی علتِ غائی کیا ہے؟ اس کا جواب قرآنِ حکیم نے اپنے معجز نما ایجازِ بلاغت سے پانچ الفاظ میں اس طرح دیا ہے کہ دریائے معانی کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہوتا ہے: كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (الرحمٰن ۵۵: ۲۹)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کے نو بنو تقاضوں اور مسائل کی علتِ غائی یہ ہے کہ "وہ" (ربِّ حی و قیوم) ہے، جس کی جمالیاتی تخلیقی فعلیت سے کائنات و حیات کے ثبات میں ہر لحظہ ایک تغیرِ مدام کی نمود ہوتی رہتی ہے۔ اس کی مثال دریا کی روانیِ مدام میں

حباب و امواج کے ظہور و غیاب سے دی جاسکتی ہے۔ اِسے "تاریخی عمل" سے تعبیر کرتے ہیں، جس کے باعث زندگی کی مطلق و ناقابلِ تغیّر و تبدّل اقدار کے باوجود اس کی اضافی و ہنگامی اقدار میں تغیّر و تبدّل کی نمود رہتی ہے۔ مطلق جمالیاتی اقدار کا تعلق جمالیاتی حِسّ سے اور اضافی اقدار کا تعلّق جمالیاتی ذوق سے ہوتا ہے۔ تاریخی عمل سے ہر زمان و مکان کے افراد و اقوام کے جمالیاتی ذوق میں تغیّر و تبدّل، بوقلمونی و تنوّع اور اختلاف و تضاد پیدا ہوتا رہتا ہے۔ علاوہ ازیں، اس سے زندگی اور عقل کے ارتقاء کے ساتھ ان کے تقاضوں میں بھی جدّت و ندرت اور تغیّر و تبدّل پیدا ہوتا رہتا ہے اور ان کی تکمیل وقت کی اہم ضرورت بن جاتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ تاریخی عمل سے زندگی نئے نئے مسائل سے دوچار ہوتی رہتی ہے جنہیں حل کرنا ناگزیر ہوتا ہے اور اس کے لیے اِجتہاد ایک ضروری پیش شرط ہے۔ جو قوم یہ شرط پوری نہیں کرتی، اس کا پس ماندہ و درماندہ ہو جانا شدنی ہو جاتا ہے۔ یہ قانونِ تاریخی عمل ہے۔ چنانچہ ایسی قوم زمانے کی مرکب بن جاتی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ترقی یافتہ اقوام کی محکوم و غلام اور مقلّد بن جاتی ہے۔ علاوہ ازیں، وہ ذہنی انتشار کا شکار ہو جاتی ہے اور اس طرح اس کے فکر و عمل میں اختلاف و تضاد پیدا ہو جاتا ہے، نیز اس کی عقل اپنے حُسن و زندگی سے جزوی یا کُلّی طور سے محروم ہو کر پہلے ذوق و شوقِ اجتہاد سے اور پھر اس کی صلاحیت سے محروم ہو جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ جمود و تعطّل پسند ہو جاتی ہے اور اِجتہاد سے گریزاں و ترساں رہنے لگتی ہے اور اسے "شجرِ ممنوعہ" بنا لیتی ہے۔ اس طرح فکر و عمل کی جدّت و ندرت، ذوق و شوق اور آزادی، نیز قوّتِ ایجاد و اختراع اور عزم و ہمّتِ مسابقت سے محروم ہو جاتی ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ اس وقت یہ صورتِ حال اُمّتِ مُسلمہ کی ہے تو مبالغہ نہیں بلکہ ایسی حقیقت کا اظہار ہوگا، جس کے اعتراف اور اس صورتِ حال سے عہدہ برآ ہوئے بغیر اس پر ترقی کی راہیں بدستور مسدود رہیں گی۔

جس طرح "كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ" ایک ازلی و ابدی حقیقت ہے اور اس کا نتیجہ زندگی

کا نشو و ارتقاء مسلسل اس کے تقاضوں اور اذواقِ انسانی کا تغیر و تبدل اور اختلاف و تنوع اور اس کی مقتضیات کی جدّت و ندرت ہے، اسی طرح اجتہاد انسان کی ضرورتِ مدام ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اجتہاد کے بغیر نہ تو کسی قوم کا نشو و ارتقاء ممکن ہے اور نہ وہ زمانے کے تقاضوں اور اپنی معاشرتی مقتضیات ہی کو پورا کر سکتی ہے۔ علاوہ بریں، کوئی قوم اپنے عقائدِ جلیلہ و محرکہ کی قوت و توانائی ہی کی بدولت اپنی دینی روایات و ثقافت اور آزادی و بقا کا تحفّظ کر سکتی؛ نیز زمانے کی حریف قوّتوں کا کامیابی سے مقابلہ کر سکتی اور جولانگاہِ مسابقت میں دوسری اقوام سے سبقت لے جا سکتی ہے، اور یہ اجتہاد ہے جو کسی قوم کے عقائد کو زندہ و حرکی رکھتا ہے۔

عشق:

عشقِ الٰہی کیا ہے؟ عشق اور عقل کے مابین کوئی رشتہ ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو اس کی نوعیت کیا ہے؟ نیز عشق کی ہماری زندگی میں اہمیت کیا ہے؟ یہ اور اس سے پیدا ہونے والے ضمنی سوالات کا جواب معلوم کرنے سے پہلے اس موازنہ عقل و عشق پر ناقدانہ نظر ڈالنا فائدے سے خالی نہ ہوگا جو بعض منکرین و فلاسفہ اور صوفیہ عشق کا عقل پر تفوّق ثابت کرنے کے لیے کیا کرتے ہیں، اور وہ یہ ہے:

۱۔ عقل میں اپنی بزدلی کی وجہ سے جراُتِ اقدام نہیں ہوتی، بخلاف اس کے عشق نڈر، بیباک اور سر فروش ہوتا ہے۔ چنانچہ علّامہ اقبال کہتے ہیں:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی (بانگِ درا)

۲۔ عقل عیّار و مصلحت اندیش ہے، اور اپنا کام ولائل و براہین کے زور سے نکالتی ہے، جبکہ عشق ایسا نہیں، بلکہ وہ بہادر، بیباک اور حق گو ہے:

عقل عیّار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے
عشق بے چارہ نہ مُلّا ہے نہ زاہد نہ حکیم (بالِ جبریل، ص ۸۸)

اسی مفہوم کو علامہ اقبال باندازِ دیگر اس طرح بیان کرتے ہیں:

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی (بالِ جبریل،)

۳۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں انفاق وقتال وجہاد کا حقیقی محرک عشق ہے، بخلاف اس کے عقل انسان کو افلاس و ہلاکت و بربادی ڈرا کر بخیل و بزدل اور نامرد بناتی ہے اور انفاق و جہاد وقتال کی راہ میں مزاحم ہوتی ہے۔

۴۔ عقل سے غمِ روزگار پیدا ہوتا ہے۔ جو انسان کو آتشِ خوف و حزن کے عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اس کے علی الرغم، عشق سے جمالیاتی غم پیدا ہوتا ہے، جو انسان کو ہر غم و خوف سے آزاد کر کے صاحبِ حسن و سرور، اہلِ جذب و شوق اور رحمتِ عالم بنا دیتا ہے۔ غمِ عشق ہی کو غمِ انسانیت کہتے ہیں اور احسان سے مل جائے تو "رحمت" بن جاتا ہے۔

۵۔ عقل نہ تو حقیقتِ مطلقہ کا ادراک وعرفان کر سکتی ہے اور نہ اپنے الٰہ کا مشاہدہ برخلاف اس کے عشق ہی کی بدولت انسان کو اللہ تعالیٰ کی دید و معرفت اور حقیقتِ مطلقہ کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔

اس موازنۂ عقل و عشق پر نقد و نظر کا آغاز کرنے سے پہلے اس امر کی وضاحت کر دی جاتی ہے کہ ان نظریاتِ خمسہ میں ایک تو عقلِ سلیم اور عقلِ سقیم میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھا گیا، دوسرے عشق کی فوقیت ثابت کرنے کی خاطر عقلِ سلیم کے اوصاف سے انصاف نہیں کیا گیا۔ یہ موازنہ دراصل عشق و عقلِ سقیم کا ہے۔ بہرحال، اس سے شق وار گفتگو کی جاتی ہے:

۱۔ یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ عقل دور اندیش و مصلحت کیش ہوتی ہے اور سود و زیاں کا شعور رکھتی ہے، لیکن یہ عقلِ سقیم ہے، جو عجلت پسند ہونے کے باعث حال کو مستقبل پر اور دنیوی و انفرادی مفادات کو اُخروی و اجتماعی مفادات پر ترجیح دیتی ہے؛ لہٰذا ایسی سقیم و تبیع عقل کا آتشِ نمرود میں جل مرنے سے خوف کھانا اس کے تجسس کی وجہ سے اس کی طبیعت کا خاصہ

بن جاتا ہے۔ برخلاف اس کے عقلِ سلیم و حسین، جسے سود و زیاں کا حقیقی شعور ہوتا ہے، اس کا انفرادی و دُنیوی مفادات پر اجتماعی و اُخروی مفادات کو ترجیح دینا، اس کی فطرت کا مقتضیٰ ہے؛ لٰہذا یہ عقلِ سلیم و حسین ہے جو عشق کو احسان و رضوانِ "دوست" اور جنّت کی حیاتِ ابدی کے حصول کی خاطر کبھی فرعون و ہامان اور آزر و قارون سے نبرد آزما ہونے اور کبھی آتشِ نمرود میں کود جانے کی ترغیب و تحریک دیتی ہے۔ عقلِ سلیم و حسین معرکۂ حق و باطل میں محوِ تماشائے لبِ بام نہیں ہوتی بلکہ عشق کے ساتھ شمشیر بدست و سربکف ہوتی ہے۔ کبھی وہ بُت شکنی کے جرم میں عشق کے ساتھ آتشِ نمرود میں کودتی ہے تو کبھی فرعون و ہامان اور ان کی افواج کو غرق دریا کرتی ہے کبھی وہ عشق کی معیت میں ہجرت کرتی ہے تو کبھی اس کے ساتھ بدر و حنین کے معرکے سر کرتی ہے۔

عقلِ سلیم کی تو ایک امتیازی و بنیادی خوبی ہی یہ ہے کہ وہ صیرفیِ سود و زیاں ہے۔ لٰہذا وہ زیاں کاری یا گھاٹے کا سودا کرنے سے روکتی اور نفع کا سودا کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ تاریخی عمل شاہد ہے کہ انسان خسارے میں ہے، بجز اُن کے جو ایمان لاتے اور اعمالِ صالحہ کرتے ہیں، نیز تواصی بالحق اور تواصی بالصّبر ان کا شعارِ زندگی ہوتا ہے۔ زندگی کے ان اہم ترین امورِ العبد کو انسان عقلِ سلیم ہی کی بدولت سرانجام دے سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ عقلِ سلیم ہے جو انسان کو زیانِ دُنیوی و اُخروی سے محفوظ رکھتی ہے؛ لٰہذا نہ صرف اپنے نفس کو بلکہ قوم و ملت کو زیانِ مسلسل سے بچانے، اور احیائے دین و قوم اور حق کی خاطر مال و جان، گھر بار اور اولاد کی قربانی دینے کا داعیہ پیدا کرنا اس کا طبعی وظیفہ ہے۔ چنانچہ ایسی صورتِ حال میں وہ عشق کی ہمنوا و معاون ہی نہیں ہوتی بلکہ قائد و دلیلِ راہ بھی ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے اس کی اہمیت عشق سے کم نہیں، بلکہ زیادہ ہی ہے۔

عشق اپنی جگہ ایک زبردست قوّت جلیلہ و محرّکہ اور جذبۂ ایثار و جانفروشی ہے، لیکن یہ "باطنی جوہری توانائی" عقلِ سلیم کے قبضۂ اختیار میں ہو تو وہ نہ صرف ایک ناقابلِ تسخیر قوّت بن

جاتی ہے اور اس پر بڑے سے بڑا معرکہ سر کرنے کی راہیں بھی آسان ہو جاتی ہیں عسکری معرکوں میں جنگی حکمت عملی اور قیادت کو جو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے، وہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے اور یہ دونوں چیزیں عقلِ سلیم ہی کی بدولت حاصل ہوتی ہیں۔ عشق و عقلِ سلیم کے حسین امتزاج کی بہترین مثالیں ہمیں حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت محمّد مصطفیٰ علیہم السلام میں ملتی ہیں۔

۲۔ عقل اگر سلیم نہ رہے اور شیطان کی ہمنوا و پیروکار بن جائے تو اس کی طرح عیّار و مکّار اور جعلساز و سرکش بن جاتی ہے، اور اگر علم رکھتی ہو تو اس کی دلائل و براہین میں جمالیاتی فریب کاری و جعلسازی مضمر ہوتی ہے۔ وہ کبھی خرقہ سالوس زیب تن کر کے لوگوں کو جمالیاتی فریب دیتی ہے اور کبھی طلاقت و چرب زبانی سے انہیں سبز باغ دکھا دکھا کر اپنے دامِ تزویر میں پھنساتی ہے۔ علاوہ ازیں، وہ ہر موقع و محل کے مطابق رنگ روپ دھارنے اور ہر قسم کی اداکاری کرنے کا ملکہ رکھتی ہے۔ مختصر یہ کہ عقلِ سقیم و قبیح رہزنِ تمکین و ہوش اور غارت گرِ ایمان و آگہی ہے، لیکن انسان کے ظلم و جہل کو کیا کہیے کہ جانتا ہے پر مانتا نہیں۔

بہر حال، جہاں تک عقلِ سلیم کا تعلّق ہے وہ سادہ بھی ہوتی ہے اور زیرک بھی۔ سادہ ان معنوں میں کہ وہ عیّار و مکّار نہیں ہوتی؛ اور زیرک اس اعتبار سے کہ وہ شیطان کے وسوسوں اور جمالیاتی دھوکوں میں نہیں آتی، اور نہ اس کی طاغوتی دلائل و براہین سے منطقی مغالطہ کھاتی اور گمراہ ہی ہوتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ عقلِ سلیم نہ صرف خود حسین ہوتی ہے بلکہ اس میں آرزوئے حسن ہوتی ہے، اور اس کے باعث دل میں سعادت پیدا ہوتی ہے، جس سے محبت الٰہی کے چشمے کے پھوٹ پڑنے کا امکان ہوتا ہے۔ اس سے یہ استنباط کیا جا سکتا ہے کہ عقلِ سلیم اور عشقِ الٰہی میں ہم آہنگی و ہمرنگی ہوتی ہے۔

زندگی ایک دریائے رواں دواں ہے، جس میں انسان کو سفر کرنا پڑتا ہے۔ عقل سقیم و قبیح ہو تو وہ اپنی منزلِ مقصود اور اس کی صحیح جہت سے بے نیاز، نیز آبشاروں، گردابوں اور طوفانوں

کی پروا کیے بغیر اپنے ہمسفر کو رواں دواں اور سرگرداں رکھتی ہے۔ بخلاف اس کے عقلِ سلیم اپنے ہمسفر کو اپنے سفینۂ ادراک کے ذریعے اس کی منزلِ مقصود پر اس راستے سے پہنچاتی ہے جو کامیاب انسانوں کا ہے، جسے قرآنِ مجید صراطِ مستقیم سے اور کامیاب انسانوں کو ان کے مراتب کے لحاظ سے بالترتیب انبیاؑ، صدیقین، شہدا اور صالحین سے تعبیر کرتا ہے۔ عشقِ الٰہی بھی اپنے ہمسفر کو منزلِ مقصود پہ پہنچاتا ہے لیکن اپنی شدتِ جذبات یا جذب وشوق کی رو کے سہارے؛ یہی وجہ ہے کہ اگر اس کی راہ میں گرداب و آبشار اور طوفان و تلاطم آئیں تو وہ ان سے بچ نکلنے کی راہِ سلامتی تلاش نہیں کرتا، بلکہ اپنے زور و تہوّر کے بل پر ان موانعات کو عبور کرنے کی کوشش کرتا اور خطرات کی پروا کیے بغیر جان پر کھیل جاتا ہے۔ عشق کے لیے کارنامے قابلِ قدر و ستائش ہوتے ہیں، لیکن ایسے ہی خطرناک و مہلک مراحل کو حکمت سے سر کرنے کے لیے ربِّ حکیم نے انسان کو عقلِ سلیم ودیعت کی ہے، لہٰذا سفرِ زندگی میں عقلِ سلیم کو اپنا مرشد و دلیل راہ بنانا، عشق کے لیے ناگزیر ہے۔

۳۔ افلاس و مفلوک الحال کے خدشات کو ہوّا بنا کر دکھانا اور انسان کو بخیل و حریصِ زر و مال بنانا، نیز انفاق بالعفو سے باز رکھنا اور اکتناز و احتکار اور کسبِ حرام کی ترغیب دینا، شیطان کا وظیفہ اور شیطنت کا خاصّہ ہے؛ لیکن عقل بگڑ کر قبیح و طاغوتی بن جاتی ہے تو اس کا خاصّہ و کردار بھی ایسا ہی ہو جاتا ہے۔ برخلاف اس کے چونکہ عقلِ سلیم سود و زیاں کا شعور رکھتی ہے، لہٰذا وہ انسان میں ربّ العالمین پر توکّل اور کسب و اکلِ حلال کا داعیہ پیدا کرتی ہے اور اس میں اس حقیقتِ نفس الامری کا شعور بیدار کرتی ہے کہ انفاق فی السبیل اللہ سے نہ صرف دولت کا تزکیہ ہوتا ہے بلکہ اس میں برکت اور اس کی گردش میں تیزی و توازن اور اس کے دائرے میں وسعت پیدا ہوتی ہے چنانچہ انفاق اہلِ عقلِ سلیم یا اولوالالباب کا شعارِ زندگی ہوتا ہے، جس کا حسین ترین نمونہ (= اُسوۂ حسنہ) ہمیں رحمۃٌ للعالمین صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سیرتِ طیّبہ میں ملتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ عقلِ سلیم

اگر اپنی حکمت کے ذریعے انسان کو محسن و کریم، اور فیاض و صالح بناتی ہے تو عشق یہ کام اپنے جذبات کی شدت کے ذریعے سرانجام دیتا ہے۔ عشق کا ایسا اقدام غیر معمولی احوال و ظروف میں بلاشبہ مستحسن و مستفید ہوتا ہے۔ لیکن حالات معمول پہ ہوں تو عمل میں اعتدال قائم رکھنا جتنا ضروری ہوتا ہے اُسی قدر عشق کو عقلِ سلیم کی حاجت ہوتی ہے۔ عشق بلاشبہ ایک ایسی قوت ہے جس کے ذریعے انفس و آفاق کی تسخیر ممکن ہے۔ لیکن اس امکان کو واقعیت میں بدلنے کے لیے عقلِ سلیم کی معاونت ناگزیر ہے۔

اصل یہ ہے کہ عقلِ سلیم و عشقِ الٰہی کے حسین امتزاج ہی سے انسان اللہ تعالیٰ کے آخری مثالی انسان، صاحبِ خُلقِ عظیم و رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ کے مطابق اپنی شخصیت کو محاسنِ اخلاق سے مزین کر کے اپنے اِلٰہ و ربّ کی نعمتِ احسان و رضوان کی آرزو میں اس کی حسین مخلوقات سے محبت و احسان کرتا ہے۔ ایسے ہی اہلِ ایمان کے لیے قرآنِ حکیم نے اولوالالباب، عباد الرحمٰن، اولیاء اللہ، محبانِ الٰہی (یعنی عشاق)، نفوسِ مطمئنہ اور اہلِ جنت کی تعبیریں اختیار کی ہیں۔

۴۔ "عقل سے غمِ روزگار اور عشق سے جمالیاتی غم پیدا ہوتا ہے۔" اس موازنے پر تو یہ مصرع صادق آتا ہے:

یہ واقعہ بھی خوب یہ تہمت بھی خوب ہے

وجہ یہ ہے کہ یہ مقولہ عقلِ طاغوتی و قبیح پر تو صادق آتا ہے، لیکن عقلِ سلیم پر یہ تہمت ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ شیطان ایک تو انسان کی اس جمالیاتی کمزوری سے واقف ہے کہ وہ حسن پسند ہے اور دوسرے اس کمزوری سے کہ وہ عجلت پسند ہے۔ چنانچہ انسان اپنی عجلت پسندی کی وجہ سے حال (دنیا) کے فوائد کو مستقبل (آخرت) کے فوائد پر ترجیح دینا پسند کرتا ہے۔ شیطان اپنی مقتدی عقل کی معاونت سے انسان کی ان دونوں کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھتا اور اسے دُنیا کے سود و زیاں کے غم میں مبتلا کر دیتا ہے۔ ان دونوں یعنی عقل و شیطان کا طریقِ واردات عموماً یہ ہوتا ہے کہ وہ نفسِ امارہ اور اس کی خواہشات کو انسان کا اِلٰہ

(= معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود) بنا دیتے ہیں، اور وہ اپنی خواہشوں، تمناؤں، ارمانوں اور حسرتوں کو پورا کرنے کے چکّر میں پھنس کر اپنے حقیقی اِلٰہ و ربّ کے ساتھ اپنے نفس کو بھی فراموش کر بیٹھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد حرزِ جان بنانے کے قابل ہے کہ "انسان کے سینے میں دو قلب نہیں ہوتے"۔ ظاہر ہے ایک دل میں بیک وقت ایک ہی اِلٰہ یا معروضِ حسن و محبت رہ سکتا ہے۔ اگر دل میں حقیقی اِلٰہ بس جائے تو اُس کے حسن کی برکت سے وہ امن و سلامتی، طمانیت و سکینت، مسرّت و راحت کا بہشت یا حُسنُ المآب بن جاتا ہے۔ بخلاف اس کے اگر دل میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور اِلٰہ بس جائے تو دل اُسے فطرۃً قبول نہیں کرتا اور اس کی موجودگی سے اس میں نفرت و غُصّہ اور خوف و حُزن کی آگ لگ جاتی ہے اور وہ جہنّم یا شرّ المآب بن جاتا ہے۔ اس سے مستنبط ہوا کہ عقلِ سلیم سے نہیں بلکہ قبیح و طاغوتی عقل سے غمِ روزگار پیدا ہوتا ہے۔

عقلِ سلیم سے جمالیاتی غم پیدا ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ انسان میں ایک طرف اللہ تعالیٰ کی اُلوہیت و ربوبیّت کا اور دوسری جانب اس کی عبدیّت و مربوبیّت اور ان کے تقاضوں کا، نیز حقوق اللہ اور حقوق العباد اور انہیں پورا کرنے کا احساس و شعور بیدار کرتی ہے۔ اس احساس و شعور سے غمِ انسانیت ہی نہیں، غمِ مخلوقات بھی پیدا ہوتا ہے۔ الحسن و الحق کے ناطے سے اس غم میں حُسن و حق پیدا ہوتا ہے، جس کے لیے ہم نے "جمالیاتی غم" کی تعبیر اختیار کی ہے۔ جمالیاتی غم اپنی تاثیرِ حُسن کے باعث قُرّۃُ العین ہوتا ہے۔ یہ جہاں دل میں طمانیت و مسرّت اور کیف و سُرور کی روح پرور ٹھنڈک پیدا کرتا ہے، وہاں اس میں غمِ روزگار کی آگ بجھانے اور ٹھنڈا کرنے کی بھی تاثیر ہوتی ہے۔

عشق تین قسم کا ہوتا ہے: وجدانی، عقلی اور شہودی (= سمعی و بصری)۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے:

(۱) **عشقِ وجدانی**: ایک تو یہ جمالیاتی حسن کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ جمالیاتی حسن قلب

کی ایک از بس اہم جمالیاتی قوت ہے، جو الحسن والٰہ کی طرف سے انسان کو ودیعت کی گئی ہے۔ اس کا وظیفہ حسن کو پہچاننا، حُسن و قُبح میں تمیز کرنا، قُبح سے نفرت اور حسن سے محبت کرنا اور اس کے جمالیاتی مشاہدے سے جمالیاتی لذت و مسرت اور سرور و سوز حاصل کرنا ہے۔ اس دعوے کے ثبوت میں ہم بچوں کی رغبت و تشوّقِ حسن کو پیش کر سکتے ہیں۔ یہ سامنے کی بات ہے کہ حسن کے سمعی و بصری مشاہدے سے بچے کی اضطراری حرکات و کیفیات اور رویے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اسے پسند کرتا اور اس سے جمالیاتی لذت و مسرت حاصل کرتا ہے؛ مثلاً وہ روشنی خوبصورت کھلونوں، تصویروں، شگفتہ و متبسم چہروں، محبت بھری نظروں، اشاروں اور حرکتوں اور باتوں کو دیکھ اور سن کر خوش ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے وہ اندھیرے، بدصورت چیزوں، خوفناک جانوروں، نظاروں، نفرت انگیز و غضبناک صورتوں، نگاہوں، اور وحشت انگیز و قبیح آوازوں سے نفرت و خوف کھاتا ہے۔ یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ موسیقی سے بچے محظوظ ہوتے اور اضطراری طور پر رقص کرنے لگتے ہیں۔ بخلاف اس کے قبیح یا خوفناک آواز سے بچے سخت نفرت کرتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ انسان وجدانی طور پر حسن سے محبت کرتا ہے۔

وجدانی عشق کی توجیہہ باندازِ دیگر بھی کر سکتے ہیں۔ قدرت ہر بچے کو آرزوئے حسن دے کر دنیا میں بھیجتی ہے آگے بڑھنے سے پہلے حسن کی انواعِ ثلاثہ کی طرف اشارہ کر دینا فائدے سے فائدے سے خالی نہ ہوگا، اور وہ یہ ہیں: (۱) حسنِ الٰہی (۲) حسنِ تکوینی اور (۳) حسنِ فنّی۔

۱۔ حسنِ الٰہی:

اسے حسنِ حقیقی بھی کہتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی حقیقت میں الحسن والحق اور الحیّ والقیّوم ہے اور حسن ہی اس کی ذات ہے، اس لیے وہ قدیم ولازوال اور ازلی و ابدی ہے۔ چنانچہ جمال و جلال، حیات و قیّومیت، نور و خوشبو، عظمت و کبریائی اور قدوسی و جبروت وغیرہ وغیرہ جنہیں انسان کی نسبت سے صفاتِ حسنہ یا اسماءِ حسنیٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ذاتِ الٰہی کے اعیان ہیں، اور اس کے حسن یا ذات کی طرح قدیم ہیں۔ برخلاف اس کے حسنِ مجازی اور اس

کہ صفات مخلوق و حادث ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ہر تخلیق کو حسین بنایا ہے۔ چونکہ ہر تخلیق حادث ہوتی ہے، اس اعتبار سے حسنِ اشیا بھی حادث ہے، لہٰذا وہ قدیم و لازوال حسنِ الٰہی کے مثل نہیں ہو سکتا اور نہ ہے، اس لیے اُسے مجازی کہتے ہیں۔ حسن بہر حال حسن ہے، حقیقی ہو یا مجازی، اپنی تاثیر رکھتا ہے، جس میں لذت و حلاوت، بہجت و طرب، طمانیت و سکینت، مسرت و لبسط، سرور و سوز، بیخودی و مستی، کیف و روح پروری، جاذبیت و دلکشی اور لذتِ چشم و قرۃ العین ہوتی ہے۔ جہاں تک حسنِ حقیقی کا تعلق ہے اس کی تاثیر اس کی طرح ہر اعتبار سے بے مثال و بے نظیر ہے۔ ایک تو ذاتِ الٰہیہ حقیقتِ مطلقہ و بحت ہے اور دوسرے لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی، لہٰذا انسان ظاہری آنکھ سے اُسے دیکھ نہیں سکتا۔ اصل یہ ہے کہ حسنِ حقیقی کا مشاہدہ حواس کے مقدور ہی میں نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ حواس کا تعلق مادی یا کثیف چیزوں سے ہے، لہٰذا وہ غیر مادی یا لطیف و تنزیہی اشیاء کا مشاہدہ و ادراک نہیں کر سکتے۔

لیکن ربِ جلیل نے انسان کو نورِ حسی کے علاوہ نورِ قلبی بھی ودیعت کیا ہے، جس کے ذریعے وہ حسنِ حقیقی کا صوری و معنوی ہر رنگ میں مشاہدہ کر سکتا ہے جو تین شرائط سے مشروط ہے: اول، نورِ قلبی کے نشوو ارتقا کا مرحلہ مکمل ہو چکا ہو۔ دوم، اس کی آرزوئے حسن سچی اور حرکی ہو اور اپنے کمال کو پہنچ چکی ہو۔ سوم، ربِ جلیل کی مشیت میں اُسے اپنی دید سے فیضیاب کرنا ہو۔ دید "دیدِ دوست" تین طرح کی ہوتی ہے: ایک دیدِ صورت؛ دوسری دیدِ تجلیات اور تیسری دیدِ عالمِ دہر۔ یہاں اس حقیقت کی صراحت کر دینا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ یگانہ و بے مثال اور بے نظیر و بے عدیل یا قرآن مجید کی معجز نما زبان میں "لَا کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ" ہے، اس لیے یہ بات کوئی نہیں جانتا کہ وہ مُصوّر و مُتشکّل ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو اس کی تشکل و صورت کی ماہیت و نوعیت کیا ہے؟ اگر نہیں ہے تو اس کے الواحد، الحیّ و القیّوم کی نوعیت و حقیقت کیا ہے؟ اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ماہیت کا کوئی متنفس فہم و ادراک نہیں کر سکتا اور نہ اس کی معرفت ہی رکھتا ہے۔ یہ انسان کے مقدور ہی میں نہیں کہ مخلوق ہو کر اپنے ربِ سبحان و بے نظیر اور بے کیف و کم کا

اِدراک کر سکے۔ لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کا ربِّ ذوالجلال والاکرام اور اِلٰہ جمیل و کریم ہے؛ دوسرے وہ علیم و حکیم اور عزیز و قدیر ہے، لہٰذا وہ اپنی طلب و جستجو رکھنے والے جس بندے کو اپنی دید سے نوازنا چاہتا ہے، اس کے ذوق و شوق اور اپنی حکمت و مشیت کے مطابق جس صورت و شکل، رنگ و نور اور انداز و کیف میں چاہتا ہے، اس پر اپنا جلوہ پیدا کرتا ہے، جس کا مشاہدہ وہ نورِ حسنِ قلب کے ذریعے کرتا ہے۔ اس سے اس امر کی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں ربِّ جلیل نے انسان کو ایسے انداز سے یہ دُعا سکھائی ہے کہ اس میں اس کا یہ حق الیقین مضمر ہے کہ وہ اپنے نورِ قلب کے ذریعے اپنے اِلٰہ و ربّ کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ دُعا یہ ہے:
رَبَّنَآ اَتۡمِمۡ لَنَا نُوۡرَنَا وَاغۡفِرۡ لَنَا ۚ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ (التحریم ۶۶: ۸) اے ہمارے ربّ! ہمارے لیے ہمارے نور کی تکمیل کر دے اور ہمیں (ہر قسم کی لغزش و خطا، غفلت و نسیان وغیرہ سے) محفوظ رکھ۔ یقیناً تُو ہر شے پر قدرتِ کاملہ رکھنے والا ہے)۔

یہاں موقع و محل کی نسبت سے اس لطیف نکتے کی طرف اشارہ کر دینا اولیٰ ہے کہ حسنِ کائنات کا جمالیاتی مشاہدہ، جو بنیادی طور سے حسّی ہوتا ہے، انسان کے جمالیاتی ذوق کی تسکین کرتا اور اُسے جمالیاتی سُرور و سوز عطا کرتا ہے، اس لحاظ سے اس کی زندگی میں ازبس اہمیت رکھتا ہے؛ لیکن حُسنِ حقیقی کا مشاہدہ، جو نورِ حسنِ قلب کا مرہونِ منّت ہوتا ہے، اس سے اسی قدر افضل و اعلیٰ ہے جس قدر حقیقت مجاز سے اور خالقِ حقیقی اپنی مخلوقات سے افضل و اعلیٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حسن اس کی طرح قدیم ہے، اس لیے لازوال ولافانی اور ابدی ہے۔ میرے نزدیک حسن ہی ذاتِ الٰہی ہے اور جن حقائق کو انسان علم کی نسبت سے صفاتِ حسنہ (مثلاً جمال و جلال، حیات و قیومیت، نور و خوشبو، قدوسی و جبروت، عظمت و کبریائی وغیرہ وغیرہ) سے تعبیر کرتا ہے، وہ اصل میں ذاتِ الٰہی کے اعیان ہیں۔

۲۔ حُسنِ تکوینی:

اس سے مراد حُسنِ کائنات ہے۔ قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے: اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ (السجدہ ۳۲: ۷) اُس نے ہر چیز کو حسین بنایا جو اُس نے تخلیق کی۔ اس ارشادِ الٰہی میں یہ نکتہ مضمر ہے کہ حُسن ہر اس چیز میں بالقوہ موجود ہوتا ہے، جس کی تخلیق کرنا مقصودِ باری تعالیٰ ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی مطلوبہ تخلیق کی تشکیل باندازِ تسویہ و تعدیل اس طرح کرتا ہے کہ جو اس کے موضوعی و معروضی احوال و ظروف کے اعتبار سے موزوں ہوتی ہے تو اس میں حُسن اپنا جلوہ پیدا کرتا ہے۔ یہ یاد رہے کہ تخلیقی موزونی کی نسبت سے حُسن اپنا جلوہ پیدا کرتا ہے۔ حُسن کیا ہے؟ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ اس کا ادراک و عرفان ممکن ہی نہیں، اور شرمندۂ تعبیر ہونا اس کے مقدور ہی میں نہیں۔ یہ واقعیت بھی عقل کی رسائی سے ورا ہے کہ حُسن کیوں اور کیسے مخلوقات میں بالقوہ موجود ہوتا ہے؟ بہر حال، حُسن اشیاء کے باطن میں بالقوہ موجود ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی جمالیاتی تخلیقی فعلیّت سے قوّت سے فعل میں آتا ہے، یعنی اپنا جلوہ پیدا کرتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ حُسن ہی وہ شے ہے جسے حقیقت کہتے ہیں۔ یہ لطیف و منزّہ اور بسیط و بحت ہے، اور اپنی اس خوبی کے باعث ہی وہ تعیّنات میں اپنا جلوہ پیدا کرتا ہے۔ حُسن ہمیشہ مرکب اشیاء میں اپنی نمود رکھتا ہے، مُفرد اشیاء میں نہیں۔ غالباً اسی بنا پر اہلِ فکر بالخصوص صوفیہ نے یہ رائے قائم کی ہے کہ یہ جمیل و جلیل کائنات آئینۂ حُسنِ الٰہی ہے؛ یا بالفاظِ دیگر، مظاہرِ فطرت میں حُسنِ الٰہی کی نمود ہوتی ہے۔

قرآنِ حکیم کی رُو سے اللہ تعالیٰ کی ہر چیز تخلیق بالحق ہے۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ وہ باطل و لایعنی نہیں، بلکہ اپنے اندر افادی مقصدیت و معنویت رکھتی ہے۔ اس کا معنٰی الحق بھی ہے۔ جمالیاتی نقطۂ نظر سے اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ قبیح نہیں حسین ہے۔ دلیل یہ ہے کہ حُسن اصلاً حق ہی تو ہے۔ سِرِّ حُسن یہ ہے کہ وہ باطن بھی ہے اور ظاہر بھی، اور لطیف و منزّہ اور بسیط و بحت ہونے کے باوجود تعیّنات میں اپنا جلوہ پیدا کرتا ہے اور انسان کو اس کے

حقیقی إلٰہ یعنی معروضِ حُسن وعشق کی یاد دلاتا ہے؛ نیز انسان کی آرزوئے حُسن کو حرکی بناتا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی ہر چیز تخلیق بالحق ہے، لہٰذا اس کی جملہ مخلوقات جمالیاتی نقطۂ نظر سے آئینہ دارِ حُسن وحق ہیں، اور الحسن والحق اللہ تعالیٰ ہی کے اسمائے حُسنیٰ ہیں۔

حُسن اصلاً جوہر ہے، لیکن خالقِ حقیقی یا خالقِ مجازی کی جمالیاتی تخلیقی فعلیت کے ذریعے تخلیقات میں اپنا جلوہ پیدا کرتا ہے تو عرض کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس اعتبار سے حُسنِ خلقی یا مجازی کو حادث کہتے ہیں۔ حُسن بلاشبہ اپنے معروضِ حادث کے حوالے سے حادث ہے، لیکن حقیقت میں اس کا ہر نقش زمانے کی لوحِ محفوظ میں اس طرح مرتسم ہو جاتا ہے کہ روزِ حساب اس کے نقوش متحرک تصویر کے مانند اپنا جلوہ پیدا کریں گے۔ یہی صورتِ حال حُسن کی ضد ونقیض قُبح کی بھی ہے۔

جس طرح حُسنِ تکوینی عالمِ مکانی میں اپنی نمود رکھتا ہے اسی طرح وہ عالمِ زمانی میں بھی جلوہ افروز ہوتا ہے، اور ہر رنگ میں جمالیاتی ذوق کی تسکین کرتا، اور اہلِ ذوق ونظر کو جمالیاتی سُرور وسوز عطا کرتا ہے؛ نیز اُن کے لیے لذّتِ عین، قُرّۃُ العین اور جمالیاتی ثروت بھی ہے۔ یہاں اس لطیف جمالیاتی نکتے کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے کہ جس طرح جمالیاتی حِس اور حُسن لازم وملزوم ہیں، اُسی طرح حُسن کے جلووں کی کثرت وبوقلمونی اور جمالیاتی ذوق کا اختلاف وتنوّع لازم وملزوم ہیں۔ اگر ربّ ذوالجلال والاکرام نے انسان کو جمالیاتی حِسّ وذوق ودیعت نہ کیے ہوتے تو وہ حُسن کی جمالیاتی ثروت سے محروم رہتا اور اس کے لیے نہ صرف حُسنِ الٰہی، حُسنِ تکوینی اور حُسنِ فنّی بے معنی ہوتا، بلکہ خود اس کی زندگی بھی اپنے معنیٰ سے محروم ہوتی۔ حُسن زندگی کا معنیٰ ہے۔ جس طرح لفظ معنی کے بغیر بے حقیقت ہوتا ہے، اُسی طرح زندگی حُسن کے بغیر بے معنی ہے۔ اصل یہ ہے کہ حُسن جمالیاتی ثروت کا مخزن ہے، جس کی بدولت یہ عالمِ زمان ومکان دلکش ونظر افروز، روح پرور وسُرور انگیز اور لذّتِ عین وقُرّۃُ العین ہے۔ انسان کی جمالیاتی حِسّ زندہ وفعّال اور وہ صاحبِ ذوق ونظر ہو تو عالمِ زمان ومکان میں جمال وجلال کے

مناظر اور نظارے شاہدِ مطلق کی ہستی کے بصیرت افروز شواہد و دلائل ہیں۔ قلب زندہ و حسین اور بیدار و فعال ہو تو جمالیاتی حس بھی زندہ و حرکی ہوتی ہے اور ذوقِ حسن میں اختلاف و تنوع، بوقلمونی و گوناگونی اور لطافت و آفاقیت پائی جاتی ہے۔ یہ ایسی نعمتیں ہیں جو آدمی کو اہلِ نظر، صاحبِ ذوق و شوق، صاحبِ حسن و سرور اور خود آگاہ و خداشناس بناتی ہیں۔

۲۔ حُسنِ فنّی:

اس سے مراد وہ حُسن ہے جو خالقِ مجازی کی جمالیاتی تخلیقی فعلیت سے ادب و فن میں اپنا جلوہ پیدا کرتا ہے۔ حُسن کی نوعیت کوئی ہو اور وہ کسی صورت و رنگ اور آواز و آہنگ میں اپنا جلوہ پیدا کرے، اس کی تاثیر ایک جیسی ہوتی ہے، البتہ اس میں کمیت و کیفیت کے لحاظ سے فرق ضرور ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہیے۔ حُسنِ فنّی میں یہ فرق بکثرت ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہر خالقِ مجازی کی صلاحیت، جمالیاتی ذوق اور آرزوئے حُسن میں تفاوت پایا جاتا ہے۔ خالقِ مجازی جتنا عظیم اور اس کی جمالیاتی تخلیقی فعلیت جتنی کامل ہوگی، اُسی قدر اس کے تخلیقی شہکاروں میں حُسن کی نمود کیفیت و کمیت میں اعلیٰ و زیادہ ہوگی۔ بخلاف اس کے خالقِ مجازی جتنا معمولی درجے کا ہوگا اور اس کی جمالیاتی تخلیقی فعلیت جتنی ناقص ہوگی، اُسی قدر اس کی تخلیقات ناقص اور معمولی درجے کی ہوں گی اور اسی نسبت سے ان میں حُسن اپنا جلوہ پیدا کرے گا۔

آرزوئے حُسن اور حُسنِ فنّی کے باہمی تعلّق کی نوعیت یہ ہے کہ اگر دونوں کو لازم و ملزوم کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ خالقِ مجازی (= ادیب و فنکار) میں آرزوئے حُسن جس قدر زندہ و حرکی، مُحکم اور سچّی ہوتی ہے، اسی قدر اس کے ادب و فن میں حُسن اپنا جلوہ اکمل صورت میں پیدا کرتا اور اُسے عظیم بناتا ہے۔ علاوہ بریں، آرزوئے حُسن ہی انسان کو صاحبِ ذوق و نظر بناتی ہے۔ ثقافت بھی اپنے نشو و ارتقاء کے لیے قوم کی آرزوئے حُسن کی مرہونِ منّت ہوتی ہے۔ یہ یاد رہے کہ ارتقائے ثقافت کا مطلب اس کے حُسن کا ارتقاء ہے۔ اصل یہ ہے ارتقائے حیات اور ارتقائے انسان کا مطلب ہی ان کے نورِ حُسن کا ارتقاء ہے۔

حسن اور ادب و فن کا رشتہ بعینہٖ وہ ہے جو الفاظ اور معانی کا ہوتا ہے۔ جس طرح لفظ بے معنی ہو تو وہ مُہمل و مجہول اور لایعنی و باطل ہوتا ہے، اسی طرح فن میں حسن نہ ہو تو وہ باطل اور مُہمل و مجہول ہوتا ہے۔ موزونیِ طبع اور آرزوئے حسن دونوں وہبی ہیں اور طبعِ انسانی میں بالقوہ موجود ہوتی ہیں، انہیں قوت سے فعل میں لانا حرکی وارتقائی بنانا اور پھر انہیں درجۂ کمال تک پہنچانا، خالقِ مجازی کا وظیفہ ہے۔ اپنے اس وظیفے سے باحسن وجوہ عہدہ برآ ہونے میں اس کی اور اس کے ادب و فن کی عظمت کا راز مضمر ہے۔

۲۔ عشقِ عقلی کا سمجھنا تعصباتِ فکری و نظریاتی کے باعث جتنا مشکل ہے اس سے دشوار تر اس حقیقت کو قبول کرنا ہے کہ عقل کے ذریعے بھی عشق پیدا ہوتا ہے۔ اکثر فلاسفہ و مفکرین، صوفیہ و متکلمین اور شعراء و علماء نے عشق و عقل کو ایک دوسرے کا حریف سمجھا ہے اور اس موضوع پر اتنا کچھ نظم و نثر میں لکھا جا چکا ہے کہ یہ عقیدہ قلوبِ انسانی میں اس طرح راسخ ہو چکا ہے کہ اُسے نکالنا اگر محال نہیں تو از بس دشوار ضرور ہے۔ بہر حال واقعہ یہ ہے کہ عقل عشق کی حریف نہیں، ہمنوا و معاون ہے، بشرطیکہ وہ سلیم ہو، یعنی زندہ و بیدار، حسین و منیر اور فعّال و حرکی ہو۔

جیسا کہ ہم معلوم کر چکے ہیں عشق بلاشبہ ایک عالمگیر فطری جذبہ ہے جس کا تعلق بنیادی طور پر وجدان، جمالیاتی حِس اور جنسی جبلّت سے ہے، لیکن عقلِ سلیم کو بھی اس زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ عقلِ سلیم بھی عشق کا محرک بنتی رہی ہے۔ اپنا یہ موقف ثابت کرنے کی خاطر ہم پہلے عشقِ حسنِ الٰہی سے کلام کرتے ہیں:

(۱) عشقِ حسنِ الٰہی اور عقل:

اس میں کچھ کلام نہیں کہ انسان کے باطن میں اپنے اِلٰہِ حقیقی (= معروضِ حسن و عشق یا معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود) کی، جو الحسن والحق اور ربِّ ذوالجلال والاکرام ہے، آرزو بالقوہ موجود ہوتی ہے۔ اس آرزو کو قوت سے فعل میں لانے اور اس کے نشو و ارتقاء کرنے میں

متعدد عوامل حصہ لیتے ہیں، جن میں مشاہدۂ حسن ازبس اہم کردار ادا کرتا ہے؛ اور اس کے لیے جمالیاتی حِس کا حرکی و ارتقائی ہونا ناگزیر ہے۔ اس واقعیت سے متعلق دو رائیں نہیں ہوسکتیں کہ منکرانِ خدا کے علاوہ ہر دین و مذہب کے پیروؤں میں ان لوگوں کی کمی نہیں جو عشقِ الٰہی کی لذت سے ناآشنا ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ آرزوئے حسنِ الٰہی کے فطری و عالمگیر ہونے کے باوجود ضروری نہیں کہ وہ ہر شخص کے دل میں زندہ و فعّال ہو۔ اس کی علتِ غائی یہ ہے کہ ان کی عقل حسین و منیر اور زندہ و ارتقائی نہیں اور نہ اس کی آرزوئے حسن زندہ و فعّال ہی ہوتی ہے۔ اصطلاحِ قرآنی میں وہ "اُولوالالباب" نہیں ہوتے۔ اس کے علی الرغم، ان کے قلوب اپنے فطری نورِ حسن سے محروم ہوتے ہیں، اس لیے وہ حسن کور روحق کور اور کور ذوق و کور باطن ہوتے ہیں۔ قرآنِ حکیم کی زبان میں ان کے قلوب اندھے ہوتے ہیں۔ قلب کا اپنے نورِ حسن سے محروم یا اندھا ہونا ہی اس بات کا بنیادی سبب ہے کہ اُن کی آرزوئے حسنِ الٰہی قوت سے فعل میں نہیں آتی؛ اور اگر آتی ہے تو نشو و نما نہیں پاتی۔ چنانچہ قرآنِ مجید اس معاملے میں اپنے معجزانہ ایجازِ بلاغت سے ہماری توجّہ اس نفسیاتی۔جمالیاتی اصل الاصول کی طرف مبذول کراتا ہے کہ اربابِ عقلِ سلیم یا بزبانِ قرآن اولوالالباب وہ لوگ ہیں جو اُٹھتے، بیٹھتے، لیٹتے اور کروٹیں بدلتے خلقتِ کائنات پر حکیمانہ تفکّر بالحق کرتے رہنے کے عادی ہوتے ہیں، اور پھر اپنی عقلِ سلیم کے اس فتوے کو قبول کرتے ہیں کہ یہ کائنات ربّ ذوالجلال والاکرام کی تخلیق بالحق ہے اور اُس کے حضور اس حقیقت کا پورے ایقان و اذعان کے ساتھ اقرار کرتے ہیں؛

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (آل عمران ۳: ۱۹۱: اے ہمارے ربّ! تو نے یہ (کائنات) بے مقصد و لاطائل اور لایعنی و بے معنی نہیں بنائی)۔ اس حقیقت کا ایقان و اذعان ان کے قلوب میں اپنے اس مشاہدے اور اعتراف و اقرار کی یاد تازہ کردیتا ہے جو انہوں نے اپنے ربّ ذوالجلال والاکرام کے حضور روزِ شہودِ الست کیا تھا (الاعراف ۷: ۱۷۲)؛ اور اس

سے شمعِ محبت اِلٰہی فروزاں ہوجاتی ہے۔ اس سے یہ استنباط کرسکتے ہیں کہ عقلِ سلیم انسان کے دل میں اپنے اِلٰہِ جمیل کی محبت کو قوت سے فعل میں لانے اور اس کا نشو و ارتقاء کرنے میں ازبس اہم کردار ادا کرسکتی ہے اور اس سے فائدہ اہلِ عقلِ سلیم ہی اُٹھاتے ہیں۔

سائنس کی دُنیا عقلیت کی دُنیا ہے۔ چنانچہ کتبِ سیر شاہد ہیں کہ متعدد سائنس والوں نے اپنی عقلِ سلیم کی احسن کارکردگی کی بدولت یہ حقیقت معلوم کرکے حقیر سے حقیر ذرّئے جماداتی، دانۂ نباتاتی اور جرثومۂ حیاتیاتی میں عجائباتِ قدرت کا ایک عالم مضمر ہے، ربِ علیم و حکیم اور عزیز و قدیر کی حمد و ثنا میں رطب اللسان ہوگئے اور ان کے دلوں میں خفتہ محبتِ الٰہی بیدار و فعال ہوگئی۔ علاوہ بریں، تاریخ شاہد ہے کہ اربابِ عقلِ سلیم نے ہر زمان و مکان میں کلامِ الٰہی میں تدبّر بالحق سے حُسن و حق کو پہچان اور اپنے خالق و ربّ کو اپنا معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود یا جمالیاتی اصطلاح میں معروضِ حسن و عشق بنالیا۔ چور سے قطب بن جانے کا مقولہ سچّا بھی ہے اور اس حقیقت کی بُرہانِ قاطع بھی کہ عقل کی اپنی شمع منوّر ہوجائے تو اس کے نور سے محبتِ الٰہی کی شمعِ خاموش بھی فروزاں ہوجاتی ہے۔

(ب) عشقِ حُسنِ مجازی اور عقل:

اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی شخص شکل و صورت کے لحاظ سے حُسن کے معیار پر پورا نہیں اترتا، لوگ اسے بدصورت بھی سمجھتے ہیں، لیکن اس کے باوجود اس سے محبت کرتے ہیں۔ اس کا زوج اس سے محبت بلکہ عشق بھی کرتا ہے۔ سوال پیدا ہوا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ جمالیاتی ذوق کے بجائے عقلِ سلیم کا فتویٰ یہ ہوتا ہے کہ اس کے محاسنِ اخلاق ایسے ہیں کہ اس سے محبت کی جائے۔ وہ اپنے حُسنِ خُلق کی وجہ سے اس قابل ہے کہ اس سے محبت کی جائے۔ اس سے یہ مستنبط ہوا کہ یہ عقل ہے جو اُسے محبوب بناتی ہے۔ یہ عقلِ سلیم ہے جو فلاسفہ و حکماء، علماء و مفکرین، شعراء و ادباء اور اہلِ قلم و فن کو محبوبِ خلائق بناتی ہے۔ لوگ اپنے دینی و مذہبی پیشواؤں، سیاسی، عسکری

اور جماعتی رہنماؤں سے ایسی شدید محبّت کرتے اور ان کے لیے ایسی ایسی قربانیاں دیتے ہیں کہ جو عشق ہی دے سکتا ہے۔ کیوں؟ وجہ یہ ہے کہ یہ عقل ہے جو ان میں ایسا کرنے کی تحریک و داعیہ پیدا کرتی ہے۔ الغرض، عشق و محبت کے اس کاروبار میں عقل اہم کردار ادا کرتی ہے۔

یہ بصیرت افروز و خیال انگیز نکتہ ہے کہ عقل سے خشیّت پیدا ہوتی ہے اور خشیّت میں محبّت مضمر ہوتی ہے۔ اس نکتے کی وضاحت کردی جاتی ہے۔ یہ عقلِ سلیم ہے جو ایک صالحہ بیوی کے دل میں اپنے وفا شعار شوہر کی خشیّت پیدا کرتی ہے کہ کہیں وہ ایسا غلط قدم نہ اُٹھائے جو اُسے اپنے شوہر کی محبت و رفاقت سے محروم کردے۔ اس خشیّت میں محبّت مضمر ہوتی ہے۔ جس عقلمند بیٹی کے دل میں اپنے والدین سے شدید محبّت ہوتی ہے، اس میں اسی قدر ان کی خشیّت بھی ہوتی ہے، وجہ یہ ہے کہ عقل اُسے سمجھاتی ہے کہ والدین ہی اس کے سچّے خیر خواہ، حافظ و ناصر، وکیل و کفیل اور اس کے خوشگوار مستقبل کے ضامن ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری زندہ و ناطق کلام قرآنِ مجید میں، جو اس کی رُو سے کتاب الانسان ہے[۴] (یعنی اس کا موضوع و محور انسان ہے)، اس نفسیاتی حقیقت کی طرف انتہائی بلیغ اشارہ کیا ہے کہ بندوں میں سے اہلِ علم ہی اس سے ڈرتے ہیں[۵]، اور وہ اہلِ علم سے اُولوالالباب یا اہلِ عقلِ سلیم مراد لیتا ہے چونکہ خشیّت میں محبّت مضمر ہوتی ہے، لہٰذا یہ ارشادِ الٰہی اس دعوے میں قولِ فیصل ہے کہ عقلِ سلیم سے محبّتِ الٰہی پیدا ہوتی ہے۔

۲۔ عشقِ شہودی:

اس کا مطلب ہے ایسا عشق جو مشاہدۂ سمعی و بصری سے پیدا ہو۔ عشق دید کی طرح آواز سے بھی پیدا ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ حُسنِ صُوری اگر جنّتِ نگاہ ہے تو حُسنِ صوتی فردوسِ گوش ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ آرزوئے حُسنِ "دوست" ہے، جو دید و کلامِ "دوست" سے شُعلۂ نور بنتی ہے تو عشق کہلاتی ہے۔ میرے لیے تو یہ مشاہدہ ہی اللہ تعالیٰ کی ہستی اور اس کی اُلوہیت و ربوبیت

پر ایمان لانے کے لیے کافی ہے کہ وہ بسیط و بحت، مطلق و منزہ اور لطیف و بے مثال ہونے کے باوصف اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اپنا صوری جلوہ پیدا کرتا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا اللہ تعالیٰ کی صورت و شکل ہے یا نہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا یہ راز کوئی نہیں جانتا۔ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہے اور کوئی تخلیق اپنے خالق کی ماہیت و حقیقت کا اِدراک نہیں کر سکتی۔ اس کا علم و ادراک اور معرفت و عرفان کسی مخلوق کے مقدور ہی میں نہیں۔ قرآنِ مجید کا ایک ارشاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ الواحد، الحیّ والقیّوم ہے اور جہاں تین اشخاص ہوں، چوتھا وہ ہوتا ہے، اور اگر چار ہوں تو پانچواں وہ ہوتا ہے اور علیٰ ہذا القیاس[۱]۔ اس سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ اس کی صورت و شکل اور پیکر ہونا چاہیے، چاہے اس کی صورت، صورتِ حسن اور پیکر، پیکرِ حسن ہو، اور حسن لطیف و منزّہ ہے۔ ساتھ ہی قرآن مجید میں اس حقیقت سے بھی آگاہ کیا ہے کہ وہ احد، لَا کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ اور لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ[۲] ہے، لہٰذا ایسی کوئی چیز، شکل وصورت اور وجود و پیکر نہیں جو اس کے مثل و مشابہ ہو۔ بالفرض اگر وہ شکل وصورت اور پیکر و وجود رکھتا بھی ہے تو وہ یقیناً بے مثل و بے نظیر ہوں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی کوئی شکل وصورت ہی نہ ہو۔ بہر حال، حقیقت جو کچھ بھی ہو، وہ چونکہ ربِّ ذوالجلال والاکرام بھی ہے اور اپنے بندوں کا اِلٰہ بھی، لہٰذا اپنی طلب و آرزو رکھنے والے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے ان کے جمالیاتی ذوق اور حسنِ تصور سے کہیں زیادہ حسین صورت میں اپنا جلوہ پیدا کرتا ہے، اور یہ بندے ان ظاہری آنکھوں کے ذریعے نہیں بلکہ اپنے نورِ حسنِ باطنی کے ذریعے اس کا صوری مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس کے سچے اور جھوٹے ہونے کا معیار بھی ہے۔ اوّلاً، اس جمالیاتی مشاہدے سے شاہد کو جو لذت و قُرّۃُ العین حاصل ہوتی ہے، وہ جتنی شدید ہوتی ہے، اتنی ہی طمانیت انگیز و سُرور آفرین، کیف پرور و روح افزا اور بصیرت افروز و ایمان افزا ہوتی ہے۔ یہ مشاہدہ یا تو عالمِ خواب میں ہوتا ہے یا ایسے جمالیاتی عالمِ اِستغراق و محویّت میں، جسے صوفیہ

سُکر و مراقبے سے تعبیر کرتے ہیں۔ ثانیاً، شاہد اس مشاہدے کے جمالیاتی اثرات عالمِ استغراق و محویت کے علاوہ بیداری و صحو کی حالت میں بھی محسوس کرتا ہے اور یہ مشاہدہ ناقابلِ فراموش ہوتا ہے اور خود نفس اس کی صداقت کو تسلیم کرتا اور اس کے اثرات قبول کرتا ہے، جو بعض اوقات شاہد کی نفسیاتی کیفیات اور آرزوؤں کو بدل ڈالتے ہیں۔ ثالثاً، اس جمالیاتی اُلُوہی مشاہدے کی تاثیرِ برقِ حسن سے آرزوئے حسن میں اتنی شدت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ شدید محبت یا عشق میں بدل جاتی ہے۔ علاوہ بریں، "صورتِ دوست" آئینۂ قلب میں مرتسم ہو کر جمالیاتی ثروت کا گنجینہ بن جاتی ہے۔ رابعاً، اس مشاہدے سے شاہد کو اس حقیقت کا عین الیقین بلکہ حق الیقین ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ صرف الحسن والحق، اعظم واکبر، سُبحان وصمد، الحیّ والقیوم اور عزیز وقدیر ہے، بلکہ انسان کا حقیقی اِلٰہ بھی ہے۔ خامساً، جمالیاتی مشاہدے سے جمالیاتی ثروت ملتی ہے جو نعمتِ عُظمٰی و حُسنٰی ہے۔ سادساً، رویتِ الٰہی نورِ حُسنِ باطنی کے ذریعے حق ہے۔

بہر حال، دیدِ دوست" نورِ موضوعی کے ذریعے ممکن ہے اور ہر زمان و مکان میں آرزوئے "دوست" رکھنے والے اس تجربے سے گزرے ہیں اور گزر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ربِّ ذوالجلال والاکرام بھی ہے اور اِلٰہ (= معروضِ حُسن و عشق) بھی ہے؛ لٰہذا ایک تو الحسن ہونے کی وجہ سے پیدائی اس کی ذات کا خاصّہ ہے، اور دوسرے اُلُوہیت کا تقاضا بھی ہے کہ وہ اپنی آرزو رکھنے والوں پر مشہود ہو، چاہے کسی طرح ہو؛ نیز شہود و مشاہدے کی نوعیت بندے کے نورِ موضوعی کی ارتقائی کیفیت کے اعتبار سے چاہے کیسی ہو۔ قرآنِ حکیم کا ارشاد کہ "وہ" الظاہر والباطن ہے، اس حقیقت پر بھی دلالت کرتا ہے۔ دیدِ دوست" سے جہاں آرزوئے حسن کی تسکین ہوتی ہے، وہاں اس سے اس میں اتنی شدت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ جذب و شوق یا عشق کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

(ب) مشاہدہ کلامی اور عشق :

عشق آواز و کلام سے بھی پیدا ہوتا ہے۔ ربّ العزّت کا کلام دو طرح کا ہے: ایک ملفوظی و مکتوبی، جسے وحی و تنزیل سے تعبیر کرتے ہیں۔ دوسرا رمزی، جس کے لیے اِلہام واِلقا وغیرہ

کی تعبیریں مستعمل ہیں۔ کلامِ الٰہی کی ان اقسام سے گفتگو کی جاتی ہے:

۱۔ **وحی و تنزیل :**

اللہ تعالیٰ الحیّ والقیّوم ہے، اس لیے اس کا کلام زندہ و ناطق ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں اس کی روح کارفرما ہوتی ہے، جو اصلِ حیات ہے۔ مثال کے طور پہ ایک سچے ادیب و فنکار کی رُوح اس کے ادبی و فنی شہکاروں میں جلوہ نما ہوتی ہے اور انہیں زندگی بخشتی ہے، اگرچہ اس زندگی کی نوعیّت محض مجازی ہوتی ہے۔ اس پہ ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ ایک زندہ بالذّات اور قائم بالذّات احسن الخالقین کے کلام میں اس کی روح کی نوعیّت کیا ہوگی؟ بہر حال، یہ زندہ خدا کی روحِ زندہ کا اعجازِ اتم ہے کہ اس کا کلام زندہ و ناطق ہے۔ اگرچہ اس زندگی و نطق کی نوعیت نہ تو انسان کے ادبی و فنی شہکاروں کی زندگی و نطق ایسی ہے نہ ربِّ جلیل کی متنفس تخلیقات کی زندگی و نطق ایسی؛ بلکہ عجیب و غریب اور ناقابلِ بیان ہے اور سمجھنے کے لیے اُسے مجازی۔حقیقی کہہ سکتے ہیں۔ کلامِ الٰہی بلاشبہ زندہ و ناطق ہے، لیکن ان کے لیے جو اس کا ذوق و شوق رکھتے ہیں اور ان کے مُطہر دلوں میں آرزوئے حسن فعّال و حرکی ہوتی ہے۔ قرآنِ مجید قلبِ حسین و منیر پہ اپنا جلوۂ حسن و نور پیدا کرتا ہے، نتیجۃً روحِ قرآنی اور روحِ نفسی اس طرح ہم آہنگ ہو جاتی ہیں کہ بغیر الفاظ و آواز کے ایک دوسری کو سنتی اور سمجھتی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ محبّت کی زبان حسن کی زبان ہوتی ہے، جسے الفاظ و آواز کی حاجت نہیں ہوتی، اور یہ کُل مخلوقات کی زبان ہے۔ میری رائے میں اسے ''اُلوہی زبان'' کہنا احسن ہوگا۔ اگر یہ حقیقت ہے اور یقیناً ہے کہ موسیقی کی زبان محض صوتی ہونے کے باوجود عالمگیر زبان ہے اور مصوّری کی زبان نہ ملفوظی، نہ صوتی ہونے کے باوجود آفاقی زبان ہے اور ان زبانوں کو ہر زمان و مکان کے اہلِ ذوق سمجھتے ہیں تو پھر اہلِ ذوق و شوق کے اس تجربے کو جھٹلانے کی کوئی وجہ جواز نہیں کہ زندہ خدا کے زندہ کلام کی روحِ اُلوہی سے اہلِ ذوق و شوق کی روحِ نفسی ہمکلام ہوتی، اسے سنتی اور سمجھتی ہے۔ کلامِ الٰہی بظاہر بے جان و بے زبان نظر آتا ہے، لیکن حقیقت میں

وہ روحِ اُلوہی کے اعجاز اثر سے ناطق، کلیم، سمیع اور مجیب الدعوات ہے چنانچہ کلامِ الٰہی کو حکیم وکریم اور نور وہدایت کہنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ یہ عام مشاہدہ وتجربے کی بات ہے کہ قاری جب قرآنِ کریم کی قرأت کرتا ہے جس طرح قرأت کرنے کا حق ہے تو حسنِ قرأت میں اہلِ ذوق وشوق روحِ اُلوہی کا مشاہدۂ صوتی کرتے اور اس سے جمالیاتی ثروت حاصل کرتے ہیں علاوہ بریں، اس روحِ اُلوہی ہی کی بدولت حسنِ قرأت سے قلبِ انسانی میں جمالیاتی۔ نفسیاتی آن کے وقوع پذیر ہونے کا امکان ہوتا ہے۔

۲۔ اِلہام واِلقاء:

یہ ایک ایسے تجربے کی بات ہے جس سے لوگ عموماً گزرتے ہیں، مگر بہت کم اس کا شعور رکھتے ہیں۔ جو لوگ اس کا شعور رکھتے ہیں، وہ دانائے راز، خود آگاہ وخدا آگاہ ہوتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس شعور کے فقدان کے باوجود اس تجربے سے انسان کے حسّی۔ قلبی۔ نفسی نظام میں ایک حسین انقلاب آجاتا ہے اور اس کی آرزوئے حسن زندہ وفعّال ہو جاتی ہے۔ بات یہ ہے کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ "کوئی" چپکے سے دل میں ایسی بات ڈال دیتا ہے جو آرزوئے حسن کی محرک بن جاتی ہے اور اس سے دل میں محبتِ الٰہی کے شرارے رقصاں ہو جاتے ہیں اور اُسے اپنی آگ لگا دیتے ہیں۔ اس آتشِ محبت کی تب وتاب میں قُرَّۃُ العین ہوتی ہے، جو اس کے الہامی ہونے کی ایک پہچان ہے۔ بہر حال، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دل میں بات کون ڈالتا ہے؟ ایک مکتبِ فکر کے نزدیک ایسی بات لاشعور یا تحت الشعور میں پہلے سے موجود ہوتی ہے، جو اتفاقاً دل میں پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسرے مکتبِ فکر کی رائے میں ایسی باتیں الہامی ہوتی ہیں، جنہیں ملائکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کے بندوں کے دلوں میں ڈالتے ہیں۔ ایسی باتوں کو الہام والقاء اور کشف وشہود وغیرہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ تیسرے مکتبِ فکر کے نزدیک اِلہام واِلقاء دراصل اللہ تعالیٰ کی باتیں ہوتی ہیں جو شہ رگ

کے قریب ہے اور براہِ راست اپنے بندوں کے دلوں میں اِلقا کرتا ہے۔ ان باتوں میں تاثیرِ برقِ حُسن ہوتی ہے، جس کے باعث دوست آشنا اہلِ ذوق فوراً انہیں پہچان لیتے ہیں، جس طرح ذوقِ شعر رکھنے والے اپنے محبوب شعراء کا کلام پہچان لیتے ہیں۔

یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ بات لاشعور میں کون ڈالتا ہے اور کس کے حکم سے وہ دل میں اپنا جلوہ پیدا کرتی ہے؟ نیز ہاتفِ غیبی یا فرشتہ کس کی بات، دل میں اِلقا کرتا ہے؟ اہلِ جذب وشوق کا ایک ہی جواب ہوسکتا ہے اور وہ ہے: ربِّ ذوالجلال والاکرام کی، جو الٰہِ جمیل ہے؛ لہٰذا النفسِ روحی اپنے معروضِ حُسن وعشق کی بات سننے اور اس کی آرزوئے حُسن فعّال نہ ہو، ایسا بہت کم ہوتا ہے۔

آرزوئے حُسن کو فعّال وحرکی اور شمع محبتِ اِلٰہی کو آفتابِ عشق بنانے میں ورائی مشاہدات بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں، مثلاً (ا) انوار وتجلّیات، (ب) برزخ اور (ج) ملکوت کے مشاہدات۔

(ا) انوار وتجلّیات:

سب سے پہلے اس نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ نور اور تجلّی میں لطیف فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ نور تو حُسن کا رنگِ جمال اور تجلّی الحُسن کا جلوہ ہے۔ ان دونوں کے مشاہدے کی تاثیر ایک ہی ہے، لیکن اس میں کمّیت وکیفیت کا تفاوت پایا جاتا ہے۔ بہرحال تاثیر کے اعتبار سے دونوں میں قرۃ العین ہوتی ہے؛ یعنی طمانیت وسُرور اور کیف ومستی کی ٹھنڈک اور جمالیاتی سوز کی خنکیِ جانفزا۔ نور کی ماہیت سے متعلق شاید اس سے زیادہ کچھ کہنے کی گنجائش نہ ہو کہ یہ حُسن کا عنصر یا رنگِ جمال ہے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ مرئی بھی ہے اور غیر مرئی بھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نور کو خارج میں بھی دیکھ سکتے ہیں اور دل میں اس کی تاثیرِ جمال کو محسوس بھی کر سکتے ہیں۔ اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ نور کا مشاہدہ حسّی قلبی بھی ہوتا ہے اور صرف قلبی بھی۔ نور کا ترشّح ایک تو مقدس ومطہر احوال وظروف

میں ہوتا ہے اور دوسرے اس طرح ہوتا ہے جیسے کوہستانی علاقوں میں برفباری ہوتی ہے۔ تیسرے اس کا مشاہدہ ان اہلِ آرزو کو ہوتا ہے جن کے قلوب منیر ہوتے ہیں اور ان کا نور حرکی و ارتقائی ہوتا ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ربِّ ذوالجلال والاکرام انہیں اپنے اس مشاہدے سے نوازنا چاہتا ہو۔ اس سے یہ مستنبط ہوا کہ اس قسم کے مشاہداتِ اکتسابی نہیں، وہبی ہوتے ہیں؛ لہٰذا یہی وجہ ہے کہ اس قسم کا مشاہدہ کبھی کبھی ان لوگوں کو بھی ہو جاتا ہے جن میں مذکورہ صفات نہیں ہوتیں، لیکن بارانِ انوار کی بدولت ان کے دلوں میں جالیاتی نفسیاتی آن وقوع پذیر ہو جاتی ہے یا ماحول کے اثرات سے ان کے دلوں میں وقتی طور پر سعادت پیدا ہو جاتی ہے اور ان کی چشمِ قلب وا ہو جاتی ہے۔

نور باری میں جال ہوتا ہے اس کا مشاہدہ اگرچہ چشم وقلب کے نور کے ذریعے خواب اور بیداری دونوں حالتوں میں ہوتا ہے لیکن اس کے اثر سے بیداری میں ایک ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، جو صحو وسکر کی درمیانی حالت ایسی ہوتی ہے اور اس کے لیے مراقبے، وجد و حال، جذب ومستی اور استغراق ومحویّت کی تعبیریں اختیار کی جا سکتی ہیں۔ نظارۂ نورباری کے لیے شاید اس سے احسن تعبیر کوئی نہ ہو کہ اس میں قرۃ العین ہوتی ہے۔

نورِ غیر مرئی کا مشاہدہ فقط نورِ قلب کرتا ہے اور اس پر وہی جالیاتی اثرات مرتب ہو جاتے ہیں جو نورِ مرئی کے مشاہدے سے ہوتے ہیں۔ اس میں بھی آنکھوں کی ٹھنڈک ہوتی ہے اور قلب پہ وجد و حال، کیف وسُرور اور جذب ومستی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

۲۔ تجلّیات:

جیسا کہ ہم معلوم کر چکے ہیں تجلّی کا مطلب ہے الحُسن کا جلوہ۔ یہ اِبہام صراحت کا اور اجمال تفصیل کا متقاضی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ذاتِ الٰہی کی طرح اس کی تجلّیات بھی بے مثل و یگانہ ہیں اور ان کی مثل کوئی چیز نہیں، لہٰذا نہ تو اِس ابہام کی تصریح ہو سکتی ہے اور نہ

اس اِجمال کی تفصیل ۔ الحسن کی تجلّی بلاشبہ حواس و قلب پر مشہود ہوتی ہے، لیکن معرضِ اظہار میں نہیں آسکتی۔ بہرحال، تجلّی کی ایک خاصیت یہ ہے کہ یہ برق نمط ہوتی ہے، اگرچہ اس کے جمالیاتی اثرات دیرپا ہوتے ہیں۔ اس کی دوسری خاصیت یہ ہے کہ اس میں جلال کا رنگ جمال کی بہ نسبت زیادہ ہوتا ہے، لہٰذا اس کا حریفِ نظارہ ہونا قلب و نگاہ کے لیے مشکل ہوتا ہے؛ لیکن شہیدِ نظارہ کے لیے "از غیب جانے دیگر است"۔ مشاہدۂ تجلّی میں بھی اہلِ ذوق و نظر کے لیے قرّۃ العین ہوتی ہے اور اس سے آرزوئے حسن کو تحریک بھی ہوتی ہے اور جذب و شوق سوا ہوتا ہے۔ انوار و تجلّیات کا مشاہدہ و تجربہ اہلِ ذوق و نظر میں عین الیقین ہی نہیں حق الیقین بھی پیدا کرتا ہے؛ نیز انہیں جمالیاتی سُرور و سوز عطا کرتا اور ان کے لیے آرزوئے حسن کی کی تسکین کا سامان اور نعمتِ حُسنیٰ ہے۔

(ب) مشاہدۂ برزخ :

برزخ اس عالم کو کہتے ہیں جو زمانے کے اعتبار سے ہمارے اس عالمِ زمان و مکان اور دارالآخرت (= الحیوان) کے درمیان ہے اور قیامت کے دن تک قائم رہے گا، اور ان ارواحِ انسانی کا عارضی مستقر ہے، جنہیں موت اس کُرۂ ارضی سے وہاں پہنچا دیتی ہے۔ اس کے تین حصّے ہیں: ایک میں اہلِ حسن و سُرور (نفوسِ مطمئنہ)، دوسرے میں اصحابُ النّار، اور تیسرے میں قلبی بیماریوں کے مریض رہتے ہیں۔ پہلا حصہ جنت کا، دوسرا دوزخ کا اور تیسرا اعراف کا مثیل ہے۔ اعراف دراصل دارالشفاء ہے اور جنّت و جہنم کے درمیان سطحِ مرتفع پر واقع ہے۔ وہاں سے جنت و دوزخ صاف نظر آتے ہیں؛ اور وہاں جنّت کی نسیمِ جانفزا بھی آتی ہے اور جہنم کی سمومِ جانگسل بھی۔ عالمِ برزخ کے حسین و جانفزا اور قبیح و روح فرسا مناظر کے مشاہدے سے شاہد عبرت حاصل کرتا اور اس میں تقوٰی پیدا ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں اُس کی آرزوئے حُسن کو زندگی کی توانائی و حرکیت اور ثبات و دوام ملتا ہے۔

(ج) ملکوت :

ربّ العالمین کی بادشاہت کی کوئی انتہا نہیں؛ اس کے جہان بے شمار اور ان کے عجائب وغرائب محیّر العقول بھی ہیں اور بصیرت افروز بھی۔ ان کا مشاہدہ بھی چشمِ قلب سے ہوتا ہے، اور یہ مشاہدہ بھی ربّ ذوالجلال والاکرام کی نعمتِ عُظمیٰ وحُسنیٰ ہے اس کے دیگر فوائد کے علاوہ ایک جمالیاتی فائدہ یہ بھی ہے کہ یہ انسان میں اس کے اِلٰہ وربّ کی عظمت وکبریائی، جمال وجلال، قہّاری وجبروت، عزّت وقدرت اور سُبحانیّت وصمدیّت کا احساس وشعور بیدار کرتا اور اس کی آرزوئے حسن کو فعّال وحرکی بناتا ہے۔ اس کے نتیجے میں اس کی محبّتِ الٰہی شدید ہوکر عشق میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

حاصلِ کلام یہ کہ ایسے قلبی ورائی مشاہدات انسان میں ذوق وشوق پیدا کرتے اور اس کی آرزوئے حسن کو شدید کر کے عشقِ الٰہی میں بدل دیتے ہیں۔ آخر میں اس نکتے کی ایک بار پھر صراحت کر دی جاتی ہے کہ ایسے قلبی ورائی مشاہدات اکتسابی نہیں وہبی ہوتے ہیں؛ اس لیے کہ

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

۳۔ فرقان :

ایک ازبس حسین ومُنیر قوّتِ مُمیّزہ ہے جو اگرچہ وہبی وعالمگیر ہے، یعنی قدرت کی طرف سے ہر انسان کے قلب میں ودیعت ہوتی ہے، لیکن یہ فقط اُن اولی الالباب کے قلوب میں نشوو ارتقا کر کے اپنی تکمیل کرتی ہے جو اہلِ جذب وشوق ہوتے ہیں اور ان کی آرزوئے حسن ازبس حرکی وشدید ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ فرقان دُنیا میں کبھی کبھی اپنی نمود دکھاتے ہیں۔ بقول علّامہ اقبال

عُمر ہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک "دانائے راز" آید بروں

اہلِ فرقان ہی کے لیے علاّمہ اقبال نے "دانائے راز" کی تعبیر اختیار کی ہے۔ فرقان کی ایک امتیازی خصوصیت جس کی بدولت اُسے عقل، ضمیر، جبلیاتی رحس اور نفسِ لوامہ پر فوقیت حاصل ہے، یہ ہے کہ جب وہ نشو و ارتقا کر کے اپنی تکمیل کر لیتا ہے تو شیطانی قوتوں کے لیے اسے ضعیف و مضمحل اور سقیم و مردہ بنانا یا اس کے نور کو سلب کرنا محال نہیں تو انہیں دشوار ضرور ہو جاتا ہے۔ الغرض، فرقان ایک ایسا زندہ و مُنیر اور معتبر و خود کار لطیفۂ غیبی ہے جو اپنے کام میں کوتاہی و غلطی کرتا ہے، نہ اس کا نظام جمود و تعطل کا شکار ہی ہوتا ہے، اِلّا ما شا اللہ۔ یہ انسان کا سچا، معتبر اور کُل وقتی مُرشد و ہادی اور صیرفی ہے، جو اُسے از خود ہر قسم کے احوال و ظروف میں واضح طور سے بتاتا رہتا ہے کہ یہ حق ہے اور وہ باطل؛ یہ حُسن ہے اور وہ قُبح؛ یہ خیر و حسنہ ہے اور وہ شر و سیّئہ؛ یہ توحید و ایمان ہے اور وہ شرک و کُفر؛ یہ عدل و احسان ہے اور وہ ظلم و بُخل؛ یہ سود ہے وہ زیاں؛ یہ زندگی ہے وہ موت؛ یہ امن و سلامتی کی جنّت ہے اور وہ خوف و حزن کا آتشکدہ؛ یہ نور و ہدایت ہے اور وہ ظلمت و ضلالت؛ یہ دوست ہے اور وہ دشمن؛ نیز یہ کامیاب و انعام یافتہ عباد الرحمٰن کی راہِ مستقیم ہے اور وہ شیطان کے مقہور و مغضوب پیرو کاروں کا جادۂ کج۔

اصل یہ ہے کہ فرقان ایک ایسا نورِ حرکی ہے جو اہلِ حُسن و عشق کے دائیں اور آگے اسی رفتار سے دوڑتا چلا جاتا ہے جس رفتار سے ان کا رہوارِ زندگی گامزن ہوتا ہے؛ اور اس کی روشنی میں اہلِ شوق و نظر ہر حسین و قبیح شے کو اس کے اصلی رنگ روپ میں دیکھتے رہتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں وہ فریب کھاتے ہیں نہ ٹھوکر اور نہ کسی فکری مغالطے کے شکار ہی ہوتے ہیں۔ وہ ہر آن ایک نئی شان میں ہوتے ہیں اور خوب سے خوبتر کی طلب و جستجو میں سرگرم عمل رہتے اور کائنات و حیات کے نئے سے نئے گوشوں کی سیر کرتے رہتے

ہیں۔ اہلِ فرقان ہی میں سے اللہ جمیل جنہیں چاہتا ہے، احسان و رضوان یا اپنی دید و رضا کی نعمتِ عظمیٰ سے نوازتا ہے۔

یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ فرقان دراصل اجتہاد کی پیش شرط ہے، لہٰذا اس کے بغیر کسی اہلِ علم و دانش کا مجتہد ہونا محال ہے۔ بالفاظِ دیگر، اہلِ فرقان ہی مجتہد ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عقل اور عشق دونوں کا مرشدِ کامل فرقان ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ نعمتِ عظمیٰ انہیں ملتی ہے جو اُولی الالباب اور اہلِ جذب و شوق ہوتے ہیں۔ فرقان جہاں عقلِ سلیم و منیر کو نورٌ اعلیٰ نور کے مثل بنا دیتا ہے، وہاں رہوارِ عشق کو اپنے قابو میں رکھتا ہے اور اسے جذبات کی تند و تیز رو میں بے راہ نہیں ہونے دیتا۔

حاصلِ کلام یہ کہ فرقان ربِّ ذوالجلال والاکرام کی ایسی نعمتِ عظمیٰ ہے جو وجدان، عقل اور عشق سب سے افضل و اعلیٰ ہے۔

حواشی و تشریحات

۱۔ الفارابی کا نظریۂ عقل: اس سے مفصل بحث کے لیے دیکھیے مصنف کا مقالہ "الفارابی"۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وہ: یَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ٥ (یونس ۱۰: ۱۰۰)؛ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو نجاست میں مبتلا کر دیتا ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے۔

۳۔ دیکھیے آل عمران ۳: ۱۹۱۔

۴۔ کتاب الانسان: ربِّ کریم کا ارشاد ہے: لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ٥ (الانبیاء ۲۱: ۱۰)؛ البتہ ہم نے تمہاری طرف اتاری ہے جس میں تمہارا ذکر ہے، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟ (یعنی کیا تم یہ بات بھی نہیں سمجھتے کہ یہ کتاب تمہاری داستانِ زندگی ہے اور تمہارے کام کی چیز ہے)۔

۵۔ اہلِ علم ہی ڈرتے ہیں: اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ۝ (فاطر ۳۵: ۲۸)؛ سوائے اس کے نہیں کہ اللہ کے بندوں میں سے عالم ہی ڈرتے ہیں۔ بلاشبہ غالب و قوّت والا اور بخشنے والا ہے۔

۶۔ دیکھیے المجادلۃ ۵۸: ۷۔

۷۔ قرآنِ مجید کا فیصلہ ہے کہ ان ظاہری آنکھوں (= ابصار) کے ذریعے اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھا جاسکتا، کیونکہ اس کا دیکھنا آنکھوں کے مقدور ہی میں نہیں۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہوتا ہے: لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۡ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ۝ (الانعام ۶: ۱۰۳)؛ نظریں اسے نہیں پاسکتیں اور وہ سب نظروں کو پاتا ہے اور وہ بہت باریک بین و آگاہ ہے۔

مقام ۷

روحانی واردات و مشاہدات کی علّتِ غائی: آرزوئے حسن

تم نے روحانی واردات و مشاہدات سے متعلق بہت کچھ سُنا اور پڑھا ہے، لیکن کیا تم جانتے ہو کہ ان کی علّتِ غائی کیا ہے؟ اس کا جواب ایک لفظ میں دینا ہو تو وہ ہے: "آرزوئے حسن"۔ اب اس اجمال کی تفصیل سنو! یہ روح ہے جسے اپنے اِلٰہ یا معروضِ حسن و عشق کی طلب و جستجو رہتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ الحُسن نے ایک طرف تمہیں جمالیاتی حِسّ ودیعت کی اور دوسری جانب تمہیں اپنا جلوہ دکھا کر تمہارے اندر اپنے عشق کی شمع فروزاں کر دی، جس کا نتیجہ ہے کہ تمہیں الحُسن کی دید و حضوری کی طلب و جستجو رہتی ہے۔ چونکہ تم اُسے دیکھ نہیں پاتے، اس لیے تمہاری روح کو اُس کی دید کی خاطر خوب سے خوب تر کی آرزو و جستجو رہتی ہے۔

جیسا کہ تم معلوم کر چکے ہو روح اپنی رضا و رغبت سے اسیرِ زمان و مکان ہوتی ہے، لیکن اپنے معروضِ حسن و عشق کی دید و وصال کی خاطر عالمِ زمان و مکان سے آزاد ہو کر اُسے ماورائی عوالم میں ڈھونڈنے کی آرزو رہتی ہے اور وہ اس موقع کی تلاش میں رہتی ہے۔ اس موقع کا عموماً ان چار حالتوں میں امکان ہوتا ہے: (۱) خواب و نوم (۲) مراقبہ و استغراق (۳) سُکر یا جذب و مستی اور (۴) بے ہوشی و مدہوشی۔ لیکن اس موقع سے عموماً وہی روح فائدہ اٹھاتی ہے جس میں مطلوبہ نور و توانائی ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک تو ماورائی مشاہدات کے لیے روح میں طاقتِ پرواز و سیر ہونی چاہیے؛ اور دوسرے اس کا نور اپنے کمال کو پہنچا ہوا ہو۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کمال عروج و ارتقاء کے نقطۂ متناہیت

پر نہیں، بلکہ کمالِ نو کے نقطۂ آغاز پہ دلالت کرتا ہے۔

تمہاری یاد دہانی کے لیے بتا دوں کہ نور و توانائی اس شخص کی روح کو حاصل ہوتی ہے جس کا قلب زندہ و حرکی اور حسین و مُنیر، نیز نفس مطمئن و مسرور ہو۔ بالفاظِ دیگر، وہ شخص صاحبِ حُسن و سُرور ہو۔ دوسرے حسن میں جمال و جلال، حیات و قیومت اور نور و توانائی کی صفات بالذات ہوتی ہیں اور ان کے لیے عناصرِ امتزاجی کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ دراصل یہ اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں، جن کے لیے بشمول اس کی دیگر صفاتِ حسنہ کے قرآنِ مجید اور حدیثِ طیبہ میں بالترتیب صِبغۃ اللہ اور اخلاق اللہ کی تعبیریں اختیار کی گئی ہیں۔ انسان اپنے حُسنِ یقین و عمل اور حُسنِ ذکر و فکر کے ذریعے جس قدر زیادہ اپنے اندر صفاتِ الٰہی تخلیق کرتا ہے، اُسی قدر اس میں نور و توانائی پیدا ہوتی ہے۔ توانائی کی بدولت اس میں عالمِ زمان و مکان سے ماوراء عوالم کی سیر کرنے کی قوّتِ پرواز پیدا ہوتی ہے، جبکہ نورِ حُسن کے ذریعے وہ وہاں کے مشاہدات کرنے کے قابل بنتی ہے۔ اس سے مستنبط ہوا کہ روح کی آزادی، توانائی اور نور اس کے ماورائی مشاہدات کی پیش شرائط ہیں۔

۱۔ خواب و نوم :

میں نے ابھی تُم سے کہا تھا کہ چار احوال و کیفیات میں روح کے قفسِ عُنصری اور عالمِ زمان و مکان کی زنداں سے آزاد ہونے کا امکان ہوتا ہے یا اُسے اس کا موقع ملتا ہے۔ ان میں سے ایک کیفیت خواب و نوم یا نیند و غنودگی کی ہوتی ہے۔ نیند کو مثیلِ موت کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ دلیل یہ ہے کہ اس عالم میں بھی آدمی کو حالتِ موت کی طرح زمان و مکان، سود و زیاں، احوال و ظروف، تن بدن اور دُنیا و ما فیہا کا احساس و ہوش اور فہم و شعور نہیں رہتا۔ نیند میں ہوش و حواس اور احساس و شعور کا سلسلہ عارضی طور پہ منقطع ہوتا ہے، جبکہ موت میں اس انقطاع کی نوعیّت دنیا کے اعتبار سے مستقل و دائمی، لیکن آخرت کے لحاظ سے نیند کی طرح

عارضی ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ آخرت میں حشر کے دن انسان کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنی فکری و عملی زندگی کے ثمرات کی لذت سے نا آشنا ہونے کے لیے پھر سے جی اٹھنا ہے۔ اس اعتبار سے نیند اہلِ عقلِ سلیم کے لیے موت کی مثیل اور حیاتِ اُخروی پہ دال ہے۔ ان دونوں میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ نیند تو حیاتِ دُنیوی میں شب و روز کی گردش کے ساتھ بار بار آتی ہے، لیکن موت زندگی میں صرف ایک بار آتی ہے اور روحِ انسانی کو "الحیوان" میں پہنچا کر خود ہمیشہ کے لیے فنا و معدوم ہو جاتی ہے۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عدمیت موت کو اور قیومیت حیاتِ انسانی کو مستلزم ہے۔ بہرحال، ان دونوں میں ایک قدرِ مشترک یہ بھی ہے کہ نیند کو بیداری اور موت کو نشاۃِ ثانیہ مستلزم ہے۔

جس طرح موت کے بعد روح اپنے قفسِ عنصری اور عالمِ زمان و مکان سے آزاد ہو کر عالمِ برزخ میں پہنچ جاتی ہے، قریب قریب اُسی طرح خواب و غنودگی کی حالت میں بھی روح کو اپنے قفسِ عنصری اور عالمِ زمان و مکان کی حدود سے نکل کر عالمِ برزخ اور دیگر عوالم حتّٰی کہ عالمِ حُسنِ ذات کی سیر کا موقع مل جاتا ہے، لیکن اس کا رابطہ بدستور اپنے بدن اور حسّی قلبی نفسی نظام سے استوار رہتا ہے۔ مثال کے طور پر جس طرح خلائی جہاز کا اپنے مدارِ ارضی سے لاکھوں میل دور نکل جانے کے باوجود اپنے زمینی کنٹرول روم سے رابطہ قائم رہتا ہے اور اس کی یہ سیر و مراجعت کنٹرول روم کے ارباب کے اختیار میں ہوتی ہے، قریب قریب اسی طرح روح کی سیر و مراجعت ربّ العالمین کے قبضۂ قدرت میں ہوتی ہے۔ روح کو اپنی اس سیر میں بعض اہم مشاہدات ہوتے اور واقعات درپیش آتے ہیں، جنہیں روحانی مشاہدات و واردات سے تعبیر کرتے ہیں۔ کبھی کبھی اس سیر میں اُسے ایسے واقعات و حادثات کا مشاہدہ ہو جاتا ہے جو گردشِ لیل و نہار کے حساب سے مستقبلِ قریب و بعید میں وقوع پذیر ہونے والے ہوتے ہیں۔ یہ واقعات و حادثات انفرادی، عائلی، قومی اور بین الاقوامی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ عموماً سچے ہوتے ہیں، اس لیے اس خواب کو "رویائے صادقہ" سے تعبیر کرتے ہیں۔

عالمِ برزخ میں اللہ تعالیٰ کی نظرِ کرم سے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اصحابِ حسن و سرور کی ارواح کو انبیاءؑ، صدیقین، شہداء اور صالحین کی زیارت و لقاء اور ہم کلامی کی سعادت حاصل ہوتی ہے۔ ان میں سے بعض روحوں کو علم و حکمت اور عرفان و معرفت کے اکتساب اور فیضانِ نظر کا موقع بھی مل جاتا ہے۔ علاوہ بریں، ایسی ارواح کو جنّت کے حسین و روح پرور اور ایمان فزا و بصیرت افروز مناظر اور نظاروں کا مجازی مشاہدہ بھی ہوتا ہے۔ اس نوعیت کے حسین مشاہدات کو "جمالیاتی۔ ورائی مشاہدات" اور ایسے خواب کو "رویائے حسنہ" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ رویائے حسنہ یا حسین خواب میں جمالیاتی مشاہدات زمانی و مکانی بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ روح اس عالمِ زمان و مکان کی سیر کرتی ہے تو اسے گاہے گاہے ان دیکھے جمیل و جلیل مناظر اور نظاروں کے علاوہ اپنی عزیز و محبوب شخصیتوں، احباب و رفقاء اور اعزّہ و اقارب کو دیکھنے اور ملنے کا موقع بھی مل جاتا ہے۔ اس طرح حسین خواب اور جمالیاتی مشاہدے سے جمالیاتی ذوق کی تسکین بھی ہوتی ہے اور جمالیاتی ثروت بھی ملتی ہے۔ اس اعتبار سے ان کی قدر و قیمت اور اہمیت اس سے بہت زیادہ ہے، جتنی کہ سمجھی جاتی ہے۔

اعرافؒ :

جنّت کے علاوہ روح کو کبھی کبھی اعراف و جہنم کی سیر کا بھی موقع مل جاتا ہے۔ اعراف جنّت و جہنم کے درمیان ایک بلند مقام ہے، جہاں سے دونوں جہانوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ ان لوگوں کا عارضی مقام ہے، جو "روحانی مریض" ہوتے ہیں اور جنہیں بغرضِ علاج یہاں رکھا جاتا ہے۔ وہ جنّت کے قرب کے سبب اس کی ٹھنڈی اور جانفزا ہوا کے جھونکوں سے لطف اندوز بھی ہوتے ہیں اور انہیں جہنم کی سمومِ جانگسل کی اذیتیں بھی برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ اعراف دراصل قدرت کا شفا خانہ ہے، جہاں اہلِ اعراف کی قلبی بیماریوں کا علاج عملِ تطہیر کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ جن مریضوں کی تطہیر ہو چکی ہے انہیں جنّت میں لے جاتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ جنّت اہلِ حسن و سرور کا حسن المآب ہے، لہٰذا اس میں اہلِ حسن و سرور یا نفوسِ مطمئنہ ہی

جاتے ہیں۔ اعراف کا مشاہدہ عبرت انگیز و بصیرت افروز ہوتا ہے اور اس حقیقت کی یاد دلاتا ہے کہ جو لوگ دُنیا میں مؤمن ہونے کے باوجود اپنے قلوب و نفوس کا تزکیہ نہیں کرتے اور اپنی قلبی بیماریوں سے غافل رہتے ہیں، اُنہیں آخرت میں اپنی قلبی بیماریوں کے علاج کے لیے اعراف کی زندگی کے صبر آزما و شکیب رُبا تجربوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ چونکہ اعراف میں جنّت و دوزخ دونوں کے مناظر مشہود ہوتے ہیں، لہٰذا ان تقابلی مناظر سے دوزخ کے عذاب کا خوف اور جنّت سے محرومی کا غم دوچند ہوجاتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ان کے دلوں میں امید و مسرّت کی شمع بھی فروزاں رہتی ہے کہ قلبی بیماریوں سے شفا پانے کے بعد انہیں جنّتِ نعیم میں بھیجا جائے گا، جہاں وہ اپنے اِلٰہ و ربّ کے مہمان ہوں گے اور انہیں وہ سب کچھ فوراً ملے گا جو وہ چاہیں گے؛ علاوہ بریں انہیں وہ نعمتیں بھی ملیں گی جن کا انہیں وہم و گمان بھی نہ ہوگا۔ ان تمام بے مثال و بے قیاس نعمتوں سے افضل و اعلیٰ نعمتِ "احسان و رضوان" ہوگی۔ یہ دراصل "دوست" کی ہم نظری و ہمکلامی اور حضوری و ہم رضائی کی "رحیقِ مختوم" ہوگی، جس کی لذّت و سرخوشی کی کیفیت و کمیّت کا اندازہ تو کیا وہم و گمان بھی نہیں ہوسکتا۔

جہنّم: کبھی کبھی روح کو موعظت و عبرت کے لیے جہنم کی ایک جھلک بھی دکھائی جاتی ہے، جس کے مناظر اس قدر بھیانک، ہولناک، روح فرسا اور نظّارہ سوز ہیں کہ انسان تصوّر نہیں کرسکتا۔ بہشت و اعراف کی طرح دوزخ میں بھی روح کو اہلِ نار کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے جن میں اس کے اعزّہ و اقارب، احباب و رفقاء اور جان پہچان کے لوگ ہوتے ہیں۔

ان عوالم میں مستقبل میں وقوع ہونے والے انفرادی و اجتماعی المناک حوادثات و سانحات کے مشاہدے کا بھی امکان ہوتا ہے۔ روح کے ایسے عبرت انگیز و المناک مشاہدات کو "ماورائی مشاہداتِ المیہ" سے تعبیر کرسکتے ہو۔ یہاں اس نکتے کی صراحت کر دینا ضروری ہے کہ چونکہ یہ عوالم ہمارے عالمِ زمان و مکان سے ماوراء ہیں، اس لیے انہیں لامکان و لازمان کہتے ہیں؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان عوالم کے بھی اپنے زمان و مکان ہیں، اگرچہ ان کی نوعیّت جداگانہ ہے۔ ان تمام عوالم کی

حدِ آخر یا سدرۃ المنتہیٰ سے وراء الوراء ایک اور عالم ہے، جو جمال و جلال، حیات و قومیت اور نور و سرور کا جہانِ بے کیف و کم ہے۔ یہ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ کا جہانِ بے نظیر و بے عدیل ہے، اس لیے ناقابلِ فہم و ادراک ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ رویائے صادقہ ہی میں روح کو ماورائی مشاہدات ہوتے ہیں۔ خواب جھوٹے بھی ہوتے ہیں، جنہیں عام طور سے "احلام" کہتے ہیں۔ حلم میں روح کے بجائے نفس نظارہ کرتا ہے، اور اپنی خواہشات کو عموماً تمثیلی انداز میں مصوّر و متشکل دیکھتا ہے۔ یہ خواہشات پوری کر سکتا ہے، نہ ان کا استحصال ہی کر سکتا ہے تو وہ باطنی نظام کے ان گوشوں میں چھپ جاتی ہیں جنہیں تحت الشعور اور لاشعور کہتے ہیں اور جن کے لیے ہم نے حجابِ شعور اور پاتالِ شعور کی تعبیریں اختیار کی ہیں۔ یہ وجوہ کئی ہو سکتی ہیں، مثلاً تقویٰ (یعنی آرزوئے حسن، نفرتِ قبح، پرہیزگاری، محبت و خشیتِ الٰہی وغیرہ وغیرہ)؛ حیا (یعنی احساسِ عزتِ نفس، عفتِ مآبی، خودداری، شماتت و خشیتِ معاشرہ، خوفِ بدنامی و رسوائی وغیرہ وغیرہ)؛ تنذیرِ ضمیر، ملامت و سرزنشِ نفسِ لوامہ؛ ممانعتِ عقل، شعورِ سود و زیاں: فقدانِ وسائل، معذوری و مجبوری وغیرہ وغیرہ۔ نیند کی حالت میں شعور میں عارضی طور پر تعطل پیدا ہو جاتا ہے تو خواہشات ان مخفی گوشوں سے نکل آتی ہیں اور نفس کو ان کی تشفی کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ خواہشات محض جنسی نہیں ہوتیں، جیسا کہ فرائڈ کا خیال ہے، بلکہ ہر قسم کی ہوتی ہیں، مثلاً معاشی، معاشرتی، ثقافتی، عسکری وغیرہ وغیرہ۔

رویائے حسن یا حسین خواب جمالیاتی نقطۂ نظر سے جمالیاتی مشاہدے کی طرح نعمتِ حسنیٰ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس سے جمالیاتی ذوق کی تسکین ہوتی اور جمالیاتی مسرت ملتی ہے؛ نیز اس دوران میں زندگی کا سفر خوشگوار گزرتا ہے۔ سفرِ زندگی میں حسین خواب کی اہمیت اور قدر و کا اندازہ انہیں ہوتا ہے جو اہلِ ذوق ہیں یا جو ٹوٹے ہوئے خواب دیکھتے ہیں۔

(ب) غنودگی یا نیم خوابی کی حالت میں بھی بعض اوقات شعور ہنگامی طور پر معطل ہو جاتا ہے

اور روح کو قیدِ بدن سے آزاد ہو کر عالمِ زمان و مکان کے علاوہ ماورائی عالموں کی سیر کا موقع مل جاتا ہے۔

۲۔ مراقبہ و استغراق :

مراقبہ ایک ایسی کیفیتِ استغراق سے عبارت ہے جسے مراقب مشق و مزاولت اور سعی و ریاضت کے بعد اپنے اوپر طاری کرنے کے قابل بنتا ہے۔ اس عالم میں شعور محوِ خواب ہو جاتا ہے تو روح کو اس کی قید سے آزاد ہو کر سیر کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ اِستغراق سے مراد عالمِ محویّت ہے جس میں غوّاصِ عقل دریائے فکر میں اس قدر مستغرق ہو جاتا ہے کہ آدمی کو دُنیا و ما فیہا کا ہوش و شعور نہیں رہتا اور روح کو قفسِ عنصری سے آزاد ہو جانے کا موقع مل جاتا ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ مراقبہ و استغراق دونوں حالتوں میں قلب پہلے سے زیادہ فعّال و حرکی ہوتا ہے، بشرطیکہ ایسی حالتوں میں مشق و مزاولت کے ذریعے اُسے تفویض کردہ وظائف ادا کرنے کا عادی بنایا گیا ہو۔ تصوّف میں اسے قلب کا جاری ہونا کہتے ہیں۔ صوفیہ عموماً روحانی کشف و واردات کے لیے مراقبہ کرتے ہیں، جبکہ اہلِ علم و تحقیق علمی مسائل حل کرنے اور اہلِ ہنر و فن ایجاد و اختراع اور فن پارے تخلیق کرنے کی خاطر استغراق سے کام لیتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ علم و فنّی، ماورائی و روحانی، اور جدید سائنسی اور تکنیکی مسائل حل کرنے میں، نیز تحقیق و تفتیش، اِیجاد و اختراع اور جمالیاتی تخلیقی فعلیّت میں مراقبہ اور استغراق دونوں از بس اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ تمہارے لیے ایک اور لطیف و اہم نکتہ یہ ہے کہ جمالیاتی تفکّر و تدبّر بالحق اگر ذریعہ ہے نورِ عقل و فرقان کی تکمیل کا تو مراقبہ و استغراق وسیلہ ہے جمالیاتی تفکّر و تدبر بالحق کے کمال کا؛ اور کمال جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، تکمیل کا نقطۂ متناہیت نہیں، بلکہ کمالِ نو کا نقطۂ آغاز ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے ہر کمالِ نو سلسلۂ کمالات کی ارتقائی کڑی پر دلالت کرتا ہے۔

۳۔ سُکر یا جذب و مستی :

سُکر اصل میں بادۂ "حُسن و عشقِ دوست" کا نشہ ہوتا ہے۔ آتشِ عشق شعلہ زن ہو کر قلب

کو محیط ہو جائے تو اس میں تاثیرِ حسن پیدا ہو جاتی ہے، جس کی بدولت باطنی دُنیا حسن و نور، جمالیاتی سُرور و سوز اور کیف و مستی کی جنت بن جاتی ہے۔ تمہیں ایک راز کی بات بتاتا ہوں۔ پیکرِ عشق و وفا سیّدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام نمرود کے جبر سے اس کے آتشکدے میں کودے تھے تو اس وقت رحیقِ عشقِ الٰہی کی تاثیرِ برقِ حسن سے آپؑ کا قلبِ مبارک حسن و نور اور طمانیت و سرور کا بہشت تو تھا ہی، عشق کی ادائے سرفروشانہ دیکھ کر "دوست" نے آتشکدۂ نمرود کو بھی جنت بنا دیا، اور آگ آپ کے لیے قرّۃُ العین بن گئی۔

عالمِ قرب و حضوری ہو یا عالمِ فراق و مہجوری بادۂ عشقِ الٰہی کا نشہ چڑھ جائے تو جذب و مستی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، جسے "سُکر" کہتے ہیں۔ اس عالم میں اہلِ ذوق و شوق کے ہوش و حواس ماؤف ہو جاتے ہیں تو رُوح کو آزاد ہو جانے اور ماورائی عوالم کی سیر اور وہاں کے مناظر و احوال کا مشاہدہ کرنے، اور نئے نئے تجربات سے گزرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ عشق میں قوتِ جلالی ہوتی ہے جو روح کو اس کے الٰہِ جمیل کے عالمِ حسنِ ذات میں پہنچا سکتی ہے، بشرطیکہ مشیّتِ الٰہی ہو۔ یاد رکھو! "دوست" کی مشیّت کے بغیر کوئی کچھ نہیں کر سکتا، اور نہ کسی سے کچھ ہو ہی سکتا ہے۔ بہر حال، یہ روح ہے جو بدن سے رابطہ اُستوار رکھنے کے باوجود ماورائی عوالم کی سیر و مشاہدہ کرتی اور تجربات سے گزرتی ہے۔

۴: بے ہوشی و مدہوشی :

آدمی بے ہوش یا مدہوش ہو جائے تو روح کو آزاد ہو کر عالمِ زمان و مکان کے ماوراء جانے اور ماورائی عالم کی سیر و مشاہدے کا موقع مل جاتا ہے۔ چونکہ یہ صورتِ حال حسّی نظام کو غایت درجہ معطل کر دیتی ہے، لہٰذا روح کو اپنے مشاہدات و تجربات اور احوال و واردات کو حافظے میں محفوظ رکھنا ازبس دشوار ہو جاتا ہے، لیکن اہلِ ذوق و شوق کی ارواح اس مشکل پر قابو پا لینے میں کامیاب بھی ہو جاتی ہیں۔

روحانی واردات و مشاہدات سے متعلق چار دبستان پائے جاتے ہیں: (۱) دبستانِ وجدانی[۳۱] (۲) دبستانِ عقلی[۳۲] (۳) دبستانِ روحانی[۳۳] اور (۴) دبستانِ انکاری[۳۴]۔ ان سے مختصراً گفتگو کی جاتی ہے۔

۱۔ دبستانِ وجدانی:

اس نظریے کی اساس اس مقدمے پہ استوار ہے کہ عقل نشوو ارتقاء کر کے اپنی تکمیل کر لیتی ہے تو اس کی اس ارتقائی و کامل صورت کو "وجدان" سے تعبیر کرتے ہیں؛ اور یہ وجدان ہے جس کی بدولت صوفی مذہبی (Religious) یا صوفیانہ (Mystic) مشاہدات و تجربات سے گزرتا ہے۔ دورِ حاضر میں اس دبستانِ وجدانی کے دو بڑے علمبردار علامہ اقبال اور برگساں تھے۔ انہوں نے انسان کے ماورائی مشاہدات کو روح کے بجائے وجدان سے منسوب کیا ہے، حالانکہ یہ روح یا خودی ہے جو مشاہدہ و تجربہ کرتی ہے اور انسان کے نظامِ باطنی کی مدبر و ذمے دار ہے اور اس کی کارکردگی کے حُسن و قبح کے لیے جوابدہ ہے۔ ان عظیم فلاسفہ کا یہ ذہنی التباس ہے، جو انہیں غالباً اس ارشادِ قرآنی سے ہوا ہے کہ شہد کی مکھی (نحل)[۳۵] کو وحی کی جاتی ہے۔ چونکہ نحل عقل نہیں رکھتی بلکہ ہر نامیاتی مخلوق کی طرح وجدان رکھتی ہے اس پہ ان فلاسفہ نے قیاس کیا کہ نحل چونکہ وجدان سے رموزِ الٰہی سمجھتی اور ہدایت حاصل کرتی ہے اور اس طرح وہ شہد لذیذ و شیریں اور مقوّی و اکسیر مشروب تیار کرتی اور اُسے محفوظ کرنے کے لیے انتہائی دقیق، محیّر العقول اور سائنٹیفک قسم کا چھتّا تعمیر کرتی ہے، لہٰذا وجدان اور وحیِ الٰہی ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں اور وحی بہر حال عقل سے افضل و اعلیٰ ہے۔ اس سے انہوں نے یہ نتیجہ مستنبط کیا کہ وجدان عقل کی ارتقائی و کامل قوّت ہے۔ حالانکہ اگر اس وحی پہ نحل کے حوالے سے غور کریں تو اہلِ عقلِ سلیم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وہ ایک طبیعی و اضطراری کیفیت و داعیہ تخلیقی فعلیت ہے، جو ہر نامیاتی وجود کا طبیعی خاصّہ ہے، جسے وجدان سے تعبیر کرتے ہیں۔ وجدان ہی کو میگڈوگل اور اس کے ہم فکر علمائے نفسیات نے جبلّت (Instinct) سے تعبیر

کیا ہے۔ وجدان، نبات، حیوان اور انسان سب کو ودیعت ہوتا ہے، لیکن عقل فقط انسان کو ودیعت کی گئی ہے اور یہ انسان اور دیگر نامیاتی وحیوانی مخلوقات میں ما بہ الامتیاز ہے۔ عقل اور وجدان میں ایک فرق یہ ہے کہ وجدان ایک جذبۂ بے اختیار ہے، لیکن عقل میں کنٹرول کرنے کی صلاحیت بھی ہے اور خود قابو میں آجانے کی استعداد بھی ہے۔ عقل انسان کے حسّی، قلبی، نفسی نظام میں ناظم کی حیثیت رکھتی ہے، اس لیے یہ وجدان سے افضل واعلیٰ اور اکمل و احسن قوّت ہے، جو ارضی مخلوقات میں سے صرف انسان کو ودیعت کی گئی ہے۔ یہ ایک منفرد نظامِ تعقّل و اِدراک ہے۔

دیگر دبستانوں سے گفتگو کرنے سے پہلے وحی کی دو اقسام سے متعلّق تمہیں چند باتیں بتانا چاہتا ہوں۔ وحی کی ایک قسم کو وجدانی اور دوسری کو ناموسی کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔

(الف) وحیِ وجدانی:

یہ نبات، حیوان اور انسان سب کو ودیعت ہوتی ہے اور اپنی قوتِ منیر کی کمیت و کیفیت کے اعتبار سے تینوں میں علی الترتیب افضل و اعلیٰ اور اکمل و احسن ہوتی ہے، لہٰذا وحیِ وجدانی اِرتقائی ہوئی۔ نباتاتی وحیوانی مخلوق کو وحیِ وجدانی وہبی طور سے ودیعت ہوتی ہے اور یہ مستقل نوعیت کی ہوتی ہے۔ لیکن انسان کی یہ خصوصیت ہے کہ اُسے مستقل وجدانی وحی بھی ودیعت کی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ اُسے ہنگامی وحی بھی کرتا ہے۔ ہنگامی قسم کی وحیِ وجدانی طبیعی یا موضوعی نہیں ہوتی، بلکہ معروضی نوعیت کی ہوتی ہے، اس کے لیے تصوّف میں اِلہام، اِلقاء، کشف، واردات وغیرہ وغیرہ کی تعبیریں اختیار کی جاتی ہیں۔ رویائے صادقہ کو بھی ہنگامی وحیِ وجدانی میں شمار کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ کو جو وحی کی تھی، وہ اسی ہنگامی وجدانی نوعیت کی تھی۔ جس شخص کو ایسی ہنگامی وجدانی وحی آئے، وہ صاحبِ وحی نہیں ہوتا۔ صاحبِ وحی فقط ربِّ جلیل کا نبیؑ یا رسولؑ ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کا قلب وحیِ ناموسی کا مہبط ہوتا ہے۔

(ب) وحیِ ناموسی :

چونکہ حضرت جبریل علیہ السلام امینِ وحیِ الٰہی تھے اور ربِّ جلیل و رحیم کا کلام انبیاء علیہم السلام کے قلوبِ طیبہ پہ نازل کرتے تھے، اس لیے انہیں ناموسِ اکبر بھی کہتے ہیں چنانچہ اسی نسبت سے ہم نے اس وحیِ نبوت کے لیے "وحیِ ناموسی" کی تعبیر اختیار کی ہے۔ وحیِ ناموسی عام اور اکتسابی نہیں بلکہ خاص اور وہبی ہے اور انبیاء علیہم السلام سے مخصوص تھی، اس لیے صرف وہی اصحابِ وحی ہوتے تھے۔ یہ از بس اہم نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ نبوت کا سلسلہ خاتم النّبیین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ساتھ ختم ہو چکا ہے، اس لیے آپؐ کے بعد نہ کوئی صاحبِ وحی ہوا ہے نہ ہو گا۔ وحیِ ناموسی نہ تو وجدان و عقل کے ارتقاء کا حاصل تھی اور نہ اکتسابی ہی تھی، بلکہ خالصتاً وہبی اور انبیاء علیہم السلام سے مخصوص تھی۔ فلسفے میں ایک مکتبِ فکر ایسا بھی ہے جس کی رائے میں عقل ترقی کر کے اپنے منتہائے کمال کو پہنچ جاتی ہے تو اپنے مبدء عقلِ کل[1] کے ساتھ اس کا رابطہ قائم ہو جاتا ہے اور اس پہ وحی نازل ہونے لگتی ہے لیکن یہ نظریہ قرآنِ مجید اور احادیثِ طیّبہ کی رُو سے باطل ہے۔ اس نظریے کی رُو سے وحیِ ناموسی کو عقلی، عام اور اکتسابی ماننا لازم آتا ہے اور یہ غلط ہے، کیونکہ وحی ناموسی وہبی و خاص ہے، اور قرآنِ مجید اور احادیثِ طیّبہ کی رُو سے اس کا سلسلہ خاتم النّبیینؐ کی ذاتِ اقدس پر ختم ہو چکا ہے۔

۲۔ دبستانِ عقلی :

دبستانِ وجدانی کا یہ دعویٰ کہ وجدان (جو در اصل جبلّتِ حیوانی ہے) عقل کی ارتقائی قوت ہے، روحانی مشاہدات و تجربات کا مبدء ہے، منطقی مغالطہ ہے، لیکن بین السطور میں اس مکتبِ فکر کی تائید کرتا ہے جس کا دعویٰ ہے کہ عقل ارتقا کر کے عقلِ کل سے رابطہ قائم کر لیتی ہے تو اس پہ الہام و القاء اور وحی ہونے لگتی ہے اور وہ ماورائی مشاہدات و تجربات سے گزرنے لگتی ہے۔

یہ دبستان عقلِ کُل سے ناموسِ اکبر یا حضرت جبریل علیہ السلام مُراد لیتا ہے۔ چونکہ اس کے نزدیک عقل کے اِرتقا میں انسان کے حکیمانہ تفکّر و تدبّر اور سعی و جہد کا عمل دخل بھی ہوتا ہے، لٰہذا وحیِ ناموسی وہبی یا کتسابی ہوئی۔ اس کا یہ نظریہ قرآنِ حکیم و احادیثِ صحیحہ کی رُو سے بھی باطل ہے اور تاریخی و منطقی اعتبار سے بھی غلط ہے۔ اگر عقل انسان کے تفکّر و تدبّر، سعی و ریاضت اور مشق و مزاولت سے ارتقا کر کے عقلِ کُل سے رابطہ اُستوار کر سکتی تو پھر ہر صاحبِ عزم و ہمت انسان صاحبِ وحی بن سکتا، لیکن تاریخ شاہد ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہوا اور خود عقل اس دعوے کی صحت سے انکار کرتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ وحیِ ناموسی محض وہبی تھی اور اس کا سلسلہ جو حضرت آدم علیہ السلام یعنی پہلے نبی سے شروع ہوا تھا، آخری نبی و رسول حضرت محمّد مصطفےٰ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم پر منتہی ہو کر ہمیشہ کے لیے منقطع ہو گیا۔

۳۔ دبستانِ روحانی کے علمبردار صوفیہ اور متکلّمین کا ایک گروہ ہے۔ یہ مکتبِ فکر اپنے اس دعوے میں، جس کی اساس ان کے اپنے روحانی مشاہدات و تجربات اور کشف و الہام پر اُستوار ہے، سچّا ہے کہ یہ روح ہے کہ جو ماورائی مشاہدات و تجربات سے گزرتی ہے اور اس دوران میں اس پہ طرح طرح کے حقائق و معارف منکشف، رموز و اسرار آشکار اور مستقبل کے حالات و واقعات یا معانی و مطالب القا و الہام ہوتے ہیں۔

۴۔ دبستانِ انکاری سے مراد اُن اہلِ ظن و قیاس کا مکتبِ فکر ہے، جو یا تو دہرئیے ہیں (خدا، دین، وحی و تنزیل اور آخرت کے مُنکر) یا جو سیکولر قسم کے فلاسفہ و دانشور ہیں، نیز ان میں وہ متکلّمین بھی شامل ہیں جو وحی و تنزیل کو تو تسلیم کرتے ہیں، لیکن روحانی یا ماورائی مشاہدات و تجربات، نیز الہام و القا اور کشف و کرامت کے مُنکر ہیں۔ ان کے انکار کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ نہ تو اہلِ دید و نظر ہوتے ہیں اور نہ عشق و مستی، آہ و فغاں، گریہ و زاری اور ہجر و وصال کی لذّت سے آشنا ہی ہوتے ہیں۔ یہ نعمتِ عظمیٰ محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ان اہلِ جذب و شوق اور اصحابِ ذکر و فکر کو ملتی ہے جو احسان و رضوان کے حُسن المقام پہ متمکن ہوتے ہیں اور یہ تمکّن

بھی فضلِ ربّی پر منحصر ہوتا ہے۔ وہ جب چاہے جسے چاہے اور جس قدر چاہے اپنی اس نعمتِ بے مثال سے نوازتا ہے۔

ایک نکتہ اس قدر اہم ہے کہ اسے حرزِ جان بنا لینا چاہیئے، اور وہ یہ ہے کہ عبدیّت کا بلند ترین درجہ احسان و رضوان کا حُسنُ المقام اور اس پر ممکن منتہائے کمالِ عشق ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہاں اہلِ عشق و وفا کو اپنے معروضِ حُسن و عشق کی ہم نظری و ہمکلامی اور حضوری و ہم رضائی کی بے مثال نعمتِ عظمٰی ملتی ہے۔ اس نعمتِ عظمٰی کا حصول ہی اصلِ علم و حکمت، ماحصلِ عرفان و معرفت، غایتِ دین و ایمان، "مشیّتِ دوست"، مقصدِ حیات اور آرزوئے روح ہے، جس کے لیے ہم نے آرزوئے حُسن کی تعبیر اختیار کی ہے۔

حواشی

۱۔ اعراف : دیکھیے الاعراف ۷ : ۴۶ و ۴۸ ۔

۲۔ سِدرَۃُ المُنتَہیٰ : دیکھیے النجم ۵۳ : ۱۴ ۔

۳۔ دبستانِ وجدانی : (Intuitional school of thought)

۴۔ دبستانِ عقلی : (Rational school of thought)

۵۔ دبستانِ روحانی : (Mystical school of thought)

۶۔ دبستانِ انکاری : یہ منکرانِ خدا کا مکتبِ فکر ہے لیکن ان کا بھی ہے جو روحانی و ورائی مشاہدات و تجربات، الہام و القاء کے منکر ہیں۔

۷۔ نحل اور وحی : دیکھیے النحل ۱۶ : ۶۸ ۔

۸۔ عقلِ کُل : مسلم فلسفے میں اس سے مراد حضرت جبرئیل علیہ السلام ہے۔

مقام ۸

اسرار کھلتے گئے!

۱۔ سوچ ؟

میں کون ہوں ؟ اس کا جواب سمجھ میں آتا ہے، مگر اس طرح جیسے کوئی خیالِ گریزاں آئے اور حافظے کی گرفت سے صاف بچ کر نکل جائے۔ میں سوچ کے جہانِ گذراں میں اللہ جانے کب سے سفر کر رہا ہوں ؟ لیکن خود سوچ کیا ہے ؟ میں یہ سوچ رہا تھا کہ ندائے سروش آئی:

"جسے تم سوچ کہتے ہو یہ عقل کا سفرِ حیات ہے۔ یہ راز تو تم جانتے ہی ہو کہ ہر شے سفرِ حیات میں ہے۔ جانتے ہو کیوں ؟ سنو! میں تمہیں بتاتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر چیز ربِّ زندہ و قیوم[۱] کی زندہ تخلیق[۲] ہے اور اُسے اپنے اس حقیقی اِلٰہ یا معروضِ حُسن و عشق کے قُرب و حضور اور دید و رضوان[۳] کی آرزو ہے، اور وہ اس کی طلب و جستجو میں رواں دواں رہتی ہے۔ یہ آرزو اُسے بیقرار رکھتی ہے، لیکن اس بیقراری میں قُرّۃُ العین اور لذّتِ طمانیت ہوتی ہے اور یہی سچّی آرزوئے حُسن کی پہچان ہے۔ آرزوئے حُسن سچّی نہ ہو تو انسان کو جو بیقراری ہوتی ہے اس میں خوف و حزن کی آمیزش اور جلن ہوتی ہے اور اس کی بھی لذّت و حلاوت ہوتی ہے۔ اگر یہ لذّت و حلاوت نہ ہوتی تو انسان مجرم و گناہگار، مشرک و بُت پرست، ظالم و بخیل اور غافل و

زیاں کار نہ ہوتا۔

۲۔ ماں ؟

سنو! میں تمہیں تمہاری باتیں سناتا ہوں۔ شاید تم پر کچھ اسرارِ حیات آشکارا ہو جائیں۔ تم پیدا ہوئے تو تم نے اپنی ماں میں الٰہ و ربّ کا جلوۂ حسن دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تمہارے لیے حسن و محبت کا ایک بحرِ بیکراں تھا اور اس کو محیط ایک تصویر تھی؛ تمہارے الٰہ کی مانوس، روح پرور اور پیاری تصویر۔ تم اسے دیکھتے تو دیکھتے رہ جاتے۔ اس میں تمہارے لیے لذتِ عین بھی تھی اور قرۃ العین بھی۔ تمہاری ماں کی مسکراہٹ میں تمہارے لیے تمہارے الٰہ کے تبسمِ جانفزا کی نمود تھی؛ اس سے تمہارے دل کی کلی کھل اٹھتی۔ تمہاری ماں کی آغوش تمہارے لیے جنّت و حسنُ المآب تھی، جس میں تمہیں وہ راحت، وطمانیت اور مسرّت و سرخوشی ملتی، جو کہیں نہ ملتی۔ ماں کی گود اور اس کے قدموں میں رہنا ہی تمہاری آرزو تھی؛ اس میں تمہاری خوشیوں کا راز مضمر تھا۔ تمہیں اس وقت اس حقیقت کا شعور نہ تھا کہ "جنّت ماں کے پاؤں تلے ہے"۔ سب سے پہلے رحمۃ للعالمین نے انسان کو اس حقیقت سے آشنا کیا ہے اور اس طرح عورت کو معاشرۂ انسانی میں ایسا افضل و اعلیٰ حسنُ المقام عطا کیا جس کا تصوّر کوئی قوم یا فرد کر ہی نہیں سکتا تھا۔

کاش عورت کو اس حقیقت کا شعور ہوتا کہ اسلام ہی اس کا حقیقی قدر شناس، اس کے حقوق کا محافظ و نگہبان ہے اور صرف وہی اسے معاشرے میں ایسا مقدس و اطہر اور ارفع و احسن مقام دیتا ہے، جس کا وہ تصوّر تک نہیں کر سکتی تھی۔ آج بھی غیر اسلامی معاشرے میں عورت اور مرد کسی کو اس حقیقت کا علم و شعور ہی نہیں کہ "ماں کے پاؤں تلے جنّت ہے"۔ اس اعتبار سے وہ اسلام کی اس قدر مرہونِ منّت ہے کہ اس کا حقِ تشکّر ادا ہی نہیں کر سکتی؛ بجز اس کے کہ وہ اسلام کی تحریک رحمۃ للعالمینی میں سچے دل سے شامل ہو جائے اور اس کی مخلص و ایثار پیشہ رضا کار بن جائے۔

یہ تو تھا جملہ معترضہ۔ ماں سے تمہیں اس قدر محبت تھی کہ وہ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی تو تم بیقرار ہو جاتے۔ پیار کرنے والے بھی ہوتے، لیکن تمہیں کسی کل چین نہ آتا۔ بلاشبہ ماں تمہاری معروضِ حسن و محبت اور آنکھوں کی ٹھنڈک تھی؛ اُسی کو تم اپنی رفیق و غمگسار اور رازق و پروردگار سمجھتے تھے، لیکن اس کے باوجود تمہیں کسی کی یاد بے قرار رکھتی تھی اور تم سوچتے رہتے تھے کہ "میں کہاں تھا اور کہاں آگیا؟ میرا اِلٰہ و رب، جو میرا رفیق و ہمسفر تھا، مجھے کیوں اور کس لیے یہاں چھوڑ کر چلا گیا؟ تم کبھی اس کی ایک جھلک دیکھ لیتے تو جاگتے ہوتے یا سوتے، خود بخود ہنسنے لگتے اور کبھی اس کی جدائی کے خیال سے از خود رونے لگتے۔ دیکھنے والے کہتے ہیں: "تم نے کوئی خواب دیکھا ہے؟" حالانکہ ایک حقیقت کا مشاہدہ ہوتا تھا، اور رونا، غمِ جدائی کا ہوتا تھا۔ کاش یہ حقیقت علمائے نفسیات سمجھ سکتے۔ ظن و تخمین پر اپنے نظریات کی بنیاد رکھنے والے ایسے حقائق کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ شب و روز گزرتے گئے اور تم سفر کرتے اور نشو و نما پاتے رہے؛ لیکن آرزوئے حسن تمہیں بے قرار رکھتی، اور اپنے معروضِ حسن و عشق کی یاد کے تیرِ نیمکش کی خلش محسوس کرتے رہتے۔

نشو و ارتقاء کے اس دور میں تم پر جو چیز سب سے زیادہ گراں گزری وہ اکتسابِ علم تھا۔ اس عہد میں تم کھیل کود اور تماشوں کے دلدادہ تھے۔ دوسرے تمہارا حریفِ نفسی۔ ابلیسؔ تمہارے ساتھ یارانہ گانٹھنے لگا اور اپنی وسوسہ اندازیوں اور جمالیاتی فریب کاریوں سے تمہیں کھیل تماشوں اور شرارتوں کو خوشنما اور اکتسابِ علم و ہنر کو گھناؤنا بنا کر دکھلانے لگا۔ علاوہ بریں، انسان کی ذہنی تربیت کا کام اس سے کہیں زیادہ مشکل ہے جتنا دام و دد کی تربیت کا کام۔ انسان کے حسی قلبی نفسی نظام میں دماغ کی حیثیت وہی ہوتی ہے جو معاشرتی نظام میں بادشاہ یا حکمران کی ہوتی ہے، لہٰذا اسے قابو میں کرنا اور اس سے کام لینا ازبس دشوار کام ہے۔ لیکن دماغ کی یہ خصوصیت ہے کہ ایک بار اس کی احسن طریق سے تربیت ہو جائے اور اسے اپنی حیثیت و منصب کا شعور ہو جائے تو پھر اس میں حکمران بن کر حسی قلبی نفسی نظام میں حکم چلانے کا داعیہ پیدا ہو جاتا ہے اور اس کی آرزوئے حسن فعال و حرکی بن جاتی ہے۔ تعلیم کی بات چل نکلی ہے تو میں چاہتا ہوں کہ اس

کی مقصدیت، غایت اور غایت الغایات، سے بھی تمہیں آگاہ کر دوں۔

۳۔ تعلیم و علم کی غایت؟

تعلیم کا مقصد انسان کی استعدادِ علمی کو، جو قدرت کی طرف سے اس میں بالقوہ ودیعت ہوتی ہے، قوت سے فعل میں لانا اور اسے نشوونما دینا ہے تاکہ وہ اپنی قلبی قوتوں خصوصاً عقل سے کام لے، اسے فعال و حرکی، حسین و منیر اور تفکر و تدبر کا عادی بنائے۔ علاوہ بریں، چونکہ علم اپنی ماہیت میں نور و توانائی ہے، لہٰذا اس کے ذریعے ایک طرف اپنی ذات کے نور کا نشوو ارتقاء کرنا اور اُسے منوّر بنانا ہے، اور دوسری جانب علم کے نور و توانائی سے اشیائے کائنات میں مضمر نور و توانائی حاصل کرنا اور اس کی بدولت اس کی تسخیر کر کے ان کے گوناگوں اور بے شمار فوائد سے تمتع کرنا ہے۔

علم کی غایت یہ ہے کہ انسان اس کی روشنی سے اپنے نفس کو پہچانے؛ یعنی اپنے حیرت انگیز و بصیرت افروز اور اعجوبۂ روزگار حسّی۔ قلبی۔ نفسی نظام میں حکیمانہ تفکر و تدبر کر کے اس نتیجے پر پہنچے کہ نہ تو یہ کائنات بے مقصد و لایعنی ہے اور نہ خود اس کی اپنی ذات ہی ایسی ہے؛ بلکہ دونوں ربِ ذوالجلال والاکرام کی تخلیق بالحق ہیں؛ نیز اللہ تعالیٰ نہ صرف ربّ العالمین بلکہ اِلٰہ العالمین بھی ہے۔ علاوہ بریں، انسان کے قلب میں جو آرزوئے حسن ہے وہ دراصل الحسن کی ہے، جو اس کا حقیقی معروضِ حسن و عشق ہے اور اس کا مشاہدہ نورِ ذات سے ہوتا ہے، بشرطیکہ وہ نشوو ارتقاء کر کے اپنی معراجِ کمال کو پہنچ چکا ہو اور یہ مشاہدۂ "دوست" ہی علم کی غایت ہے۔

یہ مانا کہ تمہیں اس بات کا علم نہیں کہ تم کون ہو؟ لیکن یہ تو تم جانتے ہو کہ تمہارا کوئی خالق و پروردگار ہے اور وہ اس قدر رحمٰن و رحیم اور ذوالجلال والاکرام ہے کہ اس کی محبت کا شرارہ تمہارے قلب کی گہرائیوں میں رقصاں و درخشاں ہے اور بجھنا جس کے مقدور ہی میں نہیں۔ اس شرارِ محبت کی تب و تابِ جاودانی سے تمہیں اپنے معروضِ حسن و عشق کی طلب و جستجو رہتی ہے اور یہ

طلب و جستجو ہی اصل تعلّم ہے اور اس طلب و جستجو کو فعّال بنانا اور اسے اس کی صحیح جہت میں رکھنا، اصلِ تعلیم ہے۔ جمالیاتی نقطۂ نظر سے تعلیم کی غایت طالبانِ علم کی جمالیاتی حسِ کو زندہ و فعّال کرکے اُن کے جمالیاتی ذوق میں لطافت و نظافت اور وسعت و بوقلمونی پیدا کرنا اور ان کی آرزوئے حسن کو فعّال بنانا ہے تاکہ وہ نشوو ارتقا کرکے حسنِ الٰہ الحقیقی تک پہنچ جائے اور اس کے حوالے سے کُل کائنات کو محیط ہو جائے۔ اس سے متعدد ازبس اہم نتائج برآمد ہوتے ہیں، مثلاً

اوّلاً، طالبانِ علم فقط ایک، اللہ تعالیٰ ہی کو اپنا الٰہ یا معروضِ حسن و عشق بناتے ہیں؛ اور

ثانیاً، اس کے حوالے سے اس کی مخلوقات سے محبت و احسان کرتے ہیں اور اس طرح ان کے لیے رحمت بن جاتے ہیں۔

ثالثاً، وہ معاشرۂ انسانی میں "شہادت" کے حسن المقام پر متمکن ہو جاتے ہیں، اور انہیں اصطلاحِ قرآنی میں "شہدآء" کہتے ہیں۔

رابعاً، انہیں علم و حکمت اور فرقان کی قوت و توانائی اور بصیرت کے نورِ حرکی کے ساتھ جمالیاتی ثروت بھی حاصل ہو جاتی ہے۔

خامساً، اللہ تعالیٰ انہیں اپنا دوست بنا لیتا اور احسان و رضوان اور قرب و حضوری کے حُسن المقام پر متمکّن کر دیتا ہے۔ علاوہ ازیں، اُن کی آرزوئے حسن کی شدّت کے پیشِ نظر انہیں جنّت کا وارث اور اپنے اہلِ حسن و سرور بندوں اور دوستوں کا رفیق بنا دیتا ہے، جن کی صحبت و رفاقت کا ایک دن ہزاروں دنوں سے بہتر ہے۔

۴- آرزوئے حسن نعمتِ عظمیٰ ہے:

کاش تمہیں اس حقیقت کا ایقان و اذعان ہو تا کہ آرزوئے حسن ربِّ ذوالجلال والاکرام کی نعمتِ حُسنیٰ و عظمیٰ ہے، جس کے صحیح استعمال سے انسان کو دُنیا میں بھی جمالیاتی ثروت و حسنہ ملتی ہے اور آخرت میں بھی۔ اور وہ خوف و حزن کے عذاب النار سے محفوظ بھی رہتا ہے؛ لیکن اس کی

تکفیر و غلط استعمال سے وہ جمالیاتی ثروت اور دُنیوی و اُخروی حسنہ سے محروم و نامراد رہ کر رہینِ خوف و حزن ہو جاتا اور ان کی آگ میں جلنا اس کا مقدر بن جاتا ہے۔

یہ تو تم جانتے ہو کہ ہر متنفس چیز میں زندہ رہنے کی آرزو ہے، اس لیے کہ اُسے زندگی بے حد پیاری ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ربِّ حیّ و قیّوم کی ہر چیز زندہ ہے اور اُسے زندہ رہنے کی آرزو ہے۔ جانتے ہو اس کی علتِ غائی کیا ہے؟ اس کا ایک لفظ میں جواب دینا ہو تو وہ ہے "آرزوئے حسن"۔ یہ جواب سن کر تم حیران ہو گئے ہو گے۔ تمہیں حیران ہونا بھی چاہیے تھا کسی نے یہ رازِ حقیقت آشکارا کیا ہوتا تو تمہیں پتا ہوتا۔ تمہیں اس کی تفصیل سننے کا تجسس و اشتیاق پیدا ہو گیا ہے۔ یہ بڑی ہی خوش آئند بات ہے، کیونکہ سننا اور دیکھنا آ جائے تو بات بن جاتی ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اقوامِ عالم کی ذلت و مسکنت، محرومی و نامرادی اور ہلاکت و بربادی کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ سنتی تھیں نہ دیکھتی تھیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ نہ گوشِ حق نیوش سے حسن و حق کی باتیں سنتی تھیں اور نہ واقعات و حوادث روزگار کو دیدۂ عبرت نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ اگر وہ کچھ سنتی اور دیکھتی بھی تھیں تو اس پر غور و فکر نہ عمل ہی کرتی تھیں، اور نہ اس سے عبرت و سبق ہی حاصل کرتی تھیں۔ دیکھنا اور سننا ایک از بس اہم فن ہے۔ یہ فن آ جائے اور اسے عمل میں لایا جائے تو آدمی انسان بنتا ہے اور اس کی آرزوئے حسن زندہ و حرکی رہتی ہے، جو اُسے نفسِ مطمئنہ، صاحبِ حسن و سرور اور عظیم و کامیاب بنانے میں از بس اہم کردار ادا کرتی ہے۔

بہر حال، یہ آرزوئے حسن ہے جو ہر متنفس میں آرزوئے حیات کو زندہ رکھتی ہے۔ کوئی مانے نہ مانے، اصل یہ ہے کہ "موت فقدانِ آرزوئے حیات کا نام ہے، نیز آرزوئے حسن اور آرزوئے حیات لازم و ملزوم ہیں"۔ تم چاہتے ہو کہ تمہیں زمین و دولت، عورت و شہرت، منصب و عزت اور اولادِ نرینہ وغیرہ وغیرہ ہاتھ لگے۔ یہ طلب و جستجو تم میں حرکت و عمل اور سعی و جہد کا داعیہ اور زندگی کی اُمنگ پیدا کرتی ہے۔ کیا تمہیں اس امر کا شعور ہے کہ تمہارا نفس جو عبارت ہے تمہارے وجود اور اس کی

حسّی، قلبی اور نفسی قوتوں کے نظام سے، کروڑوں بلکہ اربوں نامیاتی خلیوں سے مرکب ہے، جو قدرت کے حیاتیاتی قانون کے مطابق ہر آن مرتے اور پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ جب تک اس نظامِ موت وحیات میں توازن رہتا ہے، نفس میں زندہ رہنے کی طلب و آرزو رہتی ہے؛ لیکن جب یہ توازن قائم نہیں رہتا تو اس میں اختلال و فساد، جمود و تعطّل اور انتشار و تضاد پیدا ہوجاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ زندگی سے بیزار ہوجاتا ہے اور اس میں مرنے کی آرزو اس پُراسرار طریقے سے پیدا ہوجاتی ہے کہ اسے اس کا پتا ہی نہیں چلتا۔ لیکن قدرت کو تو اس کا علم ہوتا ہے اور وہ اس کی آرزوئے مرگ پوری کر دیتی ہے، جسے موت سے تعبیر کرتے ہیں۔ خلیوں کی موت ان کے اِحیاء کی پیش شرط ہے۔ اگر وہ خلیے جنہیں مرنا ہو، مرنے سے انکار کر دیں اور نشو و ارتقاء کرنے لگیں تو نئے خلیے پیدا نہیں ہوتے۔ اس کے نتیجے میں وجود کے نظامِ حیات و موت میں توازن برقرار نہیں رہتا اور "مرنے والے" خلیے "زندہ رہنے والے" خلیوں کو اپنی خوراک بنانا شروع کر دیتے ہیں۔ نفس اپنے ان اندرونی سرکش عناصر کی تخریب کاری کا کوئی مداوا نہیں کر سکتا تو جنگ ہار جاتا ہے۔ اگر وہ اپنی شکست شعوری یا لاشعوری طور پر تسلیم کر لیتا ہے تو جان حق تسلیم کرنے پر آمادہ ہوجاتا ہے، اگرچہ اس کا بھی اُسے بسا اوقات شعور نہیں ہوتا۔ اس کی یہ آمادگی حقیقت میں آرزوئے مرگ ہوتی ہے، جس کو قدرت اپنے قانونِ احترامِ آرزو کے مطابق پورا کر دیتی ہے۔

جس طرح تم یہ حقیقت نہیں جانتے کہ تمہارے خلیے کس طرح اور کیوں ہر آن کروڑوں کی تعداد میں مرتے اور پیدا ہوتے رہتے ہیں اور بعض اوقات وہ کیوں جینے اور مرنے سے انکار کر دیتے ہیں، نیز خلیوں کی پیدائش کا عمل روک دیتے ہیں اور نہیں جانتے کہ وہ اس طرح اپنے سمیت کل وجود کو موت کے حوالے کر دیں گے، اسی طرح تم یہ بھی نہیں جانتے کہ تمہارے نظامِ وجود میں فساد و اختلال یا جمود و تعطّل پیدا ہوجانے سے تمہارے نفس کے ان گنت اجزائے حیاتیاتی میں آرزوئے حیات و حُسن مضمحل و مفلوج ہوگئی ہے اور ان میں موت سے ہم آغوش ہونے کی آرزو پرورش پا رہی ہے۔

تم یہ سن کر حیران تو ہو گے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر خلیے میں آرزوئے حسن وحیات ودلیعت ہوتی ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ایک تو اس میں نشو ونما پائے اور دوسرے دیگر خلیوں کے ساتھ مل کر وجود کی تعمیر وتحسین کرنے اور ایک منظم ومتوازن زندگی بسر کرنے طلب وجستجو ہوتی ہے۔ یہ آرزوئے حسن ہے جو نامیاتی خلیوں کو اپنے وجود کی تعمیر وتحسین کرنے میں ہمہ وقت مشغول رکھتی ہے، حتّٰی کہ وہ اس کام میں اپنی جان تک دینے سے دریغ نہیں کرتے۔

غور کرو تو یہی صورتِ حال تمہارے معاشرتی وجود کی بھی ہے۔ اس کے افراد نامیاتی خلیوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر ان کی آرزوئے حسن زندہ وفعّال ہو تو وہ اس کی تعمیر وتحسین میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھتے۔ اصطلاحِ قرآنی میں انہیں "صالحین" کہتے ہیں۔ اگر وجودِ معاشرہ کو خطرہ لاحق ہو جائے تو وہ اس کے تحفّظ وبقا کی خاطر ہر قسم کی جدوجہد اور ایثار وقربانی کرتے ہیں، اور اس جہاد میں انہیں جان بھی دینی پڑے تو وہ دریغ نہیں کرتے اور شہادت کے ارفع واعلیٰ حسن المقام پر فائز ہو کر بھی ان "شہدا" کی صدائے دل یہ ہوتی ہے:

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا　　　(غالبؔ)

ایسی ہی قوم میں زندہ رہنے کی آرزوئے ہوتی ہے اور وہ اپنے آپ کو زندہ رکھنے اور ترقی کرنے کی خاطر تگ ودو اور جہاد و اجتہاد میں مصروف رہتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی نصرت اس کے شاملِ حال ہوتی ہے۔ یہ لطیف نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ آرزوئے حسن وحیات رکھنے والے افراد واقوام کا ربّ ذوالجلال والاکرام حامی وناصر ہوتا ہے، اس لیے کہ وہ خود ہر لحظہ اپنی جمالیاتی تخلیقی فعلیّت میں اپنی شان دکھاتا اور ان افراد واقوام کی امداد کرتا ہے جو تخلیقی فکر اور جمالیاتی تخلیقی فعلیّت میں مصروف رہتے اور اس میں اپنے علم وہنر (سائنس و ٹیکنالوجی) کے کمالات دکھلاتے رہتے ہیں۔ کمال تاریخی عمل کے ارتقائی تقاضوں کی تکمیل سے عبارت ہے، نیز یہ علم وہنر کے ارتقاء کے لامحدود امکانات کا مظہر ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کمال سلسلۂ ارتقاء

کی آخری کڑی پر نہیں بلکہ اس کی اگلی کڑی پر دلالت کرتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ آرزوئے حسن و حیات ہو تو قوم نہ صرف عصری تقاضوں بلکہ مستقبل کے تقاضوں کے حوالے سے بھی علم و ہنر کی نئی سے نئی راہوں اور ایجادات و اختراعات میں ترقی کرتی رہتی ہے۔ کمال ایک اعتبار سے (جس پر تاریخ شاہد ہے) عروجِ زندگی کا ازبس خطرناک مقام ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس پر متمکن ہو کر ترقی یافتہ قوم کے اکثر عناصرِ ترکیبی میں اِجتہاد و جہاد کے جذبات و داعیات سرد پڑنے اور استحصال و تکاثر کے جذبات پرورش پلنے لگتے ہیں۔ ایسے افراد جو استحصال کی قوت رکھتے اور اس کا استعمال بھی کرتے ہیں، وجودِ قوم میں "سرطان" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان معاشرتی سرطانوں کے لیے ہی قرآنِ مجید نے فرعون و ہامان اور قارون و آذر کی فکر انگیز و بصیرت افروز تلمیحی تعبیریں اختیار کی ہیں۔ ایسے عناصر کی نمود اس قوم کی ہلاکت و بربادی کی دلیل ہوتی ہے، لیکن نشۂ قوت و دولت میں سرشار قوم اس قدر غافل و بے بصر ہو جاتی ہے کہ اُسے اپنے اس مرضِ مہلک کی پرواہی نہیں رہتی اور اُس کی تشخیص ہی نہیں کر پاتی۔ سب سے بڑھ کر یہ اُسے اس حقیقت کا شعور تک نہیں رہتا کہ سرطانی عناصر اس کے وجود کے دیگر عناصر کا اس طرح استحصال و استیصال کر رہے ہیں کہ وہ وادیِ ہلاکت و بربادی کی طرف گامزن ہے۔

۵ - اِجتہاد و جہاد :

کیا تم حیاتِ قومی میں اِجتہاد و جہاد کی اہمیت سے آگاہی رکھتے ہو؟ یہ بات ذہن نشین کر لو کہ اس رزم گاہِ ہستی میں کوئی قوم اِجتہاد و جہاد کے بغیر نہ تو نشو و اِرتقا کر سکتی ہے اور نہ اپنے عقائدِ جبلیہ و محرکہ، ثقافت اور آزادی اور جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت ہی کر سکتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ تاریخی عمل کو اپنے حق میں رکھنے کے لیے اِجتہاد و جہاد ناگزیر ہیں۔ تاریخی عمل اپنے موافق نہ رہے تو وہ بالآخر مخالف ہو جاتا ہے اور اس کا نتیجہ اس قوم کے ضعف و انحطاط، ذلت و مسکنت اور مرگِ مفاجات کی صورت میں نکلتا ہے۔ اب میں ان ازبس اہم مصطلحات

کی جا یا تی نقطۂ نظر سے مجملاً صراحت کیے دیتا ہوں۔

(ا) اجتہاد عقلِ سلیم کی اپنے اور قرآن کے نور کے تعاون سے ایسے مسائل حل کرنے کی حکیمانہ مساعی جمیلہ سے عبارت ہے، جو زندگی کی خوب سے خوب تر کی طلب وجستجو سے مسلسل پیدا ہوتے رہتے ہیں اور جن کے متعلق کتاب وسُنّت کا سکوتِ حکیمانہ انسان کی کاوشِ ذہنی کا متقاضی ہو۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نئے سے نئے مسائل کیوں پیدا ہوتے رہتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو الحسن ہے، ہر آن ایک نئی شان میں جلوہ پیدا کرتا رہتا ہے اور روحِ حیات اس کے نو بنو اور تازہ بتازہ جلوؤں کے مشاہدے کی خاطر حرکتِ مدام میں رہتی ہے اور اس سے زندگی کے نئے سے نئے ہنگامے پرورش پاتے اور نو بنو مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں، جن کو حل کرنا از بس ضروری ہوتا ہے، اگر انہیں بروقت حل نہ کیا جائے تو قومی زندگی میں ایسا خلا پیدا ہو جاتا ہے، جسے اجتہاد کے بغیر پورا کرنا ممکن نہیں ہوتا؛ دوسرے قوم کی فکری وعملی زندگی میں جمود و تعطّل پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اپنا نشوو ارتقاء کرنے کے قابل نہیں رہتی۔

زندگی کا خاصہ حرکتِ مدام ہے اور حرکتِ مدام کا فقدان موت ہے۔ تاریخی عمل سے قومی زندگی میں مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں، جنہیں اجتہاد کے ذریعے حل کرنا انتہائی ضروری ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اگر انہیں حل نہ کیا جائے تو وہ راہِ حیات میں موانعات بنتے اور قومی زندگی کی رفتار کم کرتے رہتے ہیں۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ قوم دوسری اقوام کے مقابلے میں پیچھے رہ جاتی ہے اور تیز رو قوم یا اقوام کے پیچھے چلنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے جو قوم پیچھے چلے گی وہ ہمیشہ پیچھے ہی رہے گی۔ اس اعتبار سے کسی قوم کے پیچھے رہ جانے کا ایک بنیادی سبب فقدانِ اجتہاد ہے۔ بلاشبہ اس کا مداوا و تلافیِ مافات ممکن ہے لیکن جس قوم کو اجتہاد کی اہمیت کا احساس وشعور نہ رہے اور وہ اسے شجرِ ممنوعہ سمجھ کر اس سے گریزاں و ترساں رہے تو وہ لاعلاج مریض کی طرح ہوتی ہے، جس کی گھات میں موت لگی ہوتی ہے۔ ایسی قوم اپنے اوپر اجتہاد کے دروازے بند کر لیتی ہے تو اس پر ترقی کی راہیں بھی

مسدود ہو جاتی ہیں۔ علاوہ بریں، اس کی معاشرتی زندگی کا آبِ محیط روانی و موجزنی سے محروم ہو کر بند پانی کی طرح ہو جاتا ہے، جس میں فساد کی بو آنے لگتی ہے اور یہ صورتِ حال معاشرتی زندگی کی صحت و صالحیت کے لیے مضرّت رساں ہوتی ہے۔ صحت و صالحیت کو نقصان پہنچنے سے قوم نحیف و ضعیف ہو جاتی ہے اور ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات۔

اِجتہاد ان چھے حقائق پر دلالت کرتا ہے: اوّل "كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ" پر۔[۳] دوسرے قومی زندگی کی آرزوئے حسن اور خوب سے خوب تر کی طلب و جستجو پر۔ تیسرے، زندگی کی حرکتِ مدام اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے نو بنو مسائل اور صُورِ حال پر۔[۴] چوتھے ان مسائل کو حل کرنے اور صورِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے عقلِ سلیم کی حکیمانہ مساعی جمیلہ پر۔ پانچویں، اس حقیقت پر کہ تاریخی عمل کو اپنے حق میں رکھنے کے لیے اِجتہاد ناگزیر ہے۔ چھٹے، اس واقعیت پر کہ اِجتہاد قوم کے نشو و اِرتقاء کے لیے ناگزیر ہے اور قوم اس سے صرفِ نظر کرتی اور اس کی اہمیت سے غافل ہو جاتی ہے۔ اس کی عقل و فکر کے ساتھ زندگی بھی جمود و تعطّل کا شکار ہو جاتی ہے۔ علاوہ بریں، قدرت کے قانونِ کفرانِ نعمت کی رُو سے وہ قوم مسلوب العقل ہو جاتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ کسی قوم میں اِجتہاد کا فقدان اس کی آرزوئے حسن اور خوب سے خوب تر کی طلب و جستجو کے فقدان اور عقل ایسی نعمتِ حسنیٰ و عظمیٰ کے کفران پر دلالت کرتا ہے۔ یہ صورتِ حال اس قوم کے لیے بڑی سنگین ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ قدرت اپنے قانونِ کفرانِ نعمت کی رُو سے اسے اس نعمت سے محروم کر دیتی ہے۔[۱۰] دوسرے اس نے زندگی کو رہینِ اجتہاد و جہاد بنایا ہے،[۱۱] لہٰذا جو قوم اِجتہاد و جہاد سے منہ موڑ لیتی ہے قدرت اُسے زندگی ایسی نعمتِ عظمیٰ سے محروم کر دیتی ہے اور وہ "مردہ بدستِ زندہ" کی طرح ترقی یافتہ اقوام کی دست نگر و محتاج اور محکوم و غلام بن جاتی ہے۔

یہ ایک انتہائی عبرت انگیز تاریخی المیّہ ہے کہ اُمّتِ مُسلمہ جو کبھی اپنے ذوق و ملکۂ اِجتہاد

کے لیے شہرۂ آفاق تھی اور جس نے اقوامِ عالم کو حریتِ فکر و نظر اور اِجتہاد کا درس دیا اور ہر گوشۂ حیات میں اپنی برق رفتار ترقی و فتوحات سے ان کی غیر معمولی اہمیت کو عملاً ثابت کر دیا، مدت ہوئی اس میں ذوق و شوقِ اجتہاد کا فقدان ہے اور بلکہ اِجتہاد کی تکفیر کی وجہ سے یہ نعمت سلب ہو چکی ہے۔ چنانچہ کفرانِ نعمت کے اس جرم کی پاداش میں اُمتِ مسلمہ ذہنی تضادات، تشتت و افتراق اور لسانی و الواتی اور جغرافیائی و قبائلی عصبیت کا شکار ہے؛ نیز اس میں اتفاق و اِتحاد، وحدت و انفرادیت، اخوت و مساوات اور یکجہتی و رواداری کا فقدان ہے۔ وہ علم و ہنر اور خاص کر سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی یافتہ اقوام کے مقابلے میں ایک تو صدیوں پیچھے ہے اور دوسرے اس کی پس ماندگی اس کی درماندگی و درماندگی کی آئینہ دار ہے۔ یہ مرضِ مزمن انتہائی خطرناک تو ہے، لاعلاج نہیں؛ لیکن اس کا درماں اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اُمتِ مسلمہ میں اس مرضِ کہن کی ہلاکت آفرینی و علتِ حقیقی کا شعور پیدا نہ ہو اور وہ اجتہاد کی ناگزیر ضرورت کو عملاً تسلیم نہ کرے اور اس کا صدیوں سے بند باب دوبارہ وا نہ کرے؛ نیز اجتہاد کی قوتِ عقدہ کشا کے ذریعے ان جملہ مسائل کو حل نہ کرے جو قدرت کے تاریخی عمل اور زندگی کی آرزوئے حسن و خوب تر سے پیدا ہوئے ہیں اور ہماری ترقی کی راہ میں ناقابلِ عبور مواقع بنے ہوئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اُمتِ مسلمہ کی نفسیاتی و معاشرتی بیماریوں اور اس کی پس ماندگی و واماندگی کا علاج "اِجتہاد و جہاد" ہے، لیکن انسان کی محرومی و نامرادی اور ذلت و شقاوت کا ایک بنیادی سبب یہ ہے کہ "جانتا ہے پر مانتا نہیں۔"

(ب) <u>جہاد</u> اہلِ حسنِ یقین کی آرزوئے حسن کا ایسا مظاہرۂ جلال ہے، جو الحسن کی رضا کے لیے اس کے دین و ملت کی حفاظت و صیانت اور اس کے بندوں کی آزادی و حقوق کے تحفظ، نیز اُنہیں فرعونوں، ہامانوں، قارونوں اور آزروں کی محکومی و غلامی اور ظلم و استحصال سے نجات دلانے اور ان میں آرزوئے حسن و زندگی کا اِحیاء کرنے کی خاطر ان طاغوتی قوتوں

کے خلاف زبان وقلم اور سامانِ حرب کے ساتھ کیا جائے، چاہے اس جدّوجہد میں مال ودولت اور جان کی قربانی بھی دینا پڑے۔ خونِ زندگی جو اس راہِ حسنٰ میں میدانِ کارزار کو رنگین کرتا ہے وہ مجاہد و شہید کے گلستانِ زندگی کو بھی ہمیشہ کے لیے سدا بہار و ثمرور بنا دیتا ہے۔ مجاہد و شہید کا ہر قطرۂ خون الحسنٰ کی نظر میں لعلِ فردوس سے حسین تر و عزیز تر ہے، لیکن یہ راز اُن پر کھلتا ہے جو راہِ عشق و وفا میں ہر لحظہ خونِ دل و جان کرتے اور ساتھ ہی غیب سے ایک نئی روحِ حیات پاتے ہیں۔ جہاد اور جنگ میں فرق یہ ہے کہ جہاد فی السبیل اللہ ہوتا ہے، یعنی اس میں آرزوئے حسنٰ اور رضوانُ الحسنٰ کی طلب و جستجو مضمر ہوتی ہے، جبکہ جنگ فی السبیل اللہ نہیں ہوتی۔ جہاد دراصل تحریکِ رحمۃُ للعالمینی کو کامیاب بنانے کی مساعیِ جمیلہ سے عبارت ہے، جس میں جدال وقتال تو ہوتا ہے، لیکن اس میں آرزوئے حسنٰ ورضوانِ "دوست" مضمر ہوتی ہے۔ مجاہد اپنی رضا و رغبت سے اپنے معروضِ حسنٰ وعشق کی رضا کی خاطر جہاد کرتا ہے اور اس میں جان دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔

جب تک دُنیا قائم، تاریخی عمل جاری وساری ہے اور زندگی کے ہنگامے پرورش پارہے ہیں، جہاد کی ضرورت واہمیت سے متعلق دو رائیں نہیں ہوسکتیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ جہاد لازمۂ حیات ہے، یعنی جہاد اور زندگی لازم وملزوم ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ انسان میں بعض ایسی جبلتیں پائی جاتی ہیں، جن کی جہت درست نہ رکھی جائے اور وہ عقلِ سلیم کے اختیار میں نہ رہیں تو وہ اسے فرعون، ہامان، قارون اور آذر بنا دیتی ہیں؛ اور جب تک یہ طاغوتی قوتیں دُنیا میں ہیں اور ان کا استیصالِ کُلی نہیں ہوجاتا، اُس وقت تک "جہاد" زندگی کا ایک ایسا تقاضا رہے گا جس سے صرفِ نظر کرنا اپنی ہلاکت و بربادی، محکومی وغلامی اور ذلّت ومسکنت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ اگرچہ اس امر کا بظاہر کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ دُنیا کبھی طاغوتی طاقتوں اور دینی ومذہبی، لسانی والوانی، قبائلی ونسلی اور جغرافیائی وقومی اور نظری وثقافتی تعصبات سے نجات حاصل کرے گی، لیکن پھر بھی چونکہ اسلام کے عقیدۂ توحید میں ان طاغوتی قوتوں اور تعصبات کے

استیصال کی قوت مضمر ہے، لہٰذا اس بات کا امکان بھی موجود ہے کہ اقوامِ عالم اسلام کے عقیدۂ توحید کے مضمرات ولوازمات کی بنا پر اس کی تحریکِ رحمۃٌ للعالمینی میں شامل ہو جانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اس صورت میں جہاد کی ضرورت پھر بھی رہے گی، لیکن باندازِ تحریکِ رحمۃٌ للعالمینیٰ جس میں جنگ و قتال کے بجائے صُلح و آشتی، عدل و احسان، اخوت و مساوات، ایثار و محبت اور حریت و محبت کا مظاہرہ ہوگا۔

تاریخی عمل جو صدیوں سے جاری ہے، اس سے یہ نتیجہ مستنبط کرنا مُستبعد نہ ہوگا کہ انسان چونکہ اپنی بے رہرو جبلتوں اور دیگر عوامل و محرکات کی وجہ سے نفسیاتی بیماریوں میں ہمیشہ مبتلا رہا ہے اور رہے گا، لہٰذا یہ دُنیا جو ہمیشہ سے رزمگاہ رہی ہے۔ آئندہ بھی جنگاہ بنی رہے گی۔ اگر یہ حقیقت ہے اور یقیناً ہے تو پھر اپنی قوم و ملت کے وجود و دینٔ تہذیب و ثقافت اور نظریاتی و سیاسی سرحدوں کے تحفظ کے لیے جہاد کی غیر معمولی اہمیت ایک مُسلّمہ امر ہے۔ علاوہ بریں، جنگاہِ حیات میں "جہاد" کی طرح جہاد کی تیاری بھی ناگزیر ہے۔ جہاد کی تیاری کا مطلب دُہرا ہے۔ ایک یہ کہ قوم و ملت کے اندر جہاد کا شعور و داعیہ پیدا کرنا اور افراد کو سچا مجاہد بنانا؛ دوسرے حال و مستقبل کے تقاضوں کے مطابق دفاعی و جارحانہ جنگ کے لیے ضروری سامانِ حرب تیار رکھنا۔

اگر یہ کہا جائے کہ عسکری قوت جو ضروری سامانِ حرب و ضرب کی رسد، افرادی قوتٔ جہاد کی تیاری اور اس کے ذوق و شوق اور جذبہ و حوصلے سے عبارت ہے، دشمنوں کو مرعوب کرنے اور ان کے حوصلوں سے مرعوب رہنے کا بہترین عسکری حربہ ہے تو یہ مبالغہ نہیں بلکہ ایسی حقیقت کا اعتراف ہے جس پہ تاریخی عمل کے علاوہ خود قرآن حکیم شاہد ہے[۱۲]۔ اس کا نقیض یہ ہوا کہ جہاد کی تیاری سے تغافل جو عسکری کمزوری کی علامت ہے، دشمنوں کو

جارحیت کی دعوت دینے اور تاریخی عمل کو اپنے خلاف کرنے کے مترادف ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جو قوم مجاہد نہیں رہتی اور اس میں جہاد کی اہمیت کا احساس و شعور اتنا نہیں رہتا جتنا کہ رہنا چاہیے تو وہ کمزور و نحیف اور بزدل و کم ہمت ہو جاتی ہے۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ عموماً یہ نکلتا ہے کہ اس قوم میں آرزوئے حسن و زندگی مردہ ہو جاتی ہے اور اس کے اندر ذلت و مسکنت کی قبیح زندگی اور موت کی آرزو اس کے حجابِ شعور میں پرورش پانے لگتی ہے۔ اس کے نتیجے میں تاریخ کا دھارا اس کے خلاف چلنے لگتا ہے، جس سے بچنا جہاد و اجتہاد کے بغیر ممکن نہیں۔

دریا کا پانی جاری و ساری رہے، تو وہ دریا ہوتا ہے، اور سمندر موجزن و تلاطم خیز اور رواں دواں رہے تو سمندر رہے، اسی طرح قومی زندگی کا دریا رواں دواں رہے تو اس میں قوّت و توانائی اور زور ہوتا ہے، لیکن اس میں روانی نہ رہے تو وہ دریا نہیں رہتا جوہڑ بن جاتا ہے اور اس میں پانی بند ہو کر متعفّن ہو جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ قوم اپنی قوّت و توانائی اور جمال و جلالِ زندگی سے محروم ہو جاتی ہے۔ یہ علامت ہوتی ہے قومی زندگی کے ضعف و نقاہت، اضمحلال و انحطاط اور فقدان آرزوئے حسن و حیات کی۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ دریائے زندگی اپنی روانی سے اس وقت محروم ہوتا ہے جب اس میں اجتہاد و جہاد کا "آبشار" نہیں رہتا۔ اس آبشار سے دریائے زندگی میں وہ تندی و تیزی اور تلاطم خیزی و موجزنی آتی ہے جو تاریخ کے دھارے کو اپنا ہمرو بنا کر حریف قوتوں کو لکڑی کے تنوں کی طرح بہا کر لے جاتی ہے۔

حاصلِ کلام یہ کہ اجتہاد و جہاد کے بغیر قومی زندگی اپنے جمال و جلال سے محروم ہو کر جمود و تعطّل کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس میں حسن و زندگی کی آرزو و جستجو نہیں رہتی اور یہ علامت ہوتی ہے اس کی مرگِ مفاجات کی۔ وجہ یہ ہے کہ قدرت اس کی آرزو کو، چاہے وہ حسن و زندگی کی ہو یا قبح و موت کی، پورا کرنے پر آمادہ رہتی ہے۔ اسے

ہم قدرت کے "قانونِ تکمیلِ آرزو" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

۶۔ حسنِ موت وحیات:

ایک تیرِ نیمکش دل میں اس وقت لگا جب میری عمر کوئی چھ سات برس کی ہوگی ہمارے محلّے کی چھوٹی سی خوبصورت مسجد میں ایک اجنبی عمر رسیدہ بزرگ جمعۃ المبارک کا خطبہ دے رہے تھے۔ ان کی صورت جمیل وکریم اور نورانی تھی۔ کسی نے میرے معصوم دل سے کہا: "یہ خواجہ خضر علیہ السلام" ہیں"۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد وہ مسجد کے دروازے پر کھڑے ہو گئے تاکہ حاضرینِ جماعت ان سے بآسانی مصافحہ کر سکیں۔ سب سے آخر میں میری باری آئی۔ میں نے مصافحہ کرتے ہی عرض کیا: "مجھے کوئی نصیحت کیجیے"۔ انہوں نے فرمایا: "برخوردار! موت کو یاد رکھنا"۔

وہ بزرگ پھر کبھی دکھائی نہیں دیے اور نہ میں نے کبھی ان کا ذکر ہی سنا۔ لیکن ان کی نصیحت کا تیرِ نیمکش دل میں ہمیشہ خلش پیدا کرتا رہا اور ابھی تک کر رہا ہے۔ کھیلنے کودنے کی عمر تھی، لیکن میں سوچنے لگا: "موت کیا ہے؟ اسے کیوں یاد رکھوں؟ موت بھی کوئی یاد رکھنے کی چیز ہے؟ خوفناک اور بھیانک شے کو بھی کوئی یاد رکھتا ہے؟ قافلۂ زندگی کے رہزن کو کوئی یاد رکھے تو کیوں؟" میں موت سے متعلق سوچتا رہا اور اس سوچ کا سفر ابھی تک جاری ہے۔ غور کریں تو موت زندگی سے زیادہ قابلِ غور اور "یقینی چیز" ہے[۱۳]۔ ایک مدت کے بعد یہ راز کھلا کہ موت واقعی یاد رکھنے کی چیز ہے، اور اس کی یاد سمِّ شیطنت کا تریاق ہے۔ وہ بزرگ کون تھے؟ معلوم نہ ہو سکا، لیکن ان کے یہ الفاظ: "برخوردار موت کو یاد رکھنا"، گنبدِ دل میں ہمیشہ گونجتے رہے اور اب تک گونجتے رہتے ہیں۔ ان کی آواز گونجتی ہے تو ساتھ ہی ان کی تصویر چشمِ قلب کے سامنے جلوہ افروز ہو جاتی ہے۔ زندگی میں ایسے لمحات بھی آئے کہ موضوعی ومعروضی شیطان نے اپنی وسوسہ اندازی اور جمالیاتی فریب کاری سے جرم وگناہ

کو مزیّن یعنی خوشنما و دلکش بنا کر دکھایا اور قریب تھا کہ نفس شجرِ ممنوعہ کی لذت سے آشنا ہو جاتا اور میں دل کی جنّت سے نکل کر اس کے آتشکدے میں جا گرتا کہ وہ بزرگِ خجستہ پا جلوہ افروز ہو جاتے اور ان کی آواز گونجنے لگتی: "برخوردار موت کو یاد رکھنا"۔ موت کی یاد آتی تو چشمِ قلب کھل جاتی اور شیطان بساطِ ہستی پر مات کھا جاتا۔ اس کی وسوسہ اندازی اور جمالیاتی فریب کاری کا طلسم پاش پاش ہو جاتا، جُرم و گناہ اپنی اصل قبیح اور بھیانک صورت میں عریاں ہو جاتا اور اس کے نظّارے کے حریف قلب و نظر نہ ہو سکتے، اور نفس زندگی کے پُل صراط پر سے پھسل جانے سے بچ جاتا۔

"کیا موت وحیات للازم وملزوم ہیں؟ موت کیوں اتنی قبیح، خوفناک اور غم انگیز ہے؟ کیا موت سے مَفرّ کا کوئی اِمکان نہیں؟ موت انسان کو کہاں لے جاتی ہے کہ اس کا پھر نام و نشان تک نہیں ملتا؟" میں سوچتا رہا اور زندگی فکر و عمل کی وادیوں میں سفر کرتی رہی۔

زندگی کے اسرار و رموز قابلِ ادراک بھی ہیں اور ماورائے ادراک بھی۔ کبھی ہار کر جیت ہوتی ہے اور کبھی جیت کر ہار۔ انگریز جن کی سلطنت میں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا تھا، اِتحادیوں کی امداد سے محوری قوّتوں کو شکست دے کر خود ہار گئے۔ ہندوستان آزاد ہو گیا اور اس کے اندر ایک عظیم مُسلم سلطنت معرضِ وجود میں آ گئی۔ پاکستان میں آباد ہونے کے لیے ہم امرتسر (بھارت) سے ہجرت کر کے کراچی پہنچے، لیکن "دوست" کو امتحانِ صبر و شکیب مقصود تھا، بسنا محال ہو گیا۔ پاکستان کی آزاد فضا میں ہم پر زِیست اس قدر تنگ ہو گئی کہ جینا محال ہو گیا۔ کبھی آرزوئے حُسن درِ زندگی سرگرمِ عمل رکھتی تھی اور اب تنگیِ زیست کی اذیتیں موت سے پہلے مرنے پر مجبور کرنے لگیں۔ جانتا تھا، خودکشی حرام اور رحمتِ الٰہی سے مایوسی کُفر ہے، لیکن جب جینے کے لیے گھر تھا نہ سامان، پیسہ تھا نہ روزگار تو زندہ رہتا تو کیسے؟ زندگی نے منہ موڑا تو سب بیگانے بن گئے لیکن اقربا عقرب بنے تو ان کے نیشِ زبان و رویّہ کے درد و کرب نے دل میں مرنے کی آرزو پیدا کر دی اور شیطان نے اپنے جمالیاتی فریب

سے خودکشی کو اس قدر مزین وخوشنما بنا کر دکھایا کہ دل موت کی طلب وجستجو کرنے لگا۔

منوڑہ کراچی کا ایک حسین و پُرفضا جزیرہ ہے، ایک ننھا مُنّا ٹاپو۔ بحرِ زخّار وبیکراں کے جلیل ونظرافروز مناظر میں منوڑہ گمشدہ جنّتِ ارضی کا ایک گوشۂ گریزاں ہوگا۔ جو خطۂ پاکستان کی طلب وجستجو میں یہاں پہنچا اور سراپا انتظار ہوگیا۔ سمندر کی تلاطم خیزیوں اور موجوں کی ساحل سے پیکار و تصادم کے نظّارے میرے لیے سرورانگیز و وجدآفرین تھے اور میری روح ان جلیل نظّاروں پر جان دیتی تھی۔ شفق کا منظر میرے لیے جنّتِ نگاہ تھا تو سورج کے سمندر میں ڈوبنے کا نظّارہ اس قدر دلکش وکیف پرور تھا کہ اسے دیکھنے کے بعد حسرتِ نظّارہ بیقرار رکھتی۔ میں وہاں جاتا تو وہاں سے نکلنا غالباً اتنا ہی صبرآزما تھا جتنا آدمؑ کا جنّت سے نکلنا۔ لیکن آج وہاں گیا تو وہی منوڑہ تھا اور وہی اس کے جلیل ونظرافروز مناظر تھے؛ وہی سمندر تھا اور اس کی موجوں کی شوخیاں بھی وہی تھیں جو پہلے ہوا کرتی تھیں۔ موجوں کی تندی وہنگامہ پروری کے نظّارے اور ساحل کی چشمِ حیرت وسکوتِ معنی خیز کے مناظر بھی وہی تھے۔ لیکن آج مجھے موجوں کے ساتھ ساحل سے ٹکرا کر اُسی طرح غائب ہوجانے کی آرزو تھی جس طرح وہ غائب ہوجاتی تھیں۔ معاً میرے دل میں خیال آیا: موجیں تو غائب ہوکر پھر نمودار ہوجاتی ہیں۔ لیکن میں غائب ہوا تو پھر میری نمود کسی اور جہاں میں ہوگی۔ معلوم نہیں، وہ جہاں کیسا ہوگا؟ کیا اس میں بھی اسی قسم کے لوگ ہوں گے؟ آرزوئے حسن ومحبّت سے محروم، ظالم وجاہل اور سمندرسرشت انسان۔ کیا صلۂ رحمی اور مہر ووفا کے الفاظ وہاں بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوں گے؟ وہ جہاں کیسا کیوں نہ ہو، ایک دن وہاں جانا تو پڑے ہی گا، کیوں نہ آج ہی چلا جاؤں؟ تنگنائے زیست کی اذیتوں اور خوف وحزن کی آتش فشانیوں سے نجات تو مل جائے گی۔ شماتتِ اعزّہ واقربا کے عذاب سے بچ تو جاؤں گا؟ میں خودکشی نہیں کروں گا؛ سمندر میں چھلانگ نہیں لگاؤں گا۔ میں ساحل کے بلندترین مقام پر لیٹ جاؤں گا، جو ڈھلواں بھی ہے اور جہاں سے پھسل کر سمندر میں فنا ہوجانا، ہر اس شخص کا مقدّر ہے، جو وہاں قدم آزمائی کرے۔ ان خیالوں کی دُنیا میں

چلتے چلتے میں اُس "مقامِ مرگ" پر پہنچ گیا۔ نیچے جھانکا تو ایک عظیم الجثہ ویل مچھلی کو دیکھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ میرا انتظار کر رہی ہے۔ موجوں کے تصادم اور تلاطم خیزیوں کے شور میں دفعتاً میں نے ایک پُراسرار آواز سنی، جیسے کوئی ہاتفِ غیبی مجھ سے کہہ رہا تھا:

"موت بیشک حسین ہے، لیکن زندگی اس سے کہیں زیادہ حسین و دلکش ہے موت چکھنے کی اور زندگی بسر کرنے کی چیز ہے۔ رحمتِ الٰہی کی طرح زندگی بھی بیکراں ہے۔ تنگیٔ زیست کو کشادگی مستلزم ہے راہِ عشق و وفا میں "دوست" کو اپنے اسیرانِ محبت کا امتحان مقصود ہو تو وہ انہیں زندانیٔ زیست بھی بنا دیتا ہے؛ نیز کبھی انہیں تختہ دار پر چڑھا دیتا اور کبھی مقتل میں کشتۂ تیغِ جور و جفا بنا دیتا ہے۔ اس طرح انہیں احسان و رضوان کے بلند ترین حسنُ المقام پر متمکّن کر دیتا ہے۔ یہ محض امتحان ہے جلدی نہ کرو۔ سونے سے جاگنا اَولیٰ ہے۔ رحمتِ الٰہی اور کشادگیٔ زیست کی ساعتِ مُنتظر قریب ہے۔ انتظار بلاشبہ شکیب طلب و صبر آزما ہے، لیکن صبر اگرچہ تلخ بھی ہو تو اس کا پھل پھر بھی شیریں ہوتا ہے۔"

نسیمِ بحری کے جھونکے نشاط انگیز و جانفزا ہوا کرتے تھے، لیکن آج ان میں خمارِ مرگ تھا۔ میں عالمِ خمار میں اس قلعہ نما ڈھلان پر لیٹ گیا؛ بحرِ موت کے پُرآشوب گرداب کے کنارے۔ خمار انگیز نسیمِ بحری نے اثر دکھایا اور میں عالمِ خیال سے عالمِ خواب کی طرف سفر کرنے لگا۔ نیند ناظورۂ حیات کی طرح اپنی آغوشِ راحت فزا وا کیے میری طرف بڑھنے لگی تاکہ مجھے مرگِ مفاجات کے حوالے کر دے۔

نیند زندانِ دار میں شبِ دار بھی آجاتی ہے۔ عالمِ خواب جہاں جانفزا ہے وہاں ہلاکت آفریں بھی ہے، لیکن ان کے لیے جو سوئے رہتے ہیں۔ لذتِ خواب سحر لے تک لذتِ صبوحی کی طرح ہوتی ہے، لیکن رضوانِ "دوست" کی آرزو میں بیداریٔ آخرِ شب سے جو لذت ملتی ہے، اس میں قُرۃُ العین بھی ہوتی ہے اور جمالیاتی ثروت بھی۔ افراد کی طرح اقوام بھی جب سونے کو جاگنے پر ترجیح دیتی ہیں تو نیند انہیں اپنی زوجِ موت کے حوالے کر دیتی

ہے اور انہیں اس کی خبر بھی نہیں ہونے دیتی۔ نیند حسین و راحت انگیز نشہ ہے، جو جینے کے لیے ناگزیر ہے، لیکن یہ نشہ سرمستی و سیاہ مستی کی صورت اختیار کر لے تو مہلک بن جاتا ہے۔ انسان جاتا ہے پر مانتا نہیں۔

نسیم بحری کی خنکی و آسودگی مجھے آہستہ آہستہ نیند کی آغوش میں دے رہی تھی کہ دفعتاً وہ بزرگِ خضر صورت نمودار ہوئے اور میں بیدار ہو گیا۔ اگرچہ میں عالمِ خواب ہی میں تھا۔ بقولِ مرزا غالبؔ میری یہ حالت تھی:

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

بزرگِ خجستہ پا نے اپنے اُسی مشفقانہ انداز میں مجھے مخاطب کر کے فرمایا: "برخوردار موت کو یاد رکھو!"

میں نے عرض کیا: میں نہ آپ کی نصیحت بھولا ہوں نہ موت کو؛ لیکن جس موت کی یاد کو میں نے بچپن سے حرزِ جان بنا رکھا ہے۔ اب اسے گلے لگانے کی آرزو ہے۔

وہ: کیوں؟

میں: زندگی اپنے حسن سرور سے محروم ہو جائے تو زیست تنگ ہو جاتی ہے اور نفس کے لیے زندان وار بن جاتی ہے۔ نفس اس زندانِ تنگ و تار میں گھٹ کر رہ جاتا ہے اور مرگِ مسلسل کی اذیتیں برداشت کرنے کے قابل نہیں رہا؛ لہٰذا مجھے اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی خاطر موت کی آرزو ہے۔

وہ: نہ زندگی تمہاری ہے نہ موت۔ یہ تمہارے الٰہ و ربّ کی تخلیقات ہیں۔ زندگی اس کی امانت ہے، تم اس میں خیانت نہیں کر سکتے۔ خودکشی امانت میں خیانت بھی ہے اور کفرانِ نعمت بھی؛ اور یہ اتنا بڑا جرم و گناہ ہے کہ اس کی سزا بھی اتنی ہی بھیانک اور اذیت ناک ہے۔ خودکشی آرزوئے حسن و زندگی کے فقدان پر دلالت کرتی ہے اور اس کی سزا حسن و زندگی سے محرومی اور مرگِ مسلسل کا عذابِ مقیم ہے۔ جو شخص ربِّ ذوالجلال والاکرام کی اس نعمتِ حسنیٰ و عظمیٰ کی قدر نہیں کرتا اور اسے ضائع و برباد کر دیتا ہے، اس کی پاداش میں وہ الحیوان میں حیات و موت دونوں سے محروم رہتا ہے۔ اس کا مطلب

سمجھتے ہو کیا ہے؟ سنو!

زندگی ربِّ ذوالجلال والاکرام کی ایسی عظیم و حسین نعمت ہے، جس میں جمال وجلال، نور و سرور، لذّت و نشاط، طمانیت و مسرّت، قوّت و توانائی، حرکتِ مدام اور ثباتِ دوام کی صفات کے علاوہ آرزوئے حسن پائی جاتی ہے۔ یہ آرزوئے حسن دراصل روحِ حیاتِ انسانی کو اپنے معروضِ حسن و عشق کے قُرب و حضوری، ہم نظری و ہمکلامی اور دوستی و رِضوان کی ہوتی ہے؛ نیز اس کے حوالے سے جنّت الفردوس میں اس کے دوستوں کی صحبت و رفاقت کی، اور وہاں کے مناظرِ جمیل و جلیل اور لذّتِ آفرین و سرور انگیز نعمتوں کی ہوتی ہے۔ موت بھی ربِّ جلیل کی ایک حسین تخلیق ہے اور ان کے لیے نعمتِ حسنیٰ بن جاتی ہے، جو دُنیا میں زندوں کی طرح زندگی بسر کرتے اور اہلِ حسن و سرور ہوتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ موت ان اہلِ حسن و سُرور کو ایک آن میں عالمِ برزخ کے جہانِ جنّت نما میں پہنچا دیتی ہے۔ بخلاف اس کے جو لوگ دُنیا میں اہلِ نار کی طرح نہ زندہ ہوتے ہیں نہ مُردہ، موت انہیں عالمِ برزخ کے جہانِ جہنّم نما میں پہنچا دیتی ہے، جو ان کے لیے خوف و حزن اور حسرت و پشیمانی کا آتشکدہ اور زندانِ روح فرسا ہے۔ موت اُن کے لیے ازبس قبیح و مہیب ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ایک تو وہ ان کی رُوح کو اس طرح نکالتی ہے کہ جان کنی کا ہر لمحہ شدّتِ عذاب میں ان کے لیے صدیوں طولانی بن جاتا ہے؛ دوسرے وہ انہیں زندانِ آتشکدہ میں لے جاتی ہے، جو مثیلِ جہنم ہے اور جس کی ہر آن شدّتِ عذاب کے باعث انہیں آنِ جاودانی محسوس ہوتی ہے۔ احساس کا زمان و مکان سے ایسا تعلّق ہے جو لاینفک بھی ہے اور پُر اسرار بھی۔ احساس و شعور کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ آرزوئے حسن کے عوامل و محرّکات ہیں؛ نیز جیسی آرزو ہوتی ہے ویسی موضوعی دُنیا کی تعمیر کرتے ہیں؛ یعنی آرزو اگر حسن کی ہوگی تو موضوعی دُنیا کی تشکیل و تعمیر حسین ہوگی اور اگر آرزوئے قبیح کی ہوگی تو موضوعی دُنیا کی تشکیل و تعمیر بھی قبیح ہوگی۔ اصل یہ ہے کہ انسان اپنی موضوعی دُنیا

ہی میں رہتا اور سفر کرتا ہے اور یہی دُنیا برزخ اور الحیوان میں معروضی صورت اختیار کرے گی؛ قبیح ہوگی تو النار و شرّ المآب ہوگی، اور حسین ہوگی تو قُرّۃ العین و حُسن المآب ہوگی۔

زندانِ شرّ المآب میں اہلِ نار کا احساس وشعور ایک تو انتہائی شدید اور دوسرے دُہری نوعیت کا ہوگا۔ ایک تو اہلِ جنّت کی حسین و بے نظیر زندگی اور لامتناہی و تعجب خیز نعمتوں کو دیکھ کر ان کا اپنی محرومی و نامرادی کا احساس وشعور شدید تر ہوتا جائے گا، دوسرے اپنے خوف و حزن اور حسرت و ندامت کی آتشِ سوزاں کی اذیتوں کا احساس وشعور بھی شدید سے شدید تر ہوتا جائے گا اور عالمِ یاس و قنوطیت میں زندگی اُن کے لیے سوہانِ روح اور موت حسین بن جائے گی؛ وہ موت کو ترسیں گے اور ان پر جان دیں گے، لیکن وہ موت اور زندگی دونوں کی لذّت سے محروم رہیں گے۔

زندگی کا اصل الاُصول یہ ہے کہ جو ظالم و جاہل انسان اس دُنیا میں زندگی کی قدر نہیں کرتے؛ یعنی وہ نہ تو حسین زندگی گذارتے ہیں اور نہ لذّتِ زندگی سے بہرہ مند ہی ہوتے ہیں، وہ آخرت میں بھی حسن و لذّتِ زندگی سے محروم و ناآشنا رہیں گے۔ چونکہ وہاں موت نہیں، اس لیے وہ اس کی لذّت سے بھی محروم رہیں گے۔ قرآنِ مجید کی زبان میں ثُمَّ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيٰى ﴿الاعلیٰ ۸۷: ۱۳﴾: پھر وہ (اہلِ نار) نہ اس میں مرے گا نہ زندگی ہی کرے گا۔

چونکہ تم حیات و کائنات پر اپنے اور اپنے اِلٰہ و ربّ کے حوالے سے حکیمانہ انداز میں سوچتے رہتے ہو، اس لیے تم مُفکّر و حکیم ہو؛ نیز تم میں آرزوئے حسن و زندگی نشوونما پاچکی ہے، اگرچہ طوفانِ حوادث کی تاب نہ لاکر اس وقت اس میں جان نہیں رہی اور نفس گھبرا کر ہمت ہار بیٹھا ہے۔ علاوہ بریں، تم میں شنید و دید کا ذوق و شوق بھی ہے۔ ان صفات کی بنا پر میں تمہیں زندگی سے متعلق چند اُصولی باتیں بتانا چاہتا ہوں جو علم و حکمت کی باتیں ہیں اور تمہیں ان کا مفہوم سمجھنے میں دقّت نہ ہوگی۔

حیاتِ انسانی سے متعلق یہ نکتہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ربِّ ذوالجلال والاکرام نے اسے اپنی حکمتِ کاملہ کی رُو سے رہینِ رنج ومحن بنایا ہے، لہٰذا سعی وجُہد اور محنت و مشقّت زندگی کا مقتضیٰ ہے اور اسے پورا کرنے کا انسان مُکلّف ہے۔ چنانچہ جو شخص اسے احسن طریق سے مسلسل پورا کرتا رہتا ہے، وہی عظیم کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے۔ یاد رکھو! ربِّ جلیل وعزیز ان کی مدد کرتا ہے جو محنت ومشقّت اور سعی وجُہد میں لگے رہتے ہیں اور راہِ حیات میں پیش آنے والے مصائب اور مواقع کو عزم وہمّت اور صبر واستقامت کے ساتھ جھیلتے اور عبور کرتے رہتے ہیں۔ وہ ادھر فارغ ہوتے ہیں تو اُدھر کام میں جُٹ جاتے ہیں؛ نیز وہ نامساعد حالات، طوفانِ حوادث اور کرب وبلا میں ہمّت ہارتے ہیں، نہ اُن کے پائے صبر واستقامت میں لغزش ہی آتی ہے۔ بخلاف اس کے جو لوگ اقوام ہوں یا افراد محنت ومشقّت سے جی چُراتے اور سعی وجہد سے کنارہ کش ہوجاتے ہیں، عظمت وکامیابی بھی ان سے کنارہ کش ہوجاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک تو وہ ذلّت ومسکنت اور ناکامی ونامرادی کے شکار، اور دوسرے ربِّ ذوالجلال والاکرام کی تائید ونصرت اور رحمت ورضوان سے محروم ہوجاتے ہیں۔ انسان سمجھے تو یہ بہت بڑی محرومی ونامرادی ہے۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ "زندگی استحقاق نہیں، ربُّ العالمین کا انعام بصورتِ امانت ہے۔" انسان اس امانت سے متمتّع ہونے کا تو مجاز ہے، لیکن اس کی تضییع وتکفیر کا مجاز نہیں، کیونکہ یہ گناہِ کبیرہ اور ظُلمِ عظیم ہے۔ جو شخص اس جُرم کا ارتکاب کرتا ہے، اس کی پاداش میں وہ زندگی ایسی نعمتِ حسنٰی وغیر مُترقبہ سے محروم ہوجاتا ہے، اور الحیوان میں بھی محروم رہتا ہے۔ کاش انسان سمجھتا کہ یہ کتنی بڑی محرومی اور سزا ہے۔

ربِّ ذوالجلال والاکرام نے بلا شُبہ اس دُنیا کو جمیل وجبیں نظّاروں، حسین ولذیذ اور

سرور انگیز و کیف پرور نعمتوں اور زندگی کے دلکش و جاذبِ نظر ہنگاموں سے معمور بنایا ہے، لیکن یہ سب کچھ اس نے اپنے بندوں کا امتحان لینے کے لیے بنایا ہے۔ بالفاظِ دیگر، یہ دنیا انسان کے لیے دارالعمل اور امتحان گاہ ہے اور اسے اس میں اس لیے پیدا کیا جاتا ہے کہ وہ صرف ایک اِلٰہ و ربّ (= اللہ تعالیٰ) کی عبادت کرے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایمان بالحق کے ساتھ اپنی آرزوئے حسن کی تکمیل کرے اور اس راہِ حسن میں اسے جن صبر آزما و حوصلہ فرسا امتحانات و تجربات میں سے گزرنا پڑے، اہلِ تسلیم و رضا کی طرح گزر جائے۔ اہلِ تسلیم و رضا ہی، اربابِ صبر و حق، اہلِ جذب و شوق اور اصحابِ عشق و وفا ہوتے ہیں اور انہیں اس کے صلے میں اپنے معروضِ حسن و عشق کی طرف سے ہر لحظہ ایک نئی شانِ زندگی ملتی ہے۔ شانِ زندگی کا مطلب ہے احسان و رضوان کے حسن المقام پر ارتقائے مسلسل اور علوئے مرتبت۔ یہی مفہوم ہے اس شعر کا، جو جتنا مشہور ہے اتنا سچا بھی ہے اور وہ ہے:

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زماں از غیب جانے دیگر است

زندگی امتحانِ مسلسل ہے اور اس میں سے انسان کو مہد سے لحد تک گزرنا پڑتا ہے۔ امتحانِ زندگی جتنا آسان ہے اتنا مشکل بھی ہے۔ آسان اس لیے ہے کہ انسان میں آرزوئے حسن ودیعت کی گئی ہے اور مشکل اس لیے ہے کہ اس کے ساتھ اس کا حریفِ موضوعی معروضی لگا ہوا ہے۔ یہ نکتہ وضاحت طلب ہے، لہٰذا اس کی مختصراً توضیح کیے دیتا ہوں: آرزوئے حسن کی بدولت انسان ایک تو حسن سے محبت کرتا، اس کی حمد و ستائش کرتا، اس سے اپنے جمالیاتی ذوق کی تسکین اور جمالیاتی ثروت حاصل کرتا ہے؛ نیز وہ حسنِ عمل کا داعیہ رکھتا اور اس کی طلب و جستجو میں رہتا ہے۔ دوسرے اسے قبح سے طبعاً نفرت ہے اور قبح کا مطلب سیئہ و شر، جرم و گناہ، ظلم و جہل، فتنہ و فساد، عدوان و استحصال اور شرک و بت پرستی ہے۔

اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ امتحانِ زندگی انسان کے لیے آسان ہے، لیکن یہ حریفِ آدم بے حیا سے اپنی وسوسہ اندازیوں اور جمالیاتی فریب کاریوں کے ذریعے مشکل بلکہ از بس مشکل بنا دیتا ہے۔ اس کا طریقِ واردات یہ ہے کہ وہ اپنے اس جمالیاتی تلبیسِ ابلیس کے ذریعے انسان کی قبیح سے قبیح خواہشات واعمال کو خوشنما و نظر فریب بنا کر دکھاتا ہے، اور انسان اس خوبصورت دھوکے میں مارا جاتا ہے۔ یہ ابلیس کا جمالیاتی فریب ہے، جس نے خودکشی ایسے گھناؤنے اور سنگین جرم کو تمہیں اس طرح مزین کر کے دکھایا ہے کہ اس میں تمہیں اپنی نجات نظر آنے لگی ہے، حالانکہ یہ سراب و فریبِ نظر ہے۔ خودکشی سے خوف وحزن کی اذیتوں سے نجات نہیں ملتی، بلکہ آتشکدۂ خوف وحزن میں جلنے اور جانکنی کے عذابِ مقیم میں رہنے کی سزا ملتی ہے۔ کاش انسان جانتا کہ خودکشی سے انسان اپنے ربِ رحیم وکریم کی مغفرت و رحمت، جنت اور رفاقتِ اہلِ حسن وسرور اور لذتِ حیاتِ محض، نیز اپنے الٰہِ جمیل کی محبت و رضوان اور ہم نظری وہمکلامی کی نعمتوں سے محروم ہو جاتا ہے اور یہی اصل محرومی ونامرادی ہے۔

اٹھو! مصائب وشدائد کا صبر واستقامت سے مردانہ وار مقابلہ کرو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ ربِ ذوالجلال والاکرام صبر وتوکل کرنے والوں سے محبت کرتا اور ان کے ساتھ ہوتا ہے، اور جن کے ساتھ وہ ہو، ان کی کامیابی شدنی ہے؟ کیا تمہیں اس حقیقت کا علم نہیں کہ رحمتِ الٰہی سے مایوسی کفر ہے اور عسرت کو فراخی مستلزم ہے اور ربّ العزت ایک لحظے میں فقیر کو غنی، گدا کو شاہ اور مفلوک الحال کو مرفہ الحال بنا دیتا ہے؟ وہ جسے چاہے بے حساب رزق دیتا ہے اور اس طرح دیتا ہے کہ آدمی کو اس کا سان گمان بھی نہیں ہوتا۔

مانا کہ راہِ عشق و وفا پُر خار اور تم آبلہ پا ہو، لیکن پھر کیا ہوا؟ رہ نوردِ شوق تو ہو۔ اس راہِ پُر خار میں ایک تو برہنہ پا چلنا پڑتا ہے اور دوسرے پائے فگار سے خار نکالنے کے لیے لمحہ بھر رکنا بھی جرمِ محبت ہے اور اس کی سزا جو ملتی ہے اُسے ایک صاحبِ حال نے اس طرح بیان کیا ہے:

رفتم کہ خار از پا کشم، محمل نہاں شُد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دُور شُد (قُمی)

دُنیا میں آدمی کو اپنے موضوعی معروضی دشمن کے علاوہ دیگر حریف قوتوں سے بھی عمر بھر جنگ لڑنا پڑتی ہے۔ فرعونوں، ہامانوں، تمناؤں اور آرزوؤں کے ظلم وستم برداشت کرنا پڑتے اور ان کے خلاف جہاد کرنا پڑتا ہے۔ جنگ ایک لڑائی کا نام نہیں، بلکہ عبارت ہے لڑائیوں کے سلسلے سے۔ ہارتا وہ ہے جو لڑائیوں کا سلسلہ یا جنگ ہارتا ہے اور جیتا وہ ہے جو جنگ جیتے۔ تم نے تو ابھی ایک لڑائی ہاری ہے اور اسے اپنی شکستِ فاش سمجھ بیٹھے ہو۔ یہ تمہاری بھول ہے، اور اس کا سبب بھی جمالیاتی تلبیسِ ابلیس ہے۔ ابھی تو تم نے کارزارِ ہستی میں بیسیوں لڑائیاں لڑنی ہیں۔ مجاہد وہ ہے جو ہار تسلیم نہیں کرتا بلکہ ہار کر جیتنے کی تگ و دو کرنے لگتا ہے۔ ہمت ہارنا شیوۂ مردانگی نہیں۔ خودکشی آئینِ جواں مرداں نہیں۔ میں نے تمہیں صرف موت کو یاد کرنے کی نصیحت کی تھی، بِن آئی موت مرنے کے لیے تو نہیں کہا تھا۔ زندگی ایسی نعمتِ غیر مترقبہ کی تکفیر کے لیے تو نہیں کہا تھا۔

سنو! موت کی آرزو قبیح و حرام اور زندگی کی آرزو حسین و حلال ہے۔ موت کی آرزو سے لذتِ مرگِ مسلسل اور زندگی کی آرزو سے لذتِ حیاتِ مدام ملتی ہے۔ کیا تمہیں اپنے الٰہِ جمیل و رحیم اور ربِ جلیل و کریم کا یہ احسانِ عظیم یاد نہیں کہ اُس نے تمہیں "تفسیرِ کبیر" لکھنے پر مامور کیا ہے؟ اس کام کی جزا و انعام کا تم تصور تک نہیں کر سکتے۔ تم نے یہ کام کرنا اور اس کے لیے زندہ رہنا ہے۔ اس راہِ عشق و وفا میں ابھی کئی صبر آزما و تسکیب رُبا مرحلے آئیں گے اور تمہیں انہیں مردانہ وار سر کرنا ہوگا۔ صبر و استقامت، توکل و رجا، محنت و مشقت اور جہاد و اجتہاد کو اپنا شعارِ زندگی بناؤ اور قلم بدست مصارفِ زندگی میں مصروفِ سعی وجہد ہو جاؤ۔ انشاء اللہ تمہاری آرزوئے حسن پوری ہوگی۔

اُٹھو اور دیکھو! ایک نوخیز و وجیہ لڑکا خودکشی کے ارادے سے تمہاری جگہ آ رہا ہے۔

اُس کے اعزّہ و اقارب اُسے سمجھا بجھا رہے ہیں، لیکن وہ کسی کی ماننے کا نہیں، کیونکہ اُس میں آرزوئے حسن و زندگی مردہ ہو چکی ہے۔ مذ زندگی سے فرار کا مطلب مرگِ مفاجات ہے اور موت اسے بکار رہی ہے اور وہ اس کی آغوش میں سو جانے کے لیے اس طرف لپک رہا ہے۔ یہ راز مشکل سے کسی کی سمجھ میں آئے گا کہ بچپن ہو یا لڑکپن، شباب و کہولت ہو یا پیری، کوئی عہد و عالم ہو، آرزوئے حسن و زندگی مردہ ہو سکتی ہے۔ قدرت کا یہ اصل الاصول یاد رکھو، جو افراد اور اقوام سب کے لیے ہے کہ زندہ رہنا ہے تو آرزوئے حسن و حیات کو زندہ رکھو"!

میں تھا تو عالمِ خواب میں، لیکن عالمِ بیداری سے زیادہ ہوش و حواس میں تھا۔ کبھی کبھی انسان کو ایسے عالم میں سے بھی گزرنا پڑتا ہے، جسے "جمالیاتی آن کا عالم" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس کی کیفیت و کمیّت کو بیان تو نہیں کیا جا سکتا، البتہ اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ وہ عالمِ بیداری سے زیادہ حقیقت کے قریب ہوتا ہے۔ میں اس سرور انگیز و بصیرت افروز عالمِ جذب و شوق میں بادۂ حکمت کے جام پہ جام پیے جا رہا تھا کہ دفعتاً وہ آوازِ فردوس گوش رہی نہ صورتِ جنّت نگاہ۔ میں بے قرار ہو گیا اور شدّتِ اضطراب سے میری آنکھ کھُل گئی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ چند مرد، عورتیں اور بچے ایک نوخیز لڑکے کو گھیرے میں لیے اس "مقامِ مرگ" کی طرف بڑھے چلے آ رہے ہیں، جہاں میں لیٹا ہوا تھا۔ یہ مقام دراصل عام گزرگاہ کے قریب ہی تھا۔ وہ لڑکا چلا چلا کر کہہ رہا تھا: "مجھے چھوڑ دو۔ میں مر جاؤں گا لیکن گھر نہیں جاؤں گا۔" مرد خاموش، بچے حیران و پریشان تھے، مگر عورتیں اس کی منتیں کر رہی تھیں اور اس کا دامن اور بازو تھامے ہوئی تھیں۔ اچانک ایک آواز آئی: "چھوڑ دو اسے! دیکھیں کیسے سمندر میں چھلانگ لگاتا ہے!" یہ آواز لڑکے کے دل پر برقِ فنا بن کر گری اور اس کے صبر و شکیب کو خاکستر کر گئی۔ اس نے پاگلوں کی طرح اپنے آپ کو چھڑایا اور دیوانہ وار بھاگا اور میرے قریب آتے ہی وہ اپنے نوز میں سمندر میں جا گرا اور چشم زدن میں وادیِ مرگ میں روپوش ہو گیا۔

دل جو پہلے ہی آتشِ غم میں سوختہ و گداز ہو چکا تھا، مرگِ شباب کا یہ نظارۂ زہرہ گداز

دیکھ کر سکتے میں آگیا۔ وہ حریفِ نظّارہ ہوا تو کیسے؟ یہ رازِ "دوست" ہی جانتا ہے۔ میرے حواس مختل ہو گئے؛ سوچ مفلوج ہو گئی، آنکھیں پتھرا گئیں اور میں بُت بنا ڈوبنے والے جواں مرگ کے عزاداروں کا نالہ و شیون سُن رہا اور ان کی حالت زار دیکھ رہا تھا کہ میرے مسیحا کی ندائے جانفزا آئی:

"سنو ہر فرد بشر کو اپنی منزل مقصود۔ جنت میں پہنچنے کے لیے زندگی کے پُل صراط پر سے گزرنا پڑتا ہے اور عمر بھر گزرنا پڑتا ہے۔ دیکھنے میں یہ پُل کشادہ و محفوظ ہے، لیکن حقیقت میں بازی گر کے رسے کی طرح ہے جس پہ اُسے ہمہ وقت اپنا توازن برقرار اور پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ اس مقصد کی خاطر اُسے دونوں ہاتھوں سے ایک ڈنڈا مضبوطی سے تھامے رکھنا پڑتا ہے اور نظر ہر وقت منزلِ مقصود یا دوسرے سرے پہ رکھنا پڑتی ہے۔ اسی طرح ہر رہرو کو زندگی کے پُلصراط پر پھونک پھونک قدم رکھنا چاہیئے؛ ہاتھوں میں اللہ تعالیٰ کی رسی یعنی قرآنِ مجید کو مضبوطی سے تھامے رکھنا چاہیے اور اپنی نظر ہمہ وقت اپنی منزلِ مقصود پہ جمائے رکھنی چاہیے؛ ورنہ پُل پار کرنا محال ہو گا۔ اس پُل کے راستے میں قدم قدم پر شیطان اُسے ورغلا کر پُل پر سے گرانے کے لیے گھات لگائے بیٹھا ہوتا ہے۔ اُس سے بچتا وہ ہے، جو قرآن مجید کو کسی حال میں نہیں چھوڑتا۔ یاد رکھو! قرآنِ مجید کے بغیر اس پلصراط سے گزر کر اپنی منزلِ مقصود پہ پہنچنا، ناممکن ہے۔ زندگی ہے تو قرآنِ مجید کے ساتھ۔ اصل یہ ہے کہ قرآنِ مجید میں زندگی و شفا بھی ہے اور حسنہ و خیر بھی، حسن و نور بھی ہے اور رشد و ہدایت بھی، طمانیت و برکت بھی ہے اور مسرت و قرۃ العین بھی۔ یاد رکھو! اس پلصراط کے نیچے دوزخ ہے۔"

۷۔ آرزوئے بقائے دوام:

میں سوچتے سوچتے عالمِ جذب و مستی میں گُم ہو جاتا ہوں یا سو جاتا ہوں اور مجھے دُنیا و

مافیہا کا ہوش نہیں رہتا تو پھر بھی میں اس عالم بے خودی میں سوچتا رہتا ہوں۔ سوچ کے سفر کے دوران کبھی کبھی یہ سوچنے لگتا ہوں کہ میرے اندر وہ کون ہے جو سوچتا رہتا ہے؟ میری خواہش و ارادے کے بغیر بھی وہ سوچتا رہتا ہے۔ آخر کیوں؟ ندائے سروش آئی:

اے سوچنے والے! یہ تیرا نفس ہے جو سوچتا رہتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اُسے آرزوئے بقائے دوام مضطراب و بے قرار رکھتی ہے۔ یہ آرزو کبھی اس کے حجابِ شعور میں ہوتی ہے اور کبھی پاتالِ شعور میں۔ یہ آرزو بڑے کام کی چیز ہے۔ کیونکہ اس میں حسنِ زندگی کی آرزو پنہاں ہوتی ہے۔ میں آج تم سے آرزوئے بقائے دوام کے متعلق چند حقائق بیان کرنا چاہتا ہوں تاکہ تم اس پر حکیمانہ تفکر و تدبّر کرو اور خود آگاہ و خدا آگاہ بن جاؤ۔ سنو! ہر انسان تین چیزوں کے امتزاج سے عبارت ہے: روح، نفس اور بدن سے۔ اب ان عناصرِ ثلاثہ کی صراحت کرتا ہوں:

روح مخلوق ہونے کے باوجود زندۂ جاوید ہے، اگرچہ یہ زندہ بالذّات ہے نہ قائم بالذّات۔ اس کی حیاتِ جاوید کا راز اس حقیقت میں مضمر ہے کہ وہ ربِّ حیّ و قیوّم کا "نفخۂ روحی" ہے، جس کی اس حقیقت کے سوا کوئی نہیں جانتا اور نہ جان ہی سکتا ہے۔ روح کے متعلق انسان کو بہت کم علم دیا گیا ہے۔ بہر حال، وہ ایک ایسا پیکرِ لطیف ہے، جس میں صفاتِ الٰہیہ اس کی تنگنائے ظرف کے مطابق ودیعت کی گئی ہیں، جنہیں قوّت سے فعل میں لانا انسان کا وظیفۂ حیات ہے اور ایسا کرنا "تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ" اور اپنے آپ کو رنگِ الٰہی سے رنگنے کا عمل ہے۔ روح اگر قدرت کا جمالیاتی معجزۂ امر ہے تو انسان اپنی کُلّی حیثیت میں اس کا جمالیاتی معجزۂ امر و خلق ہے۔ چونکہ روح کی حقیقت حسن ہے، اس لیے یہ ایسا جمالیاتی لطیفہ ہے جو جمال و جلال، حیات و قومیّت اور نور و توانائی کا خزینہ ہے۔ روح اپنے نور و توانائی کی بدولت ارتقاء کرتی ہے اور اس میں ارتقاء کے لامتناہی امکانات مضمر ہیں۔ اس میں یہ لطیف نکتہ ہے کہ ارتقاء کا ہر امکان اس کا ایک مقام ہے، جو نورِ روح کا کمال ہے؛ لیکن

جس طرح امکانات کا سلسلہ دراز و لامتناہی ہے، اسی طرح کمال کا سلسلہ بھی دراز و لامتناہی ہے۔ نورِ روح کے ارتقائے لامتناہی کا راز کُلَّ یَوۡمٍ هُوَ فِیۡ شَاۡنٍ ○ (الرّحمٰن ۵۵ : ۲۹) میں مضمر ہے۔ روح کی اپنے نور کے ارتقاء و کمال کی آرزو میں دراصل اپنے معروضِ حسن و عشق کے قرب و حضوری اور دید و رضوان کی آرزو مضمر ہوتی ہے۔

جانتے ہو نفس کیا ہے اور کیسے پیدا ہوتا ہے؟ سنو! میں تمہیں بتاتا ہوں نفخۂ روحِ ربّی کی بدولت جب روحِ بشری اپنے پیکرِ ارضی میں ظہور پذیر ہوتی ہے تو اس کے اتصال سے ایک تیسری عجیب و غریب چیز پیدا ہو جاتی ہے جس میں قدرت روح اور بدن دونوں کے خصائص و خصائل ودیعت کر دیتی ہے، جسے نفس سے تعبیر کرتے ہیں۔ نفس ایک صاحبِ ارادہ، اختیار اور باشعور نامیاتی کل ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کی حیات و بقا کا انحصار روح و بدن کے اتصال پر ہے، اس لیے اسے بدن کی بقا اور آرام و آسائش کا بہت زیادہ خیال رہتا ہے؛ نیز بدن موت کی دسترس میں ہوتا ہے بلکہ اس کے ہیولے میں موت بصورتِ خرابی مضمر ہوتی ہے، علاوہ بریں، بدن کو انحطاط و زوال، موت و ہلاکت اور فنا و عدمیت مستلزم ہے جبکہ روح انحطاط و زوال، موت ہلاکت سے ماوراء ہے۔ بدن کے حوالے سے نفس میں آرزوے حیات و بقا پائی جاتی ہے۔ چونکہ وہ جانتا ہے کہ
بدن کے حوالے سے نفس میں آرزوے حیات و بقا پائی جاتی ہے۔ چونکہ وہ جانتا ہے کہ
موت ہر متنفس کی تقدیر ہے، لہٰذا وہ اپنی آرزوے حیات و بقا کی تکمیل اپنی ذات کی توسیع کے ذریعے کرنے کی شدید طلب و جستجو رکھتا ہے۔ علاوہ بریں، اس خواہش کی تکمیل میں ہر حیاتیاتی نوع کی نسل کی افزائش و بقا کا راز مضمر ہے، لہٰذا احسن الخالقین نے اس خواہش کی تکمیل کے لیے ہر حیاتیاتی و نباتاتی نوع کا زوج بنایا اور زوجین میں جنسی جذب و انجذاب کی جبلت پیدا کر دی۔ جنسی جبلت کی غیر معمولی اہمیت کے پیشِ نظر ایک تو اسے انتہائی قوی اور اس کے تقاضے کو بدرجۂ غایت شدید بنایا ہے، اور دوسرے جنسی تقاضے کی تشفی کو اسی قدر حظ انگیز، تسکین دہ اور کیف پرور بھی بنایا ہے۔ تیسرے جنسی عمل اگرچہ خاصا محنت طلب ہوتا ہے، لیکن اس سے جو جمالیاتی حظ اور جنسی لذّت ملتی ہے وہ انتہائی شدید ہوتی

ہے، لہٰذا جنسی عمل کی کلفت بھی لذت بن جاتی ہے اور وہ بے حد مرغوب و حظ انگیز، طمانیت و تسکین دہ اور سرور انگیز و کیف پرور بن جاتی ہے۔ قدرت نے جنسی جبلت ہر متنفس کو اپنی نسل کی افزائش و بقا کے لیے ودیعت کی ہے اور اس میں نفس کی آرزوئے بقائے دوام مضمر ہوتی ہے۔ غور سے دیکھیں تو آرزوئے بقائے دوام میں آرزوے حسن و زندگی پنہاں ہوتی ہے۔

چونکہ نفسِ انسانی روح و بدن کے اِتصال سے معرضِ وجود میں آتا ہے، لہٰذا دونوں کے خواص و خصائص اس میں منتقل ہو جاتے ہیں اور وہ دونوں کے تقاضے پیدا کرنے پر فطرۃً مجبور ہوتا ہے۔ روح کا اوّلیں مولد و مسکن اپنے ربِ یگانہ و بے مثال اور اپنے معروضِ حسن و عشق (= اِلٰہ) کا عالمِ حسن و صفر تھا، اور وہاں سے ہجرت کے بعد اس کا حسنُ المآب ملاءِ اعلیٰ کا وہ جہانِ حسن و صفر نما تھا، جسے عالمِ ارواح کہتے ہیں، اس لیے اس میں آرزوے حسن بدرجۂ اَتم پائی جاتی ہے، جس میں بیک وقت تین تمنائیں مضمر ہوتی ہیں: ایک الحسن کی طلب و جستجو، دوسرے اپنے اہلِ حسن و سرور رفقائے دیرینہ کی دید و لقا کی تمنا، اور تیسرے، الحیوان کے حسن جہان (= جنت) کی آرزو، جو اس کا حسن المآب ہے۔ روح سے اتصالِ مدام کے باعث نفسِ روحی میں بھی آرزوئے حسن پائی جاتی ہے جو انسان کے جمالیاتی ارتقاء کی حقیقی محرّک ہے۔ جمالیاتی ارتقاء سے مراد انسان کے حسنِ ذات کے نور کا اِرتقاء ہے۔ اس نورِ حسن ذات کے تمام و کمال پر جو ارتقاء کا نتیجہ ہوتا ہے، جمالیاتی، روحانی مشاہدات و مکاشفات اور واردات و تجربات منحصر ہوتے ہیں۔

۸- دین موضوعی معروضی ہے:

کیا تمہیں دین کے اصل الاصول سے آگاہ نہ کروں؟ دین حق ہے اور حقیقت کی طرح موضوعی، معروضی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دین کی تکمیل اس کے موضوعی اور

معروضی دونوں پہلوؤں سے ہوتی ہے اور یہ دونوں پہلو لازم وملزوم ہیں اور مل کر دین کی تکمیل کرتے ہیں؛ لہٰذا دین محض انفرادی ہے نہ اجتماعی، بلکہ انفرادی۔اجتماعی ہے۔ دین اس اعتبار سے موضوعی یا انفرادی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر فرد کا ربّ والٰہ ہے؛ یعنی اس کا خالق و رازق، نشوونما دینے والا، حافظ وناصر، مولیٰ ووکیل، شافی ومشکل کشا، رفیق وکارساز، آقا ومالک اور سمیع ومجیب الدعوات ہے؛ نیز وہ اس کا معبود ومحبوب اور مطلوب ومقصود ہے؛ لہٰذا فرد اور اللہ تعالیٰ کے درمیان مربوبیّت وربوبیت اور عبودیّت ومعبودیت کا رشتہ ہے۔عبودیت عبارت ہے پرستش واطاعت اور محبّت سے، اور یہ موضوعی ہوتی ہے۔ محبّت عاشق ومحبوب کے درمیان بلاواسطہ اور بلا شرکتِ غیرے ہوتی ہے۔محبّت کیا ہے؟ آرزوئے "دوست" ہی تو ہے اور اس میں روح روزِ "شہود والست" سے مبتلا ہے۔چنانچہ روح امرِ ربّی سے پیکرِ خاکی میں جلوہ پیدا کرتی ہے تو اس میں حسّی۔قلبی۔نفسی نظام معرضِ وجود میں آجاتا ہے اور وہ خود اس میں عنکبوت کی طرح اسیر ہو جاتی ہے؛ لیکن اُسے آرزوئے الحسن بے قرار رکھتی ہے۔چنانچہ وہ دیدووصالِ "دوست" کی طلب وجستجو میں زندانِ مکان وزمان سے آزاد ہو کر ماورائی عوالم کی سیر کرنا چاہتی ہے۔ یہ ہے روحانی یا ماورائی مشاہدات و تجربات اور کشف و واردات کی علّتِ غائی۔یاد رکھو! آرزوئے حسن ہی اصلِ دین وایمان اور روحِ عبادت ہے اور اسی میں مناسکِ عبادت اور ہنگامہ ہائے زندگی کا راز مضمر ہے؛ نیز یہی طریقت یا تصوّف کا اصل الاصول ہے۔

یہ تھا دین کا موضوعی یا انفرادی پہلو؛ لیکن اس کا دوسرا پہلو بھی ہے، جسے معروضی یا اجتماعی کہتے ہیں۔یہ عبارت ہے اجتماعی عبادت اور حقوق العباد سے۔اگرچہ معروضی پہلو نسبتاً زیادہ اہم ہے، لیکن فرد حقوق العبادات ادا کرنے میں کامیاب اسی صورت میں ہو سکتا ہے اگر اس میں آرزوئے الحسن ہو، جو محبّتِ الٰہی سے عبارت ہے۔فرد اپنے اِلٰہ وربّ کی محبّت کے حوالے ہی سے اس کے بندوں اور دیگر مخلوقات سے محبّت کر سکتا، ان

کے حقوق ادا کر سکتا اور ان کے لیے رحمت بن سکتا ہے۔ یہ ہے رحمۃ للعالمینی کا سرّالاسرار اور رحمۃ للعالمینی اسوۂ حسنہ ہے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا، جنہیں خود ربِ ذوالجلال والاکرام نے رحمۃ للعالمین اور صاحبِ خُلقِ عظیم فرمایا ہے۔ یہ نکتہ ہمیشہ ذہن نشین رکھنا کہ اپنے اندر اپنے معروضِ حسن وعشق کی آرزو زندہ و حرکی کرو گے تو تمہارے دل میں اس کی شمعِ عشق فروزاں ہوگی اور اس کی تب و تاب کی بدولت تم اس کی مخلوقات سے محبت کر سکو اور ان کے لیے رحمت بن سکو گے؛ نیز ان کے حقوق باحسن وجوہ ادا کر سکو گے۔ یاد رکھو! عدل و احسان اور ایثار و قربانی کا محرکِ حقیقی آرزوئے حسن ہے۔ حاصلِ کلام یہ کہ اگر دین اسلام ہے اور یقیناً ہے تو پھر اسلام آرزوئے حسن ہے اور یقیناً ہے؛ نیز دین موضوعی۔ معروضی یا انفرادی۔ اجتماعی ہے اور حقوق اللہ کی ادائیگی حقوق العباد ادا کرنے کی پیش شرط ہے۔

روحانی مشاہدات وتجربات سے انکار عموماً وہ لوگ کرتے ہیں جو حسنِ قلب ونظر سے محروم اور محبتِ الٰہی کے سوز و سرور کی لذّت سے نا آشنا ہوتے ہیں؛ نیز وہ اس حقیقت کے بھی منکر ہوتے ہیں کہ حیاتِ انسانی کی غایت الغایات احسان و رضوان کے حسن المقام پر متمکن ہونا ہے۔ علاوہ بریں، وہ اس تجربے سے بھی نہیں گزرے ہوتے یا انہیں اس کا احساس نہیں ہوتا کہ یادِ "دوست" ہی سے طمانیتِ قلب ملتی ہے، اور نفسِ مطمئنہ ہی اپنے اِلٰہ و ربّ کا سچا بندہ اور اس کی جنّت کا وارث ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حیاتِ انسانی میں روحانی مشاہدات وتجربات از بس اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ آدمی میں عین الیقین بلکہ حق الیقین بھی پیدا کرتے، اس پر اسرارِ حسن اور حقائقِ زمان و مکان آشکارا کرتے اور اُسے صہبائے عشق کے نشے سے سرشار اور جمالیاتی ثروت عطا کرتے ہیں؛ نیز اسے شرک و بُت پرستی اور تشکیک والحاد سے بچانے میں غیر معمولی کردار ادا کرتے ہیں۔ علاوہ بریں، یہ انسان کو صرف اپنے اِلٰہ و ربّ کا بندہ اور اس کے بندوں کا دوست و محسن بناتے اور اس میں حقوق اللہ و حقوق العباد ادا کرنے کا ذوق و شوق پیدا کرتے ہیں۔ یہ آرزوئے حسن میں شدت پیدا کرتے

ہیں، جو ان کی محرک ہے۔ ان کا ایک غیر معمولی نوعیت کا فائدہ یہ بھی ہے کہ ان کی بدولت قلب کا نورِ حسن اپنی تکمیل کے مراحل تیزی سے طے کرنے لگتا ہے۔ اس کے نتیجے میں قلب میں مضمر وہ ملکہ بھی قوت سے فعل میں آجاتا ہے جسے قرآنِ حکیم نے "فرقان" سے تعبیر کیا ہے۔ فرقان وہبی۔ اکتسابی ملکہ ہے، جو حق و باطل، حسنہ و سیئہ، معروف و منکر، عدل و ظلم، ہدایت و ضلالت اور خوب و ناخوب میں تمیز کرتا اور موضوعی معروضی شیطان کی جمالیاتی فریب کاریوں کو جانتا اور پہچانتا ہے اور جس سے ہم کلام کر چکے ہیں۔

۹۔ احساسِ تنہائی :

میں جانتا ہوں کہ جب تم عصرِ حاضر کی ثقافتی بیماری "احساسِ تنہائی" میں مبتلا ہو جاتے ہو تو کیا سوچنے لگتے ہو؟ تم اس بھری دنیا میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتے ہو اور تمہارا دل گوناگوں اندیشوں کی جولانگاہ بن جاتا ہے۔ شیطان کو وسوسہ اندازی و جمالیاتی فریب کاری کا موقع مل جاتا ہے۔ اس عالم میں تم کو یہ سوال اکثر بے قرار کر دیتا ہے کہ انسان تنہا کیوں ہے؟ کیا وہ واقعی تنہا ہے یا یہ اس کا احساسِ باطل یا واہمہ ہے؟ سنو! میں تمہیں بتاتا ہوں کہ ایسا کیوں ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے؟

یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ بطنِ مادر میں تم اکیلے تھے، اور وہ دنیا تمہارے لیے روشن و کشادہ تھی، حالانکہ باہر کی دنیا والوں کے لیے بے حد تنگ و تاریک تھی۔ جانتے ہو کیوں؟ وہ دنیا تمہارے لیے روشن تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اس میں الحُسن کا نور تھا اور وہ تمہارے پاس تھا۔ تم تنہا ہونے کے باوجود تنہا نہ تھے۔ تم اپنے "دوست" کے ساتھ تھے، جو تمہارا ہم سفر ہے۔ وہ "الباطن" جو ہوا۔ وہ دنیا تمہارے لیے بے حد وسیع و کشادہ تھی۔ اس کا راز یہ ہے کہ جب تم صُلبِ پدر سے رحمِ مادر میں آئے تو تم اس قدر لطیف و باریک جرثومۂ حیات تھے کہ باصرہ پر نامشہود تھے، اگرچہ خوردبین میں تم اپنی نمودِ ہستی رکھتے تھے۔ اس نئی دنیا میں تم ہجرت

کر کے آئے تو اکیلے نہ تھے تمہارے ساتھ کروڑوں جراثیمِ حیات تمہارے ہمسفر تھے اور سب تمہارے رقیب تھے۔ سب کو تمہاری طرح حسن و زندگی کی آرزو و جستجو تھی، اگرچہ اس کے لیے تم سب کو پہلے اپنی ہستی کی تکمیل و تحسین کرنا تھی اور اس مقصد کی خاطر تمہیں شریکِ حیات یا زوج کی حاجت تھی۔ ربّ ذوالجلال والاکرام نے تمہیں وجدانی طور سے بتا دیا تھا کہ تمہارا زوج کہاں ہے اور اس کی خاطر تمہیں صحرائے اعظم و بحرالکاہل ایسی طویل و دشوار گزار مسافت طے کرنا اور کوہِ ہمالہ ایسی بلند چوٹی کو سر کرنا ہوگا۔ تم سب نے بلاتوقف اس دنیا میں انتہائی تیز رفتار سے سفر شروع کیا جو کم ہمت اور کم حوصلہ تھے اور صابر و متوکّل نہ تھے، ہمت ہار بیٹھے، جو آرام طلب تھے۔ ذرا دیر کے لیے سستانے لگے، ان کے لیے ایک لحظہ کا تغافل صدیوں کی پس ماندگی کا سبب بن گیا۔ تم میں سے جو بلند ہمت اور صاحبِ صبر و عزیمت تھے، اپنے زوج کے وصال کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی خاطر پورے زور سے دوڑتے گئے۔ تم نے سب سے زیادہ صبر و ہمت سے کام لیا تو نصرتِ الٰہی نے تمہارا ساتھ دیا اور تم سب سے پہلے اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ گئے اور اپنے زوج کو پالیا اور ادھر تم نے اُسے اپنے اندر جذب کر لیا، اُدھر قدرت نے تمہارے حجلۂ وصال کا دروازہ بند کر دیا۔ تمہارے ہمسفر جو فوج در فوج تھے اس ناکامی کی تاب نہ لاکر مر گئے۔

اپنی اس حکایتِ سفر و مسابقت پر غور کرو تو اس میں علم و حکمت کے بہت سے نکات و رموز پاؤ گے۔ افسوس تو یہ ہے کہ تم ان باتوں پر غور ہی نہیں کرتے۔ یہ تو تھا جملہ معترضہ۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک سے زائد جراثیمِ حیات بیک وقت اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ جاتے ہیں، جہاں ان کے ازواج ان کے منتظر و چشم و براہ ہوتے ہیں۔ یہاں اس لطیف نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ ان کامیاب و بامراد تیز رووں میں جسے صنفِ جلال یا مرد بننے کی آرزو ہوتی ہے وہ اپنے زوج کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے؛ برخلاف اس کے، جسے صنفِ جمال یا عورت بننے کی آرزو ہوتی ہے وہ اپنے زوج میں جذب ہو جاتا

ہے۔ اسے قدرت کے قانونِ ترویجِ جنسی سے تعبیر کر سکتے ہو جو انسان کی آزادیِ انتخاب پر دلالت کرتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ قدرت کو انسان کی آزادیِ ارادہ و اختیار کا بے حد پاس و احترام ہے۔ بہر کیف اس دُنیا میں تمہاری زندگی کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ رحمِ مادر کی یہ دُنیا تمہارے لیے انتہائی مصئون و محفوظ جنّت ہوتی ہے، لیکن اس جنّت میں تمہیں اپنے وجود اور اپنے حسّی، قلبی، نفسی نظام کی تشکیل و تعمیر اور تحسین و تکمیل کے لیے مقدور بھر محنت کرنا پڑتی ہے۔[۱۴] اس کا مطلب یہ ہوا کہ تخلیق و حُسن کاری جس کے لیے ہم نے جمالیاتی تخلیقی فعلیّت کی تعبیر اختیار کی ہے، تمہاری طبیعت کا خاصّہ بھی ہے اور مُقدّر بھی۔[۱۵]

یاد رکھو! ایک تو تمہیں محنت و مشقّت سے مفر نہیں اور دوسرے تم اپنی محنت و مشقّت یا سعی و جہد کے مرہون و منّت ہو، جیسا کہ قرآنِ حکیم سے ثابت ہے: كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ ٥ (الطور ۵۲: ۲۱)؛ ہر شخص اپنے اکتساب کے عوض رہن ہے۔ سورۂ مدثّر میں ارشاد ہوتا ہے: كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ٥ (۷۴: ۳۸)؛ ہر نفس اس امر کا مرہون ہے جو اس نے اِکتساب کیا یا کمایا ہے۔

ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ قدرت کے قانونِ عدل یا قانونِ مکافات کے مطابق ہر شخص کو ویسا ہی اجر ملے گا جیسی اس نے محنت و مشقّت اور سعی و جہد کی ہو گی۔ اس سے معاشیات کے اس اصل الاصول کا سُراغ ملتا ہے کہ ہر انسان اپنی محنت کی کمیت و کیفیت اور اس کے حاصل کے مطابق محنتانے (معاوضے یا اُجرت) کا حقدار ہے۔ اس سے یہ ضمنی اصول مستنبط ہوا کہ محنت کیے بغیر جو شخص سود کاری، سرمایہ کاری اور احتکار وغیرہ سے جو کچھ حاصل کرے وہ ظلم و استحصال اور کسب و رزقِ حرام ہے۔ یہ ظُلم و جہل ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس سے دلوں میں عدل و احسان، محبّت و رحمت اور محنت کشی کے جذبات و داعیات اور آرزوئے حُسن و حیات کے سوتے آہستہ آہستہ خشک ہو جاتے ہیں۔ یہ سوتے خشک ہوتے ہیں تو دلوں میں احساسِ تنہائی پیدا ہوتا ہے۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ تم اپنی دُنیا میں بظاہر اکیلے اپنے وجود و باطنی نظام کی تشکیل و تعمیر اور تحسین و تکمیل کے کام میں مصروف تھے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ لاکھوں، کروڑوں کی تعداد میں تمہارے "ہم نفس" اس جمالیاتی تخلیقی فعلیت میں تمہارے ممد و معاون تھے۔ وہ تمہاری طرح شب و روز جمالیاتی تخلیقی فعلیت میں مصروف رہے، حتّٰی کہ تم نے ان کے تعاون اور اپنے خالق و رب کی ہدایت و نصرت سے مقررہ مدّت میں اپنی تکمیل کر لی۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے ربِ حکیم و رحیم کی ہدایت کے مطابق کام کرتے ہیں، وہ یقیناً اپنے مشن میں کامیاب ہوتے ہیں۔

تم نہیں جانتے کہ جب "تم شکمِ مادر" میں اپنے وجود کی تعمیر و تکمیل کر رہے تھے تو تمہارے رفقائے کار کون تھے؟ اصل حقیقت تو فقط ربِ علیم و حکیم ہی جانتا ہے، لیکن میں فی الحال تمہیں اتنا ہی بتا سکتا ہوں کہ وہ رفقائے کار تمہارے نفس ہی کے اجزاء تھے، جن کے لیے ہم نے [۱۶] "ہم نفس" کی تعبیر اختیار کی ہے۔ یہ راز اب راز نہیں رہا کہ ہر آن لاکھوں، کروڑوں خلیے جو تمہارے اجزائے وجود و ہم نفس ہیں، ہر آن مرتے رہتے ہیں اور ان کی جگہ دوسرے خلیے پیدا ہوتے، کام کرتے اور مرتے رہتے ہیں۔ خلیوں کے مرنے اور جینے کا یہ سلسلہ تمہاری تخلیق کی ابتداء سے تمہارے نفس کی موت تک جاری و ساری رہتا ہے۔ اس جگہ ضمناً اس نکتے کی طرف اشارہ کر دینا چاہتا ہوں کہ جو خلیے اپنے طبیعی یا فطری وظائف سر انجام دینے سے انکار کر دیتے اور سرکش و باغی ہو جاتے ہیں، وہ اپنے ہم نفس زندہ و فعّال اور محنت کش خلیوں کو اپنی غذا بنانا شروع کر دیتے ہیں۔ اس طرح ایک طرف ان کی افزائش و وسعت پذیری کا سلسلہ دراز ہوتا جاتا ہے اور زندہ خلیوں کی موت میں افزونی اور تعداد میں کمی ہوتی جاتی ہے اور یہ صورتِ حال وجود کی حیات و بقا کے لیے از حد خطرناک و مہلک ہوتی ہے، اور اس کا نتیجہ نظامِ وجود میں فنا کی صورت میں نکلتا ہے۔ ان سرکش و باغی اور ہم نفس کش خلیوں کو سرطان یا کینسر کہتے ہیں۔ یہ اپنے ہی وجود و نفس کے دشمن ہوتے ہیں اور انہیں ہلاک کر کے خود بھی ہلاک و برباد ہو جاتے

ہیں۔ معاشرۂ انسانی صالح نہ رہے تو اس میں بھی "جار سرطان" پیدا ہو جاتے ہیں، جن کے لیے قرآنِ مجید نے فرعون و ہامان اور آرزو قارون کی تلمیحی تعبیرات اختیار کی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ جس معاشرے میں قدرت کے قانونِ عدل و احسان پر پوری طرح عمل درآمد نہیں ہوتا، اس میں "جار سرطان" پیدا ہو جاتے ہیں اور یہ صورتِ حال اس معاشرے کے لیے خطرناک ہوتی ہے، اور سرطانی معاشرے ہی میں "احساسِ تنہائی" کا مرض پیدا ہوتا ہے۔

یہ بات بیشک تمہارے لیے نئی ہے، لیکن ہے حقیقت کہ تم الحسن والحق کے عالمِ ہر میں تھے یا عالمِ ارواح میں؛ ہیکلِ آدم میں تھے یا صُلبِ پدر میں، رحمِ مادر میں تھے یا اس عالمِ آب و گِل میں، تم اپنے ہمسفر رفقاء کے ساتھ بھی تھے اور سب سے الگ بھی؛ البتہ تم اپنے اِلٰہ و ربّ کے ساتھ تھے، اس لیے تمہیں کبھی احساسِ تنہائی نہ ہوا اور تم خوش رہے۔ "وہ" تم سے خوش رہا اور تم "اُس" سے خوش رہے؛ اور تم ایک عالمِ کیف و سُرور میں اس کے ساتھ ان گنت جہانوں میں رہے اور ہجرت کرتے کرتے اس کرۂ ارضی میں پہنچے ہو۔ یہ دُنیا بھی تمہارا عارضی مستقر ہے، دارالامتحان ہے؛ یہاں سے امتحان دینے کے بعد تم پھر ہجرت کر جاؤ گے اور موت کے رہوارِ برق پہ سوار ہو کر عالمِ برزخ میں پہنچ جاؤ گے۔ موت خود برقِ فنا بن کر اپنے آپ کو حرفِ غلط کی طرح مٹا ڈالے گی۔ موت بلاشبہ تمہارے ربِّ جلیل کی حسین تخلیق ہے، ان کے لیے جو اہلِ حُسن و سُرور ہیں اور وہی اپنے معروضِ حُسن و عشق کے حضور نذرانۂ حیات و ممات پیش کرتے ہیں اور وہی یہ نذرانہ پیش کرنے کے سزاوار بھی ہیں اور انہیں ہی "دوست" یہ نذرانہ پیش کرنے کی فرمائش بھی کرتا ہے:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ٥ (الانعام ۶: ۱۶۲) کہو! بیشک میری نماز اور میری عبادتیں، میری زندگانی اور میری موت اللہ کے لیے ہے جو کُل عالموں کا خالق و پروردگار اور آقا و مالک ہے۔

یہ حکمت کی بات یاد رکھو: جو اس دُنیا میں لذّتِ زندگی سے آشنا ہوں گے وہ الحیوان

میں بھی لذّتِ زندگی سے آشنا رہیں گے۔ بخلاف اس کے جو یہاں لذّتِ زندگی سے ناآشنا ہوں گے، وہ وہاں لذّتِ زندگی و موت سے ناآشنا رہیں گے۔ اہلِ نار کو دُنیا میں موت بھیانک دکھائی دیتی ہے اور ان سے خوف کھاتے ہیں، لیکن دوزخ میں ان پر موت و حیات کی حقیقت کھلے گی، تو انہیں ان کی جالیاتی قدروں کا حق الیقین ہوگا۔ وہ موت اور زندگی کو ترسیں گے، لیکن دونوں سے محروم رہیں گے۔

اس دنیا سے ہجرت کر کے تمہیں پہلے عالمِ برزخ میں جانا ہے، جہاں تم قیامت تک رویائے صادقہ کے عالم میں رہو گے۔ یہاں سے پھر تمہیں قیامت کے دن محشر میں اپنے ربِ جلیل کے حضور کُل افرادِ نسلِ انسانی کے ساتھ حساب دینا ہوگا۔ یوم الدّین یا روزِ جزا قیامت کا دن ہوگا۔ وہاں سے ہجرت کر کے تمہیں اپنی دُنیا میں جانا ہوگا؛ جنّت میں یا جہنم میں۔ یاد رکھو احسنِ ایمان و عمل سے جنّت بنتی ہے۔ بخلاف اس کے کفر و شرک اور اعمالِ سیّئہ سے دوزخ بنتا ہے۔ تمہیں اہلِ جنّت اور اہلِ دوزخ کی ایک پہچان بتاتا ہوں۔ اپنے نفس کو دیکھو اگر وہ مطمئن ہے تو تم اہلِ جنّت ہو یا برخلاف اس کے اگر تمہارا نفس مضطرب و بیقرار رہتا اور اُسے خوف و حزن کی آگ لگی رہتی ہے تو تم اہلِ نار یا جہنمی ہو۔ اس معیار پر ہر شخص اپنے نفس کو جانچ کر معلوم کر سکتا ہے کہ وہ کون ہے؟ بہر حال، اگر تم مجرم و گنا ہگار، ظالم و جاہل یا مشرک و کافر ہو گے تو الحیوان میں تمہارا گھر شرالمآب ہوگا۔ اس دُنیا میں فی الواقعہ تم پہلی مرتبہ تنہا ہو گے۔ حالانکہ وہاں اہلِ نار کثرت سے ہوں گے۔ تمہارا احساسِ تنہائی اس وجہ سے انتہائی شدید و کرب انگیز ہوگا کہ وہاں تمہارا کوئی دوست و رفیق، کوئی غوث و دستگیر، کوئی مولیٰ و مشکل کشا اور کوئی ہمدم و غم خوار نہ ہوگا۔ تمہاری طرح ہر اہلِ نار عالمِ سکرات میں ہوگا؛ موت و حیات دونوں سے مایوس ہوگا اور کوئی کسی کا پُرسانِ حال نہ ہوگا! اس نفسا نفسی کے عالم میں تمہاری سب سے بڑی محرومی اور احساسِ تنہائی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوگی کہ وہ وہاں تمہارا قدیم کا حقیقی رفیق و ہم سفر، مولیٰ و کارساز، حافظ و ناصر اور ہمدرد و غمگسار نہ ہوگا۔ جانتے ہو

وہ کون ہے؟ وہ تمہارا الٰہ و ربّ ہے، رحمان و رحیم؛ جمیل و جلیل، مولیٰ و نصیر، محسن و منعم غفور و کریم، وہّاب و معطی اور عزیز و قدیر۔

اصل یہ ہے کہ "دوست" کے بغیر تم پہلی مرتبہ دوزخ میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرو گے اور یہ احساسِ تنہائی جتنا سچا ہوگا اتنا روح فرسا و شکیب رُبا بھی ہوگا۔ اس وقت تم پر تنہائی اور احساسِ تنہائی کی حقیقت کھلے گی اور تم پر یہ رازِ حقیقت بھی آشکارا ہوگا کہ آج سے پہلے تم کبھی "تنہا" نہ تھے؛ کسی عالم میں بھی تم تنہا نہ تھے؛ کیونکہ ہر عالم میں تمہارا الٰہ و ربّ تمہارا ہمجلیس و ہم سفر، رفیق و نگہبان اور ہادی و دلیلِ راہ ہوتا تھا۔ افسوس ہے ان ظالم و جاہل انسانوں پر جو اپنے "سچے دوست" کی قدر نہیں کرتے؛ انہیں اپنا رفیق و ہمسفر بناتے ہیں نہ مرشد و رہنما۔ افسوس کہ تم نے "اُسے" اپنا الٰہ بنایا نہ ربّ! تم نے اس کی دوستی و محبّت اور احساس و رحمت کی پروا نہ کی؛ تمہارا دل "اُس" کی یاد و آرزو سے خالی رہا اور اُس کے حسن و نور کے نہ ہونے سے تیرہ و تاریک اور شیطان کا شرّ المآب رہا۔ لذّتِ موت سے آشنا ہونے کے وقت تم پر یہ راز کھلے گا کہ تم کس قدر ظالم و جاہل تھے، اس لیے کہ تم نے اپنے سچے الٰہ اور ربّ ذوالجلال والاکرام کو چھوڑ کر اپنے کھلے دشمن شیطان کو اپنا دوست و مرشد بنایا اور اس کے مطیع و منقاد بندے بن گئے۔ تم نے شیطان کی صحبت و رفاقت میں اپنے الٰہ و ربّ کو بھلا دیا؛ لیکن اس کے باوجود وہ اتنا رحمان و رحیم ہے کہ تمہارے ساتھ رہا؛ تمہاری توبہ و انابت کا منتظر رہا اور تمہاری دعائیں قبول، تمہاری آرزوئیں پوری اور تمہاری ربوبیّت کرتا رہا، لیکن اُس نے اپنے وعدے کے مطابق روزِ حساب کے بعد اپنے قانونِ مکافات کی رُو سے تمہیں بھلا دیا، اندھا کر دیا، تم سے صرفِ نظر کر لیا اور تمہیں چھوڑ دیا تاکہ تم شرّ المآب میں اکیلے رہو۔ تمہارا کوئی پُرسانِ حال نہ ہو، غمخوار و ہمدرد نہ ہو اور تم موت و حیات کی لذّت سے محروم عذاب النّار میں اکیلے رہو۔ یاد رکھو! وہاں احساسِ تنہائی کا ہر لمحہ تمہارے لیے عذاب کی صدیوں ایسا طولانی ہوگا۔ پھر تمہیں معلوم ہوگا کہ تنہائی کسے کہتے ہیں اور اس کا عذاب النّار کیا ہوتا ہے؟

سنو! میں تمہیں ایک پتے کی بات بتاتا ہوں۔ زندگی کی لذّت سے آشنا ہونا اور حسن سے جمالیاتی سرور و سوز حاصل کرنا چاہتے ہو تو اپنے کو حسین بناؤ اور اپنے معروضِ حسن و عشق کے لیے اسے حسن المآب بناؤ اور اس کے ساتھ زندگی بسر کرو۔ تم جانتے ہو کہ وہ تمہارا خالق و پروردگار بھی ہے اور معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود بھی۔ پھر تم اس کا کہا کیوں نہیں مانتے؟ اس کی عبادت کیوں نہیں کرتے؟ اس کی یاد کو حرزِ جاں کیوں نہیں بنالیتے؟ اس سے محبت کیوں نہیں کرتے؟ اس کے بجائے دوسروں سے مدد کیوں مانگتے ہو؟ ان کو اپنا کارساز و حاجت روا، غوث و دستگیر، حافظ و مشکل کُشا اور رازق و مجیب الدعوات کیوں سمجھتے ہو؟ تُم اسے چھوڑ کر دوسروں کو اپنا اِلٰہ و ربّ بنالیتے ہو اور اس طرح تم اِدھر کے رہتے ہو نہ اُدھر کے، نتیجۃً تم دنیا میں واقعی اکیلے رہ جاتے ہو۔ اصل یہ ہے کہ اپنے اِلٰہ و ربّ کے بغیر انسان واقعی تنہا رہ جاتا ہے۔ سمجھو تو ہماری دُنیا کی رونق ہی وہ ہے اور وہی آرزوئے حیات و ناظورۂ زندگی ہے۔ وہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ وہ زندگی کا معنیٰ ہے۔ اس کے بغیر زندگی میں باقی کیا رہ جاتا ہے؟ نہ حُسن نہ سوز و سُرور اور نہ جمالیاتی لذت نہ طمانیت و سکینت۔ پھر آدمی اپنے آپ کو تنہا محسوس نہ کرے تو کیا کرے؟

دیکھو! "دوست" سے والہانہ محبت کرو اور اس کے ساتھ اس کے حسین حیاتیاتی شہکار انسان اور اس کی دیگر جمیل و جلیل مخلوقات سے بھی محبّت کرو۔ اس کی نعمتوں کی قدر کرو۔ ان سے خود بھی تمتّع و استفادہ کرو اور دوسروں کو ایسا کرنے کا موقع دو۔ "دوست" کی نعمتوں سے اس کے بندوں کو محروم رکھنا گناہِ کبیرہ ہے جو قاطعِ محبّت اور وجہِ دوری و مہجوریِ "دوست" ہے۔ اس جُرم کی سزا ہے کہ وہ احساسِ تنہائی کے عذاب میں مبتلا ہے اور بہت کم اس کا شعور رکھتے ہیں۔

تمہاری بیماریِ احساسِ تنہائی کا سبب اگر "دوست" سے دُوری و مہجوری ہے تو اس کا علاج اس سے دوستی و محبّت ہے۔ تم اس سے باتیں کرو اور اس کی باتیں سنو۔ وہ سمیع و بصیر

اور مجیب و مستجیب الدعوات ہے۔ اس سے راز و نیاز کی باتیں کرو۔ اس کے حضور گریہ و زاری اور آہ و فغاں کرو، ناصیہ فرسائی کرو اور خوب کرو۔ اس کے قرب و حضوری اور دید و رضوان کا یہ بہترین ذریعہ ہے۔ اس سے مانگو، پورے وثوق سے مانگو اور دل کھول کر مانگو۔ وہ ارض و سموٰت کا مالک و شہنشاہ ہے؛ وہّاب و مُعطی، جوّاد و کریم ہے اور رحمٰن و رحیم ہے۔ اس کی شان کے مطابق مانگو، "وہ" دے گا، ضرور دے گا! اپنے دل کا دروازہ کھول دو۔ اسے کُھلا اور روشن رکھو! "وہ" آئے گا اور ضرور آئے گا۔ "وہ" تمہارا مہمان بنے گا تو تمہاری دُنیا ملائکہ سے معمور و منوّر بن جائے گی اور اس میں یگانگت پیدا ہو جائے گی۔ اس طرح احساسِ تنہائی جاتا رہے گا۔

تمہیں میری باتوں پر تعجب ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ دیکھنا، سُننا اور غور و فکر کرنا تمہاری عادت نہیں۔ سنو! میں تمہیں راز کی بات بتاتا ہوں۔ پہلے یہ بتاؤ کہ کبھی تم نے محسوس یا غور کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جُملہ مخلوقات جنہیں تم بے جان و بے زبان اور ساکت و صامت بھی سمجھتے ہو، وہ اپنی زبان میں باتیں کرتی ہیں۔ وہ تمہاری باتیں سنتی، سمجھتی اور ان کا جواب بھی دیتی ہیں۔ وہ تم سے اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کرتی اور تم سے باتیں بھی کرتی ہیں؛ جو بڑے کام اور پتے کی ہوتی ہیں۔ لیکن تم ہی ظالم و جاہل ہو کہ نہ تو ان کی باتیں سنتے ہو، نہ اُن کی طرف دیکھتے ہی ہو۔ تم اس حقیقت کا شعور ہی نہیں رکھتے۔

اچھا یہ بتاؤ کہ جوہری پتھروں، دھاتوں اور موتیوں کی زبانیں سمجھتا ہے یا نہیں؟ وہ ان کی زبان سمجھتا ہے تو ان کی قدر و قیمت پہچانتا ہے۔ ہر چیز اپنی قدر و قیمت بتاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے ارضیات زمین کی باتیں سمجھتے اور اس کے خزینوں کے بھید جانتے ہیں۔ ابھی تو ہمکلامی کی شروعات ہے۔ جوں جوں انسان زمین کی زبان کے معانی و مفاہیم سمجھتا اور اس کے اشارات و کنایات سے آشنا ہوتا جائے گا۔ سنو! اسی میں رحمۃ للعالمینی کا مفہوم مضمر ہے۔ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّتِ حسنہ پر پوری طرح عمل کرنا چاہتے ہو تو کُل عوالم

(جماداتی، نباتاتی، حیواناتی، انسانی) کی زبانیں سیکھو جو تم طبعاً جانتے ہو۔ دلیل یہ ہے کہ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ کُلَّهَا (البقرہ ۲: ۳۱)، علمائے نباتات، عالمِ نباتات کی اور علمائے حیاتیات عالمِ حیاتیات کی زبانیں جانتے ہیں، اور ان عوالم کی مخلوقات سے جو انسان کے لیے بالخصوص نعمتیں ہیں، بے شمار فوائد حاصل کر رہے ہیں اور نئی سے نئی نعمتیں دریافت کرتے اور نئے سے نئے فائدے اٹھاتے رہیں گے۔ سائنس دانوں نے ذرّہ و آب کی زبانیں سیکھیں تو ان کے اندر نور و توانائی کے خزینوں کا سراغ لگا لیا۔

کیا یہ سامنے کی بات نہیں کہ تم جانوروں سے اور جانور تم سے باتیں کرتے ہیں۔ تم ان کو اپنی زبان سکھانے اور ان کی زبان سیکھنے کے لیے سدھاتے ہو اور تم دونوں ایک دوسرے کی زبانیں سیکھ لیتے ہو۔ اس کا مظاہرہ تم دن رات ٹیلی ویژن اور سرکسوں میں دیکھتے رہتے ہو۔ گھروں میں بھی تم پالتو جانوروں سے باتیں کرتے اور ایک دوسرے کی باتیں سمجھتے ہو، اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ تمھارے احکام کی تعمیل کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شجر و حجر، ماہ و انجم، گُل و لالہ، طیور و غُنوم، دام و دد، مُرغ و ماہی اور زمان و مکان سب تم سے باتیں کرتے ہیں۔ ربِّ حیّ و قیّوم کی جملہ مخلوقات حسین بھی ہیں اور زندہ بھی اور شعور و زبان بھی رکھتی ہیں۔ یہ راز کسی دن عیاں ہو کر رہے گا۔ اگر یہ سچ ہے اور یقیناً سچ ہے کہ ربِّ ذوالجلال والاکرام کی مخلوقات جنھیں تم بے جان و بے زبان بھی سمجھتے ہو، تم سے باتیں کرتی اور تمھاری باتیں سمجھتی ہیں تو پھر تمھیں اس بات میں شک و شبہ یا بدگمانی کرنے کی کوئی وجہِ جواز نہیں کہ ربّ العالمین، جو علیم و خبیر، سمیع و بصیر اور مجیب و مستجیب الدعوات ہے، تم سے باتیں نہیں کرتا۔ اس کی باتیں سننا اور سمجھنا چاہتے ہو تو قلب و سمع کو حسین و مُنیر بناؤ؛ ذوقِ کلامِ الٰہی پیدا کرو، "دوست" کے اشارات و کنایات کو نورِ قلب کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کرو؛ اس سے محبت کرو، اس کی حمد و ستائش اور پرستش و اطاعت کرو؛ اس کی مخلوقات سے بھی اس کے حوالے سے محبت و احسان کرو اور ان کے لیے رحمت بن جاؤ۔ اس کا

نتیجہ یہ ہوگا کہ ربِّ رحمٰن و رحیم تمہارا بن جائے گا تو اس کی مخلوقات بھی تمہاری بن جائیں گی۔ پھر تم حقیقت میں نہ اکیلے ہوگے اور نہ تمہیں احساسِ تنہائی ہوگا۔ خلوت بھی تمہارے لیے انجمن ہوگی، کیونکہ اس عالمِ تنہائی میں تمہارے پاس تمہارا الٰہ و ربّ ہوگا، جو الحسن اور تمہارا معروضِ حُسن و عشق ہے۔ علاوہ بریں، کائنات کی ہر حسین چیز تمہاری رفیق، وہمدم اور مونس و ہم زبان ہوگی۔ اصل یہ ہے کہ تمہیں خلوت کی آرزو ہوگی تاکہ "دوست" تمہارے پاس ہو اور اس کے قُرب و حضوری سے تم حیاتیاتی ثروت حاصل کرو۔ ایسے میں تم کس پیار سے اپنے ناظورۂ زندگی سے کہو گے:

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا (مؤمن)

۱۰۔ خوف و حزن:

"یہ حقیقت تو تسلیم کہ محنت و مشقت انسان کی تقدیر اور وہ رہینِ سعی و جہد ہے، لیکن ایسا کیوں ہے کہ وہ خوف و حُزن کا شکار ہوجاتا ہے؟" میں اکثر سوچتا رہتا تھا۔ اصل یہ ہے کہ زندگی ہے تو سوچ ہے؟ اور سفرِ زندگی اگر سفرِ مدام ہے تو سوچ کا سفر بھی مسلسل و جاودانی ہے۔ بہر کیف، یہ سوال دل کا تیرِ نیمکش بنا اور خلش پیدا کرتا رہا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ میری زندگی پر اکثر کوئی نہ کوئی صبر آزما امتحان آتا رہا اور مجھے شکیب رُبا تجربوں سے گزرنا پڑا۔ امتدادِ وقت کے ساتھ خلشِ دل بڑھتی رہی۔ آخر میرے رفیقِ اعلیٰ و ہمسفرِ حقیقی کو مجھ پر ترس آ ہی گیا اور اس کے فضل و کرم سے یہ راز مجھ پر منکشف ہو ہی گیا۔ یہ حقیقت بھی ہے اور "اُس" کے لُطف و کرم کی بات بھی کہ عالمِ تنہائی میں آرزوئے حسن و زندگی لیے "اُس" کے حضور سربسجود یا قرآنِ مجید کے دریائے معانی میں مستغرق ہوتا ہوں یا اُس کی یاد لیے قلم بدست ہوتا ہوں تو اسرار کُھلتے، اشارات و کنایات اور مشاہدات

ہوتے ہیں ۔ چنانچہ میں ایسے ہی عالمِ حزن میں "دوست" سے امداد طلب تھا کہ ندا آئی :

"اے سوچنے والے ! اللہ کرے تیری سوچ حسین ومنیر اور راست رو و رسا ہو ۔ سنو! تدبر فی القرآن اور تفکر بالحق کا ہر لمحہ نگاہِ "دوست" میں آن دھر اور قدر وقیمت میں بے بہا ہوتا ہے ۔ بڑے ہی خوش نصیب ہیں وہ اہلِ حسن و فکرِ حسن تفکر اور تدبر بالحق جن کا شعارِ زندگی ہے ۔ اب اپنے سوال کا جواب سنو ! پہلے خوف اور پھر حزن سے کلام ہوگا ۔

۱۔ خوف : غور کرو تو قرآنِ حکیم کا فلسفۂ خوف وحزن اصل میں کتابِ زندگی کا دیباچہ ہے ۔ اسے جامع طور سے سمجھنے کی خاطر تمہیں اپنے الٰہ و ربّ کے ان بصیرت افروز ارشادات کو ہمیشہ کے لیے ذہن نشین کر لینا ہوگا :

۱۔ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ٥ (یونس ۱۰ : ۶۲) : سنو ! بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے دوستوں کو نہ خوف ہوتا ہے اور نہ وہ غم ہی کھاتے ہیں ۔

۲۔ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ٥ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ٥ (الاحقاف ۴۶ : ۱۳، ۱۴) : بیشک جن لوگوں نے کہا : اللہ ہمارا ربّ (رازق و پروردگار اور حاکم و مالک) ہے اور اس (قول وعقیدے) پر قائم رہے تو نہ خوف لگے گا اور نہ وہ غم ہی کھائیں گے ۔ وہی اہلِ جنت ہیں اور اس میں ہمیشہ رہیں گے ۔ یہ جزا اس کی جو وہ کرتے تھے ۔

۳۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ٥ (الرعد ۱۳ : ۲۸) : جو لوگ ایمان لائے تو انہیں کے دل ذکرِ الٰہی سے مطمئن ہوتے ہیں ۔ سُن رکھو ! اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو اطمینان ملتا یا قرار آتا ہے ۔

۴۔ يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ٥ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ٥ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ٥ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ٥ (الفجر ۸۹ : ۲۷ تا ۳۰) : اے مطمئن نفس ! اپنے ربّ کی طرف لوٹ آ ۔ تو اس سے خوش وہ تجھ سے خوش ۔ پس میرے بندوں میں آجا اور میری جنت

میں داخل ہو جا۔

غور کرو تو ان آیات جلیلہ میں فلسفۂ خوف وحزن کے اُن بس فکر انگیز و بصیرت افروز اور انقلاب آفرین حقائق کی نشاندہی کی گئی ہے، مثلاً

ایک یہ کہ اولیاء اللہ یا اللہ تعالٰی کے دوست ہی خوف وحزن سے محفوظ رہتے ہیں۔ اس کی ضد یہ ہوئی کہ جو اللہ تعالٰی کے دوست نہیں، وہ آتشِ خوف وحزن سے محفوظ نہیں، بلکہ انہیں خوف بھی ہوتا ہے اور غم بھی۔

دوسرے، خوف وحزن سے وہ لوگ محفوظ رہتے ہیں جو محض زبان سے اللہ تعالٰی کو اپنا رب یعنی رازق و پروردگار اور آقا و مالک نہیں کہتے، بلکہ اس عقیدے کو اپنی زندگی کا جُزو لاینفک بنا لیتے ہیں اور عمر بھر اس عقیدے پر قائم رہتے اور اس کے مطابق زندگی کرتے ہیں۔

تیسرے، اہلِ ایمان کی پہچان یہ ہے کہ ایمان سے ان کے دلوں کو قرار آ جاتا ہے، خوف وغم دُور ہو جاتے اور وہ مطمئن ہو جاتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ایمان کا خاصہ دل سے شکوک و شبہات کے کانٹے نکال کر اس میں اطمینان و قرار پیدا کرتا ہے۔

چوتھے، ذکرِ الٰہی ہی وجۂ طمانیتِ قلب ہے۔ بالفاظِ دیگر، اطمینانِ قلب و قرارِ جاں کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے، اپنے اِلٰہ یا معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود کا ذکر۔ یادِ الٰہی حرزِ جاں بن جائے تو بات بن جاتی ہے۔

پانچویں، مطمئن نفس ہی جنّت میں جائے گا اور وہاں اپنے معروضِ حُسن و محبت کے دوستوں کی صحبت و رفاقت میں ہمیشہ رہے گا۔ وہاں جنّت حُسن المآب، رفقا و احباب حسین، زندگی حسین اور نعمتیں بھی حسین ہوں گی۔

چھٹے، ربِّ علیم و حکیم نے دوسرے مقام پر اس امر کی صراحت کر دی ہے کہ اس کے انعام یافتہ بندوں کی چار اصناف ہیں: انبیاء کرامؑ، صِدّیقین، شُہداء اور صالحین۔ یہی

مطمئن نفوس ہیں، جن کے لیے ہم نے اہلِ حسن و سرور کی تعبیر اختیار کی۔ وجہ یہ ہے کہ ایک تو ان کی زندگی حسین و منوّر ہوتی ہے اور وہ اہلِ مہر و وفا اور محسن ہوتے ہیں؛ دوسرے، وہ اپنے ربِ ذوالجلال والاکرام کے انعام و اکرام، احسانات اور نعمتوں سے شاداں و فرحاں ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان سے خوش ہوتا ہے۔ یاد رکھو! جنہیں حسنِ زندگی اور رضوانِ "دوست" کی نعمتِ عظمیٰ مل جائے ان سے بڑھ کر کوئی کامران و کامیاب اور خوش نصیب نہیں ہو سکتا۔

ساتویں، ان مباحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ خوف و حزن اہلِ نار کی علامت ہے۔ بالفاظِ دیگر، اہلِ خوف و حزن ہی طمانیتِ دل و قرارِ جان اور حسن و سرور سے محروم ہوتے ہیں اور وہی حقیقت میں ناکام و نامراد اور اہلِ جہنم ہوتے ہیں۔ فلسفۂ زندگی کا خلاصہ یہ نکلا کہ زندگی کا مقصد خوف و حزن سے محفوظ رہنا اور اطمینانِ قلب حاصل کرنا ہے۔

یاد رکھو! خوف کی دو بڑی قسمیں ہیں: خوفِ الٰہی اور خوفِ ذاتی۔ اب سن لو کہ ان میں فرق اور اس کی اہمیت کیا ہے؟

(۱) خوفِ الٰہی:[۱۸]

قرآن مجید نے اس کے لیے خشیّت اور تقویٰ کی تعبیریں بھی اختیار کی ہیں۔ اس سلسلے میں تجھے ایک راز کی بات بتاتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا مطلب اس کے قانونِ عدل و مکافات سے ڈرنا ہے، ورنہ وہ تو ربِ رحمٰن و رحیم، وہاب و کریم اور توّاب و غفور ہے۔ اس نے تو اپنے اوپر رحمت لازم کی ہوئی ہے[۱۹]۔ اس کی ذات تو رحمت و حسنہ، محبت و احسان، مغفرت و شفقت اور حلم و بخشش کا سرچشمہ ہے؛ لہٰذا وہ ہوّا نہیں، خوفناک و دہشت ناک اور غضب ناک و ظالم نہیں، سفّاک و سنگدل نہیں۔ بخلاف اس کے وہ بڑا ہی حسین، پیارا، حلیم و بردبار، شفیق و ودود اور رؤف و کریم ہے۔ اصل یہ ہے کہ وہ حسنِ محض، رحمت و شفقتِ محض، محبت و مغفرتِ محض ہے۔ وہ تو جمیل و قُرّۃُ العین، محبوب و مطلوب اور مقصودِ حیات بلکہ غایت الغایات ہے۔ پھر اس سے ڈر کاہے کا۔ اصل یہ ہے کہ خوفِ خدا کا مطلب

انسان کا قدرت کے قانونِ عدل و مکافات سے اور اپنے ظلم و جہل اور جرم و گناہ کے مآل و سزا یعنی عذاب النّار سے خوف کھاتا ہے۔ ایسا خوف کھانے والا متّقی ہوتا ہے اور متّقی ہی مؤمن و صالح اور ولی اللہ ہوتا ہے۔ تقوٰی بنیاد ہے ایمان و دین کی۔ طلب و جستجوئے حسن و صداقت ہی کا دوسرا نام تقوٰی ہے۔ یہ راز اہلِ مہر و وفا اور رہ نوردانِ شوق جانتے ہیں کہ شدّتِ محبّت سے تقوٰی پیدا ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ اصل میں انسانوں کا معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود یا جمالیات کی زبان میں ان کا معروضِ حسن و عشق ہے، لہٰذا انہیں ڈر اس بات کا ہوتا ہے کہ کہیں وہ اپنے ظلم و عدوان، جُرم و گناہ، تغافل و تجاہل اور خطا و نسیان سے اسے ناراض و خفا نہ کر دیں اور اس کے نتیجے میں اس کی مغفرت و رحمت، انعام و اکرام، احسان و نعم، قرب و حضوری اور محبّت و رضوان سے محروم نہ ہو جائیں۔ اس طرح آتشِ خوف و حزن میں مبتلا ہو کر اہلِ نار نہ بن جائیں اور قیامت کے دن اُس کی ہم نظری و ہمکلامی اور لقاء و رضوان سے محروم نہ ہو جائیں۔ اصل یہ ہے کہ یہ محرومی سب سے بڑی محرومی ہے۔ جن اہلِ ایمان کو یہ ڈر ہو وہی متّقی اور اولیآء اللہ ہوتے ہیں۔

(ب) خوفِ ذاتی:

اسے خوفِ روزگار یا خوفِ ماسوا سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ خوفِ الٰہی اور خوفِ ماسواء میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اوّل الذکر میں تاثیرِ برقِ حسن ہوتی ہے جو خوفِ ماسواء کو بھسم کر کے قلب و جان کو طمانیت و مسرت کی ٹھنڈک سے سرشار کر دیتی ہے۔ بخلاف اس کے خوفِ ماسوآ کی تاثیر صاعقۂ فنا ہے جو قلب و جان کے صبر و قرار کو جلا کر خاکستر بنا دیتی ہے۔ خوفِ ذاتی اصلاً ان نفسیاتی کیفیات پر دلالت کرتا ہے: (۱) جُرم و گناہ، خطا و نسیان یا غفلت و لغزش کے احساس اور ان کے افشائے راز کے اندیشے اور مواخذے پر؛ (۲) اپنی جان و آبرو، مال و دولت اور منصب و روزگار، قوت و سطوت اور شہرت و عزتِ نفس کو خطرہ لاحق ہونے کے اندیشے پر (۳) طمانیتِ نفس و قرارِ جان کے فقدان پر (۴) اللہ تعالیٰ پر توکّل نہ ہونے پر

(۵) افلاس و دست نگری، محرومی و نامرادی اور شکست و ناکامی کے ڈر پہ (۶) احساسِ تنہائی پر اور (۷) یاس و قنوطیت پر۔

اصل یہ ہے کہ خوفِ ذاتی نفس کا ایسا روگ ہے جس سے اس کی آرزوئے حسن و زندگی نحیف و نزار اور مفلوج ہو جاتی ہے اور یہ صورتِ حال، خودکشی کا ایک زبردست محرک ہے۔ نام نہاد علمائے نفسیات ابھی تک اس حقیقت سے کم آشنا ہیں۔ علاوہ بریں۔ یہ صورتِ حال، جہاں آدمی کو بزدل و کم ہمت بنا دیتی ہے، وہاں اس سے تخلیقی صلاحیت کو بھی نقصان پہنچتا ہے، جو اکثر اوقات ناقابلِ تلافی ثابت ہوتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جہاد و قربانی، صبر و استقلال، حوصلہ و مردانگی، شجاعت و جرأتِ اقدام ایسی صفات ہیں جن کی بدولت ہی کوئی قوم زمانے کی حریف قوتوں کے درمیان عزت و آبرو سے زندہ و آزاد رہ سکتی ہے۔ غور سے سنو۔ ان صفاتِ حسنہ کا ضد و دشمن خوفِ ذاتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اللہ کے دوستوں (= اولیآء اللہ) کو جو مجاہد و سرفروش، متوکل و صابر اور شجاع و محسن ہوتے ہیں، خوفِ خدا تو ہوتا ہے، خوفِ ذاتی نہیں ہوتا۔ خوفِ ذاتی سے آدمی ایسا محسوس کرتا ہے جیسے

اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

اور یہ آتشِ قلب و نفس اس حقیقت کی علامت ہوتی ہے کہ وہ شخص حسن و سرورِ زندگی سے محروم اور اہلِ نار ہے۔

(ب) حزن یا غم:

خوف کی طرح غم بھی اصلاً آگ ہے۔ یہ باطنی آگ لگتی ہے تو قلب و جان کو اس طرح محیط ہو جاتی ہے کہ اس سے چھٹکارا پانا محال ہو جاتا ہے۔ خوف کی طرح غم بھی دو قسم کا ہے: ایک غمِ نفسِ وجودی اور دوسرا غمِ نفسِ روحی۔

۱۔ غمِ نفسِ وجودی:

یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دوستوں کو غمِ نفسِ روحی تو ہوتا ہے، جو

ان کے لیے قرّۃ العین اور جمالیاتی ثروت ہے، لیکن غمِ نفس وجودی نہیں ہوتا، جو آتشِ سوزاں ہے اور جمالیاتی ثروت کو جلا کر بھسم کر دیتا ہے۔ علاوہ ازیں، یہ غم انسان کو حسن کے سرور و سوز اور زندگی کے جمالیاتی حظ سے محروم کر دیتا ہے۔ جس طرح طمانیتِ نفس کی ٹھنڈک اہلِ جنت کی علامت ہے اسی طرح آتشِ غم اہلِ نار کی نشانی ہے۔ اسے اگر جنت و جہنم کا معیار کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ جس شخص نے یہ معلوم کرنا ہو کہ وہ اہلِ جنت میں سے ہے یا اہلِ جہنم میں سے؟ اسے اپنے نفس کا جائزہ لینا ہوگا کہ وہ حسین و منوّر اور مطمئن و مسرور ہے یا قبیح و تاریک اور آتشِ خوف و حزن کے سبب مضطرب و بیقرار ہے؟ یہ ہے اصل میں جمالیاتی تحلیلِ نفسی[21]، جس سے علمائے نفسیات ناآشنا ہیں۔

ظُلم کی آتشِ خوف و غم بڑی اذیت ناک ہوتی ہے، اور شرک ظُلمِ عظیم ہے۔ اس کی آگ قلب و جان کو لگتی ہے تو بُجھتی نہیں، بجز اشکِ توبۃ النّصوح کے۔ چونکہ ظالم اس دُنیا میں لذتِ زندگی سُرورِ حسن اور حسنہ سے محروم ہوتا ہے، لہٰذا وہ عالمِ برزخ اور الحیوان دونوں کے آتشکدوں میں لذّتِ حیات و موت سے ناآشنا رہے گا۔ یاد رکھو! یہ بہت بڑا عذاب ہے۔ لیکن انسان کے ظُلم و جہل کا ستیاناس ہو کہ اکثر لوگ اپنے آپ کو مؤمن و موحّد اور عامل و دانشور سمجھنے کے باوجود ظلم و شرک سے باز نہیں آتے۔

یہ حقیقت تمہیں ہمیشہ یاد رکھنی چاہیئے کہ ظُلم و گناہ غم آفرین و حزن افزا ہوتے ہیں۔ آتشِ خوف و حزن کی اذیّت سے محفوظ رہنا چاہتے ہو تو ان سے بچو، خاص کر ظُلم سے، جو ربِ رحمن و رحیم کو جبّار و قہّار اور ذو انتقام بناتا ہے۔ وہ ظالم کو اس طرح پکڑتا ہے کہ اُسے اس کا سان گمان بھی نہیں ہوتا۔ بہت کم یہ حقیقت جانتے ہیں کہ شقی القلب و ظالم اور مجرم و گناہگار اور بخیل و متکبّر اصل میں اپنے نفس کے دشمن ہوتے ہیں۔ وہ دوسروں پر ظُلم کرنے سے پہلے اپنے نفس پر ظُلم کرتے اور اُسے عذاب النّار میں مبتلا کرتے ہیں۔ قرآنِ حکیم نے ایسے شقی القلب انسانوں کی حیثیت و مرتبے اور جرم و گناہ، ظلم و عدوان اور بُخل و تکاثر کے

لحاظ سے اس تلمیحی انداز میں درجہ بندی (Classification) کی ہے: فرعون وہامان اور قارون وآذر۔ یہ چاروں معاشرۂ انسانی کے شیطانی کردار ہیں، جن کے لیے ہم نے "چار سرطان" کی تعبیر اختیار کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ چاروں تاریخی شیطانی کردار افرادِ معاشرہ کے حقوق کا استیصال اور ان کی تمناؤں کا خون کرکے بظاہر شان وشوکت، قوت وصولت اور عیش وعشرت کی زندگی گزارتے ہیں، لیکن حقیقت میں زہرآبِ غم کے نشے میں سرشار ہوتے ہیں، لیکن اس کا شعور نہیں رکھتے۔

غم نفس کو دیمک کی طرح چاٹ جاتا ہے اور اس کی آرزوئے حسن وزندگی کو بتدریج ضعیف وکمزور اور مفلوج ومسلوب کردیتا ہے اور اسے خبر تک نہیں ہوتی، لیکن اس کا نتیجہ عموماً خودکشی ومرگِ مفاجات کی صورت میں نکلتا ہے۔ آرزوئے حسن نہ رہے تو زندگی میں کچھ بھی نہیں رہتا۔ وہ جنسِ کاسد ولاطائل بن جاتی ہے، اس کے نتیجے میں نفس اس سے بیزار ہوکر موت کی آرزو کرنے لگتا ہے اور "جوئندہ یابندہ" کے مصداق اس کی آرزو پوری ہوجاتی ہے۔ شیطان جو حریفِ انسان ہے، اُسے نفسِ وجودی کا غم دینے کے لیے ہر دم گھات میں لگا رہتا ہے۔ وہ اسے کبھی افلاس سے ڈرا کر اور کبھی اس میں تمنائے تکاثر پیدا کرکے اُسے کسبِ حرام وحرام خوری، فحشاء ومنکر، بُخل واکتناز اور اسراف وتبذیر کی ترغیب دیتا رہتا ہے۔ یاد رکھو! شیطنت کی غایت انسان کو طمانیتِ نفس سے محروم کرکے اسے خوف وحزن دینا اور ابلِ نار بنانا ہے۔ اگر یادِ الٰہی سے طمانیت ومسرّت ملتی ہے تو اپنے اِلٰہ ورب کو بھلا دینے سے غم کا عذاب النّار ملتا ہے؛ اور یادِ الٰہی ہی آتشِ غم کو ٹھنڈا کرنے کا احسن وآزمودہ طریقہ ہے۔ جانتے ہو یادِ الٰہی کسے کہتے ہیں؟ سنو میں تمہیں بتاتا ہوں۔ یادِ الٰہی ثمرہ ہے محبتِ الٰہی کا؛ بالفاظِ دیگر، محبت کا خاصا یادِ محبوب ہے، اور یہ دونوں لازم وملزوم ہیں محبتِ الٰہی یکتائی چاہتی ہے، جسے توحید کہتے ہیں اور اسے کسی حال میں دوئی یا شرک منظور نہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ جو ربّ العالمین اور رحمٰن ورحیم ہے، اس کی محبت کا تقاضا ہے کہ عبادت یعنی حمد وثنا اور

پرستش و اطاعت تنہا اسی کی جائے اور اس میں کسی اور ہستی کو شریک نہ کیا جائے، لیکن محبت اس کی جملہ مخلوقات سے کی جائے، اور یہ محبتِ خلائق عدل و احسان، ہمدردی و غمگساری، خدمت و حُسنِ خُلق اور ایثار و قربانی چاہتی ہے۔ حرفِ آخر یہ ہے کہ محبتِ الٰہی کا تقاضا ایمان و رحمۃ للعالمینی ہے۔

۲۔ غمِ نفسِ روحی:

یہ حسین اور سچا غم ہے، اس لیے کہ یہ حقیقت میں غمِ "دوست" ہے، جو الحُسن والحق ہے۔ اس غم کی قدر و قیمت کچھ اہلِ مہر و وفا ہی جانتے ہیں اور اس میں ان کے لیے قُرّۃ العین اور جالیاتی ثروت ہوتی ہے، جس کے عوض جنت ملتی ہے، جو "دوست" کا مقامِ لقاء و دید، اس کا اپنے دوستوں کے لیے مہمان خانہ اور حسنُ المآب ہے۔ اس میں اہلِ حسن و سُرور کی صحبت و رفاقت کا لُطفِ مدام ہوگا؛ "دوست" کی ہم نظری و ہم کلامی کی شرابِ طہور کے جام پہ جام ملیں گے اور اس کے کیف سرور کو ہزار چند کرنے کی خاطر "دوست" اپنی رضوان کی رحیقِ مختوم پلائے گا، جس کا کیف و سرور روز افزوں ہوگا۔

شدّتِ محبت یا عشق میں بیم و رجا یکجا ہوتے ہیں۔ خوف اس بات کا ہوتا ہے کہ کہیں "دوست" ناراض نہ ہو جائے اور اس سے رشتۂ محبت ٹوٹ نہ جائے؛ نیز دل کو جو "دوست" کا گھر ہے، خوف و حزن کی آگ نہ لگ جائے اور اس سے دور و مہجور نہ ہونا پڑے۔ یاد رکھو! جو شخص اپنے الٰہ و ربّ سے دور و مہجور ہوا، وہ اپنے آپ سے دور و مہجور اور ناکام و نامراد ہوا؛ جو اس سے بیگانہ ہوا، وہ اپنے آپ سے بیگانہ ہوا؛ جو اس کا نہ رہا، وہ اپنا بھی نہ رہا؛ جس نے اُسے بھلا دیا، اُس نے اپنے آپ کو فراموش کر دیا۔ ایسا شخص ہمیشہ کے لیے اس نور سے محروم ہو جاتا ہے جو انسان کو اس دُنیا اور آخرت میں اس کی راہ و منزل دکھاتا ہے۔ اس نور کے بغیر انسان دنیا میں قلب کا اندھا ہوتا ہے اور قیامت کے دن بھی اندھا اُٹھے گا۔ جب وہ قیامت کی ظُلمتوں میں سرگرداں جہنم میں گرے گا تو اس پر نور کی حقیقت کُھلے گی اور

وہ پچھتائے گا، لیکن پچھتاوا اس کے غم کی اذیتوں کو افزوں کرتا جائے گا۔ سمجھو تو یہ بڑے کام کی بات ہے، بھلانے کی نہیں، یاد رکھنے اور سوچنے کی بات ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ بہت کم ایسی باتیں سنتے، یاد رکھتے اور ان پر غور و فکر کرتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ محبتِ نفسِ روحی، محبتِ الٰہی اور محبتِ مخلوقات ایک ہی سلسلے کی تین لاینفک کڑیاں ہیں۔ اہلِ مہر و وفا وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے اِلٰہ و ربّ اور اس کی مخلوقات سے محبت کرتے ہیں، جن میں وہ خود بھی شامل ہوتے ہیں۔ محبتِ الٰہی کا تقاضا ہے کہ اس کا بندہ صرف اس کی پرستش و اطاعت کرے اور اس کی دید و لقاء، رضوان اور جنت کی ابدی حیاتِ محض حاصل کرنے کی خاطر اس دنیا میں حسین زندگی بسر کرے۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حسین زندگی ہی سچی اور محبت کی زندگی ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ حسن و عشق ایک ہی حقیقت کے زوجین ہیں۔ جس طرح ہر چیز کا زوج ہے، اسی طرح حسن کا عشق زوج ہے اور یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

انسان کو غمِ نفسِ روحی ہو تو وہ متقی ہوتا ہے اور تقوٰی ایمان و دین کی اساس ہے۔ علاوہ بریں، یہ غم انسان کی آرزوئے حسن کو زندہ و فعّال رکھتا اور سعادتِ دل پیدا کرتا ہے۔ یاد رکھو! قلبِ سعید ہی میں ایمان و حسنِ عمل، صدق و تقوٰی، محبت و رحمت، حسنہ و خیر، عدل و احسانٔ اجتہاد و جہاد اور ایثار و قربانی کے چشمے ابلتے اور گلشنِ زندگی کو سرسبز و شاداب اور پُربہار و بارآور کرتے ہیں۔ بخلاف اس کے جس دل میں قساوت ہوتی ہے، اس سے کفر و شرک، ظلم و عدوان اور سیئہ و شر کے سوتے پھوٹتے ہیں، جو مزرعِ حیات کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔

آخر میں تمہیں ایک راز کی بات بتاتا ہوں۔ جنت کی قیمت جمالیاتی ثروت ہے، جو غمِ نفسِ روحی سے ملتی ہے۔ سمجھو تو یہ فلسفۂ حسنِ زندگی کا حرفِ آخر ہے۔

۱۱۔ قلم

دُکھ انسان کو مُفکّر بنا دیتا ہے، بشرطیکہ وہ تنگنائے ذات سے نکل کر معروضی و آفاقی بن جائے۔ اپنی زندگی اسیرِ رنج و محن تو تھی ہی، لیکن قوم و ملّت کی زبوں حالی و محکومی کا غم بھی، وجہِ بیقراریِ دل تھا۔ مجھے اس صورتِ حال کی علّتِ فاعلی معلوم کرنے کی طلب و جستجو تھی۔ پڑھنا، سوچنا اور غم کھانا میری عادت اور دوست کی مشیت بھی تھی۔ غمِ "دوست" بڑی ہی حسین و محبوب نعمت ہے میں سوچا کرتا تھا کہ اُمّتِ مُسلمہ جس نے صدیوں مذہب و ثقافت، علم و حکمت، ادب و فن، تہذیب و تمدّن، سیاست و اقتصادیات میں اقوامِ عالم کی قیادت کی، اس کے اضمحلال، انحطاط اور زوالِ عبرتناک کی وجہِ حقیقی کیا ہے؟ میں سوچتا رہا؛ عمر گزرتی گئی، لیل و نہار میرے ساتھ سفر کرتے رہے۔ اس اثنا میں قلم میرا دوست و ہمسفر اور کتاب ناظورۂ حیات بن چکی تھی۔ میرا اِلٰہ جمیل و جلیل بھی میرا دوست و ہمسفر تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ "وہ" تو سب کا دوست و ہم سفر ہے، لیکن ظالم و جاہل انسان جانتا ہے پر مانتا نہیں۔ سچ یہ ہے کہ مجھ پر یہ راز کھل چکا تھا کہ میرا رب میرا دوست و ہمسفر بھی ہے۔ ایک دن گوشۂ تنہائی میں جو بچپن سے میرا حسنُ المآب ہے، اسی سوچ میں محو یہ شعر گنگنا رہا تھا:

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں؟　　غالب

کہ دفعتاً ایک بے حرف و صوت آواز بصورتِ برقِ حسن دل میں لہرائی اور اشارہ کر گئی۔ دل اشارہ سمجھ گیا اور بیقرار ہو گیا۔ میں بے اختیار اٹھا اور اپنے "دوست" کے حضور سربسجود ہو گیا۔ وہ صورتِ حسن میں جلوہ افروز ہو تو ناصیہ فرسائی اور اظہارِ آرزو سے جو جمالیاتی ثروت ملتی ہے، وہ اور کہاں مل سکتی ہے؟ "دوست" نے کب تک مجھے اس عالمِ حسن و سُرور میں رکھا، یہ تو وہ جانتا ہے، لیکن حضوریِ "دوست" کا عالم، اس عالمِ زمان و مکان سے ماوراء،

عالم دہر ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کی ایک آن ہمارے حساب میں ہزاروں برس پر حاوی ہوتی ہے۔ وہ منظرِ حسن بیمثال نہ رہا تو میں اپنے عالم میں لوٹا، سر اٹھایا تو وہی زمان و مکان اور عالم تنہائی تھا۔ البتہ قلم میرا منتظر تھا۔ یہ مبالغہ نہیں، حقیقت ہے کہ قلم مجھے جان سے عزیز ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے میں "دوست" سے باتیں کرتا ہوں؛ نیز وہ میرا مونس و غم خوار، رفیق و ہمراز، ہمسفر و دلیلِ راہ اور میرا نطق و ترجمان ہے۔ اگر "دوست" نے محض اپنے فضل و کرم سے مجھے قلم ایسی نعمتِ عظمیٰ عطا نہ کی ہوتی تو میں گونگا اور بے زبان ہوتا اور اس سے رازونیاز کی باتیں نہ کر سکتا اور نہ اس کے حُسن کی تفسیر ہی لکھ سکتا۔ قلم "دوست" کی نشانی ہے، اسے دیکھتا ہوں تو وہ یاد آجاتا ہے؛ اور اُسے پکڑتا ہوں تو وہ "دوست" سے رازونیاز کی باتیں کرنے اور اس کے حُسن وعشق کی باتیں لکھنے کے لیے مچلنے لگتا ہے۔ اس سے مجھے جمالیاتی ثروت کے علاوہ کچھ اور بھی ملتا ہے۔ یہ راز بھی بہت کم جانتے ہیں کہ قلم کو روحِ علم و حکمت اور آرزوئے تخلیق و تحسین ودیعت کی گئی ہے۔

ناگہاں میری نظر اپنے ناظورِ حیات قلم پر پڑی جو میرا منتظر تھا اور اپنی زبان میں مجھ سے کہہ رہا تھا: "میرے دوست مجھے پکڑو کہ میں تم پر زوالِ اُمّتِ مسلمہ کا راز آشکارا کروں۔" میں نے اپنے دوست و ہمراز کو اُٹھایا تو وہ مجھ سے یوں ہمکلام ہوا:

"میں مخزنِ اسرارِ حُسن و حیات، خزینۂ قوّت و توانائی اور گنجینۂ نور و سرور ہوں، ان کے لیے جو میری قدر کرتے ہیں، لیکن جو لوگ (افراد ہوں یا اقوام) میری قدر نہیں کرتے اور مجھے اپنا معلّم و رہنما اور رفیق و ہمسفر نہیں بناتے، وہ سنگین نوعیت کا کفرانِ نعمت کرتے ہیں اور اس گناہِ کبیرہ کی پاداش میں علم و حکمت کے جمال و جلال، نور و رنگ، قوّت و توانائی (= سلطان)، قوّتِ ایجاد و اختراع، آرزوئے تخلیق و تحسین اور جمالیاتی ثروت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ایسی قوم میں آرزوئے حُسن و زندگی اس کی نفسانی خواہشات کے بارِ گراں تلے دبتی چلی جاتی اور گھٹ کر مر جاتی ہے۔ ایسی ہی قوم کو "مردہ قوم" کہتے ہیں، جو زمانے کا

مرکب بن کر ذلیل وخوار اور محکوم وغلام ہوجاتی ہے۔ اگر اس میں نشاۃ ثانیہ کی آرزو پیدا نہ ہو تو قدرت کا قانونِ مجاوزات واستبدال حرکت میں آجاتا ہے۔ تاریخی عمل اسے ہلاک و برباد کر کے کسی بہتر قوم کو اس کی جگہ متمکن کر دیتا ہے۔ قرآنِ مجید اسے "سُنتِ الٰہی" تعبیر کرتا ہے اور اسے غیر مبدّل قرار دیتا ہے۔

یاد رکھو! جو قوم مجھے اپنی نظروں سے گرادیتی ہے اور ان اہلِ علم وحکمت انسانوں کی قدر نہیں کرتی جیسا کہ قدر کرنے کا حق ہے، وہ نہ صرف علم وحکمت کی قوتوں اور نعمتوں سے محروم رہتی ہے، بلکہ ربّ علیم وحکیم کی نظر سے بھی گر جاتی ہے۔ جو قوم اس کی نظروں سے گرتی ہے وہ انسانیت کے ارفع واعلیٰ مقام سے پھسل کر بہیمیت کے تحت الثریٰ میں جا گرتی ہے۔ مثال کے طور پر جس طرح اُمتِ مسلمہ گری ہوئی ہے جب سے اس کے "علمائے دین" نے قریب قریب مجھ سے رشتہ منقطع کر رکھا ہے۔ اس گراوٹ کی علتِ فاعلی یہ ہے کہ "دینی مدارس" میں قلم "شجرِ ممنوعہ" ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ ہے کہ ان مدارس میں سائنس اور ٹیکنالوجی بھی ایسا "شجرِ ممنوعہ" ہے، جس کے قریب طلباء تو کیا اساتذہ بھی نہیں پھٹکتے۔ یہی تمہاری ملت کی ذلت وپس ماندگی، محکومی وغلامی اور ضعف وکمزوری کی وجہ حقیقی ہے۔ تم بے دست وپا ہو؛ اپنے ہی دشمنوں کے محتاج ودست نگر ہو؛ ان کے اشاروں میں آپس میں برسرِ پیکار ہو؛ ان کے مقلد ہو اور انہیں اپنا دوست ومددگار سمجھتے ہو۔ تم جانتے ہو کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے، مگر مانتے نہیں۔

جب سے تم نے مجھے چھوڑا ہے تم علم وفن یا سائنس وٹیکنالوجی کی قوتِ تسخیر (سلطان) سے محروم ہو کر ضعیف وکمزور اور ذلیل وخوار ہو گئے ہو؛ نیز اس کے سبب تم میں جذبۂ جہاد سرد پڑ گیا ہے اور آرزوئے حسن وزندگی نحیف ونزار ہو چکی ہے۔ قرآنِ مجید اور تاریخ شاہد ہیں جب کوئی قوم علم کی قوتِ تسخیر، جذبۂ جہاد اور صالحیت سے محروم ہو جاتی ہے تو وہ قدرت کے قانونِ استبدالِ اُمم کی مستوجب ہو جاتی ہے۔

جس دین وملّت میں علم کے معنیٰ "علم بالقلم" ہو اور جس نے علم بالقلم کی غیر معمولی اہمیت کا اقوامِ عالم کو احساس دلایا اور ان میں اس کا شعور بیدار کیا ہو، وہی ملّتِ اسلامیہ "علم بالقلم" کو اپنے مدارس میں شجرِ ممنوعہ سمجھنے لگے، یہ ظُلم وجہل نہیں تو کیا ہے؟ جانتے ہو تمہاری ملّت نے اپنے مدارس سے قلم کو کیوں نکال دیا؟ اس کا جواب خواہ تمہیں کتنا عجیب اور بعید از قیاس لگے لیکن وہ سو فیصد سچا جواب یہ ہے کہ یہود کی سازش کی وجہ سے۔ یہود کی سازش سے مدرسۂ نظامیہ کی بنیاد پڑی، جس میں "لوح وقلم" کا داخلہ ممنوع قرار دیا گیا۔ ملّت قلم کے "سلطان" محروم ہوئی تو آخرِ کار قوّتِ حرب سے بھی محروم ہوگئی۔ قوّتِ حرب وضرب نہ رہے تو جذبۂ جہاد بھی سرد پڑ جاتا ہے اور آرزوئے حسن وزندگی بھی رفتہ رفتہ کمزور ہوتی جاتی ہے۔

علم وقلم لازم وملزوم ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ علم ہی انسان کو حیات وقیومیت بخشتا ہے اور اعتبارِ علم بھی قلم ہی ہے۔ اگر تم ذلّت ومسکنت کی موجودہ حالت سے نکلنا چاہتے ہو تو قلم کو ربِّ علیم وحکیم کی نعمتِ عظمیٰ سمجھ کر اس کی قدر کرو جیسا کہ قدر کرنے کا حق ہے۔ دینی مدارس میں بالخصوص "علم بالقلم" کو لازمی قرار دو؛ اور قلم کو وہ ارفع واعلیٰ مقام دو جس کا وہ مستحق ہے۔ جب تک تمہاری ملّت یہ نہیں کرے گی یا بالفاظِ دیگر قلم ایسی نعمتِ عظمیٰ کی قدر ناشناس رہے گی، وہ اہلِ علم وقلم اقوام کی محکوم و دست نگر اور مقلّد وپس ماندہ رہے گی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں آرزوئے حسن وزندگی زندہ وفعّال نہیں ہوگی۔ تاریخ کا فتویٰ یہ ہے کہ ایسی قوموں کا انجام ہلاکت وبربادی اور استبدال ہوا کرتا ہے۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تم جو چاہو گے قدرت ویسا ہی کرے گی، کیونکہ اُسے تمہاری آزادیِ ارادہ واختیار بہت عزیز ہے۔ یہ اسی کی عطا کردہ نعمتِ عُظمیٰ ہے۔ سمجھو تو یہ بات گنجینۂ معانی ہے۔

لوح وقلم کا نام تو تم نے سنا ہوگا، لیکن ان سے متعلق تم کچھ اور نہیں جانتے۔ جانتے بھی کیسے؟ تم ایسی باتوں پر غور ہی نہیں کرتے۔ یہ تو تمہارا اب قومی وملّی شعار ہے۔ محکوم ومقلّد قوموں کا یہی شعار ہوا کرتا ہے۔ سنو! لوحِ کُل عوالم کا نوشتۂ تقدیر ہے اور قلم کاتبِ تقدیر ہے۔

علامہ اقبال کے اس شعر میں یہی حقیقت مضمر ہے:

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

افسوس کہ تم لوح و قلم کی حقیقت و اہمیت سے آشنا نہیں رہے؛ اس لیے خالقِ تقدیر نہیں ہو، بے علم و بے ہنر ہو، فلسفۂ معراج سے نابلد ہو؛ "سلطان" سے محروم ہو؛ تمہیں کائنات کی تسخیر کرنے کا حکم ہے اور تم حکم عدولی کر رہے ہو۔ ستم تو یہ ہے کہ تمہیں اپنے اس جرمِ مسلسل کا شعور بھی نہیں۔ کاش تم سمجھ سکتے کہ قلم و سلطان لازم و ملزوم ہیں۔ قلم چلتا ہے تو اس سے سلطان پیدا ہوتا ہے۔ یہ قلم کا سرّالاسرار ہے۔

قلم اگر کاتبِ تقدیر ہے تو تقدیر نویسی کا معلّم و مرشد کلامِ الٰہی ہے۔ فرد، قوم اور ملّت کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتے ہو تو ایک ہاتھ میں قلم اور دوسرے ہاتھ میں کلامِ الٰہی کو مضبوطی سے تھام لو اور اُسے اپنا مرشد و اتالیق بنا لو۔ اس کی ایک ایک بات گوشِ حق نیوش سے سنو!!! اس پر حکیمانہ تدبّر کرو اور ان کی روشنی میں اپنی تقدیر لوحِ زمانہ پر رقم کرو۔ یہ نہ بھولنا کہ قلم ہی کی بدولت انسان نے ذرّے کو چیر کر اس سے جوہری توانائی و نور حاصل کرنے، اس کے ذریعے گوناگوں قسم کے قیامت خیز جوہری آلات بنانے اور تسخیرِ کائنات کا علم و ہنر سیکھا ہے اور سیکھ رہا ہے۔

تم اہلِ قلم ہو، جانتے ہو کہ تمہاری تخلیقی فعلیت کے تمام شہکار و معجزات میرے ہی مرہونِ منت ہیں۔ میں نہ ہوتا تو کتاب کہاں اور کتب خانے کہاں ہوتے؟ اخبار و رسائل کہاں ہوتے؟ گلشنِ زندگی ادب و فن کے گلہائے رنگ رنگ سے محروم و ویران ہوتا۔ تمہاری کوئی بات محفوظ نہ رہتی۔ تم کاروبار نہ کر سکتے، بلکہ کچھ بھی نہ کر سکتے۔ پھر بھی تم لوگ میری قدر نہیں کرتے۔ مجھے تمہارے علماء سے بالخصوص شکوہ ہے۔ وہ اپنے آپ کو انبیاءؑ علیہم السلام کے وارث اور دین کے محافظ و علمبردار سمجھتے ہیں، لیکن ان کے مدارس میں میرا داخلہ ممنوع ہے۔

انہیں اوّل تو میری غیر معمولی اہمیت کا شعور ہی نہیں، جنہیں شعور ہے وہ بھی خاموش ہیں۔ وہ سناتے تو بہت ہیں، مگر سنتے کسی کی نہیں۔ وہ جو کہتے ہیں اس پر خود عمل نہیں کرتے۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ ہے کہ ان کی تخلیقی استعداد قوّت سے فعل میں نہیں آتی؛ اُن میں اوّل تو تخلیقی فعلیت کی آرزو پیدا ہی نہیں ہوتی، اگر ہوتی بھی ہے تو "بے قلم" ہونے کے باعث اپنی آرزو کی تکمیل کر نہیں پاتے۔ کاش انہیں اس حقیقت کا شعور ہوتا کہ قلم کے بغیر شجرِ علم برگ و بار نہیں لاتا، اگر کچھ پھل لائے بھی تو وہ ناپختہ و بے سود ہوتا ہے۔ اگر یہ سچ ہے اور یقیناً سچ ہے کہ علم و حکمت، سائنس و ٹیکنالوجی، ادب و فن اور ثقافت و حیات کے نشو و ارتقا کا دار و مدار قلم پر ہے۔ تو پھر یہ کہنا بھی اتنا ہی سچ ہے کہ ان چیزوں میں ملّتِ اسلامیہ کی پسماندگی و درماندگی اور نتیجۂ اُن کے ضعف و زوال اور ذلّت و مسکنت کے ذمے دار بہت حد تک علما ہیں، بالخصوص وہ جو دینی مدارس کے منتظمین ہیں۔

میں ہی تمہارا وفا کیش و ہمراز، ہمدرد و غمگسار اور رفیقِ تنہائی و ہمسفر ہوں؛ لیکن بہت کم اس راز سے آشنا ہیں۔ جب زمانہ تمہیں تمہارے رفیقوں اور دوستوں سے محروم کر دیتا ہے تو میں تمہارے ساتھ رہتا ہوں اور تمہارے سفرِ زندگی کو دلچسپ بناتا ہوں۔ اگر تمہیں میرے ساتھ سچّی محبت ہو تو میں تمہیں دُنیا سے بے نیاز کر دیتا ہوں۔ انسان کا وقار اور عزّت و قوت مجھ سے ہے؛ تمہاری ثقافت کا نشو و ارتقا مجھ سے ہے؛ میں تمہیں جمالیاتی لذّت و طمانیت، سوز و ساز اور کیف و سُرور دیتا ہوں۔ میں تمہارا ذکر بلند کرتا، تمہیں شہرت و عزّت اور دوام بخشتا ہوں۔

کاش اہلِ مدرسہ جانتے کہ بے قلم بے دست و پا اور محروم و تہی دست ہوتا ہے، فرد ہو یا قوم؛ نیز میں ربِّ علیم و کریم کی نعمتِ بے بہا ہوں اور میری قدر ناشناسی کفرانِ نعمت ہے اور اس گناہِ کبیرہ کی سزا حُسن و زندگی، قوّت و توانائی، ہیبت و جبروت اور عزّت و عظمت سے محرومی ہے۔ آخر میں تمہیں ایک راز کی بات بتاتا ہوں:

اہلِ قلم حسن کا بہ ہوتا ہے۔

۱۲۔ تلاشِ مسرّت: ندا آئی:

تمہیں تلاشِ مسرت ہے، ہونی بھی چاہیے۔ دیکھنے میں تو ہر فردِ بشر مسرت کی طلب و جستجو میں ہے، لیکن بہت کم ہیں، جنہیں حقیقت میں مسرت کی تلاش ہے جویانِ مسرت کی پہچان یہ ہے کہ انہیں آرزوئے حسن و زندگی ہوتی ہے۔ انہیں ڈر ہوتا ہے تو آتشِ خوف و حزن کا۔ ان کے دلوں میں سعادت ہوتی ہے، قساوت نہیں ہوتی؛ ان میں حق و حسنہ کی طلب و جستجو ہوتی ہے۔ مسرت حقیقت میں حسنہ یا تاثیرِ حسن ہے۔ جمالیاتی طمانیت کی روح پرور و جاں فزا ٹھنڈک شدید ہو جائے تو مسرت کہلاتی ہے۔ مسرت حسنِ یقین و عمل، محبت، رحمت اور اپنے اِلٰہ و رب کی یاد سے ملتی ہے۔ سلبی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو مسرت فقدانِ خوف و حزن پر دلالت کرتی ہے۔

کیا یہ واقعہ نہیں کہ تم میں سے ہر شخص اپنے آپ کو عقلمند سمجھتا ہے، اس لیے کسی کی سُنتا نہیں اور نشۂ تغافل میں سرشار کسی حادثے، سانحے اور منظر و نظارے کو دیدۂ عبرت نگاہ سے دیکھتا ہی نہیں؛ ذرا پڑھ لکھ جائے تو "دانشوروں" کے زُمرے میں شامل ہو جاتا ہے۔ پھر سُناتا بہت ہے، سُنتا نہیں۔ اوّل تو پڑھتا لکھتا نہیں، پڑھتا ہے تو "دانشوروں" کا لٹریچر جو رہزنِ حسن و مسرت، غارتگرِ ایمان و آگہی اور گمراہ کُن ہوتا ہے۔ ایسے لٹریچر سے قلب میں خواہشاتِ نفسانی کا سیلاب آجاتا ہے، جو آرزوئے حسن و مسرت کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے۔ جمالیاتی ثروت اور اس کی آرزوئے نہ رہے تو آدمی کے پاس باقی کچھ نہیں رہتا، وہ مفلس و تہی دست اور محرومِ و نامراد ہو جاتا ہے۔

یہ سامنے کی بات ہے کہ اہلِ حسن و سرور کے علاوہ قریب قریب سبھی لوگ دولت اور مسرت کو لازم و ملزوم سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ دُنیا دیوانہ وار دولت کے پیچھے بھاگ

رہے ہیں اور سرگشتہ خمارِ دولت بدمست ہیں۔ سنو! دولت کسبِ حلال سے حاصل ہو تو مسرت دیتی ہے اور اسے راہِ حسن و حق میں خرچ کیا جائے تو مسرت دیتی ہے۔ بخلاف اس کے دولت کسبِ حرام سے حاصل کی جائے تو غارتگر حسن و مسرت ہوتی ہے اور خوف و حزن پیدا کرتی ہے۔ تم جانتے تو ہو کہ کسبِ حرام کسے کہتے ہیں؟ لیکن مانتے نہیں، اس لیے کہ تم کسبِ حرام کیے جا رہے ہو۔ یاد رکھو! سرمایہ کاری جو سود کاری ہو، کسبِ حرام ہے؛ اکتناز و احتکار، استحصال و جلبِ منفعت، سلب و نہب، ضمیر فروشی و تن فروشی، قلم فروشی و نطق فروشی، قوم فروشی و ملک فروشی، ایمان و دیانت فروشی اور خود فروشی و انسان فروشی کسبِ حرام ہے۔ علاوہ ازیں، رشوت ستانی و جعلسازی، خیانت کاری و ظلم کاری، قمار بازی و نذرانہ ستانی کسبِ حرام ہی کی گوناگوں شکلیں ہیں۔ تم اغیار کی تقلید میں سود کاری و سرمایہ کاری کو عملاً جائز سمجھتے ہو، حالانکہ یہ کسبِ حرام ہے۔ دلیل یہ ہے کہ یہ اسلام کے قانونِ عدل و احسان کے منافی ہے۔ میں اس نکتے کی صراحت ایک مثال سے واضح کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تم کارخانے لگاتے ہو۔ ان میں ہزاروں محنت کش کام کرتے ہیں۔ ان میں مزدور، کاریگر اور انتظامیہ کے چھوٹے بڑے ارکان سب مل کر دولت پیدا کرتے ہیں؛ لیکن سرمایہ کار ہی فقط اپنے آپ کو پیداوار، دولت یا نفع کا مالک سمجھتے ہیں، لہٰذا وہ اُسے اسلام کے عدل و احسان کے مطابق آپس میں تقسیم کرنے کے قائل نہیں۔ وہ پیداکاروں یا محنت کشوں کی اُجرتیں، تنخواہیں ان کی مجبوریوں کی نسبت سے رسد و طلب کے "اُصولِ قارونی" کے مطابق مقرّر کرتے ہیں، اور اس میں ان کی مرضی کا بھی عمل دخل ہوتا ہے۔ چنانچہ تم دیکھتے ہو کہ سرمایہ کار اپنے سرمائے کی بنا پر پیداکاروں کو ان کی اُجرتیں اور تنخواہیں دینے کے بعد بقیّہ سارا منافع اپنے سرمائے کی مقدار کی نسبت سے خود بانٹ لیتے ہیں۔ پیداکار تو جھونپڑوں میں فقر و فاقہ کی حالت میں زندگی گزارتے ہیں اور سرمایہ کار بنگلوں میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں، لیکن پیداکار اپنے حصّے سے محروم رہتے ہیں۔ قرآنِ حکیم کے اُصولِ عدل و احسان کی رُو سے یہ ظلم و کسبِ حرام ہے، جسے جدید معاشیات کی اصطلاح میں استحصال کہتے ہیں۔ سرمایہ کاری اس اعتبار سے سود کاری ہوئی،

جو جُرمِ عظیم اور گناہِ کبیرہ ہے۔ سرمایہ کار و سود کار اصل میں "قارون" ہوتا ہے اور قارون معاشرتی سرطان ہے، جو افرادِ معاشرہ سے ان کی جالیاتی ثروت چھین کر ان کے دلوں میں خوف و حزن کی آگ لگا دیتا ہے۔ انسان کی جالیاتی ثروت کے چار بڑے رہزن و غارتگر ہیں، جن کے لیے قرآنِ مجید نے فرعون و ہامان اور قارون و آذر کی تلمیحی تعبیریں اختیار کی ہیں۔ یہ خود بھی اہلِ نار ہوتے ہیں اور معاشرے میں خوف و حزن کی آگ لگا دیتے ہیں۔

جویائے مسرت! سنو! قدرت کا قانونِ مسرت یہ ہے کہ "دوسروں کو مسرت دینے سے مسرت ملتی ہے اور ان کی مسرت سلب کرنے سے اپنی مسرت بھی سلب ہو جاتی ہے۔" بالفاظِ دیگر، دوسروں کو خوش کرو گے یا خوش کرنے کی کوشش کرو گے تو تم بھی خوش ہو گے اور تمہیں خوشی ملے گی۔ بخلاف اس کے اگر دوسروں کو ناخوش کرو گے یا ناخوش کرنے کی کوشش کرو گے تو تم بھی ناخوش ہو گے۔ علم کی طرح مسرت دینے سے ملتی اور بڑھتی ہے؛ اور چھیننے سے چھن جاتی ہے۔ یاد رکھو! دوسروں کو مسرت سے محروم کرنے سے خود بھی مسرت سے محروم ہونا پڑتا ہے۔ اس قانونِ مسرت کی توجیہہ یوں بھی کر سکتے ہیں کہ انسان و حیوان سب رب العالمین کی مخلوقات ہیں اور اسے بے حد عزیز ہیں؛ لہٰذا جو لوگ اس کی مخلوقات کو خوش کرتے یا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ ان سے خوش ہوتا اور انہیں خوش کرتا ہے۔ برخلاف اس کے جو لوگ دوسروں کو دکھ دیتے، ان کا استحصال کرتے، ان پر ظلم کرتے اور انہیں خوف و حزن میں مبتلا کرتے ہیں، وہ خود بھی رہینِ خوف و حزن ہو جاتے ہیں، اور ان کی آگ میں جلنا ان کا مقدر بن جاتا ہے۔ وہ اس آگ کو عیش و عشرت، طلبِ دولت و قوت اور خود نمائی و شہرت سے بجھانے کی کوشش میں اسے تیز تر کرتے رہتے ہیں، لیکن اس کا شعور نہیں رکھتے۔ اصل یہ ہے کہ یہ سب چیزیں ایندھن ہیں، جس کا خاصّہ آگ کو بھڑکانا ہے۔

سنو! تمہیں ایک راز کی بات بتاتا ہوں، جو اس لیے راز ہے کہ مرہونِ التفات نہیں۔

بنی نوعِ انسان کے چار دوست ہیں، جو انہیں مسرّت دیتے ہیں، ان کے چار گروہ ہیں جنہیں قرآن مجید نے انبیاءؑ، صدّیقین، شہدآء اور صالحین سے تعبیر کیا ہے۔ بخلاف اس کے نوعِ انسانی کے چار دشمن ہیں، جو غارتگرِ طمانیت و رہزنِ مسرّت ہیں، اور وہ ہیں: فرعون وہامان اور قارون وآذر۔ چونکہ یہ طمانیت ومسرّت کے چور اور رہزن ہیں، لہٰذا ہر زمان ومکان میں نام اور بھیس بدل کر آتے ہیں، اور شیطان اپنی وسوسہ اندازیوں اور جالیاتی فریب کاریوں کے ذریعے لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کراتا رہتا ہے کہ وہ غارتگرِ ایمان و آگہی اور رہزنِ طمانیت و مسرّت ان کے دوست و خیرخواہ، مربی و رہنما اور ان کی آزادی و دین کے محافظ ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ان کا قلع قمع کیا تھا تو حضرت محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے۔ جانتے ہو کس طرح؟ اسلام کی تحریکِ توحید کے ذریعے۔ یہ حقیقت ہمیشہ تمہارے پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ عقیدۂ توحید میں جمال وجلال کی ایسی قوّتِ تسخیر ہے جس کی حریف کوئی باطل و طاغوتی قوّت نہیں ہوسکتی، چاہے وہ فرعونی و ہاماتی ہو یا قارونی و آذری۔ اس عقیدے کی دوسری خوبی یہ ہے کہ یہ غارتگرِ خوف و حُزن بھی ہے اور طمانیت انگیز و مسرّت آفرین بھی۔ اب میں تمہیں سرِّ توحید سے آگاہ کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کو اِذعان وایقانِ کامل اور اطمینان سے اپنا اِلٰہ (= معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود) اور ربّ (رازق و پروردگار، والی و وکیل، حافظ و ناصر اور حاکم و آقا) سمجھنا، اس پہ قائم رہنا اور اس عقیدے کو اپنی فکری و عملی زندگی کا جزوِ لاینفک بنا لینا۔ یہ عقیدہ عمل میں آتا ہے تو اس میں جمال وجلال اور حیات و قومیت کی صفات اور ان کے حُسنِ امتزاج کے اعجازِ تاثیر سے حیرت انگیز قوّتِ تسخیر و تالیف پیدا ہوجاتی ہے۔ علاوہ بریں، عقیدۂ توحید میں تاثیرِ برقِ حُسن ہوتی ہے جس سے نہ صرف خوف و حُزن کی آگ خاموش و سرد ہوجاتی ہے، بلکہ طمانیت و مسرّت کی ٹھنڈک میں بدل جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عقیدۂ توحید میں قُرّۃُ العین ہے۔

ٓ توحید سے آگاہ اور تحریکِ توحید کے علمبردار متذکرہ چار گروہوں میں سے پہلا گروہ انبیاء علیہم السلام کا ہے۔

(ل) انبیاءِ علیہم السلام :

یہ ربِّ ذوالجلال و الاکرام کے برگزیدہ بندوں اور پیغمبروں کا برگزیدہ گروہ ہے، جس کا سلسلہ حضرت آدمؑ سے شروع ہو کر خاتم النّبیین و رحمۃ للعالمین حضرت محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس پہ آ کر ختم ہو گیا۔ یہاں دو اہم نکات کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے: اوّلاً، چونکہ ربّ العالمین نے آپؐ کو رحمۃ للعالمین بنا کر مبعوث فرمایا تھا، لہٰذا آپؐ کو خاتم النّبیین بنایا اور نبوت کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے منقطع کر دیا۔ ثانیاً، چونکہ رحمت میں طمانیت و مسرّت کا مفہوم پایا جاتا ہے، لہٰذا آپؐ بندگانِ الٰہی کو سب سے زیادہ طمانیت و مسرت دیتے ہیں اور اس حقیقت پر قرآن و عصر گواہ ہیں۔ ثالثاً، تحریکِ اسلام جو دراصل تحریکِ توحید ہے، تحریکِ رحمۃ للعالمینی بھی ہے اور اس کی نسبت معنوی سے تحریکِ طمانیت و مسرت بھی ہے۔ رابعاً اس تحریک میں قول و فعل اور جان و مال سے مقدور بھر حصہ لینا، ہر بشر کا انسانی فریضہ ہے۔ خامساً، جمالیاتی نقطۂ نظر سے اسلام آرزوئے حُسن ہے، اور حُسن کا خاصہ طمانیت انگیزی و مسرت آفرینی ہے۔ اس اعتبار سے بھی اسلام کو تحریکِ طمانیت و مسرت سے موسوم کر سکتے ہیں۔

اس گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ مسلمان خود بھی صاحبِ حُسن و سُرور ہوتا ہے اور دوسروں کو مسرت دینا اس کا شعارِ زندگی ہوتا ہے؛ نیز اجتماعی حیثیت سے اسلام کی تحریکِ طمانیت و مسرت کا نقیب و رضا کار بننا ہر مسلمان کا اہم فریضہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں، ربّ العالمین کے بندوں کی مسرتوں کو چھیننا، برباد کرنا، یا انہیں خوشیوں سے محروم کرنا یا رکھنا شیوۂ مسلمانی نہیں۔ علاوہ بریں دوسروں کو دُکھ اور غم دینا اور ان پر خوف و حُزن کی کیفیات طاری کرنا یا ایسا ماحول پیدا کرنا جس میں انہیں حالتِ خوف و حُزن میں زندگی گزارنی پڑے، اسلام کی تحریکِ طمانیت و مسرت کے منافی ہے۔

جانتے ہو اسلام کی تحریکِ توحید کی غایت کیا ہے؟ اس کی غایت انسان کی آرزوئے حُسن کی تکمیل کرنا ہے تاکہ وہ اپنے اِلٰہ و ربّ کا بندہ و دوست بن جائے۔ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ کے

بندے (= عباد الرحمٰن) اور دوست (= اولیآء اللہ) ہی اصحاب الجنت، اہلِ حسن وسرور اور نفوسِ مطمئنہ ہوتے ہیں۔ اس تحریکِ توحید کو کامیاب بنانے کے لیے رب العالمین کے بندوں کو متذکرہ چار معاشرتی سرطانوں کی محکومی وغلامی، جبر واستبداد، ظلم واستحصال، جور وجفا اور خوف وخطر سے نجات دلانا۔ ان کے نفسیاتی امراض خصوصاً شرک وکفر اور اصنام پرستی کے علاج کے لیے ان کا تزکیۂ قلب کرنا، انہیں علم وحکمت (بشمولِ سائنس وٹیکنالوجی) سکھانا، ان میں آرزوئے حسن وحیات زندہ وفعال کرنا، انہیں الٰہ ورب العالمین سے ملانا اور ان کے لیے ایسے حسین، پاکیزہ اور پرامن معاشرے کی تشکیل وتعمیر کرنا ہے، جس میں اللہ تعالیٰ کے آئین وقوانین کی سیادت اور حاکمیت ہو اور تنہا وہی سب کا الٰہ ورب ہو۔ چونکہ انبیآء علیہم السلام کی بعثت کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے منقطع وبند ہو چکا ہے، اس لیے اسلام کی تحریکِ توحید کو چلانے کی ذمے داری جملہ مسلمانوں یا اُمتِ مُسلمہ پر عائد ہوتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس تحریک کے نقیب وعلمبردار ہمیشہ صدّیقین، شہدآء اور صالحین ہوئے ہیں۔

(ب) صدّیقین:

جس طرح فنکار، مثلاً شاعر ومصوّر کو موزونیِ طبع اور مغنّی کو سُریلی آواز قدرت کی طرف سے ودیعت ہوتی ہے، لیکن وہ اکتساب سے فن میں کمال حاصل کر کے کامل یا سچّا فنکار بنتا ہے، اسی طرح صدّیقین کو صدق بھی قدرت کی طرف سے ودیعت ہوتا ہے، لیکن وہ اس سانچے میں اپنی زندگی کو ڈھالتا ہے تو صدّیق بنتا ہے۔ صدّیق نہ صرف سچّا ہوتا ہے اور سچ کی تصدیق کرتا ہے، بلکہ اس کی زندگی سچ کا معیار بھی ہوتی ہے۔ اگر یہ سچ ہے اور یقیناً سچ ہے کہ صدق اصل میں حسن ہی کا ایک ذاتی صفاتی عنصر ہے تو پھر یہ کہنا بھی سچ ہے کہ انبیآء علیہم السلام کے بعد آرزوئے حسن سب سے زیادہ صدّیقین کو ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ نہ صرف اپنی اور اپنے افرادِ قوم وملت کی زندگیوں کو بلکہ کُل افرادِ نسلِ انسانی کی زندگیوں کو حسین دیکھنے اور بنانے کی طلب وجستجو رکھنے اور سعی وجہد کرنے والے ہوتے ہیں۔ وہ بنی نوع انسان کی آرزوئے حسن کو زندہ و

فعال کرنے اور اس کی تکمیل کرنے میں کوشاں رہتے ہیں۔ علاوہ ازیں، وہ تحریکِ رحمۃً للعالمینی کے، جو حسن وحسنہ، حق وصداقت اور عدل واحسان کی تحریک ہے، نقیب وعلمبردار ہوتے ہیں۔ ان کی ایک امتیازی خوبی یہ ہے کہ حق جہاں بھی ہو اور جس شکل وصورت میں ہو، وہ اسے فوراً پہچان لیتے ہیں اور اس کی تصدیق وحمایت کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ حریفانِ حسن وحق اور معاشرتی سرطان، فرعون وقارون اور آذر وہامان انبیاء علیہم السلام کے بعد صدیقین، شہداء اور صالحین کے سخت دشمن ہوتے ہیں اور انہیں اپنا دشمن سمجھتے اور ان کے درپئے آزار رہتے ہیں۔

مردِ کامل دانائے راز اور صاحبِ حسن وسُرور بننے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کے اندر آرزوئے حسن زندہ وحرکی ہو۔ وجہ یہ ہے کہ آرزوئے حسن کے بغیر انسان اپنے نور کی تکمیل نہیں کرسکتا اور نور کی تکمیل نہ ہو تو مردِ کامل ودانائے راز اور صاحبِ حسن وسُرور بننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تمہیں آرزوئے حسن اور تلاشِ حق کب ہے، اس لیے ایک اور راز کی بات بتاتا ہوں۔ جانتے ہو "فرقان" کسے کہتے ہیں؟ یہ وجدان وعقل سے ارفع واعلیٰ ایک حسین ومنیر قوتِ ممیّزہ ہے۔ فرقان قدرت کی طرف سے صدّیق کو بالقوہ ودیعت ہوتا ہے، جسے وہ صدق کے نور وتوانائی کی بدولت قوت سے فعل میں لاتا ہے۔ جب نورِ فرقان کی قوتِ حسن کے طفیل نشو وارتقاء کرکے اپنی معراجِ کمال کو پہنچ جاتا ہے تو صدّیق صاحبِ فرقان بنتا ہے۔ فرقان دراصل قوتِ ممیّزہ کے کمالِ نور سے عبارت ہے۔

اس ضمن میں ایک اور راز کی بات بتاتا ہوں۔ اگرچہ یہ گوہرِ اسرار شہوار کی طرح سچی ہے لیکن باور نہ آئے تو اس پر غور کرو کہ تحقیق وتلاشِ حق کا یہ اصل الاصول ہے۔ بات یہ ہے کہ مشاہدہ حسّی ہو یا قلبی نور کے ذریعے ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہر حسّی، قلبی اور نفسی قوت اپنے نور کے ذریعے اپنا وظیفہ سرانجام دیتی ہے۔ مثال کے طور پر انسان سُنتا ہے تو نورِ سمعی سے، دیکھتا ہے نورِ بصری سے؛ فہم وادراک کرتا ہے تو نورِ عقلی سے، عَلٰی ہٰذا القیاس۔ مختصر یہ کہ نور ہی

کے حسّی، قلبی، نفسی نظام اپنے فطری وظائف سرانجام دیتا ہے۔ جسے ہم سننا، دیکھنا، سونگھنا، چکھنا اور چھونا کہتے ہیں، یہ دراصل "حسّی شہود" ہے جو متعلقہ حاسّہ کے نور سے وقوع پذیر ہوتا ہے۔ اولی الالباب یا اہلِ عقلِ سلیم جانتے ہو کون ہوتے ہیں؟ وہ اہلِ فکر و دانش ہوتے ہیں" جن کے مسلسل تفکر بالحق کے باعث ان کا نورِ عقل اپنا نشوونما، ارتقاء اور اِتمام کرلیتا ہے۔ یہ نورِ حسن ہی ہے جو قلب میں طمانیت و مسرّت اور کیف و سُرور بنتا ہے۔ عشق نور ہی ہوتا ہے، بشرطیکہ سچا ہو، اسی لیے اس کے سوز و ساز دونوں میں قُرّۃ العین ہوتی ہے۔ جھوٹے عشق کی پہچان یہ ہے کہ اس کی لذّت و سوز دونوں میں آگ ہوتی ہے، جو آتشِ خاموش اور کبھی آتشِ فروزاں ہوتی ہے۔

آخر میں ایک بات اور سُن لو۔ حسن و حسنہ، حق و صداقت اور عدل و احسان کی نمود اس حقیقت پر دال ہوتی ہے کہ دُنیا کبھی اہلِ صدق سے خالی نہیں ہوئی۔ جس روز ایسا ہوا، وہ قیامت کا دن ہوگا۔

(ج) شُہدآء :

صِدّیقین کی طرح شُہدآء بھی حسن و مسرّت کے سچے طلبگار ہوتے ہیں اور اس طلب و جستجو میں کسی قسم کے ایثار و قربانی سے دریغ نہیں کرتے۔ وہ تو حسن و حق کی خاطر جان دے کر اہلِ حُسن و سُرور بنتے ہیں۔ میں تمہیں تلاشِ مسرّت کا اصل الاُصول بتاتا ہوں: "شہادت سے حُسن و سُرور کی جنّتِ ابدی ملتی ہے۔" شہید اپنے اِلٰہ و ربّ کی راہ میں اپنی آنی و فانی جان دے کر حُسن و سُرور کی حیاتِ محض حاصل کرلیتا ہے۔ اس سے زیادہ نفع بخش سودا اور کون سا ہو سکتا ہے؟ لیکن آج کے نام نہاد مسلمان کا ظلم و جہل ہے کہ جانتا ہے پر مانتا نہیں۔ شہید یہ راز جانتا اور مانتا ہے اور اپنے اِلٰہ و ربِّ ذوالجلال والاکرام سے یہ سودا کر کے الحیوان کے جہان حُسن و مسرّت کی حیاتِ محض و سرمدی کے علاوہ "دوست" کے قرب و حضور اور احسان و رضوان کی عظیم نعمتیں بھی حاصل کرلیتا ہے۔

شہادت ایک لحظہ میں شہید کو صاحبِ حسن و سرور، وارثِ جنت اور اِلٰہ و رب کا دوست و مقرب بنا دیتی ہے۔ بنگاہِ "دوست" میں شہید کا ہر قطرۂ خون لعلِ بے بہا ہوتا ہے اور اس کے عوض اُسے "دوست" سے طمانیت و مسرت اور کیف و سرور کی وہ ٹھنڈک ملتی ہے جس میں لذت و حلاوت کا نشہ ہے جو مسترجب خمار نہیں۔ جنت نعمتوں کی ایسی بیتاں بے نظیر حسین و سرور انگیز اور کیف پرور و سحر انگیز دُنیا ہے جس میں جا کر کوئی شخص واپس اس جہانِ مرگ و حیات میں آنے کی خواہش تو کجا، تصور تک نہیں کرے گا، بجز شہید کے جو شہادت کی قدر و قیمت اور طرب و مسرت کی کیفیت و کمیت سے آشنا ہوگا، اور عروسِ شہادت کے وصال کی مسرتِ بے پایاں کی خاطر دُنیا میں بار بار جلنے اور شہید ہونے کی تمنا کرے گا لیکن الحیوان میں جا کر نہ کوئی واپس دنیا میں آیا ہے نہ کبھی آئے گا۔ وجہ یہ ہے کہ نفسِ انسانی کو ایک بار ہی لذتِ موت سے آشنا ہونا ہوتا ہے، اس لیے کہ اس کی موت اس کو الحیوان میں پہنچا کر خود ہمیشہ کے لیے فنا و معدوم ہو جاتی ہے۔

اگر تمہیں مسرت کی سچی آرزو ہے تو شہید بنو۔ اپنے اندر جذبۂ جہاد پیدا کرو اور جانِ فانی دے کر جنت خرید لو جو تمہارا حسن المآب اور تمہارے لیے "دوست" کا مہمان خانہ اور اس کی جائے لقا ہے۔ جہاد پیش شرط ہے شہادت کی۔ جہاد اور جذبۂ جہاد دونوں سے جدا لیاتی مسرت ملتی ہے، جس کی وجد آفرین ٹھنڈک کا اندازہ مجاہد ہی کر سکتا ہے۔ جہاد کی راہ میں اٹھنے والے ہر قدم سے دل میں مسرت کا فوارہ چھوٹتا ہے۔ دشمن کی ہر ضرب سے مسرتِ بے پایاں کا چشمہ پھوٹتا ہے اور ضرب باعثِ شہادت بن جائے تو شہید کے اندر اور باہر حسن و مسرت کی جنت بس جاتی ہے۔

شہید کے خون میں تاثیرِ حسن پیدا ہو جاتی ہے جو اس کے دل میں اگر آگ ہو تو اُسے ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ اسی طرح جذبۂ جہاد اور شوقِ شہادت میں تاثیرِ حسن ہوتی ہے، جس کی بدولت مجاہدین کے علاوہ دیگر افرادِ معاشرہ کے سینوں کی آگ بھی سرد پڑ جاتی ہے

اور ان کے نفس مطمئن ہو جاتے ہیں۔

بلادِ اسلامیہ پر بالخصوص اس وقت خوف و خطر کے بادل چھائے ہوئے ہیں اور ان کی اقوام کے دلوں کو آتشِ خوف و حزن محیط ہے۔ جانتے ہو اس کی وجوہ کیا ہیں؟ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان کے دلوں میں آرزوئے حسن و زندگی مردہ ہو چکی ہے اور اس کے سبب ان میں جذبۂ جہاد و شوقِ شہادت کا قریب قریب فقدان ہے۔ اس عذاب انتشار سے چھٹکارا پانے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے اندر آرزوئے حسن و زندگی کو زندہ و فعال کرو، اپنے عقائدِ جلیلہ و محرّکہ کو اپنی زندگی کے اجزائے لاینفک بنا لو اور سچے مجاہد بن جاؤ۔ سچا مجاہد وہ اولوالعزم مردِ مسلمان ہوتا ہے، جو جذبۂ جہاد سے سرشار ہو، جدید فنِ حرب و ضرب میں ماہر ہو، نیز جدید ترین سامانِ حرب و ضرب سے لیس بھی ہو اور اس کے استعمال میں مہارتِ تامّہ بھی رکھتا ہو۔ تم اس وقت تک سچے مجاہد نہیں بن سکتے جب تک تم سائنس و ٹیکنالوجی میں ترقی یافتہ اقوام کے ہم پلہ نہیں ہو جاتے، بلکہ ان سے آگے نہیں نکل جاتے۔ آگے بڑھو گے تو بات بنے گی، ورنہ اسلام دشمن اقوام تم پر اپنے "سلطان" کے بل پر اسی طرح مسلط رہیں گی اور تم اپنی آزادی و بقا کے لیے ان کے رحم و کرم پر رہو گے، نیز ان سے بدستور اسلحہ اور ٹیکنالوجی کی بھیک مانگتے رہو گے۔

یہ مبالغہ نہیں حقیقت ہے کہ اُمّتِ مسلمہ کے نشو و ارتقاء اور عروج کا سبب یہ تھا کہ اس نے اپنے عقائدِ جلیلہ و محرّکہ کو اپنی زندگی کے اجزائے لاینفک بنا لیا تھا اور علم و حکمت اور سائنس و ٹیکنالوجی میں اقوامِ عالم سے اس طرح آگے تھی جس طرح ترقی یافتہ اقوام آج اس سے آگے ہیں۔ اگر اس کے ارتقاء و عروج کا سبب یہ تھا تو اس کے انحطاط و زوال کا سبب بھی یہ ہے کہ ایک تو اس نے اپنے عقائدِ جلیلہ و محرّکہ سے اپنا تعلق برائے نام رکھا ہوا ہے اور دوسرے اس نے سائنس و ٹیکنالوجی کو اپنے "دینی" مدارس سے نکال باہر کیا ہوا ہے۔ اگرچہ بعض مسلم ممالک میں دینی مدارس کے باہر سائنس و ٹیکنالوجی کی طرف توجّہ دی

جاتی ہے، مگر اتنی نہیں جتنی توجہ کی وہ مستحق ہے۔ اس کا سبب پاکستان میں تو وسائل کی کمی ہے، لیکن تیل پیدا کرنے والے عرب ممالک میں اس کی طرف توجہ نہیں دی جاتی۔ اس کی بنیادی وجہ دولت کی فراوانی ہے، جس کے نشے میں وہ اقوام سرشار ہیں۔ نشہ کسی قسم کا ہو، فرد و قوم کو خودی و خدا دونوں سے غافل کر دیتا ہے۔ ایسی صورتِ حال، احساسِ سود و زیاں شعورِ ذمے داری اور آرزوئے حسن و زندگی کے فقدان پہ دلالت کرتی اور قوموں کی محکومی و غلامی اور ہلاکت و بربادی کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

تیل کی دولت کے نشے میں سرمست عرب اقوام بالخصوص مٹھی بھر اسرائیلیوں کی قوت کے سامنے عاجز و بے بس ہیں، جو جب چاہے انہیں ہلاک و برباد کر سکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیشتر عرب قوموں میں جذبۂ جہاد و شوقِ شہادت نہیں، اس لیے وہ مجاہد نہیں۔ ان میں جو مجاہد بھی ہیں، وہ ان معنوں میں حقیقی مجاہد نہیں کہ جدید ترین قسم کے روایتی اور ایٹمی سامانِ حرب سے محروم ہیں۔ عرب اور دیگر مسلم اقوام جدید سائنس اور ٹیکنالوجی میں مہارت تامہ نہیں رکھتیں اور ترقی یافتہ قوموں سے صدیوں پیچھے ہیں۔

(د) صالحین سے مراد ایسے متقی و اہلِ عدل و احسان انسان ہیں، جو اپنی اور دوسروں کی آرزوئے حسن و زندگی کو پورا کرنے، معاشرے میں تضاد و اختلاف، خوف و حزن، ظلم و عدوان، فتنہ و فساد، فحشا و منکرات اور جرم و گناہ، کفر و شرک اور ناانصافی و استحصال کا استیصال کرنے اس میں توازن پیدا کرنے اور اُسے صلح و آشتی، اتفاق و اتحاد، یگانگت و رواداری، اخوت و حریت، عدل و احسان، محبت و رحمت، خیر و حسنہ اور امن و سلامتی کی جنت بنانے کی سعی و جہد کرنے والے ہوتے ہیں۔ علاوہ بریں وہ نہ صرف اپنا تزکیہ اور نور کی تکمیل کرنے میں کوشاں رہتے ہیں، بلکہ اپنے افرادِ معاشرہ اور دیگر افرادِ نسلِ انسانی کا تزکیہ نفس کرنے اور ان میں حسن و مسرت کا نور پیدا کرنے میں بھی مصروفِ عمل رہتے ہیں۔ یہ سب کچھ وہ اپنے اِلٰہ و رب کے حوالے سے کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ صالح افراد نہ صرف اپنے اور اپنے اہل و عیالٔ

قوم وملت، بلکہ تمام اقوام وافراد، حتیٰ کہ دیگر عوالم کی مخلوقات (حیوانی ہوں یا نباتاتی و جماداتی) کے لیے بھی رحمت ہوتے ہیں۔ یہی اسلام کی تحریک رحمۃ للعالمینی کی غایت ہے اور اسی بنا پر میں اسلام کو آرزوئے حسن سے بھی تعبیر کرتا ہوں۔

معاشرے میں صالحین کی کثرت ہو تو اس میں سرطانی طبقات کے پیدا ہونے کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں۔ بخلاف اس کے اگر صالحین کی قلت ہو جسے قحط الرجال سے تعبیر کرتے ہیں، تو معاشرے کے احوال وظروف سرطانی طبقات کی پیدائش کے لیے ازبس سازگار ہوتے ہیں۔ سرطانی طبقات ہمیشہ غیر صالح معاشرے ہی میں پیدا ہوتے ہیں؛ اور یہی رہزنِ طمانیت مسرت اور غارتگرِ امن وسلامتی کے ساتھ ساتھ معاشرۂ انسانی میں خوف وحزن کی آگ لگانے والے بھی ہوتے ہیں۔ اگر تمہیں سچی مسرت کی سچی طلب وجستجو ہے تو صدیق، شہید اور صالح بننے کی کوشش کرو۔ تمام جہانوں کی مخلوقات کے لیے رحمت بنو اور اس کے نتیجے میں اپنی دنیا کو حسن ومسرت سے منوّر ومنور کرلو۔ جمالیاتی نقطۂ نظر سے اگر تمہیں جمالیاتی مسرت کی آرزو ہے تو اپنی جمالیاتی حس کو فعّال وحرکی بناؤ اور اپنے جمالیاتی ذوق میں لطافت اور وسعت و بوقلمونی پیدا کرو۔ کائنات کے جمیل وجلیل مناظر اور زندگی کے حسین وعبرتناک نظاروں کا دیدۂ عبرت نگاہ سے جمالیاتی مشاہدہ کرو، خود بھی اہلِ حسن ومسرور بنو اور دوسروں کو بھی ایسا بنانے کی کوشش کرو اور ہمیشہ کوشش کرتے رہو۔

حاصلِ کلام یہ کہ اپنے الٰہ ورب کو خوش کرنے سے سچی خوشی ملتی ہے، جس کے لیے ہم نے جمالیاتی مسرت اور جمالیاتی ثروت کی تعبیریں اختیار کی ہیں۔ یاد رکھو! رضوانِ الٰہی سب سے بڑی اور بے مثال نعمت اور انسان کی عظیم وبے نظیر کامیابی ہے جو صالحین کے حصے میں آتی ہے۔ قرآنِ مجید ہمیں یہ حقیقت یاد دلاتا ہے کہ صالحیت وکامیابی لازم وملزوم ہیں اور اس دنیا میں وہی شخص کامیاب ہوا ہے جو صالح تھا۔

۱۳۔ شعورِ ذمّے داری :

شاید یہ بات تمہیں عجیب سی لگے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ آرزوئے حُسن اور شعورِ ذمے داری کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ آرزوئے حسن و زندگی نہ رہے تو انسان میں اپنی ذمے داری کا احساس و شعور نہیں رہتا۔ وجہ یہ ہے کہ احساس و شعورِ ذمے داری میں آرزوئے حُسن و زندگی مضمر ہوتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ احساس و شعورِ زندگی میں آرزوئے حسن و زندگی مضمر ہوتی ہے تو یہ بھی درست ہے۔ سنو! میں تمہیں اقوام کے عروج و زوال کا اصل الاصول بتاتا ہوں: "آرزوئے حُسن و زندگی فعال و حرکی رہے تو قوم ترقی کرتی رہتی ہے؛ اور اگر آرزو مضمحل و مردہ ہو جائے تو قوم بھی مضمحل و نحیف ہو کر زوال پذیر ہو جاتی ہے۔" اس اصول میں یہ نکتہ مضمر ہے کہ قدرت کو انسان (فرد ہو یا قوم) کی آزادیِ ارادہ و اختیار کا بے حد پاس ہے، اس لیے کہ یہ نعمتِ عظمیٰ ربِّ جلیل و کریم نے خود اُسے ودیعت کی ہے۔ اُمّتِ مُسلمہ کے زوال کے عوامل و اسباب میں سے ایک بنیادی سبب یہ تھا کہ اُس میں حُسن و زندگی کی آرزو کے فقدان کے ساتھ ذمے داری کا احساس و شعور بھی نہیں رہا تھا۔ ایسی صورتِ حال عموماً سرطانی معاشرے کی علامت ہوتی ہے۔ یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ سرطانی معاشرہ وہ ہوتا ہے جس میں فرعونوں، ہامانوں، قارونوں اور آزروں کی حکومت و سیادت ہو۔ ان سرطانی طبقوں کے ظلم و استحصال کے سبب افرادِ معاشرہ کے دلوں میں آرزوئے حُسن و زندگی کا چشمہ آہستہ آہستہ خشک ہونے لگتا ہے اور اس کے فطری نتیجے میں ان میں اپنی دینی، قومی، ملّی اور ملکی ذمے داریوں کا احساس و شعور اسی نسبت و رفتار سے کم ہونے لگتا ہے۔ علاوہ ازیں، وہ خدا فراموش و خود فراموش ہو جاتی ہے اور اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ ان نعمتوں سے محروم ہو جاتی ہے جن سے ربِّ رحیم نے اُسے نوازا ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ آرزوئے حسن و زندگی بدل جائے تو زندگی بدل جاتی ہے، نعمتیں بدل جاتی ہیں اور

وہ خود بدل جاتی ہے۔ اس صورتِ حال کے اصل ذمے دار سرطانی طبقے ہوتے ہیں، جو اپنی حکومت و سیادت، منصب و اقتدار اور مالی و دیگر مفادات کے تحفظ میں جس قدر منہمک ہوتے جاتے ہیں، اسی قدر اپنے فرائضِ منصبی اور ذمے داریوں سے غافل ہوتے جاتے ہیں۔ ان کے دیکھا دیکھی رعایا بھی اپنی دینی و ملّی اور قومی و ملکی ذمے داریوں سے غافل ہو جاتی ہے۔ اس سے معاشرے کے گوشے گوشے میں فساد اپنی نمود دکھانے لگتا ہے اور زندگی اپنے حُسن یعنی جمال و جلال اور حیات و قیومیت سے محروم ہو کر موت کی تمنا کرنے لگتی ہے اور قدرت اس کی تمنا پوری کر دیتی ہے، بشرطیکہ اس میں کسی مرحلے پہ آرزوئے حُسن و بقا نہ پیدا ہو جائے۔

ظلم کا خاصہ خوف و حُزن ہے۔ چنانچہ سرطانی طبقوں کی وجہ سے رعایا خوف و حُزن کے عذاب میں مبتلا ہو جاتی ہے تو اس میں اپنی ذمے داریوں کا احساس و شعور کم ہوتا جاتا ہے، حتّٰی کہ اس میں اُنھیں پورا کرنے کی اُمنگ رہتی ہے نہ خواہش۔ وہ اگر اپنی ذمے داریوں کو پورا کرنے کی کوشش بھی کرتی ہے تو بامرِ مجبوری۔ اس صورتِ حال سے رعایا اور سرطانی طبقوں کے مابین اختلاف و تضاد اور منافرت و مخاصمت کی خلیج حائل ہو جاتی ہے، جو جبر و اکراہ سے بتدریج وسیع سے وسیع تر ہوتی جاتی ہے۔ اس طبقاتی کشمکش سے خانہ جنگی کی صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے، جس سے اندرونی و بیرونی حریف قوتیں فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتی ہیں۔ وہ اس کوشش میں کامیاب ہوں یا نہ ہوں، اس قوم کی معاشی و سیاسی اور ثقافتی حالت کو برباد کر دیتی ہیں، اور وہ بالآخر تاریخی عمل کی حریف نہیں ہو سکتی اور محکوم و غلام یا بے خانماں و برباد ہو جاتی ہے۔

معاشرتی برائیوں، بدعنوانیوں، جرائم و مظالم، فواحش و منکرات، تضادات و اختلافات، منافرت و عصبیت اور فتنہ و فساد کی آتشِ خاموش اس حقیقت کی غمّازی کرتی ہے کہ قوم میں اپنی ذمے داریوں کا احساس و شعور خطرے کی حد تک کم ہو گیا ہے اور اس کا مداوا ناگزیر ہے، ورنہ قوم کی ہلاکت و بربادی شدنی ہے۔ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ تمھاری قوم کی بعینہٖ یہی

حالت ہے؛ افرادِ قوم بھی یہ جانتے ہیں، پر مانتے نہیں۔ یہ جان لو کہ مانو گے نہیں تو برباد ہو جاؤ گے۔ جس ربِ ذوالجلال والاکرام نے تمھیں پاکستان ایسی نعمتِ غیر مترقبہ عطا کی ہے؛ اگر تم نے اس کی قدر نہیں کی تو وہ اسے تم سے چھین لینے پر بھی قادر ہے، اور کفرانِ نعمت کے جرم کی پاداش میں تمھاری جگہ اس ملک میں تم سے بہتر کسی اور قوم کو بسا بھی سکتا ہے۔ افسوس کہ تم قدرت کے قانونِ مُجازات و استبدال سے ڈرتے نہیں ہو۔ آنکھ کھول کر دیکھو تو ہلاکت و بربادی کے غار کے دہانے پر کھڑے ہو اور مرگِ انبوہ ایک اشارے کی منتظر ہے۔

کیا تم یہ حقیقت نہیں جانتے کہ جو شخص دوسروں سے جھوٹ بولتا ہے، وہ اپنے آپ سے جھوٹ بولتا اور اپنے آپ کو جھٹلاتا ہے؛ جو شخص دوسروں کو دھوکا دیتا ہے وہ اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے؛ جو دوسروں پر ظُلم کرتا ہے وہ اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے؛ اور جس شخص کو اپنی ذمے داریوں کا احساس و شعور نہیں، وہ بے شعور و بے حس اور خود فراموش و خدا فراموش ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غیر ذمے دار لوگ ہی معاشرتی بُرائیوں اور بیماریوں کے ذمے دار اور اپنے ملک و قوم، بلکہ اللہ تعالیٰ کی کُل مخلوقات کے دشمن ہوتے ہیں، مگر بہت کم اس کا شعور رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر اہلِ قلم و فن کو اپنی ذمے داریوں کا احساس و شعور نہ رہے تو ان کا ادب و فن نہ صرف حسن و زندگی سے معرّا بلکہ نفسِ انسانیت کے لیے زہرِ شیریں ہوتا ہے اور اس کی آرزوئے حسن و زندگی کو سقیم و مفلوج کر دیتا ہے۔ تلوار کا زخم تن بدن پر لگتا اور صرف اُسے گھائل یا ہلاک کرتا ہے؛ اور اگر مجاہد کو لگے تو اُسے شہید' زندۂ جاوید اور وارثِ جنّت بنا دیتا ہے۔ برخلاف اس کے قلم کا زخم نفس پر لگتا اور اُسے گھائل کرتا ہے۔ اگر کاری لگے تو اُسے زندوں میں رکھتا ہے نہ مردوں میں۔ چونکہ قلم کا زخم تلوار کے زخم سے زیادہ مضرّت رساں ہوتا ہے، اس لیے اہلِ قلم و فن کو سب سے زیادہ اپنی ذمے داریوں کا احساس و شعور ہونا چاہیے اور انھیں حسین ادب و فن تخلیق کرنا چاہیے،

جس سے جمالیاتی ثروت ملے۔ ادب و فن کا معیار ہے حُسن اور حسنِ ادب و فن معیار ہے اہلِ قلم و فن کے احساس و شعورِ ذمے داری کا۔

اگر حکمران طبقے میں اپنی ذمے داریوں کا احساس و شعور نہ رہے تو وہ فرعونی۔ ہامانی طبقہ بن جاتا ہے، جس سے دو طبقے اور پیدا ہو جاتے ہیں: ایک قارونی اور دوسرا آزری۔ یہ چاروں سرطانی طبقے کینسر یا سرطان کی طرح وجودِ معاشرہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں اور اسے اندر اندر کھاتے جاتے ہیں، اور بالآخر اس کی ذلّت و مسکنت اور ضعف و ہلاکت کا موجب بن جاتے ہیں۔ سرطانی طبقے دو حقائق کی غمّازی کرتے ہیں: ایک اس بات کی کہ افرادِ معاشرہ میں اپنی ذمے داریوں کے احساس و شعور کا فقدان ہے، اور دوسرے اس بات کی کہ اس کے دن پورے ہو چکے ہیں اور مرگِ مفادات کی ساعتِ صفر آ پہنچی ہے۔

ذمے داری کا احساس و شعور انسان کے حسنِ فطرت کا خاصّہ ہے، لیکن تربیت سے پالتو اور جنگلی جانوروں میں بھی یہ شعور پیدا کیا جاتا ہے۔ اس دعوے کے ثبوت میں گھوڑوں، کتوں اور دیگر سرکس کے جانوروں کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ قرآنِ مجید کے نزدیک غیر ذمے دار لوگ دام و دد سے بدتر یا اس کی اپنی اصطلاح میں "اسفل سافلین" ہوتے ہیں۔ اس سے تم بآسانی یہ استنباط کر سکتے ہو کہ صالحین ہی کو اپنی ذمے داریوں کا احساس و شعور ہوتا ہے اور وہی معاشرے کے ذمے دار افراد ہوتے ہیں، جن کے حسنِ عمل کی بدولت معاشرہ نشو و ارتقا کرتا اور امن و سلامتی کی برکات سے بہرہ مند ہوتا اور آتشِ خوف و حزن سے محفوظ رہتا ہے؛ نیز صالحیت و شعورِ ذمے داری لازم و ملزوم ہیں۔ اصل یہ ہے کہ شعورِ ذمے داری انسان کی جمالیاتی ثروت اور عظمت و کامرانی کی پیش شرط ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب تک کسی قوم میں اپنی ذمے داریوں کا احساس و شعور رہتا ہے، وہ ترقی کی راہ پہ گامزن رہتی ہے اور جب وہ غیر ذمے دار ہونے لگتی ہے، اس کے انحطاط و زوال کا آغاز

ہو جاتا ہے۔ اسے تم قدرت کے "قانونِ ذمے داری" سے موسوم کر سکتے ہو۔ قوم کی طرح فرد بھی اس قانونِ ذمے داری کا مستوجب ہے۔ اگر تم اپنی آرزوئے حسن و زندگی کی تکمیل کرنا اور عظیم و کامیاب اور صاحبِ حُسن و سرور انسان بننا چاہتے ہو تو اپنی ذمے داریاں کو سمجھو، محسوس کرو اور ان سے بطریقِ احسن عہدہ برآ ہونے کی مقدور بھر سعی و جہد کرو اور اسے اپنا شعارِ زندگی بنا لو۔

جب تم نے اپنی ذمے داریوں کا بارِ گراں اٹھانا قبول کر ہی لیا تو پھر اُن سے گھبرانا اور کترانا کیا اور ان سے تغافل یا اغماض کیوں؟ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ اپنی ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہو گے تو اپنی آرزوئے حُسن کی تکمیل کر سکو گے اور اس کے نتیجے میں صاحبِ حُسن و سرور، محسنِ خلائق اور اپنے الٰہ و ربّ اور اس کے بندوں کے محبوب بنو گے۔ اس دنیا اور آخرت میں حسنہ پاؤ گے اور عذابِ النّار سے بچو گے اور وارثِ جنّت بنو گے۔

آخر میں اس نکتے کی صراحت بھی کر جاتی ہے کہ اپنی ذمے داریوں کی تکمیل کے لیے حُسنِ یقین و عمل کے علاوہ صبر و استقامت بھی ناگزیر ہے؛ نیز افرادِ معاشرہ میں اس کی ذمے داریوں کا احساس و شعور پیدا کرنا اور انہیں ان سے بطریقِ احسن عہدہ برآ ہونے کی تلقین کرتے رہنا بھی از بس ضروری ہے۔

۴۔ تلاشِ حق:

ہدایت و فلاح پا گئے وہ لوگ جو جویانِ حق ہیں۔ تلاشِ حق کے مدّعی تو بہت ہیں اور ہر قوم میں ہیں، لیکن جویانِ حق کہاں ہیں؟ اگر دنیا میں حق کی طلب و جستجو رکھنے والے ہوتے تو قرآنِ مجید سے، جو آئینۂ حق ہے، دور و مہجور یا گریزاں و ترساں نہ ہوتے۔ اگر کسی شخص کو واقعی پیاس اور پانی کی طلب و جستجو ہو اور وہ چشمۂ آبِ شیریں پہ پہنچ کر پانی

نہ بیٹے، یہ ممکن نہیں۔ یہ بات دو حال سے خالی نہیں ہو سکتی۔ یا تو وہ شخص تشنہ کام و طلبگارِ آب نہیں، یا وہ اندھا، بہرہ، غافل اور مدہوش ہے۔ قرآنِ مجید چشمۂ آبِ حیات ہے، جو لوگ اس سے آبحیات نہیں پیتے، وہ نہ تو زندگی کی لذت اور قدر و قیمت سے آشنا ہیں اور نہ زندگی کی طلب و جستجو ہی رکھتے ہیں۔ اہلِ ذوق و نظر جانتے ہیں کہ قرآنِ مجید صاف کلامِ الٰہی ہے، اس لیے آئینہ حسن و حق ہے، لہٰذا جو لوگ چاہے وہ مسلم ہوں یا غیر مُسلم، اس میں حقائق کو نہیں دیکھتے، یا دیکھتے ہیں تو تسلیم نہیں کرتے، وہ جویانِ حق نہیں بلکہ منکرانِ حق ہیں۔

منکرانِ قرآن کے دو بڑے طبقے ہیں: ایک مکتبِ حق کے طفلانِ گریز پا ہیں اور دوسرے مکتبِ کفر و شرک کے طفلانِ ثابت قدم۔ جو شخص جوان ہو یا پیر، اگر حق کو رو حق ناشناس یا حق سے کم آشنا ہے، وہ ذہنی اعتبار سے طفلِ نابالغ ہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ہر دو قسم کے طفل جویانِ حق نہیں؛ وہ دیکھنے میں زندہ و ہوشیار، لیکن اصل میں مدہوش و مردہ ہیں۔ حق کا متلاشی وہ ہوتا ہے جس کی طلبِ حق سچی ہوتی ہے، جسے اصطلاحِ قرآنی میں مُتقی کہتے ہیں۔ متقی گوشِ حق نیوش کے ساتھ حق کی باتیں سنتا اور ان پہ غور و فکر کرتا ہے؛ نیز اس پہ حق آشکارا ہو جائے تو اسے قبول کر لیتا ہے، چاہے وہ اس کے معتقدات و نظریات اور جذبات و احساسات کے خلاف کیوں نہ ہو۔ علاوہ بریں، وہ تاریخ کے ایّام اور زندگی کے حادثات و واقعات کو دیدۂ عبرت نگاہ سے دیکھتا، ان سے سبق حاصل کرتا اور ان میں حق دیکھتا ہے تو قبول کر لیتا ہے۔

یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جویائے حق وہ شخص ہوتا ہے جو ان چار صفات سے متصف ہو: تقویٰ، صدق، شہادت اور صالحیت۔ بالفاظِ دیگر، حق کی طلب و جستجو رکھنے والا متقی، صدّیق، شہید اور صالح ہوتا ہے۔ یہ تلاشِ حق کا عالمگیر معیار ہے۔ اب جسے دعویٰ ہو کہ وہ متلاشیِ حق ہے، وہ خود دیکھ لے کہ وہ اس معیار پہ پورا

اُترتا ہے یا نہیں؟ یہ بات بادی النظر میں دل کو نہیں لگتی، لیکن سمجھ میں آجائے تو دل کو لگتی ہے کہ آرزوئے حسن پیش شرط ہے تلاشِ حق کی۔ یوں سمجھو کہ آرزوئے حسن ہو تو تلاشِ حق ہوتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ آرزوئے حسن من جملہ اور چیزوں کے ان نفسیاتی احوال وظروف پر دلالت کرتی ہے: حق کی تلاش، خوب سے خوب تر کی جستجو، جمالیاتی تخلیقی فعلیت کی آرزو، داعیۂ عدل واحسان اور جذبۂ محبت ورحمت۔ غور سے دیکھو تو تلاشِ حق خود آرزوئے حسن کی غمازی کرتی ہے۔

جانتے ہو تلاشِ حق کا مطلب کیا ہے؟ اس کا مطلب دہرا ہے: ایک حقیقتُ صداقت کی طلب وجستجو اور دوسرے الحق والحسن کی آرزو وتلاش۔ تقویٰ کا یہی مفہوم ہے۔ چنانچہ ربّ العالمین نے اپنے آخری ومحفوظ اور زندۂ جاوید کلام کے آغاز ہی میں اس حقیقت کی صراحت کر دی کہ

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ٥ (البقرہ ۲: ۲)؛ یہ کتاب (اللہ) ہے۔ اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں، یہ جویانِ حق کو ہدایت دیتی ہے۔

یہ آیتِ جلیلہ ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کرتی ہے کہ حق کی سچی طلب وجستجو رکھنے والے ہی قرآنِ مجید ایسے سچے کلامِ الٰہی سے ہدایت پاتے ہیں۔ اس کی ضد یہ ہوئی کہ جو لوگ قرآنِ مجید سے ہدایت حاصل نہیں کرتے، چاہے وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، ان میں یقیناً حق کی طلب وجستجو نہیں ہوتی، جسے تقویٰ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس سے یہ اصل الاصول مستنبط ہوا کہ ہدایت صرف وہی لوگ پاتے ہیں، جنہیں تلاشِ حق ہوتی ہے۔ حق کا راستہ الحق والحسن کا راستہ ہے، جو جویائے حق کو اس تک پہنچاتا ہے اور یہ الحسن ہے جو اس کا معبود ومحبوب اور مطلوب ومقصود ہے اور اس کے لیے ہم نے جمالیاتی معروضِ حسن ومحبت کی جمالیاتی تعبیر اختیار کی ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ مشرک وبت پرست اور کافر جویائے حق نہیں ہوتے۔ دلیل یہ ہے کہ جس قوم کا الٰہ مشرکوں کی طرح ایک نہ ہو، بلکہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور بھی ہوں یا

منکرانِ خدا کی طرح اللہ تعالیٰ اس کا اِلٰہ ہی نہ ہو تو وہ توم جویائے حق کیسے ہو سکتی ہے؟ یاد رکھو! حق کی طلب وجستجو کے بغیر تم حق پا ہی نہیں سکتے، لہٰذا پہلے اپنے اندر حق کی طلب وجستجو پیدا اور آرزوئے حسن کو زندہ کرو اور اسے فعّال وحرکی بناؤ۔ حق پاؤ گے تو "دوست" پاؤ گے، دُنیوی واُخروی حسنہ پاؤ گے، خوف وحزن اور عذاب النار سے بچو گے؛ صاحبِ حُسن وسُرور بنو گے اور لذّتِ زندگی سے بہرہ مند ہو گے۔ یاد رکھو! اہلِ حق ہی لذّتِ زندگی سے آشنا اور اہلِ حُسن وسُرور ہوتے ہیں۔ زندگی میں لذّت اس کی تاثیرِ حُسن ہے اور ربِّ جمیل وجلیل اس کا حسن اور تمہارا معروضِ عشق وپرستش ہے۔ حقیقت میں زندہ وہ ہیں جن کی زندگی حسنِ وصالِ "دوست" سے منوّر ومسرور ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ جویانِ حق اصل میں حُسن وزندگی کی طلب وتلاش میں ہوتے ہیں، جبکہ اہلِ حق لذّتِ حُسن وزندگی سے آشنا ہوتے ہیں۔

۱۵۔ جمالیاتی۔اخلاقی اقدار: [۲۵]

خوب سے خوب تر کی طلب وجستجو ہی انسان کو سفر میں رکھتی ہے، چاہے یہ سفر اپنی اندر کی دُنیا کا ہو یا باہر کی دُنیا کا، یا اُس دُنیا کا جسے عالمِ لازمان ولامکان کہتے ہیں۔ یہ عالم اس لحاظ سے عالم نہیں کہ یہ مخلوق ومعلوم نہیں، یا قدیم ہے؛ بلکہ اس اعتبار عالم ہے کہ یہ "ہے"۔ چونکہ یہ الحسن والحق کا عالمِ ذات ہے، اس نسبت سے اُس کے لیے ہم نے "عالمِ حُسنِ ذات" کی تعبیر اختیار کی ہے۔ اس عالم کو "حریمِ ذات" سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ دو عوالم اور بھی ہیں: برزخ اور الحیوان۔ (ا) برزخ اس عالمِ حجاب کو کہتے ہیں، جہاں نفوس کو لذّتِ موت سے آشنا ہونے کے بعد قیامت تک کے لیے رکھا جاتا ہے۔ اس عالم کی تعبیر کچھ اس طرح کر سکتے ہیں:

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

(ب) الحیوان: برزخ کے وراء ایک اور عالم ہے، جہاں زندگی ہے موت نہیں اور جو

انسان کا آخری گھر ہے، لہٰذا اس کے لیے ربّ العالمین نے قرآنِ مجید میں "الحیوان" اور "دارالآخرت" کی فکر انگیز و بصیرت افروز تعبیریں اختیار کی ہیں۔

جس طرح دُنیا کے سفر میں آنکھ خوب سے خوب تر کی طلب وجستجو میں کائنات و حیات کے مناظر اور نظارے دیکھتی چلی جاتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی کوئی منظر اس کا دامنِ دل میکشد کہ جا اینجاست"، اور وہ رُک جاتی ہے، کچھ اسی طرح عقل اپنی سوچ کے سفر میں گوناگوں مسائل کا مشاہدہ کرتی چلی جاتی ہے کہ دفعتاً کوئی مسئلہ اس کا عناں گیر ہو جاتا ہے اور وہ رُک جاتی ہے۔ ایک روز حسبِ معمول میری سوچ کا سفر جاری تھا کہ اس کی راہ میں ایک حسین مگر دشوار گزار مقام آیا اور وہ رُک گئی۔ مقامِ فکر یہ تھا کہ اخلاقی اقدار مطلق و دائمی ہیں یا اضافی و تغیّر پذیر؟ اس مقام پہ نام نہاد اہلِ فکر و دانش کی صداؤں کا شور تھا کہ اخلاقی اقدار اضافی و تغیّر پذیر ہیں اور زمانے کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ جس طرح اذواقِ انسانی بدلتے رہتے ہیں اسی طرح اخلاقی اقدار بھی بدلتی رہتی ہیں۔ "دانشوروں" کے اس شور و غل میں عقل جو وابستہ "کلامِ دوست" تھی، سراسیمہ تو ہوئی مگر مرعوب نہ ہوئی۔ وہ اس مقام پہ رکنے کے باوجود فعّال رہی اور اپنے اس مدارِ فکر کے گرد گھومنے لگی: عقل اگر سلیم اور وابستہ "کلامِ دوست" ہو تو "وہ" اس کا ہادی و ناصر بن جاتا ہے۔ غوّاصِ عقل دریائے فکر میں اس مسئلے کا گوہرِ حل تلاش کرنے میں مستغرق تھا کہ ندائے سروش آئی:

"اے سوچنے والے! تیری سوچ تجھے مبارک ہو۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو اُولی الالباب کی طرح سوچتے ہیں، اور جن کی سوچ تخلیقی، بامقصد اور حکیمانہ ہوتی ہے۔ دام و دد کی طرح سوچنا تو عوام کا شعور ہے، اس اعتبار سے ان میں سے اکثر اسفل سافلین ہوتے ہیں۔ کاش انسان پر یہ راز کھلے کہ جو شخص صرف اپنے دُنیوی مفادات کے لیے سوچتا ہے، لیکن اُخروی حسنہ کے لیے سوچتا ہے نہ بنی نوعِ انسان اور دیگر مخلوقات کے لیے، اس کی سوچ

مکڑی کی طرح اپنے گرداگرد خوف و حزن کے جالے بُنتی رہتی ہے، جس میں پھنس کے رہ جاتی ہے۔ عصرِ حاضر کی سوچ بھی یہی کیفیت ہے۔ وہ عنکبوتِ زمانہ ہے اور تیزی سے خوف و حزن کے جالے بُنتی جا رہی ہے جس سے باہر نکلنا اب اس کے بس میں نہیں رہا۔ روحِ انسانی کے خوف و حزن کی یہی وجہ حقیقی ہے، لیکن بہت کم اس کا شعور رکھتے ہیں۔ یہ بات سمجھنے کی ہے کہ بے قراری و پریشانی، انتشارِ ذہنی و تفکرات، اوہام و خدشات، اضطراب و کرب، احساسِ محرومی و تنہائی اور قنوطیت اصل میں خوف و حزن ہی کے نام اور صورتیں ہیں۔

تیرا سوچنا تجھے مبارک ہو اور تیری سوچ جادۂ مستقیم پر سفر کرتی رہے تاکہ تمہارے نور کی تکمیل ہوتی رہے اور اس روشنی میں تم اپنی راہ و منزل کو دیکھتے، پہچانتے سفر کرتے رہو۔ گھبرانا نہیں، کسی مقام پر ٹھیرنا نہیں کہ ایک لحظہ ٹھہرنے سے رہوارِ زندگی برسوں اور بعض اوقات صدیوں پیچھے رہ جاتا ہے۔ سوچ کا سفر کبھی ختم نہیں ہوتا۔ یہ لامتناہی سفر ہے، وجہ یہ ہے کہ نہ آرزوئے حسن فنا ہوتی ہے، اور نہ سوچ کا سفر ہی ختم ہوتا ہے۔ زندگی اور وقت جو ہمسفر ہیں، حسن کی طلب و جستجو میں رواں دواں ہیں اور ہمیشہ رواں دواں رہیں گے کہ یہ ان کی تقدیر ہے۔

عقل سے متعلق یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہ اپنے نور سے محروم ہو جائے تو سلیم نہیں رہتی اور قبیح و سقیم ہو جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں ان کی آرزوئے حسنِ زندگی بھی اس کے قبح و سقم کی نسبت سے سقیم و نحیف اور مفلوج و مردہ ہو جاتی ہے۔ علاوہ بریں اس کا اپنے موضوعی یہ معروضی شیطان کی جمالیاتی وسوسہ اندازی و فریب کاری سے اس کا مقلد بن جانا اور اس کی سوچ کا جادۂ مستقیم سے بھٹک جانا یقینی ہو جاتا ہے۔ چونکہ عصرِ حاضر کی عقل بہت حد تک سلیم نہیں رہی، اس لیے قبیح و سقیم اور مقلدِ ابلیس ہے؛ نیز فریب خوردہ بھی ہے اور عیار بھی کہ یہی عقلِ طاغوتی کی پہچان ہے۔ چنانچہ اس نے کمال عیاری سے یہ مشہور

کردیا ہے کہ جمالیاتی و اخلاقی اقدار مطلق و دائمی نہیں۔ بلکہ اضافی اور قابلِ تغیر و تبدل ہیں۔ اسکی دلیل یہ کہ ذوقِ انسانی کی طرح جمالیاتی و اخلاقی اقدار بھی اضافی و تغیر پذیر ہیں۔ بظاہر وزنی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ بے وزن و بے بنیاد ہے۔ دلیل یہ ہے کہ جمالیاتی اقدار کُلیات کے زمرے میں آتی ہیں اور کُلیات مُطلق و دائمی ہوتے ہیں۔ اضافی و تغیر پذیر نہیں ہوتے؛ نیز یہ جمالیاتی حِس کے معروضاتِ حسن ہیں اور جمالیاتی حِس بھی ان کی طرح عالمگیر و ہمہ گیر اور ابدی و ناقابلِ تغیر و تبدل ہے۔ بخلاف اس کے ذوقِ انسانی کا تعلق جزئیات و افراد سے ہوتا ہے اور ذوق کی طرح ان میں اختلاف و تنوع پایا جاتا ہے؛ نیز ذوق اور جزئیات و افراد اضافی و تغیر پذیر ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ذوقِ انسانی میں اختلاف و تنوع پایا جاتا ہے اور وہ تغیر پذیر ہے۔ اس لیے ہر زمان و مکان میں بدلتا رہتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ذوق کے بدلنے سے جمالیاتی و اخلاقی اقدار، جو مطلق و دائمی ہیں۔ بدل جاتی ہیں۔ یہ منطقی مغالطہ ہے، جو تلبیسِ ابلیس[۲۶] ہے۔

اس مفہوم کو اب میں دو ایک مثالوں سے واضح کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہ سامنے کی بات ہے کہ جمالیاتی حِس کو خوشبو پسند ہے چنانچہ حُسنِ بو جس انداز و رنگ اور کیف و کم میں شامہ پر اپنا جلوہ پیدا کرے، جمالیاتی حِس کا جمالیاتی معروض ہوتا ہے اور اسے جمالیاتی لذت و حظ اور کیف و سُرور دیتا ہے؛ لیکن یہ جمالیاتی ذوق ہے جس کے اختلاف و تنوع کے سبب کسی فرد کو گلاب کی خوشبو زیادہ مرغوب و محبوب ہوتی ہے تو کسی کو موتیا کی، کسی کو بوئے حنا زیادہ پسند ہوتی ہے تو کوئی بوئے مشک و عنبر کا دلدادہ ہوتا ہے۔ علیٰ ہذالقیاس۔ اسی طرح رنگ جمالیاتی حِس کی وجہ سے انسان کا معروضِ حسن و محبت ہے۔ لیکن افراد کے جمالیاتی ذوق میں اختلاف و تنوع پائے جانے کی وجہ سے کسی کو ایک رنگ زیادہ پسند ہوتا ہے تو دوسرے کو کوئی دوسرا رنگ زیادہ مرغوب و محبوب ہوتا ہے۔ یہی حال جمالیاتی جنسی معروض کا ہے، چاہے وہ صنفِ جلیلہ سے تعلق رکھتا ہو یا

صنفِ جمیلہ ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر مرد کا بحیثیت انسان کے جمالی جنسی معروض اس کا معروضِ محبت اور جمالیاتی حِس کی بدولت اس کا معروضِ حُسن بھی ہوتا ہے؛ لیکن اس فرد کی حیثیت سے اور جمالیاتی ذوق کے اختلاف کے باعث کسی مرد کو اگر ایک قسم کے رنگ و روپ، قدوقامت اور نین نقشے کی صنفِ جمیلہ زیادہ مرغوب و محبوب ہوتی ہے تو دوسرا کسی اور رنگ و روپ، قدوقامت اور نین نقشے کی صنفِ جمیلہ پر دم دیتا ہے، علیٰ ہذا القیاس۔

علاوہ بریں، چونکہ جمالیاتی ذوق تغیّر پذیر ہے، اس لیے انسان یکسانیت سے اکتا جاتا اور تغیّر و تبدّل اور اختلاف و بوقلمونی چاہتا ہے۔ اس وجہ سے زمانے کے انداز و رنگ بدلتے رہتے ہیں، جسے آج کل کی زبان میں فیشن بدلنا کہتے ہیں۔ اس سے یہ مستنبط ہوا کہ جمالیاتی اخلاقی اقدار نہیں بلکہ زمانے کے انداز و رنگ یا فیشن ہیں جو امتدادِ زمانہ کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ اکثر ممالک میں فرعونی و ہامانی اور قارونی و آزری، نیز میخواری و قماربازی، عریانی و جسم فروشی، رشوت ستانی و بددیانتی، سلب و نہب، اغوا و بردہ فروشی، سمگلنگ و ذخیرہ اندوزی، ضمیر فروشی و بیوفائی اور ظلم و بدعہدی زمانے کے انداز و رنگ ہیں، لیکن عقل و طبعِ سلیم کے نزدیک ہر زمان و مکان کی طرح آج بھی یہ سب "منکرات" ہیں۔ اس پر خود انسان کی بصیرت شاہد ہے۔ چنانچہ ہر سلیم الطبع انسان کسی "منکر" کو اپنی طرف منسوب کرنا پسند نہیں کرتا، بلکہ اُسے طبعاً بُرا سمجھتا ہے۔ تاریخ و مشاہدہ (وعصر) گواہ ہیں کہ عقل نے بدخُلقی و بدکرداری، بدگوئی و خوئے بد، سیئہ و شر، قبح و قبیح کاری، فتنہ و فساد اور جنگ و جدل کو ہمیشہ بُرا ہی سمجھا ہے، جبکہ ان کی اضداد مثلاً حُسنِ خلق و کردار، عدل و احسان، صلح و آشتی، خیر و حسنہ، حُسن و حُسن کاری، امانت و دیانت، صدق و پاکیزگی اور امن و سلامتی کو ہمیشہ ہی اچھا سمجھا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جمالیاتی۔ اخلاقی اقدار جو معروف ہیں، ہمیشہ ہی معروف رہی ہیں؛ بخلاف اس کے اقدارِ قبیحہ یعنی غیر جمالیاتی اور غیر اخلاقی اقدار ماضی میں بھی منکرات تھیں، حال میں بھی منکرات ہیں اور مستقبل میں بھی منکرات رہیں گی۔

یہاں یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ انسان کی جمالیاتی حِس، ضمیر اور نفسِ لوّامہ کبھی مرتے نہیں، بلکہ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں، خواہ وہ کتنے ہی کمزور و نحیف اور سقیم و مفلوج کیوں نہ ہو جائیں۔ جس طرح ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں قوم مردہ ہوگئی ہے، حالانکہ وہ زندہ ہوتی ہے، اسی طرح جب ہم ضمیر، نفسِ لوّامہ اور جمالیاتی حِس کو مردہ کہتے ہیں تو محض محاورۃً ایسا کہتے ہیں۔ حسّی، قلبی یعنی نفسی نظام کے یہ اجزائے لاینفک نفس کی موت سے پہلے کبھی نہیں مرتے۔ چنانچہ موت تک انسان میں نفسیاتی انقلاب آنے کا امکان رہتا ہے؛ لہٰذا موت تک حیاتِ انسانی میں جمالیاتی، نفسیاتی لمحے اور تقلیبی ۔ نفسیاتی لمحے کی وقوع پذیری کو خارج از امکان نہیں سمجھنا چاہیئے۔ اس مفہوم کی باندازِ دیگر بھی صراحت کردی جاسکتی ہے۔ انسان کی آرزوئے حسن کبھی مرتی یا معدوم و فنا نہیں ہوتی۔ وہ اسے شکمِ مادر سے لے کر دُنیا میں جاتا ہے اور شکمِ گور میں ساتھ لے جاتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ انسان کے لیے، جسے عمر بھر شعوری یا لاشعوری طور پر حُسن کی طلب و جستجو رہتی ہے، قبح و سیّئہ کی ہر شکل و صورت مکروہ و ناپسندیدہ یعنی مُنکر اور حسَن و حسنہ کی ہر شکل و صورت اس کی جمالیاتی معروض اور قرّۃُ العین یا معروف ہوتی ہے۔

اس گفتگو سے دو حقائق ثابت ہوئے: اوّلاً اخلاقی اقدار جمالیاتی ہوتی ہیں، اور ثانیاً، جمالیاتی ۔ اخلاقی اقدار مطلق و دائمی ہوتی ہیں۔

حواشی و تشریحات

۱۔ **ربّ زندہ و قیّوم:** اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید میں اپنے متعلق فرماتا ہے: اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ج لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ (البقرہ ۲: ۲۵۵)؛ اللہ ہی ہے؛ اس کے سوا کوئی معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود نہیں ہے (اس لیے کہ تنہا) وہی زندہ بالذات قائم بالذّات ہے؛ (اس لیے) نہ اونگھ اُسے آتی ہے نہ نیند۔

اس آیتِ جلیلہ سے کئی حقائق مترشح ہوتے ہیں، جن کی طرف مجمل اشارے کیے جاتے ہیں: صرف اور تنہا اللہ تعالیٰ ہی زندہ بالذات ہے، اور اس کے سوا کوئی چیز زندہ بالذات نہیں، لہٰذا ہر چیز مخلوق و حادث ہوئی؛ نیز کوئی بھی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو زندگی و بقا دینے والا نہیں ہے۔ علاوہ بریں چونکہ تنہا وہی زندہ بالذات اور اپنی سب مخلوقات کو زندگی دینے والا ہے، اس لیے تنہا وہی قائم بالذات ہے۔ اس سے دو نتائج مستنبط ہوتے ہیں: اوّلاً، اللہ تعالیٰ ہی سب مخلوقات کو زندگی و قیام دینے والا ہے، لہٰذا ہر ہستی ایک تو مخلوق ہوئی، اور دوسرے اپنی زندگی و بقا کے لیے اللہ تعالیٰ کی محتاج اور مرہونِ منت ہوئی۔ ظاہر ہوا کہ اُس کے سوا کوئی ہستی خواہ کتنی عظیم و برگزیدہ کیوں نہ ہو، اِلٰہ نہیں ہو سکتی۔ ثانیاً، ایسی ہستی جو زندہ و بالذات وقائم بالذات ہو اور اور سب مخلوقات کو زندگی و بقا عطا کرنے والی ہو، تنہا وہی اپنی مخلوقات کی معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود ہو سکتی ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ ہے، جو یکتا و صمد ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اصلاً سب سے بے نیاز اور ہر حالت سے منزہ ہے، لیکن سب اس کے محتاج و نیاز مند ہیں (اپنی زندگی و بقا، ربوبیت و ہدایت، علم و حکمت، فن و ٹیکنالوجی، الغرض ہر حاجت و ضرورت کے لیے)۔ علاوہ بریں چونکہ وہ زندہ بالذات اور صمد ہے، لہٰذا نہ تو اس نے کسی کو اولاد کی طرح پیدا کیا اور نہ کسی نے اُسے اولاد کی طرح پیدا کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صمدیت نہ اولاد کو چاہتی ہے نہ الصمد نے کوئی اولاد پیدا کی ہے۔ اصلاً وہ یکتا ہے اور اس کا ہمسر کوئی نہیں (دیکھیے سورۂ اخلاص ۱۱۲)۔

اب دو اور فکر انگیز حقائق کی نشاندہی کر دی جاتی ہے۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ چونکہ زندہ بالذات (= الحیّ) اور قائم بالذات (القیّوم) ہے، لہٰذا وہ اونگھ اور نیند سے منزہ و ماوراء ہے۔ وجہ یہ ہے کہ نیند موت کی زوج اور خاصہ ہے۔ دوسرا یہ کہ

یہ موت ہے، جو متنفس کو مضمحل و واماندہ بناتی ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ اضمحلال و واماندگی (= لُغُوب) سے منزّہ و ماوراء ہے۔ چنانچہ اُس نے آسمانوں اور زمین کو چھ ایّام یا ادوار میں تخلیق کیا تو اُسے نہ تو اضمحلال و واماندگی کا احساس ہوا اور نہ آرام کرنے کی حاجت ہی محسوس ہوئی۔ اس سے توراۃ میں اس تحریف کی تردید ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چھ ایّام میں آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تو ساتویں دن اُس نے تکان کے سبب آرام کیا (تورات، باب پیدائش)۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری زندۂ جاوید اور محفوظ و مصوّن کلام میں یہود و نصارٰی کے اس باطل عقیدے کی صاف الفاظ میں تردید کی ہے: وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ۝ (قٓ ۵۰: ۳۸)؛ ہم نے بلاشُبہ آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، چھ ایّام یا ادوار میں پیدا کیا اور ہمیں تکان اور ماندگی نہ ہوئی۔

۲- **زندہ تخلیق**: قرآنِ مجید کی رُو سے ربّ العزّت کی ہر مخلوق عالمِ حیوانی سے تعلّق رکھتی ہو یا نباتاتی و جماداتی عوالم سے، اس کی تسبیح کرتی اور اس کے احکام کی طوعاً و کرہاً تعمیل کرتی ہے (الاسراء ۱۷: ۴۴؛ آلِ عمران ۳: ۸۳ و الرعد ۱۳: ۱۰)۔ اس سے یہ استنباط کرنا مستبعد نہ ہوگا کہ کائنات کی ہر چیز زندگی، شعور اور زبان رکھتی ہے، اگرچہ انسان کو اس کا ابھی شعور نہیں اور سائنس نے ابھی یہ حقیقت ثابت کرنی ہے۔

۳- **دید و رضوان**: اس کا مطلب اللہ تعالیٰ کی رویت و رضا ہے۔ قرآنِ مجید کی رُو سے رضوانِ الٰہی سب سے بڑی نعمت ہے (التوبہ ۹: ۷۲)۔

۴- **حریفِ نفسی۔ابلیسی**: اس سے مراد نفسِ امّارہ اور شیطان ہے جو انسان کو دھوکا دینے اور گمراہ کرنے کی خاطر باہم مل کر اس کی قبیح سے قبیح خواہشات و اعمال کو اسے خوشنما و دلکش بنا کر دکھاتے ہیں۔ اس تعبیر میں خطِ وصل (-) دونوں کے ناگزیر تعاون و اشتراکِ عمل کی علامت۔ اس کے لیے ہم موضوعی معروضی شیطان کی تعبیر

بھی استعمال کرتے ہیں۔

۵۔ شہادت کا حُسن المقام: یہ نظریہ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۴۳ سے ماخوذ ہے۔

۶۔ سرطانی عناصر: ان سے مراد استحصالی طبقے ہیں جو اصطلاحِ قرآنی میں چار ہیں: فرعونی، ہامانی، قارونی اور آزری۔

۷۔ اس نظریے کا ماٰخذ سورۂ رحمٰن (۵۵) کی آیت ۲۹ ہے۔

۸۔ دیکھیے الرحمٰن ۵۵:۲۹۔

۹۔ صُورتِ حال: انگریزی میں (Situations)

۱۰۔ کُفرانِ نعمت: دیکھیے البقرہ ۲: ۲۱۱؛ اور الانفال ۸: ۵۳۔

۱۱۔ دیکھیے البلد ۹۰: ۴؛ اور الطور ۵۲: ۲۱۔

۱۲۔ دیکھیے الانفال ۸: ۶۰۔

۱۳۔ قرآن حکیم نے موت کو "الیقین" سے تعبیر کیا ہے، کیونکہ یہ ایسی یقینی چیز ہے جس کے متعلق کوئی شخص شک و شُبہ کر ہی نہیں سکتا؛ دیکھیے الحجر ۱۵: ۹۹۔

۱۴۔ یہ اصل قرآنِ مجید میں اس طرح بیان ہوئی ہے: لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا (البقرہ ۲: ۲۳۳)؛ نیز دیکھیے البقرہ ۲: ۲۸۶؛ الانعام ۶: ۱۵۲؛ اور المؤمنون ۲۳: ۶۲۔

۱۵۔ قرآن مجید کی زبان میں لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍ ؕ (البلد ۹۰: ۴)؛ بلاشبہ ہم نے انسان کو محنت و مشقت میں پیدا کیا ہے، یعنی محنت و مشقت اس کا مقدر ہے۔

۱۶۔ خلیے: (Cells)

۱۷۔ یہ آیتِ جلیلہ علم کی ماہیت اور اس کی غایت پر حرفِ آخر ہے، نیز یہ فلسفۂ تعلیم جدید (بشمول سائنس اور ٹیکنالوجی) کی اساسِ محکم ہے۔ یہاں یہ جتا دینا فائدے سے خالی نہ ہوگا کہ جب تک اُمّتِ مُسلمہ نے اپنے نصابِ تعلیم کی بنیاد اس نصِ قرآنی پر استوار رکھی، وہ ترقی اور اقوامِ عالم کی قیادت کرتی رہی اور جب اُس نے یہ بنیاد بدل ڈالی،

وہ رو بہ تنزل ہو گئی اور اب تک ہے۔ اگر ہمیں اس دُنیا میں عزت و آبرو اور آزادی و خوشحالی سے زندہ رہنا ہے تو ہمیں پھر اس آیت کریمہ پر اپنے نظامِ تعلیم کی اساس استوار کرنا ہو گی۔

۱۸۔ **خوفِ الٰہی** : ایک طرف اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اولیاء اللہ کو خوف ہوتا ہے نہ غم۔ اور دوسری طرف اس کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو (البقرہ ۲: ۱۹۴، ۱۹۶؛ النساء ۴: ۱۲۸، ۱۲۹ و بمواضع کثیرہ)۔ ان ارشادات میں بظاہر تضاد نظر آتا ہے، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں، بلکہ ان میں فلسفۂ حیات کا دفتر پنہاں ہے۔ یہ موضوع تفصیل و اطناب کا متقاضی ہے، لیکن موقع اجمال و اختصار چاہتا ہے۔ لہٰذا اس کی صراحت کر دی جاتی ہے، مگر اختصار کے ساتھ تقوٰی اور خشیتِ الٰہی کا ایک مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ربّ العالمین و ملک النّاس بھی ہے اور وہی حاکم و عادل اور مالکِ یوم الدّین بھی ہے، لہٰذا انسان کو اس کے عدل اور قانونِ مکافاتِ عمل سے ڈرنا چاہیئے۔ دوسرے اللہ تعالیٰ رحمٰن و رحیم، غفور و کریم، رؤف و ودود، ستّار و العیوب، توّاب الرّحیم اور مستجیب الدعوات ہے اور اس نے رحمت کو اپنے اوپر لازم کر رکھا ہے (الانعام ۶: ۱۲، ۵۴)؛ نیز وہ انسان کا معروضِ حُسن و محبّت (یعنی الٰہ) بھی ہے، اس لیے اس کے ڈر میں محبت مضمر ہوتی ہے، جس طرح صالح بچوں کے دلوں میں اپنی شفیق و مہربان ماں کے ڈر میں اس کی محبّت پنہاں ہوتی ہے۔ خشیتِ الٰہی حقیقت میں محبتِ الٰہی کی غمّاز ہوتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ خشیتِ الٰہی یا تقوے میں خوف ماسوا کی طرح آتشِ سوزاں نہیں ہوتی، بلکہ اس میں جمالیاتی سوز ہوتا ہے، جس میں قرّۃُ العین یا جمالیاتی ٹھنڈک ہوتی ہے۔

۱۹۔ دیکھیے سورۂ انعام ۶: ۱۲، ۵۴۔

۲۰۔ **یاس و قنوطیت** : اسلام کے نزدیک یاس و قنوطیت دراصل اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوسی ہے اور اس کے اس ارشاد کی تکفیر ہے کہ وہ ربّ رحمان و رحیم، غفّار الذّنوب اور مستجیب الدعوات ہے، نیز اس نے رحمت کو اپنے اوپر لازم کر رکھا ہے، نیز اس بنا پر وہ ان لوگوں کو گمراہ قرار دیتا ہے جو رحمتِ الٰہی سے مایوس

ہوتے ہیں (الحجر ۱۵: ۵۶)؛ اور بنی نوع انسان کو تاکید کرتا ہے کہ وہ کسی حال میں بھی رحمتِ الٰہی سے مایوس نہ ہوں، کیونکہ وہ جملہ گناہوں کو بخش دیتا ہے، اس لیے کہ وہ بلاشبہ غفور و رحیم ہے (الزمر ۳۹: ۵۳)۔

۲۱۔ جمالیاتی تحلیلِ نفسی: (Aesthetic psycho-analysis)

۲۲۔ قانونِ استبدال: قرآنِ حکیم کے فلسفۂ عروج و زوالِ اقوام کی رُو سے جس قوم میں آرزوئے حسن و زندگی نہیں رہتی اور وہ مردہ و ناکارہ ہو جاتی ہے تو اس کے احوال و ظروف کے مطابق دو نتائج ظہور پذیر ہوتے ہیں: یا تو وہ حسنِ آزادی سے محروم ہو کر ذلیل و خوار ہو جاتی ہے، یا وہ تاریخ کی حریف قوتوں سے شکست کھا کر اس طرح ہلاک یا نابود برباد ہو جاتی ہے کہ اس کی جگہ کوئی زندہ و بہتر قوم لے لیتی ہے، جس کے لیے ہم نے قانونِ استبدال کی تعبیر اختیار کی ہے (دیکھیے محمد ۴۷: ۳۸)۔

۲۳۔ استحصال: انگریزی میں (Exploitation)

۲۴۔ ساعتِ صفر: انگریزی میں (Zero hour)

۲۵۔ جمالیاتی۔ اخلاقی اقدار: انگریزی میں (Aesthetic-ethical values)

۲۶۔ تلبیسِ ابلیس: اس کا معنیٰ ہے ابلیس کا دھوکا۔ چونکہ ابلیس انسان کو دھوکا دینے کی خاطر اس کی آرزوؤں اور اعمال کو چاہے وہ قبیح کیوں نہ ہوں، خوشنما دلکش بنا کر دکھاتا ہے، لہٰذا اس کے لیے ہم نے ابلیس یا شیطان کی جمالیاتی فریب کاری کی تعبیر بھی اختیار کی ہے۔

۲۷۔ عصر: قرآنِ مجید کے تتبع میں ہم نے یہ لفظ تاریخی عمل، تاریخ اور مشاہدے کے معنیٰ میں اصطلاحاً استعمال کیا ہے۔

مقام ۹

آرزوئے جمالِ سیاسی

سوچیے تو سوچ کا سفر عبرت انگیز و بصیرت افروز اور عجیب و غریب ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا مقام بھی آجاتا ہے جو دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست۔ میں اس سفر میں رواں تھا کہ ایک مقام آیا۔ غور سے دیکھا تو وہ خزاں دیدہ گلستانِ زندگی تھا۔ اس میں دیکھنے کو تو بہت کچھ تھا لیکن حسن و زندگی کا فقدان تھا۔ بہت کچھ، معدودے چند لوگوں کے لیے اور بہت کم، بہت زیادہ عامۃ الناس کے لیے تھا۔ وہاں اندھوں اور بہروں کی بہتات تھی اور سننے اور دیکھنے والے بہت قلیل تھے۔ وہ محکوموں کی بستی تھی۔ احتیاج و محرومی کے احساسات اور خوف و حزن مار و کژدم کی صورت اُن کے نفوس کو ڈس رہے تھے۔ ان میں کچھ ایسے اشخاص بھی نظر آئے جن کے لبوں پہ اِستہزاء و شماتت سے مزّین شیطانی مسکراہٹ اور آنکھوں میں خوفناک و عیّارانہ چمک تھی۔ اُن کے جسم تقدّس و دانش کے خرقۂ سالوس سے آراستہ تھے۔ لیکن ان کے اندازِ کردار میں غرور و تکبّر اور تفاخر و تکاثُر کا رنگ تھا۔ انہیں دیکھ کر یہ جاننے کی طلب و جستجو ہوئی کہ وہ کون ہیں؟ آرزو سچی ہو تو اُسے ربِّ سمیع و بصیر پورا کر ہی دیتا ہے جو واقفِ اسرارِ قلوب اور مستجیب الدّعوات ہے۔ ندائے سروش آئی:

اے دریائے فکر کے غوّاص! یہ لوگ جو خرقۂ سالوس سے مزّین ہیں، معاشرتی

سرطان ہیں، جنہوں نے ظلم وجبر اور مکر وفریب سے سیاسی عسکری اور اقتصادی ومذہبی قوت و سطوت حاصل کرلی ہے۔ یہ عیاری ومکاری میں کمال حاصل کیے ہوئے ہیں اور ان کا کمالِ دجل وفریب یہ ہے کہ لوگ جانتے ہیں کہ وہ معاشرتی وجود کے خطرناک ومہلک سرطان ہیں لیکن مانتے نہیں اور جو مانتے بھی ہیں وہ ان کے خلاف جہاد کرنے سے گریزاں وترساں ہیں۔ ان معاشرتی سرطانوں نے لوگوں کی آرزوئے حسن وحیات کو مفلوج ومردہ کردیا ہے اور وہ ہر زمان ومکان میں نام اور بھیس بدل بدل کر آتے ہیں، اور اپنے ہی وجودِ معاشرہ کے فعال ومحنت کش عناصر کا خون چوستے اور انہیں نحیف ونزار اور مفلوج وہلاک کرتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے ابھی بتایا ہے یہ بڑے عیار وساحر ہیں، اور ان ابلیسی ساحروں کی شعبدہ بازی کا کمال ہے کہ لوگ اُن کے ہاتھوں اپنی بربادی پر نالاں وفریاد کناں ہونے کے باوجود انہیں اپنے سیاسی ومعاشی اور دینی محافظ ومددگار اور رہبر ورہنما سمجھتے ہیں۔ ان کا جادو اصل میں سحرِ سامری اور افسونِ آزری ہے، جس سے رعایا مسحور ہوئی ہے اور ہر زمان ومکان میں سوتی رہی ہے۔ مسحور لوگوں کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ وہ نہ سنتے، دیکھتے، بولتے اور نہ تفکر بالحق ہی کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان کے سحر سے مسحور افرادِ معاشرہ کا نظام باطنی فعال نہیں رہتا، اس لیے کہ وہ اپنے نورِ حسن سے محروم ہوجاتا ہے اور یہ نور ہی ہے جس کی بدولت انسان حقیقی معنوں میں سنتا، دیکھتا، سوچتا اور صحیح نتیجے پر پہنچتا ہے۔ ان سرطانی طبقوں کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی ہے کہ وہ اپنی قوت وسطوت، مال ودولت اور عزت وشہرت کے سحر سے لوگوں کے قلوب کو بے نور یا اندھا کردیتے ہیں تاکہ نہ رہے بانس نہ باجے بانسری۔

یہ بات، جو تاریخی حقیقت ہے، یاد رکھنے کی ہے کہ فرعون ہمیشہ محافظِ دین بن کر حکومت کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ انسان کو اپنے دین یعنی معتقداتِ جلیلہ ومحرکہ، تہذیب و تمدن اور ثقافتی روایات سے ازبس عقیدت ومحبت ہوتی ہے، چاہے وہ اپنے معتقدات کیمطابق زندگی بسر کرتے ہوں یا نہ۔ ایسے معتقدات جن کیمطابق زندگی بسر نہ کی جائے، محض نظریات ہوتے ہیں اور ان میں زندگی کی قوت و

توانائی، قیومیت اور جمال و جلال کا فقدان ہوتا ہے۔ بہر حال، اس واقعیت کے پیشِ نظر کہ لوگوں کو اپنا دین از بس عزیز ہوتا ہے۔ ابلیس و شیاطین جو فرعونوں کے مشیر و معاون ہوتے ہیں، انہیں خرقۂ دینی سے مزین رکھتے ہیں، جو دراصل خرقۂ سالوس ہوتا ہے۔ فرعون مذہب کے نام پر حکومت کرتے ہیں، اللہ کے نام پر نہیں۔ اشتراکی فرعون بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ وہ بھی اپنے آپ کو اشتراکیوں کے دینِ اشتراکیت یا کمیونزم کا محافظ کہتے اور یہ خرقۂ دین پہن کر حکومت کرتے ہیں۔ اکثر لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ "اشتراکی لادین" ہیں۔ اشتراکی اس اعتبار سے تو بلاشبہ "لادین" ہیں کہ ان کے نظامِ زندگی کا محور حقیقی نہیں؛ یعنی وہ نہیں، جو ہونا چاہیئے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ۔ لیکن چونکہ ان کا نظامِ زندگی ہے، جس کے عوامل و محرکات ان کے عقائدِ محرکہ ہیں، جو ایمان سے عبارت ہیں، لہٰذا ان کا دین ہوا، جو بلاشبہ باطل ہے۔ وجہ یہ ہے کہ دین میں حسن و حق اللہ تعالیٰ کی بدولت پیدا ہوتا ہے جو الحسن والحق ہے؛ نیز وہ الٰہ اور رب ہے۔ ہمیں یہ اصل فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ عقائدِ جبلیہ و محرکہ کی اساس اگر توحید و رسالت پر ہو اور وہ سچے اور حسین ہوں تو انہیں "ایمان بالحق" سے، اور اگر ایسے نہ ہوں تو انہیں "ایمان بالباطل"[۱] سے تعبیر کرتے ہیں۔ وجودی[۲] اسی بنا پر اشتراکیوں کو سیکولر (= لادین) نہیں، بلکہ "آئیڈیالوجسٹ"[۳] یا دین پرست سمجھتے اور کہتے ہیں۔

یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ایمان میں یقین کی قوت و توانائی ہوتی ہے، چاہے وہ باطل ہی کیوں نہ ہو۔ جہاں تک ایمان بالحق کا تعلق ہے اس میں یقین کی قوت و توانائی بھی ہوتی ہے اور حق کا جلال و ثبات بھی، اور اپنی اس صفت کے سبب اس میں ایمان بالباطل پر غالب آنے کی استعداد پائی جاتی ہے۔ تاریخ کا مطالعہ بالحق کرنے سے اس حقیقت کا سراغ ملتا ہے کہ اہلِ ایمان بالباطل کے ہاتھوں جب بھی شکست کھائی ہے "نام نہاد" اہلِ ایمان بالحق نے کھائی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ان کا ایمان اپنے یقین و اطمینان کی قوت و حیات سے محروم ہوتا ہے۔ ایمان میں قوت و توانائی، حیات و قیومیت اور طمانیت اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب

اہل ایمان بالحق کے عقائدِ جلیلہ و محرکہ ان کی عملی زندگی کے اجزائے لاینفک بن جاتے ہیں۔ اگر ایمان کا خاصہ عملِ صالح ہے تو عمل صالح کی پیش شرط ایمان ہے؛ اور یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ مثال کے طور پر یقین میں توانائی اس طرح مضمر ہوتی ہے جس طرح ایٹم میں ہوتی ہے؛ اور اس طرح عمل صالح ہی کے ذریعے اس ایمانی توانائی کو قوت سے فعل میں لایا جاتا ہے۔

یہ تو تھا جملہ معترضہ۔ اشتراکی فرعون ہوں یا نام نہاد دینی اور سیکولر فرعون، سبھی دین یا آئیڈیالوجی کا خرقۂ سالوس پہن کر حکومت کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ سب اپنے آپ کو کسی نہ کسی آئیڈیالوجی کا محافظ کہتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ مارکسزم ہو یا نازی ازم، فاشزم ہو یا سیکولرازم، "ہرازم" دین ہی ہوتا ہے، اگرچہ وہ باطل ہوتا ہے۔ اسی حقیقت کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں فرمایا ہے کہ دین حقیقت میں صرف اسلام ہے اور اسی لیے وہ اسلام کو پسند کرتا ہے۔ علاوہ بریں اسلام میں حسن و حق کی قوت و توانائی کی بدولت کل دین یا دین کی جملہ صورتوں پر غالب آجانے کی صلاحیت مضمر ہے۔ لہٰذا وہ غالب آکر رہے گا۔ جہاں تک اشتراکی اور دیگر نوعیت کی حکومتوں کی قوتِ تسخیر اور سطوت و سیادت کا تعلق ہے اس کا راز ان کے ایمان بالباطل کی محکمی میں مضمر ہے۔ بخلاف اس کے مسلم حکومتوں کی کمزوری و ضعیفی کا سبب ان کے ایمان بالحق کی نامحکمی و ضعیفی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان اُن کی زندگی کا جزوِ لاینفک نہیں رہا، بلکہ ایمان و زندگی کا تعلق برائے نام رہ گیا ہے۔

چونکہ نفسِ انسانی کو قدرت کی طرف سے آرزوئے جمال و جلال ودیعت کی گئی ہے؛ لہٰذا اُسے "سیاسی جلال" کی طلب و جستجو بھی رہتی ہے۔ جانتے ہو سیاسی جلال کا مطلب کیا ہے؟ اس کا مطلب ہے، عوام کی آرزوئے حسن کی تکمیل کے لیے ان کی مرضی سے حکومتِ الٰہیہ یا خلافت کے کاروبار میں حصہ لینے کی آرزو۔ اگر افرادِ قوم کسی قابل شخص کو اپنا حکمران منتخب کریں، تو اس کا وظیفہ ربِّ ذوالجلال والاکرام کے نمائندے کی حیثیت سے اس کے بندوں پر اس کے احکام کے مطابق حکومت کرنا ہوتا ہے۔ خلافت کا تقاضا اور وظیفہ یہ ہے کہ خلیفہ اپنے ربِّ ذوالجلال والاکرام کے احکام اور سنّتِ نبویؐ کے مطابق اپنے احوال و ظروف، وسائل و استعداد اور وسعت کی رعایت سے اپنی رعایا کی ربوبیت کا انتظام و

انصرام کرے۔ ربوبیت ایک وسیع المعنیٰ اصطلاح ہے اور اس میں رعایا کی روزی و پرورش، نشو و ارتقاء، تعلیم و تربیت، آرام و راحت اور حفاظت و صیانت کا مفہوم پوشیدہ ہے۔

ربِّ رحیم کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ اس نے ہر چیز حسین بنا کر پیدا کی ہے: اَلَّذِیۡۤ اَحۡسَنَ کُلَّ شَیۡءٍ خَلَقَہٗ [10] (السجدہ ۳۲: ۷) اس سے یہ مستنبط ہوا کہ ربوبیت کا خاصہ تخلیق و تحسین ہے۔ اس سے یہ ضمنی نتیجہ مستخرج ہوا کہ مثالی حکمران یا خلیفہ کا وظیفہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات کو موضوعی و معروضی طور سے حسین بنانا ہے؛ خاص کر بنی نوع انسان کو اہلِ حسن و سرور بنانا ہے [11]۔ علاوہ بریں، ربوبیت کا خاصہ اور خلافت کا وظیفہ رحمۃ للعالمینی ہے، لہٰذا خلیفہ نہ صرف اپنی رعایا بلکہ دوسری اقوام اور ممالک کی مخلوقات کے لیے بھی رحمت ہوتا ہے۔ وہ محسن و صالح ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے افرادِ قوم و ملت کے علاوہ تمام دنیا کے باشندوں کے ساتھ احسان کرتا اور ہر معاشرے میں فتنہ و فساد، جنگ و جدل اور خوف و حزن کی آگ کو ٹھنڈا کر کے اس میں امن و سلامتی اور صلح و آشتی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ خلیفہ کی نظر میں اپنے بیگانے سب برابر ہوتے ہیں، کیونکہ وہ سب کو اپنے الٰہ و ربّ کے حسین شہکار سمجھتا اور اس کے حوالے سے ان سے محبت و احسان کرتا ہے [12]۔ یہی خُلقِ عظیم اور اور رحمۃ للعالمینی، یہی پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ اور سنّتِ پیغمبری ہے۔ یہ انسان کا ظلم و جہل ہے کہ جانتا ہے پر مانتا نہیں۔

خلیفہ میں آرزوئے حسن و زندگی بدرجۂ اتم ہوتی ہے، اس لیے وہ دین و ملت اور انسانیت کے احیاء کی بھرپور جدّ و جہد کرتا ہے، اور وہ اپنے ربِ جمیل و جلیل کی حسین مخلوقات کو زندہ و مسرور اور مطمئن و ترقی یافتہ دیکھنا چاہتا ہے۔ چونکہ طاغوتی قوتیں اسے ایسا کرنے نہیں دیتیں اور اسے اپنا دشمن سمجھ کر اس کے خلاف نبرد آزما ہو جاتی ہیں، لہٰذا اسے مجبوراً مظلوم و مقہور اور مفلوک الحال و مجبور انسان کی مدد کی خاطر طاغوتی قوتوں سے جہاد کرنا پڑتا ہے۔ یہ دنیا جب سے نمودِ حیاتِ انسانی بنی ہے، رزمگاہ ہے اور قیامت تک ایسی

ہی رہے گی ؛ لہٰذا جہاد ایک ناگزیر ضرورت ہوئی۔ جہاد ہمیشہ ظلم و جہل اور شرک و بت پرستی، نیز معاشرتی سرطانوں (= فرعون و ہامان اور قارون و آزر) کے خلاف ہونا چاہیئے۔ جس طرح ہسپتال میں جرّاحی کے مریضوں کا اپریشن ان کی جان بچانے اور صحت بحال کرنے کے لیے ضروری بلکہ ناگزیر ہوتا ہے، اسی طرح قوم کی عزت و آزادی، دین و ثقافت اور جان و مال کے تحفظ کی خاطر رزم گاہِ حیات میں جنگ و قتال یا جہاد ناگزیر ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے مجاہد معاشرتی جرّاح ہوتا ہے اور وجودِ معاشرہ سے اس کے سرطانی عناصر کو دور کرتا ہے تاکہ وہ زندہ و سلامت رہے۔ جہاد دراصل اپنے اِلٰہ و ربّ کے حوالے سے معاشرتی وجود سے فرعونی و ہامانی اور قارونی و آزری عناصرِ سرطانی کو دور کرنے کی اجتماعی سعی و جہد سے عبارت ہے۔ یہ سعی و جہد آلاتِ حرب کے علاوہ قلم و زبان اور جان و مال سے بھی ہوتی ہے۔ جمالیاتی نقطۂ نظر سے جہاد کی تعریف اس طرح بھی کر سکتے ہیں کہ "یہ آرزوئے حسن کی تکمیل اور تحسینِ زندگی کا عمل ہے۔" اس تعریف کی رو سے مجاہد محسن و صالح اور شہید ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایمان کا خاصہ جہاد ہے، لہٰذا مومن مجاہد ہوتا ہے۔ جہاد اگر ایمان کا اعتبار ہے اور یقیناً ہے تو پھر مومن و مجاہد اور صالح و شہید ایک ہی ہستی کے اسمائے اربعہ ہوئے؛ اور خلیفہ ان اسمائے اربعہ کا مسمّٰی ہوتا ہے یا اسے ہونا چاہیئے۔ حکمران اگر خلیفہ نہ ہو تو اس میں فرعونی خصائص پیدا ہو جاتے ہیں، جن کے باعث ان کے مشیروں اور ارکانِ حکومت میں ہامانوں، قارونوں اور آزروں کی اکثریت ہوتی ہے، اس لیے کہ یہ فرعونیت کا تقاضا ہے۔ جدید سیاسی زبان میں ہامانیت کو افسر شاہی یا بیوروکریسی سے، قارونیت کو سرمایہ کاری، سودکاری اور جاگیرداری و سرمایہ داری سے اور آزری کو مذہبی پیشوائیت (= ملائیت و مشیخت) سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہ چاروں استحصالی طبقے ہیں، جنہیں معاشرتی سرطانی طبقوں سے موسوم کرنا زیادہ موزوں ہوگا۔ ان سرطانی طبقوں میں آرزوئے حسن و زندگی کے بجائے آرزوئے ستیزہ و مرگ ہوتی ہے، جس کا شعور نہ انہیں ہوتا ہے اور نہ عامۃ الناس کو۔

حکومت و اقتدار، قوت و سطوت، شان و شوکت، مال و دولت اور شہرت و قیادت کی بدولت ان معاشرتی سرطانوں میں سحرِ سامری پیدا ہو جاتا ہے، جس سے لوگ مرعوب و مسحور ہو جاتے اور انہیں اپنا اِلٰہ و ربّ ماننے لگتے ہیں، لیکن انہیں اس حقیقت کا شعور نہیں ہوتا کہ وہ کیا کر رہے ہیں، اور جو کچھ کر رہے ہیں وہ شرک ہے، جو ظلم عظیم اور ناقابلِ عفو جرم و گناہ ہے۔

رعایا میں آرزوئے حسن و زندگی زندہ و فعّال ہو تو حکمران کو خلیفہ بننا ہی پڑتا ہے، ورنہ وہ ان کے لیے قابلِ قبول نہ ہو گا۔ وجہ یہ ہے کہ ایمان نہ تو فرعونیت کو برداشت اور نہ اس سے مفاہمت ہی کر سکتا ہے۔ معاشرہ ہو سچّے مؤمنوں کا اور اس میں فرعونؔ ہامان و قارون و آذر ہوں، یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ مؤمن خود آگاہ و خدا آگاہ ہوتا ہے، لہٰذا وہ اللہ جلّ شانہٗ کے علاوہ کسی ہستی کو چاہے وہ کتنی عظیم و برگزیدہ اور صاحبِ قوّت و ثروت کیوں نہ ہو، اپنا اِلٰہ و ربّ تسلیم نہیں کر سکتا۔ اس کا معروضِ حُسن و پرستش[14] صرف ربِّ جمیل و جلیل ہی ہوتا ہے۔ کسی معاشرے میں سرطانی یعنی فرعونی و ہامانی اور قارونی و آذری طبقوں کا وجود اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ اس کے افراد میں آرزوئے حسن و حیات جمود و تعطل کا شکار اور مریض و سقیم ہے۔

تم اس رازِ حقیقتِ انسانی سے ناآشنا نہیں ہو کہ ربِّ ذوالجلال والاکرام نے انسان کو اپنی فطرت پر بنایا ہے اور اس میں روح پھونکی ہے، جس کے طفیل انسان میں علاوہ دیگر صفاتِ الٰہیہ کے ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ عبد ہوتے ہوئے بھی افرادِ نسلِ انسانی کا محبوب و ممدوح اور حاکم و آقا بننا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس کی اسی طلب و جستجو نے دنیا میں فرعونیت و ہامانیت اور قارونیت و آذریت کو پیدا کیا ہے۔ بہرحال یہ آرزو اس میں جلالِ سیاسی حاصل کرنے کی خواہش کا نشو و ارتقاء کرتی ہے۔ لیکن جیسا کہ تاریخ بتاتی ہے اس کی اس خواہش میں شیطان بڑی چابکدستی اور رازداری

سے تکبر و تفاخر اور طغیان و تکاثر کے جذبات کی آمیزش کر دیتا ہے؛ نتیجۃً آدمی میں قوت و اقتدار حاصل کرنے کی خواہش اس قدر شدید ہو جاتی ہے کہ وہ اس کی تکمیل کی خاطر ہر تجربے سے گذرنے، ہر حربہ آزمانے اور ہر خرقۂ سالوس پہننے سے احتراز و گریز نہیں کرتا جب افرادِ قوم اجتماعی طور سے ایسا کرتے ہیں تو اسے "سیاست" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس تعریف کی رُو سے سیاست دراصل فرعون و ہامان یا قارون و آذر بننے کی طلب، و جستجو اور سعی و جہد کا دوسرا نام ہوا بخلاف اس کے اگر آرزوئے جلالِ سیاسی سچی اور خالص ہو اور شیطانی آمیزش سے پاک و منزہ رہے، نیز افرادِ قوم صالح و مجاہد اور اسلام کی تحریک رحمۃ للعالمینی کے رضا کار و علمبردار ہوں؛ علاوہ بریں، وہ امورِ خلافت میں خلوصِ نیت سے حصہ لینے کے لیے آمادہ ہوں اور اپنی اس آرزو کی تکمیل کے لیے احسن طریق سے جدوجہد کرتے ہوں تو یہ حقیقی سیاست ہوگی جس کے لیے "سیاستِ جلیلہ" کی اور اوّل الذکر سیاست کے لیے "سیاستِ فرعونی" کی تعبیر موزوں رہے گی۔

سیاستِ فرعونی میں حصہ لینے یا اس میں یقین رکھنے اور اسے جائز سمجھنے والے آئینی طریقے سے حکمران بن جائیں یا غیر آئینی طریقے سے حکومت پر قبضہ کریں تو ان کا فرعون و ہامان بن جانا ایک فطری امر یا تاریخی عمل ہے۔ یہ تو سامنے کی بات ہے کہ فرعونی حکومت کے چار ستون ہوتے ہیں: ہامانیت، قارونیت، آزریت اور عسکریت۔ فرعون اور اس کی حکومت کے یہ چاروں ستون وجودِ معاشرہ کے طفیلی کیڑے[۱۲] ہوتے ہیں، جو اس کا خون چوستے رہتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں قوم میں آرزوئے حسن و زندگی بتدریج مضمحل و کمزور ہوتی جاتی ہے، نیز اس کی ثقافت اور افکار و معتقداتِ جلیلہ و محرکہ حسن و زندگی سے محروم ہوتے جاتے ہیں۔ ایسی قوم کا انجام ذلت و مسکنت اور ہلاکت و بربادی ہوتا ہے۔

یہاں اس نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ فرعونی حکومت کے سربراہ میں قوم کا ہیرو، محبوب، قائد، آقا، حاکم اور مطلق العنان آمر بننے کی آرزو غایت درجہ شدید ہو جاتی ہے اور

اس کے رویے اور طرزِ حکمرانی سے صاف ظاہر ہونے لگتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنی قوم کا اِلٰہ و ربّ سمجھتا اور چاہتا ہے کہ لوگ بھی اُسے ایسا سمجھیں، لہٰذا اس کے گُن گائیں قصیدے لکھیں، اس کی تشہیر کریں اور تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے احکام کی احکامِ الٰہی کی طرح بے چون و چرا اطاعت کریں۔ یہ ہے فرعونیت، جسے دعوائے خدائی سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔

سنو! بندہ لاکھ خدا بننے کی کوشش کرے، خدا نہیں بن سکتا کہ یہ محال ہے، البتہ فرعون بن جاتا ہے۔ فرعون اپنی قوم کا اِلٰہ و ربّ بننے کی کوشش میں عبدیت کے ارفع و احسن مقام سے پھسل کر ابلیسیت کے تحت الثریٰ میں جا گرتا ہے، اور خون آشام سرطانِ آدمیت بن جاتا ہے۔ فرعونیت کا خاصہ اپنی طرح اپنی رعایا کو حُسن و زندگی سے محروم اور اس کی آرزوئے زندگی کو نحیف و بے جان کرنا ہے۔ فرعونیت کی طرح اس کے عناصر۔ ہامانیت، قارونیت اور آزریت۔ کی بھی یہی خاصیت ہے۔ فرد کی طرح کسی قوم کی آرزوئے حسن و زندگی سے محرومی اس کی موت کی دلیل ہوتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ کسی قوم کے لیے فرعونیت بڑا ہی بھیانک اور رسوا کُن سرطانی عذاب ہے؛ نیز حسن و زندگی سے محرومی بہت بڑی محرومی و نامرادی اور کرب انگیز عذاب ہے، لیکن آرزوئے حسن و زندگی سے محرومی، محرومیِ عظمیٰ و جاودانی اور عذابِ اکبر و مقیم ہے۔ یاد رکھو! انسانیت خلافت کو اور شیطنت فرعونیت کو چاہتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انسانیت کو حُسن و زندگی کی اور شیطنت کو قبح و مرگ کی آرزو ہوتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ آرزوئے جلالِ سیاسی، جو سیاستِ جلیلہ کی رُوح ہے، ربِّ ذوالجلال والاکرام کی نعمتِ عظمیٰ ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ یہ اس کے حوالے سے ہو؛ نیز کاروبارِ خلافت کو اس کے احکام کے مطابق احسن طریق سے چلانے کے لیے ہو۔ یہ آرزو انسان میں اجتماعی سود و زیاں کا احساس و شعور بیدار کرنے، اسے مجاہد و صالح اور سیاست

کو جلیلہ و محرّکہ بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ سیاستِ جلیلہ و محرّکہ کی غایت معاشرے کو باطل آلہہ یا معبودوں سے پاک و صاف کرنا اور نظامِ خلافت کو خالص توحید کی اساس پر استوار کرنا ہے۔ توحید ایک "عقیدۂ عملی" ہے، جو نفی و اثبات (= لَا و اِلَّا) کے دو اجزائے لاینفک سے مرکب ہے۔ لَا یا نفی کا مطلب ہے: موضوعی و معروضی آلہہ (اِلٰہ کی جمع، معنی معبود یا اصنام) کا انکار و بطلان۔ موضوعی یا باطنی آلہہ میں اہم ترین یہ ہیں: حرص و ہوا معتقدات و نظریات اور روایات و تعصّبات۔ معروضی یا خارجی آلہہ میں سے اہم ترین یہ ہیں: فرعون و ہامان اور قارون و آذر۔ موضوعی اصنام کو انسان خود اپنے معبود بناتا ہے، جبکہ خارجی اصنام خود لوگوں کے معبود بن جاتے ہیں، اور اپنی قوت و سطوت، منصب و اقتدار اور مال و دولت کے سحر، نیز پراپگنڈے، ترغیب و تحریص اور سیاسی رشوت کے ذریعے ان کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ انہیں اپنا اِلٰہ و ربّ تسلیم کریں۔ چونکہ ان موضوعی و معروضی معبودانِ باطلہ کے اِستیصال کے بغیر خلافت کا قیام محال ہے، لہٰذا اسلام توحید کو دین کی روح قرار دیتا اور اس پر خلافت کی اساس استوار کرتا ہے۔ خلافت دراصل موحّدین و مجاہدین اور صالحین کی حکومت ہوتی ہے، جس کا حکمران فرعون نہیں، خلیفہ ہوتا ہے۔ قرآنِ حکیم کی رُو سے خلافت کو قائم کرنے اور اس کا کاروبار چلانے کے ذمے دار خلیفہ اور عوام دونوں ہوتے ہیں اور اس اجتماعی ذمہ داری کے لیے شریعت میں فرضِ کفایہ کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ بہرحال خلافت کے اوّلیں فرائض مندرجۂ ذیل ہیں: (۱) صلوٰۃ (۲) زکوٰۃ (۳) تزکیہ (۴) تعلیم (۵) حکمت (۶) عدل و احسان، (۷) جہاد (۸) حسنِ تشہیر (حق و صبر و مرحمت) اور (۹) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نظام قائم کرنا اور احسن طریق سے چلانا۔ یہ نظام ہماری انفرادی۔ اجتماعی زندگی میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، لہٰذا ان کی مختصراً صراحت کر دی جاتی ہے:

۱۔ نظامِ صلوٰۃ:

اس نظام کا مرکز مسجد ہے جسے خانۂ خدا کہتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ مسجد محض اللہ تعالیٰ

کی عبادت کے لیے وقف ہوتی ہے۔ اس کا اوّلین مقصد صلوٰۃِ خمسہ (یا نمازِ پنجگانہ) کے نظام کا قیام ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مسجد میں نمازیوں کے لیے نمازِ پنجگانہ باجماعت پڑھنے کی خاطر اذان و امامت، پانی، وضو، صفائی، فرش فروش، روشنی اور موسمی اثرات کے تحفظ کا معقول انتظام ہونا چاہیے۔ صلوٰۃ کی غایت ذکرِ الٰہی ہے ؛ یعنی بندے کا اپنے معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود کو یاد کرنا۔ ذکرِ دوست" انفرادی بھی ہوتا ہے اور اجتماعی بھی۔ یہی وجہ ہے کہ نماز فرضِ کفایہ نہیں، فرضِ عین ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر فردِ بشر کا معروضِ حسن پرستش ہے اور اس کی محبت ہر دل میں مضمر ہے۔ علاوہ بریں انسان طبیعی و فطری طور سے اللہ تعالیٰ کا عبد یا بندہ ہے، اس لیے اس کی عبادت یا بندگی کرنا، اور اس کی حمد و ثنا کرنا اور مصائب و شدائد میں اسے یاد کرنا اور اس سے مدد طلب کرنا، بندے کی فطرت کا تقاضا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اکثر لوگ اپنے حسی عقلی نفسی نظام میں جمود و تعطل پیدا ہو جانے کے سبب اپنے فطری یا طبعی تقاضوں کا کم شعور رکھتے ہیں اور ان کی تشفی نہیں کرتے۔ جس طرح روزے رکھنا، حج کرنا، زکوٰۃ دینا اور قرآنِ مجید پڑھنا، سیکھنا اور اس پہ غور و فکر کرنا مسلمان کی انفرادی ذمے داری بھی ہے، اسی طرح نماز پڑھنا بھی اس کی انفرادی ذمے داری ہے، اور یہ ذمے داری اس لحاظ سے دُہری ہے کہ وہ باجماعت نماز پڑھنے کا بھی مکلّف ہے۔

غور کریں تو صلوٰۃ آرزوئے حُسن و حیات کی تکمیل کا احسن ذریعہ ہے۔ اس سے اُسے "الحُسن" ملتا ہے جو اس کا اِلٰہ و ربّ ہے۔ بندے کو اس کا اِلٰہ و ربّ مل جائے تو اُسے جمالیاتی ثروت یعنی طمانیت و مسرت، قناعت و غنا، حُسن و نور اور جمالیاتی سوز و سُرور سب کچھ مل جاتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اُسے اللہ تعالیٰ کے قُرب و حضور اور وصال و رضوان کی نعمتِ عظمیٰ میسّر آ جاتی ہے اور وہ زندہ و جاوید ہو جاتا ہے۔ صلوٰۃ بندۂ رحمٰن کو احسان و رضوان کے حسن المقام پہ متمکن کر دیتی ہے جو اس کی معراج ہے ؛

نیز وہ اس کے لیے "دوست" کی ہم نظری و ہمکلامی اور حضوری و ہم رضائی کا حسن المقام بھی ہے۔ اس مقام پر متمکن اہلِ ایمان کے لیے صلوٰۃ میں قرۃ العین ہوتی ہے۔ اس مقام پر متمکن اہل ایمان کی ایک صفت تو یہ ہے کہ وہ عباد الرحمٰن ہوتے ہیں اور ان کا معروضی موضوعی شیطان ان کا مطیع و فرماں بردار یعنی مسلمان ہوتا ہے۔ علاوہ بریں، انہیں فحشآء و منکرات سے اس طرح نفرت ہو جاتی ہے جس طرح سلیم الفطرت انسان کو گندگی اور مکھی وغیرہ کھانے سے طبعاً نفرت ہوتی ہے۔ یہ مطلب ہے اس ارشادِ الٰہی کا کہ صلوٰۃ انسان کو فحشآء و منکر سے باز رکھتی ہے"[16]۔ نماز میں انسان اپنے الٰہ و ربّ کے حضور اس سے ہمکلام ہوتا اور اس کے انوار و تجلیات سے کیف و سرور حاصل کرتا ہے، نیز اس وقت اس کی دعاؤں پر درِ اجابت وا ہوتا ہے؛ جس سے انسان میں جالیاتی نفسیاتی انقلاب آتا ہے[17]۔ وہ جالیاتی نفسیاتی لمحہ[18] اس کے حضورِ قلب[19] اور آرزوئے حسن و حیات کی نہایت کا منتظر ہوتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ حضورِ قلب کے بغیر نماز ہوتی ہی نہیں۔ ایسی نماز جس میں نمازی اپنے حضورِ قلب کے بغیر قیام اور رکوع و سجود کرے، التفاتِ الٰہ سے محروم ہوتی ہے اور اس میں وہ نمازی پر اپنا جلوہ پیدا نہیں کرتا۔ اصل یہ ہے کہ قلب حاضر و ناظر ہو تو نماز قرۃ العین ہوتی ہے اور اس میں الحسن اپنے بندے پر مشہور ہوتا اور اس پر اپنی نظرِ لطف و کرم ڈالتا ہے۔

نماز نیت میں بندے کی اپنے الٰہ و ربّ سے محبت و پرستش اور اس کے حضور اپنے عجز و انکسار اور عبودیت کا اظہار و اعتراف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نمازیوں کو عباد الرحمٰن[20] بناتی ہے جو زندہ اور اہلِ حسن و سرور ہوتے ہیں۔ بخلاف اس کے عباد الشیطٰن مردہ و اہلِ نار ہوتے ہیں اور وہ خوف و حزن کی آتشِ خاموش کے عذاب میں مبتلا حقیقت میں نہ زندہ ہوتے ہیں نہ مردہ۔ مختصر یہ کہ زندگی حسنۂ دنیوی و اخروی، قرب و حضوری اور رضوانِ الٰہی کے حاصل کرنے کا حسین ترین ذریعہ نمازِ مشہود و مبرور ہے۔

انسان ایک ایسی پیچیدہ و پُراسرار ہستی ہے، جو اربوں خلیوں اور متعدد اعضاء و جوارح سے مرکب ہے اور فاطرِ ہستی نے، جو ربّ ذوالجلال والاکرام ہے، ہر خلیے، جارحہ اور عضو کو حسن و زندگی کی آرزو ودیعت کی ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہ فطرۃً تندرست و صحت مند اور حسین رہنا چاہتا ہے، اور صحت و تندرستی اور قوت و توانائی حاصل کرنے کے لیے ورزش ضروری ہے۔ ہماری تندرستی و صحت کا انحصار ہمارے جسم کے نظامِ طبیعی کے حسنِ کارکردگی پر ہے، اور اس کے لیے نظامِ طبیعی کو جس قسم کی ورزش کی حاجت ہے، اس کی ایک موزوں شکل صلوٰۃِ پنجگانہ ہے۔ ہم نماز میں جس طریق و ترتیب سے قیام و رکوع اور سجدہ و وقوف کرتے ہیں، اس سے ہمارے خلیوں اور اعضائے رئیسہ کو؛ نیز ان میں حسن و زندگی کی آرزو کو زندہ و فعّال رکھنے میں ضروری مدد ملتی ہے۔ بالفاظِ دیگر، ان اعضائے بدن کے نشوو ارتقا اور تندرستی و صحت کے لیے جس نوعیت کی ورزش کی حاجت ہوتی ہے، اُسے نمازِ پنجگانہ مسنون صورت میں احسن طریق سے پورا کرتی ہے۔ جسم انسان کے نظامِ طبیعی کی نسبت سے نماز کا عمل دراصل تسویہ و تعدیل کا عمل ہے، جو خلیوں میں بیماریوں کے خلاف قوتِ مدافعت پیدا کرتا، نیز ان میں آرزوئے حسن و حیات کو زندہ و بیدار بھی رکھتا ہے چنانچہ تسویہ و تعدیل کے عمل سے کسی وجہ سے جمود و تعطل یا فساد پیدا ہو جائے تو نظامِ طبیعی میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے، جسے مرض کہتے ہیں۔ اگر کسی وجہ سے خلیوں میں صحت یاب ہونے کی سچی آرزو پیدا نہ ہو تو قانونِ احترامِ آرزو کی رُو سے قدرت اُسے شفا نہیں دیتی اور مرض مہلک ثابت ہوتا ہے۔ تسویہ و تعدیل کے عمل میں فساد پیدا ہو جانے کے سبب بعض اوقات خلیے سرکش و باغی ہو کر اپنے ہی برادر خلیوں کو چپکے چپکے مارنا اور کھانا اور پھیلنا پھولنا شروع کر دیتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ اپنے ظلم و تعدّی میں حد سے تجاوز کر جاتے ہیں تو نفس کو پتا چلتا ہے اور وہ درد کے مارے چلانے اور تحفظِ جان کے لیے فریاد کرنے لگتا ہے۔ یہ مبالغہ نہیں حقیقت ہے کہ نماز اس سرطانی بیماری سے بھی محفوظ رہنے کا ایک احتیاطی عمل

ہے، اگر اس میں دُعا و توبہ بھی شامل ہو جائے تو اس کی تاثیر دو چند ہو جاتی ہے۔

مسجد میں چل کر جانے اور آنے سے مزید ورزش ہو جاتی ہے، جس سے نماز کی تاثیر یا افادیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ علاوہ بریں، وضو، جو نماز کی ایک ناگزیر پیش شرط ہے، نظام باطنی کے حسنِ کارکردگی اور اس میں تسویہ و تعدیل کے عمل کو فطری انداز میں جاری رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ وضو میں پانی استعمال ہوتا ہے، جس سے بدن کے اہم حصوں کی "آبی تطہیر" ہوتی ہے اور اس میں خلیوں کو تندرست و سلامت اور ان میں آرزوئے حسن و حیات کو فعال رکھنے کی تاثیر ہوتی ہے۔ ان دونوں اعمال سے نماز کی افادی قدروں اور تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے۔ الغرض، نماز جسمانی و قلبی بیماریوں سے محفوظ رہنے کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔

ربِّ ذوالجلال والاکرام نے انسان میں باطنی قوتوں کا خزینہ ودیعت کیا ہے، جس سے استفادہ کرنا انسان کا کام ہے، لیکن بہت کم ان سے متمتع و مستفیض ہوتے ہیں۔ اکثر لوگ تو ان قوتوں کا علم بھی نہیں رکھتے، لہٰذا وہ اپنے ربِّ کریم کی نعمتوں کی تکفیر کرتے ہیں، لیکن ان کا شعور نہیں رکھتے۔ کفرانِ نعمت زیاں کاری اور مستقل خسارہ ہے، جسے اہلِ نظر تاریخِ عمل کی تصویرِ متحرک کو دیکھ کر معلوم کر سکتے ہیں۔ اس زیاں کاری و خسارۂ مدام کی طرف ربِّ کریم نے سورۂ عصر میں نکتہ آفریں و بصیرت افروز اشارہ کیا ہے، اور سورۂ احزاب میں انسان کو اس بنا پر ظالم و جاہل کہا ہے[۲] اسی دُنیا میں ایسے انسان بھی ہیں، جو اپنی باطنی قوتوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں اور عبقری و باکمال اور مثالی و کامل کہلاتے ہیں۔ ان باطنی قوتوں سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے میں صلوٰۃ اہلِ ایمان و صالحین کی ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ اُسے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے مطابق قائم کیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نمازِ پنجگانہ منظم طریق سے اوقاتِ مقررہ پر باقاعدگی و مداومت خشوع و خضوع اور حضورِ قلب کے ساتھ باجماعت

قائم کی جائے۔ وجہ یہ ہے کہ ایسی نماز سے اہلِ نماز کی زندگی میں نظم و ضبط اور جذبۂ اطاعت انقیاد پیدا ہوتا ہے، اور یہ وہ اوصاف ہیں، جو انسان کے لیے اپنی باطنی قوتوں سے آگاہی حاصل کرنے اور ان سے مقدور بھر مستفید و متمتع ہونے، اپنی راہ منزل پر پہنچنے اور اپنی جہت کو درست رکھنے کے لیے ضروری ہیں۔ بالفاظِ دیگر، انسان کو اپنے اِلٰہ و ربّ کی راہِ راست پر چل کر اس تک پہنچنے کے لیے صلوٰۃ نور و ہدایت، ثبات و استقلال اور حوصلہ و توانائی فراہم کرتی ہے۔

جانتے ہو صراطِ مستقیم کا مطلب کیا ہے؟ یہ اللہ تعالیٰ کے متقی و انعام یافتہ بندوں کی راہ ہے جو انہیں ان کے اِلٰہ و ربّ تک لے جاتی ہے۔ یہ جاننا اور سمجھنا موجبِ رُشد و ہدایت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے انعام یافتہ اور کامیاب بندے وہ ہیں جنہیں اُس نے اپنے آخری زندہ کلام میں نبیّینؑ، صدیقین، شہدا، اور صالحین سے تعبیر کیا ہے۔[۲۲] جمالیاتی نقطۂ نظر سے ان اہلِ حسن و سرور کی قدر و قیمت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ قرآنِ حکیم کی رُو سے ان کی رفاقت و صحبت جنّت سے بھی اولیٰ ہے۔[۲۳] انسان میں اپنے پسندیدہ شعبۂ زندگی میں کمال حاصل کرنے کی آرزو قدرت کی طرف سے ودیعت کی گئی ہے اور صلوٰۃ اس آرزو کو پورا کرنے میں بلا واسطہ طور سے ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نماز حضورِ قلب کو چاہتی ہے اور حضورِ قلب عبارت ہے اِرتکازِ توجّہ سے، جو حصولِ کمال کی پیش شرط ہے، مثال کے طور پر ادب و فن ہو یا علم و ہنر، ایجاد و اختراع ہو یا تحقیق و تفتیش، تالیف و تصنیف ہو یا جلال بازی،[۲۴] ان میں کمال حاصل کرنے کے لیے حضورِ قلب یا ارتکازِ توجّہ ناگزیر ہے اور یہ ملکہ "نماز با حضور" پڑھنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ملکہ دوسرے طریقوں سے بھی حاصل ہو سکتا ہے، لیکن صلوٰۃ کی خوبی یہ ہے کہ اس سے ملکہ بالواسطہ طور سے بغیر محنت و مشقت کے حاصل ہو جاتا ہے اور اس میں رنج و تکلیف اٹھانے کے بجائے جمالیاتی ثروت (=طمانیت و مسرت، حسن و نور اور قرۃ العین و سعادت) حاصل ہوتی ہے۔

صلوٰۃ کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ نہ صرف انسان کے باطنی نظام (حسّی۔ قلبی۔ نفسی نظام) کا احیاء و تحسین کرتی ہے بلکہ اُسے اور اس کی آرزوئے حُسن (زندگی) کو زندہ و فعّال بھی رکھتی ہے۔ اس کے نتیجے میں اس کے عقائد و نظریات، افکار و تخیلات اور جذبات و احساسات کا بھی تزکیہ ہو جاتا ہے، اور اس طرح اس کا باطنی نظام حسین و منیر بن جاتا ہے۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ نورِ حُسن ہے جو ہمارے کل حسّی۔ قلبی۔ نفسی نظام اور اس کے جملہ ذیلی نظاموں کی ہدایت و حُسنِ کارکردگی کی علّتِ فاعلی ہے۔ جس طرح آنکھ کو دیکھنے کے لیے نورِ موضوعی و معروضی کی حاجت ہوتی ہے۔ اسی طرح عقل کو سلیم، حافظے کو منیر و تیز اور نفس کو مطمئن بنانا نور کے بغیر ممکن نہیں۔

فلسفہ و حکمت کا منتہائے مقصود یہ معلوم کرنا ہے کہ زندگی کی غایت الغایات کیا ہے؟ اس انتہائی معرکۃ الآراء اور بظاہر از حد مشکل سوال کا انتہائی آسان اور مختصر جواب ہے: اِلٰہِ جمیل کی ہم نظری و ہمکلامی، قرب و حضوری اور مُحابّت و ہم رضائی۔ اگر یہ جواب سچا ہے اور یقیناً سچا ہے کہ اس پر قرآنِ حکیم شاہد ہے، نیز یہ ہماری فطرتِ سلیم کا بھی فتویٰ ہے تو پھر یہ بات بھی اتنی ہی سچی ہے کہ صلوٰۃ اس غایت الغایات کے حصول کا ایک حسین ذریعہ ہے اور یہ حقیقت صلوٰۃ کی غیر معمولی اہمیت و فضیلت پر دال ہے۔

۲- زکوٰۃ:

صلوٰۃ کا تقاضا زکوٰۃ ہے، یا بالفاظِ دیگر صلوٰۃ کو زکوٰۃ مستلزم ہے اور یہ دونوں آرزوئے حُسن پر دلالت کرتی ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے: انسان اپنے اِلٰہ و ربّ کا فطرۃً عبد ہے اور عبدیّت کا خاصّہ عبودیّت ہے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ ہر فردِ بشر کا اِلٰہ ہوتا ہے جس کی وہ پرستش کرتا ہے چاہے وہ حقیقی اِلٰہ ہو یا باطل۔ بہر حال عبودیّت کا خاصّہ عبادت ہے، جس میں آرزوئے حُسن مضمر ہوتی ہے اور اپنے اِلٰہِ جمیل سے اپنے

جذبۂ محبت کا اظہار چاہتی ہے۔ عبادت عبارت ہے پرستش و اطاعت سے، اور اس کی دو احسن و اکمل شکلیں ہیں۔ جن کے لیے قرآنِ حکیم نے صلوٰۃ و زکوٰۃ کی تعبیریں اختیار کی ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ معاشرے میں گردشِ دولت کی اہمیت وہی ہے جو وجودِ انسانی میں دورانِ خون کی ہے۔ اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ زکوٰۃ گردشِ دولت میں توازن پیدا کرتی ہے اور یہ توازن وجودِ معاشرہ کی صحت و سلامتی کے لیے اتنا ہی اہم ہے جتنا وجودِ انسانی کی صحت و سلامتی کے لیے متوازن دورانِ خون اہم ہوتا ہے۔ صحت و سلامتی اصل میں نمودِ حسن سے عبارت ہے۔ اس بنا پر یہ کہنا مستبعد نہ ہوگا کہ صلوٰۃ و زکوٰۃ انفرادی و اجتماعی زندگی کی تطہیر و تحسین کرتی ہیں جس کے نتیجے میں وہ نشوو ارتقاء کرتی ہے، نیز وہ نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے والے افراد کو اہلِ حسن و سرور اور معاشرے کو امن و سلامتی کی جنّت بناتی ہیں۔

زندگی کا کوئی گوشہ ہو انسان اپنی آرزوئے حسن کی تکمیل کی خاطر سعی و جہد کرتا ہے، اگرچہ اکثر لوگوں کی سعی و جہد کی راہیں غلط ہوتی ہیں اور انہیں اپنی اس حقیقی آرزو کی حقیقت و نوعیت کا شعور نہیں ہوتا۔ کیوں؟ اس سوال کا سیدھا سادہ اور مختصر جواب یہ ہے کہ وہ خود آگاہ نہیں ہوتے، اور خود آگاہی مترادف ہے معرفتِ نفس کی۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ خود آگاہ و خدا آگاہ انسان وہ ہوتا ہے جسے اپنے نفس کی صفات و کیفیات، اس کے نظام کے وظائف و خواص، عواطف و امیال، تقاضوں اور آرزوؤں سے آگاہی ہو۔ خود آگاہی (معرفتِ نفس) کا خاصّہ خدا آگاہی (= معرفتِ الٰہی) ہے اور یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ مختصر یہ کہ خدا آگاہ بننے کی آرزو ہو تو خود آگاہ بننا اور اپنی حقیقی آرزو کو سمجھنا لابدی ہے۔

اصل یہ ہے کہ اُلوہیت کا تقاضا اور عبدیت کا خاصّہ عبادت ہے۔ عبادت کی دو احسن و اکمل صورتیں صلوٰۃ اور زکوٰۃ ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جس طرح عباد الرحمٰن اپنی عبودیت کے اعتراف و اظہار کی خاطر اپنے معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود (= اِلٰہ) کی مرضی و احکام کے مطابق صلوٰۃ قائم کرتے ہیں، اسی طرح اس کی مرضی و احکام کے مطابق اس کا دیا ہوا

مال و دولت اور دیگر نعمتیں خرچ کرنے کی خاطر نظامِ زکوٰۃ قائم کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس طرح صلوٰۃ کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بندے اس کے سوا کسی اور کو نہ تو اپنا اِلٰہ اور نہ اپنا ربّ (یعنی رازق و پروردگار، حاکم و مالک، حافظ و ناصر، غوث و دستگیر، مولیٰ و مشکل کشا اور کارساز و حاجت روا) سمجھیں اور نہ بنائیں؛ نیز نہ اس کی ذات و صفات اور کاروبارِ خدائی میں کسی کو شریک ٹھہرائیں؛ اور نہ اس کی عبادت و پرستش کریں اور نہ اسے سجدہ کریں؛ علاوہ بریں، نہ انہیں پکاریں اور نہ ان سے مرادیں مانگیں اور نہ ان کی نذر و نیاز ہی دیں؛ اسی طرح اس کا یہ بھی بنیادی تقاضا ہے کہ اس کے بندے صرف اس کے احکام ہی کے مطابق رزق کمائیں اور خرچ کریں۔ اس میں یہ از بس اہم و بصیرت افروز نکتہ مضمر ہے کہ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے ربّ العالمین کا ہے اور انسان اس سے جو کچھ حاصل کرتا ہے، ایک تو اسی سے حاصل کرتا ہے؛ دوسرے ربّ العالمین ہی کی ودیعت کردہ قوتوں، حواس و عقل، علم و حکمت اور فن و ہنر یا ٹیکنالوجی ہی کے ذریعے حاصل کرتا ہے، لہٰذا وہ انسان کا نہیں ربّ العالمین کا ہوا۔ اس سے ثابت ہوا کہ انسان جو کچھ کماتا ہے، اس کا مالک نہیں، امین ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ اس سے اپنی ضروریات کے مطابق تمتّع و استفادہ تو کر سکتا ہے، لیکن بُخل و سود، سودی سرمایہ کاری (مثلاً مضاربت و مضارعت، کرایہ کاری و دستارگری، بینکاری و حصص کاری و تمسکات کاری وغیرہ وغیرہ)، اکتناز و احتکار اور اسراف و تبذیر کے ذریعے دوسروں کو اس سے متمتّع و مستفید ہونے سے باز نہیں رکھ سکتا۔ یہ یاد رہے کہ فالتو متاع پر اس کے امین کا حق نہیں رہتا، بلکہ ان حاجت مند لوگوں کو منتقل ہو جاتا ہے، جن کے لیے ربّ العالمین نے "سائل و محروم" کی تعبیریں اختیار کی ہیں، اور اس قابلِ انتقال حق کو "حقِ معلوم" کہا ہے۔[25] وجہ یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنی ضروریات سے زائد مال کا علم ہوتا ہے اور "ضروریات سے زائد مال" کو قرآن حکیم "العفو" سے تعبیر کرتا ہے، اور اس کے انفاق کا حکم دیتا ہے۔[26] انفاق بالعفو کی

بہترین مثال ہیں رحمۃ للعالمین ﷺ کی سیرتِ طیبہ میں ملتی ہے۔ دلیل یہ ہے کہ آپ ﷺ اس حکم ربی کے بعد کبھی صاحبِ نصاب نہ بنے۔ اگر یہ کہا جائے کہ انفاق بالعفو زکوٰۃ کی احسن واکمل صورت ہے تو یہ مبالغہ نہیں بلکہ ایسی تاریخی حقیقت کا اظہار ہوگا، جس پر نصِ قرآنی اور سنتِ حسنہ، نیز کتبِ سیرت وتاریخ شاہد ہیں۔

حیاتِ انسانی کی مثال ایک باغِ ثمرور کی سی ہے، جسے سرسبز وشاداب اور بارآور رکھنے کی خاطر اس کا تزکیہ ناگزیر ہے۔ تزکیۂ باغ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے اشجارِ ثمردر کو صحت مند وتوانا اور بارآور رکھنے کی خاطر ان کو طفیلی بیلوں، خود رو جڑی بوٹیوں اور مضرت رساں جراثیم اور کیڑوں سے پاک وصاف کیا جائے، ان کی بیماریوں کا علاج کیا جائے اور انہیں اوقات پر صحیح مقدار میں کھاد اور پانی دیا جائے؛ نیز انہیں بیماریوں وغیرہ سے محفوظ رکھنے کے لیے مناسب تدابیر اختیار کی جائیں۔ جہاں تک باغِ حیاتِ انسانی کا تعلق ہے، اس کے تزکیہ کے لیے قرآنِ مجید نے زکوٰۃ کی تعبیر اختیار کی ہے۔ زکوٰۃ کی چار صورتیں ہیں: (۱) اس کی ایک جمیل ومثبت صورت انفاق بالعفو ہے۔ (۲) اس کی دوسری صورت نہایا ضروریات سے زائد مال اور وسائلِ دولت میں سے سائل ومحروم کو ان کا مقررہ حصہ (حقِ معلوم) براہِ راست یا خزانۂ عامر کے ذریعے دینا (۳) اس کی تیسری جلالی وسلبی صورت اجتماعی وجودِ انسانی کو معاشی سرطان[۲۷] سے پاک وصاف کرنا ہے؛ (۴) اس کی چوتھی اکمل واحسن صورت جملہ افرادِ نسلِ انسانی میں بالعموم اور افرادِ معاشرہ میں بالخصوص گردشِ دولت کو متوازن رکھنے اور ان کی ضروریاتِ زندگی کی باحسن وجوہ کفالت کرنے کے لیے مالیاتی نظام قائم کرنا ہے۔

جمالیاتی نقطۂ نظر سے زکوٰۃ کا مقصد بنی نوعِ انسان کی آرزوئے حسن وزندگی کو زندہ وفعال رکھنا، اس کی تکمیل کرنا اور اس مقصد کے حصول کی خاطر نظام قائم کرنا اور اُسے احسن طریق سے چلانا ہے؛ نیز اس کام میں جملہ افرادِ نسلِ انسانی کا حصہ لینا ہے۔ زکوٰۃ کو اپنے الٰہیا معروضِ حسن و عشق کے حوالے سے دیکھا جائے تو وہ بندۂ محبت کا اس کے حضور نذرانۂ محبت ہے، جس سے

آرزوئے حسن و زندگی کا نشو و ارتقا ہوتا ہے، اور اہلِ آرزو کو زندگی اور زندگی کو وسعت و پہنائی، ثبات و دوام، سوز و سازِ جاودانی اور رضوانِ دوست ملتا ہے؛ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ نماز و زکوٰۃ سے اہلِ عشق کو خود "دوست" ملتا ہے تو یہ مبالغہ نہیں، اظہارِ حقیقت ہوگا۔ دل "دوست آشنا" ہو تو اس کے ایک اشارے پر مال و دولت اور تخت و تاج کو کیا؟ اہلِ مہر و وفا تو گھر بار، جسم و جان اور اہل و عیال تک قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ اس سے اس امر کی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں اہلِ مہر و وفا کے سیّدِ بے عدیل حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اِلٰہ کے حضور نذرانۂ محبت پیش کرتے رہے اور کبھی صاحبِ نصاب نہ بنے! نیز انہوں نے کیوں اپنے معاشرے کو معاشی سرطانوں سے پاک و صاف رکھا اور افرادِ معاشرہ کی کفالت کے لیے بیت المال اور نظامِ زکوٰۃ قائم کیا۔ اصل یہ ہے کہ دُنیا میں صلوٰۃ و زکوٰۃ کے نظام قائم کرنے میں پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمۃ للعالمینی کا راز مضمر ہے، نیز رحمۃ للعالمینی اور خُلقِ عظیم ہی میں آپؐ کا اُسوۂ حسنہ ہے۔ فلسفۂ آرزوئے حسن کی رو سے اسلام کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی کی تعریف اس طرح کر سکتے ہیں کہ "یہ افراد و نسلِ انسانی کی آرزوئے حسن و زندگی کا اِحیاء، نشو و ارتقاء کرنے اور ان کے باطن میں حسنِ انقلاب لانے اور انہیں مومن و موحد اور صالح و اہلِ حسن و سرور بنانے کی منظم و منصوبہ بند انفرادی و اجتماعی تحریک ہے۔"[۲۸]

۳۔ نظامِ تزکیہ:

تزکیۂ نفس قرآنِ مجید کی اساسی مصطلحات میں سے ہے اور اس سے مراد نفسِ انسانی کی اس طرح تطہیر و تحسین اور پرورش و نگہداشت (Nursing) کرنی ہے کہ وہ پھر سے زندہ و توانا اور حسین و مؤثر بن جائے اور اس کے قویٰ نشو و ارتقا کرنے لگیں؛ نیز اس میں آرزوئے حسن و زندگی کا اِحیاء ہو جائے اور وہ خود فعّال ہو جائے۔ اس تعریف کی رُو سے تزکیہ ایک انتہائی اہم عمل ہے، لہٰذا نفسِ اجتماعی (یعنی قومی، ملّی اور بین الاقوامی یا انسانی نفس کے تزکیہ کے لیے ایک

محکم، پائیدار اور فعال و مؤثر نظام کی ضرورت سے متعلق دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ اور نہ اس امر کے متعلق بھی کسی اختلافِ رائے کی گنجائش ہے کہ نظامِ تزکیہ کے قیام اور اس کے مؤثر طور سے چلانے کی ذمے داری خلافت کی ہے اور اس سے تعاون بالمقدور افرادِ نسلِ انسانی بالخصوص رعایا کی ذمے داری ہے۔ چونکہ تزکیہ میں قوم و افراد کی نشاۃ ثانیہ اور ان میں آرزوئے حسن و زندگی کے احیاء کا راز مضمر ہے۔ لہٰذا اس کا نظام خلافت ہی قائم کر سکتی ہے اور یہ اس کی ایک پہچان بھی ہے۔ جہاں تک فرعونی، قارونی حکومت[۲۹] کا تعلق ہے، وہ ایسے نظام کو اپنے لیے باعثِ خطرہ سمجھتی ہے، اس لیے اس کے قیام کی مخالف ہوتی ہے۔ اگرچہ اس کا اخفاء اس کی حکمت عملی کا مقتضیٰ ہوتا ہے۔

جمالیاتی، اخلاقی نقطۂ نظر سے تزکیہ کی غیر معمولی اہمیت کا راز یہ ہے کہ اس سے خُلقِ انسانی کی تطہیر و تحسین ہوتی ہے اور حسنِ خُلق ہماری زندگی میں اس سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتا ہے جو عام طور سے سمجھی جاتی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حسنِ خُلق کی مثال ایک ایسے چشمے کی ہے جس سے عدل و احسان، حسنہ و خیر، ایثار و قربانی ہمدردی و غمگساری، صبر و توکل، حلم و عفو، جود و سخا اور محبت و رحمت کے دریا نکلتے اور مزرعِ حیات کو زندہ و شاداب، حسین و بار آور کرتے اور معاشرے کو امن و سلامتی کی جنت بناتے ہیں۔ بخلاف اس کے سوءِ خُلق کی مثال ایک ایسے چشمے کی ہے، جس سے ظلم و عدوان، جرم و گناہ، سیئہ و شر اور فحشاء و منکر، عصبیت و نفرت، تضاد و تخالف، جنگ و جدال، منافقت و ریاکاری، بخل و انتقام، حسد و بغض، قساوت و شقاوت اور تکبر و غرور کے ندی نالے نکلتے اور کشتِ زندگی کو تباہ و برباد کرتے اور معاشرے کو خوف و حزن کا جہنم بناتے ہیں۔ اس مفہوم کو قرآنِ حکیم کی اصطلاح۔ تلمیحی زبان میں اس طرح بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ حسنِ خُلق سے صدیقیت، شہادت اور صالحیت کے چشمے ابلتے ہیں، جو معاشرے کو جنت اور افرادِ معاشرہ کو اہلِ حسن و سرور بناتے ہیں۔ بخلاف اس کے سوءِ خُلق سے فرعونیت وہامانیت اور قارونیت و

آمریت کے سوتے پھوٹتے ہیں جو معاشرے کو دوزخ اور افرادِ معاشرہ کو اہلِ نار بناتے ہیں۔

اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ خُلقِ انسانی اپنے جمال و جلال اور عظمت و رفعت کے لیے تزکیہ کا مرہونِ منت ہوتا ہے تو بیجا نہ ہوگا۔ اصل یہ ہے کہ تزکیہ مکارم اخلاق کے حسنِ اتمام کا ذریعہ ہے۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ جس زمان و مکان میں کسی قوم کی ثقافتی زندگی نظامِ تزکیہ سے محروم ہوئی یا اس کے نظامِ تزکیہ میں جمود و تعطّل پیدا ہوا، وہ حُسن و زندگی سے محروم ہو گئی اور اس کی آرزوئے حُسن و زندگی بھی مردہ ہو گئی۔ یہ واقعیت بڑی ہی فکر انگیز و بصیرت افروز ہے کہ سب سے پہلے قرآن حکیم نے اہلِ دُنیا کو اس حقیقت سے آشنا کیا کہ تزکیہ ہر حال میں تعلیم کتاب و حکمت کی پیش شرط ہے۔[۳۰] اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ تزکیہ سے آرزوئے حسن و زندگی کا احیاء ہوتا ہے اور علم و حکمت اصل میں حسن و حیات ہی کی صورتیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ آرزو نہ ہو تو علم و حکمت سیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فلسفۂ آرزو کی رُو سے ناخواندگی و جہل دونوں آرزوئے حسن و زندگی کے فقدان کی دلیل ہیں۔

۴۔ نظامِ تعلیم :

صلوٰۃ و زکوٰۃ اور تزکیہ کے نظاموں کی طرح علم و حکمت سکھانے کا نظام قائم کرنے اور اس کا معقول اہتمام کرنے کی ذمے داری بھی خلافت کی ہے۔ پوچھتے ہیں کہ علم کیا ہے؟ اس سوال کا جواب ایک لفظ میں دینا ہو تو وہ ہے: "آگاہیِ اسماء"[۳۱] جس کا حاصل جلال ہے، جسے قوتِ تسخیر سے تعبیر کر سکتے ہیں اور اس کے لیے قرآنِ مجید نے کائنات کے حوالے سے "سلطان"[۳۲] کی تعبیر اختیار کی ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ علم بصورتِ قوت و آرزو فطرتِ انسانی میں ودیعت کیا گیا ہے۔ آرزوئے علم اصل میں آرزوئے حُسن ہے جو علم کو قوت سے فعل میں لاتی اور اس کا نشو و ارتقاء کرتی ہے، جس پر کائنات کی تسخیر اور ثقافت کے نشو و ارتقاء کا انحصار ہے۔

علم کا ایک پہلو کائنات ہے، جس کے حوالے سے اس کی تعریف گزر چکی ہے۔ اس کا دوسرا پہلو انسان اور تیسرا پہلو اللہ تعالیٰ ہے۔ اب ان دونوں پہلوؤں کے حوالے سے علم کی ماہیت معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، لیکن اس سے پہلے اس لطیف اور از بس اہم و فکر انگیز نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ علم کی اس بنیادی تعریف کا مطلب کہ "وہ اسمآء کی آگاہی ہے" یہ ہے کہ علم ہر اسم کے مُسمّٰی کی ماہیت یا حقیقت کا اِدراک ہے اور اسی میں ہر مُسمّٰی کی تسخیر کا راز مضمر ہے۔ اس سے مستنبط ہوا کہ جس طرح علم الکائنات سے کائنات کی تسخیر ہوئی ہے اور مسلسل ہو رہی ہے، اُسی طرح علم النفس سے نفس مُسخّر یا مسلمان ہوتا ہے[۳۳]۔ نفس کے مسلمان ہونے کا مطلب یہ ہے کہ نفسِ امّارہ، جو دراصل نفسِ بدنی ہے،[۳۴] نفسِ لوّامہ کا مطیع و منقاد ہو جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں وہ نہ تو ابلیسی شیطان سے تعاون کرتا اور اس کا کہا مانتا ہے اور نہ اپنے نفسِ کُلّی کو دھوکا دینے کی خاطر اپنی خواہشات کو مزیّن کر کے ہی دکھاتا ہے[۳۵]۔ یہ اصل یاد رکھنے کے قابل ہے کہ نفس امر ہے، لہٰذا یہ زہد و عبادت، ریاضت و مجاہدے، رہبانیت و ترکِ دُنیا اور تپسیا وغیرہ وغیرہ سے نہ کبھی مرا ہے نہ مر ہی سکتا ہے۔ نفسِ امّارہ یا نفس بدنی کی موت وجود کی موت کے ساتھ ہی ہوتی ہے، علاوہ بریں جنہیں لوگ طبعی، فطری، جبلّی یا طبعی تقاضے کہتے ہیں۔ وہ اصل میں اہوائے نفس ہیں۔ چنانچہ جب تک نفس کا چشمۂ حیات خشک نہیں ہو جاتا، خواہشات پیدا ہوتی رہتی ہیں؛ البتہ نفس مسلمان یا مطیع و فرماں بردار ہو جائے تو اس کی خواہشات اور تقاضوں پر قابو پایا اور اعتدال کی راہ پر رکھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اسلام رہبانیت کو روا نہیں رکھتا اور نہ نفس کو مارنے کی نصیحت و فرمائش یا فہمائش ہی کرتا ہے، البتہ نفس کو مسلمان کرنے کی نصیحت و فرمائش اور فہمائش کرتا ہے، کیونکہ یہی اس کے انعام یافتہ بندوں (= نبیین، صِدّیقین، شہدآء اور صالحین) کی حسین و راست راہِ عمل ہے جسے "صراطُ المستقیم" سے تعبیر کرتے ہیں۔

علم النفس سے انسان میں اپنی ذات اور اس کے حوالے سے جن بنیادی حقائق کا شعور بیدار ہوتا ہے، اُن میں سے اہم ترین یہ ہیں: اوّل، بشر مخلوق و عبد اور مربوب و فقیر ہے۔ دوسرے، اس کا کوئی خالقِ حقیقی، معبود، ربّ اور حاجت روا ہے، اور تیسرے وہ فقط اور تنہا اللہ تعالیٰ ہے۔ چوتھے، کائنات اور اس کی جملہ نعمتیں جملہ بنی نوع انسان کے تمتع کے لیے ہیں، اس لیے اشیائے کائنات کو مسخر کر دیا گیا ہے اور ان کی تسخیر کی خاطر انسان کو علم ودیعت کیا گیا ہے، جسے قوّت سے فعل میں لانا اس کی اپنی ذمے داری ہے؛ نیز اس میں اس کی قوّت و سطوت، شان و شوکت، آزادی و خود مختاری اور خوشحالی و ترقی کا راز مضمر ہے۔ پانچویں، وہ صاحبِ ارادہ و اختیار ہے اور اسے کسب و عمل، سعی و جہد اور تقریر و تحریر کی آزادی ہے، لیکن اس کی آزادی اس کے علم کی طرح مطلق و لا محدود نہیں۔ چھٹے، وہ صاحبِ ارادہ و اختیار ہونے کے اعتبار سے آزاد تو ہے، لیکن قدرت کے نوامیسِ طبیعی اور قانونِ مکافاتِ عمل کا مکلّف و مستوجب ہونے کے لحاظ سے مجبور ہے۔ ساتویں، نہ تو کائنات جو رنگ و نور کے نظاروں، جمیل و جلیل مناظر اور لذّت انگیز و مسحور کن نعمتوں کی جنّت ہے، اور نہ زندگی ہی، جو بے انتہا حسین و محبوب ہے، عبث و بے مقصد ہو سکتی ہے۔ لہٰذا ان دونوں کی ضرور کوئی غایت ہے۔ آٹھویں، انسان میں اپنی آرزوئے حسن و زندگی کا شعور بیدار ہوتا ہے۔ نویں، غایتِ زندگی کے شعور کے بیدار ہو جانے سے اس میں حیاتِ اُخروی کا شعور بھی زندہ و بیدار ہو جاتا ہے۔

علاوہ بریں، عالم کی برکت سے انسان کی جمالیاتی حِس زندہ و فعّال ہوتی ہے تو اس میں جمالیاتی ذوق نشو و ارتقا کرنے لگتا ہے، نتیجۃً اس میں حُسن و قُبح، حسنہ و سیّئہ، خوب و ناخوب، معروف و منکر اور خیر و شر میں تمیز کرنے کی استعداد کی تکمیل ہوتی ہے۔

ہر اسم کا مُسمّٰی اور ہر مسمّٰی کی قدر ہوتی ہے اور یہ تینوں اشیاء۔ اسم، مُسمّٰی اور قدر۔ علم کے بغیر اپنی ہستی رکھتی ہیں نہ نمود۔ یہ حقیقت علم کی غیر معمولی اہمیت کی آئینہ دار اور

اس پر حرفِ آخر ہے۔ یہ اِجمال تفصیل کا مقتضی ہے۔ زندگی اپنی قدر رکھتی ہے اور وہ ہے حسن۔ چنانچہ زندہ شخص وہ ہوگا جس کی زندگی میں حسن ہوگا، اور اس باعث وہ نفسِ مطمئنہ ہوگا اور اس میں حسن و زندگی کی آرزو فعّال ہوگی۔ زندگی میں حسن نہ ہو تو وہ اپنی جمالیاتی اقدار سے محروم اور خوف وحزن کی اسیر ہوتی ہے؛ اور جمالیاتی اقدار کا مطلب ہے: جمال وجلال، نور وسرور، حق و صداقت، طمانیت و مسرت اور آرزوئے حسن و زندگی۔ قرآن مجید نے اس لیے حسن سے محروم اہلِ نار سے متعلق فرمایا ہے: اِنَّہٗ مَنْ یَّاْتِ رَبَّہٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَہٗ جَھَنَّمَ ؕ لَا یَمُوْتُ فِیْھَا وَلَا یَحْیٰی ہ (طٰہٰ، ۲۰: ۷۴؛ نیز الاعلیٰ، ۸۷: ۱۳) (اصل یہ ہے کہ جو شخص اپنے رب کے پاس مجرم کی حیثیت سے آئے گا، اس کے لیے جہنم ہے جس میں وہ نہ تو مرے گا اور نہ جیئے گا۔

اصل میں زندہ وہ ہیں جو اہلِ حسن وسرور ہیں اور اس حقیقت سے آگاہ اہلِ علم ہوتے ہیں۔ اس سے یہ مستنبط ہوا کہ اہلِ علم ہی اصل میں زندہ اور لذّتِ زندگی سے آشنا ہوتے ہیں اور زندگی عبارت ہے جمالیاتی اقدار سے۔ اس گفتگو کا ماحصل یہ نکلا کہ تعلیم کا مقصد طلباء میں حسن و زندگی اور قبح و موت کا شعور بیدار کرنا، انہیں جمالیاتی اقدار اور لذّتِ زندگی سے آشنا کرنا، انہیں زندہ و اہلِ حسن وسرور بنانا اور ان میں حسن و زندگی کی آرزو کو زندہ و فعّال رکھنا ہے؛ اور اس حقیقی تعلیم کا نظام قائم کرنا خلافت کی ذمے داری ہے۔

۵۔ نظامِ حکمت:

اگر علم آگاہی اِسماء ہے، یعنی کائنات وحیات کی جمالیاتی اقدار اور اللہ تعالیٰ کی صفاتِ حسنہ کا اِدراک ہے تو حکمت انسان کو ان جمالیاتی اقدار سے مستفید ہونے اور صفاتِ الٰہیہ کو اپنے اندر جذب کرنے، نیز زندگی کے جادۂ مستقیم پر چل کر اپنی دُنیوی و اُخروی منزلِ مقصود پر پہنچنے کا ہُنر سکھاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حکمت انسان کو صاحبِ دل و صالح، خوش خُلق و صاحبِ کردار

اور عادل و محسن بناتی ہے۔ علاوہ بریں علم اگر اپنے ارتقاء کے ساتھ ساتھ کائنات میں پوشیدہ نعمتوں اور قوتوں کے خزینوں کا بتدریج سراغ لگاتا رہتا ہے تو حکمت انسان کو ان خزینوں سے مستفید ہونے کے قابل بناتی ہے۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حکمت کو علم مستلزم ہے اور علم حکمت چاہتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ علم کے بغیر حکمت اور حکمت کے بغیر علم سود مند و مؤثر نہیں ہوتے۔ علم کو حکمت ہی نافع بناتی ہے اور اس سے اس نکتے کی صراحت ہو جاتی ہے کہ کیوں رحمۃ للعالمین ﷺ ہمیشہ علمِ نافع کی دُعا مانگا کرتے تھے۔[۳۶] بہرحال علم و حکمت کے امتزاج سے ایک ایسی قوت پیدا ہوتی ہے جس میں تسخیر کرنے کی صلاحیت تو ہوتی ہے، لیکن خود قابلِ تسخیر نہیں ہوتی ہے۔ چنانچہ قوموں کی قوّت و سطوت، رعب و سیادت، شان و شوکت اور خوشحالی و ترقی کا مدار بہت حد تک اس امتزاجی قوت پر ہوتا ہے، جسے "علمی حکمتی قوّت" کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔ اس قوّت کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ زندگی کے نشو و ارتقا، اور دُنیوی و اُخروی حسنہ کا مؤثر ذریعہ ہے۔

چونکہ حکمت ایک ہمہ گیر مفہوم کی حامل اصطلاحِ قرآنی ہے، جو کُل زندگی کو محیط ہے، لہٰذا اس کے مختلف و اہم شعبوں کے لحاظ سے اس کی تعریف کی جاتی ہے:

۱۔ تعلیمی نقطۂ نظر سے:

علم اور تجربہ و مشاہدے سے کما حقہٗ استفادہ کرنے اور "سلطان" (= علم کی قوّتِ تسخیر) کو احسن مقاصد کی خاطر استعمال کرنے، نیز تحقیق و تفتیش، ایجاد و اختراع اور تخلیقِ ادب و فن کے ملکے سے بدرجۂ غایت استفادہ کرنے والی عقلِ جلیلہ و محرکہ کو حکمت سے تعبیر کیا جاتا ہے

۲۔ جمالیاتی نقطۂ نظر سے:

حکمت آرزوئے حُسن و زندگی کی تکمیل و اتمام کا فن ہے جو عقلِ جلیلہ و محرکہ کو چاہتا ہے۔ اس تعریف کی رُو سے حکمت انسان کو اپنے اندر حُسن و زندگی پیدا کرنے اور اہلِ حُسن و سرور

کی طرح زندگی گزارنے کا چلن سکھاتی ہے۔

۳۔ دینی نقطۂ نظر سے:

حکمت اس عقلِ جلیلہ وفاعلہ سے عبارت ہے، جس کے ذریعے اہلِ ایمان آفتابِ وحی و تنزیل سے نور و ہدایت اور حسن و زندگی حاصل کر سکتے اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے مطابق حسین و مطمئن اور مسرور و کامیاب زندگی گزار کر اپنے اِلٰہ و ربّ کا قُرب و رضوان حاصل کر سکتے ہیں۔

۴۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے:

حکمت عبارت ہے اس ملکہ اور عقلِ جلیلہ وفاعلہ سے، جس کے ذریعے اہلِ آرزو اپنی زندگی کو رنگِ الٰہی سے مزیّن کر سکتے ہیں؛ یا بالفاظِ دیگر، صفاتِ الٰہیہ کو اپنے اندر پیدا کر سکتے ہیں۔

۵۔ سیاسی نقطۂ نظر سے:

آرزوئے جلالِ سیاسی کی تکمیل و اِتمام کرنے کی، نیز عدل و احسان کی اساسِ محکم پر کُل معاشرتی نظام کو قائم کرنے اور احسن طریق سے چلانے کی صلاحیّت و عقلِ جلیلہ وفاعلہ کے زوجین کو حکمت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۶۔ ثقافتی نقطۂ نظر سے:

جمالیاتی ذوق کی احسن طریق سے تشفّی کرنے، اس میں وسعت و رفعت اور لطافت و نظافت پیدا کرنے، نیز جمالیاتی ذوق کے نو بنو اور تازہ بتازہ تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ثقافتی زندگی کو جدید ترین آرائش و زیبائش کے سامان سے مزیّن کرنے اور جمیل و جلیل زندگی گزارنے کی صلاحیّت و عقلِ جلیلہ وفاعلہ کے زوجین کا نام حکمت ہے۔

۷۔ معاشی نقطۂ نظر سے:

افرادِ معاشرہ میں قومی دولت کی عادلانہ پیدائش و تقسیم کو یقینی بنانے کی خاطر عدل و احسان

کی بنیاد پر معاشی نظام قائم کرنے اور احسن طریق سے چلانے، نیز معاشرے کو معاشرتی سرطانوں سے پاک و صاف کرنے اور محفوظ رکھنے کے ہنر و عقلِ جلیلہ و فاعلہ کے امتزاج کو حکمت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۸۔ نفسیاتی نقطۂ نظر سے:

حکمت عبارت ہے عقلِ جلیلہ و فاعلہ اور اس صلاحیت کے حسنِ امتزاج سے جس کے ذریعے اہلِ آرزو اپنے جیتے قلبی نفسی نظام کو صحت مند و صالح، زندہ و فعال اور حسین و منیر رکھنے اور اس کی تکمیل کرنے کی خاطر اس کا تزکیہ کرتے رہتے ہیں۔

حکمت کی ان از بس اہم جمالیاتی و افادی اقدار کو دیکھ کر اس امر کی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں ربِ علیم و حکیم نے قرآنِ حکیم میں حکمت کو "خیرِ کثیر" سے تعبیر کیا ہے[37] اور اس کی تعلیم کو نبوت کے بنیادی فرائض میں سے قرار دیا ہے[38]۔

۶۔ نظامِ عدل و احسان:

جس طرح انسان چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ عدل و احسان ہو، اسی طرح حسنِ فطرت کا خاصہ دوسروں کے ساتھ عدل و احسان کرنا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ آرزوئے عدل و احسان دراصل آرزوئے حسن ہی کی ایک صورت ہے۔ ظلم جو عدل کی ضد اور نقیض ہے، آرزوئے حسن یا آرزوئے عدل و احسان کے مفلوج و مردہ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ فرد کی طرح قوم کا نفس بھی عدل و احسان کی آرزو رکھتا ہے اور اس کے لیے معاشرتی عدل و احسان کا نظام ایک ناگزیر ضرورت ہے، جسے پورا کرنا خلافت کی ذمے داری ہے۔ عدل کے تین تقاضے ہیں: اول عسیر الحصول اور فوری ہو، دوسرے معیارِ عدل فطری و ہمہ گیر ہو اور بلا امتیاز سب کے لیے ہو اور ہر شعبۂ زندگی میں ہو، اور کوئی فرد، جماعت، طبقہ یا قوم اس سے مستثنیٰ نہ ہو، تیسرے حکومت اس کی ذمے دار ہو۔ اصل یہ ہے کہ نظامِ عدل کا قیام و حسنِ کارکردگی خلافت کی

اوّلین ذمے داریوں میں سے ہے ۔ اگر کوئی حکومت اپنی اس ذمے داری سے عہدہ برآ نہیں ہوتی تو اس کا سربراہ مجرم و ظالم ہے، لہٰذا اس کے لیے قابلِ مواخذہ ہے، نیز اُسے حکمرانی کے لیے نااہل قرار بھی دیا جاسکتا ہے۔

عصرِ حاضر کا تقاضا معاشی عدل ہے، اور یہ جتنا شدید ہے اتنا ہی اُسے سود، سودی سرمایہ کاری، جاگیرداری، زمینداری اور اشتراکی نظاموں نے دقیق و پیچیدہ بنا دیا ہے۔ اب اس کی قرآنی شکل، جو فطری و حسین شکل ہے، اس قدر مسخ ہو چکی ہے کہ مختلف مکاتبِ فکر کے درمیان اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ان اختلافات کو رفع کرنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ ہے قرآنِ حکیم اور اُسوۂ حسنہ، جنہیں سب دیکھتے، جانتے اور پہچانتے ہیں، لیکن مانتے نہیں، اور اس کی وجہِ حقیقی آرزوئے حسن و زندگی، حسنِ نظر، خلوصِ نیّت اور ذوقِ قرآن کا فقدان ہے۔

ایک مکتبِ فکر کے نزدیک مشینوں کی ایجاد اور صنعتی انقلاب کی وجہ سے سرمایہ و مزدور اور آجر و اجیر کے مابین جو معاشی مسائل و اختلافات پیدا ہوئے ہیں، انہیں (معاذ اللہ) قرآنِ مجید کے ذریعے حل نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ صنعتی۔ معاشی عدل کا کوئی معیار اس میں نہیں ملتا۔ اس کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ صنعتی انقلاب قرآنِ مجید کے نزول کے تقریباً گیارہ صدیاں بعد آیا تھا۔ اس نظریے کو ذوق و بصیرتِ قرآنی کی قلّت پر محمول کیا جاسکتا ہے، ورنہ اہلِ ذوق و آرزو جانتے ہیں کہ قرآنِ حکیم کے اُصولِ عدل واحسان کا اطلاق صاف صنعتی۔ معاشی عدل پہ کیا جاسکتا ہے۔ دلیل یہ ہے کہ یہ اُصول حسین اور فطری و حقیقی ہونے کے باعث عالمگیر و ہمہ گیر اور ہر گوشۂ زندگی پر حاوی ہے، اور صنعتی۔ معاشی زندگی کے قدیم و جدید جملہ تقاضوں کی تشفی کرتا ہے اور قیامت تک کرتا رہے گا۔ بہر حال قرآنِ حکیم یا فلسفۂ آرزو کی رُو سے صنعتی۔ معاشی عدل کا اوّلیں تقاضا یہ ہے کہ سرمایہ اور منافع دونوں کو سرمایہ کار کی ملکیت کے بجائے ربّ العالمین کی امانت سمجھا جائے، پھر منافع پہ سرمایہ کار سمیت جملہ کارکنوں کا حق تسلیم کیا جائے اور اسے ان کے درمیان عدل و احسان کے اصول کے مطابق تقسیم کیا جائے، یعنی ان میں سے ہر ایک کو ان کی محنت و

ذہنی کاوش کی کمیت وکیفیت کی نسبت سے حصہ ملنا چاہیے لیکن اس اصولِ تقسیم کی ایک اہم ترین شق یہ ہے کہ سب سے کم حصہ لینے والوں کے معیارِ زندگی میں کم سے کم تفاوت ہوتا کہ طبقاتی کشمکش ونزاع اور فکری تضاد وتخالف کا احتمال نہ رہے۔ اصل یہ ہے کہ مختلف طبقات و افراد کے معیارِ زندگی میں تفاوت جیساکہ سرمایہ داری، جاگیرداری، سودکاری اور زمینداری نظاموں میں ہے، غیر فطری وغیر حقیقی ہے اور عدل واحسان کے فقدان کی دلیل اور طبقاتی تضادات و تنازعات کی علتِ فاعلی ہے اور اس کا نتیجہ اشتراکیت کی صورت میں نکلا ہے۔ یہ معاشی ظلم ہے جو ایک طرف آرزوئے حسن وزندگی کے مفلوج ومسلوب ہونے کی علامت اور دوسری جانب اس کے فطری نتیجے ہلاکت وبربادی کا پیش خیمہ ہے۔ اس صورتِ حال کا ایک ہی مداوا ہے اور وہ ہے آرزوئے حسن وزندگی کا احیاء۔ اس احیائے آرزو سے حسی، قلبی، نفسی نظام میں نظامِ عدل واحسان کی اہمیت اس سے بہت زیادہ ہے جو عام طور سے اُسے دی جاتی ہے، نیز اس نظام کا قیام حکومت کی اہم ترین ذمے داریوں میں سے ہے۔ علاوہ بریں جس طرح نظامِ کائنات اپنی بقا اور حسنِ کارکردگی کے لیے قدرت کے قانونِ عدل وتوازن کا رہینِ منت ہے، اسی طرح معاشرتی زندگی کی بقا وسلامتی اور نشو وارتقاء کا دار ومدار معاشی عدل واحسان کے اصول پر ہے۔

آخر میں اس نکتے کی صراحت کردی جاتی ہے کہ معاشی احسان کا مطلب ہے عدل سے بڑھ کر حق دینا یعنی کسی کو اس کے حصے، طے شدہ اجرت، معاوضے یا معاہدے سے کچھ زائد دینا تاکہ وہ خوش ہوجائے، اور خود اپنے حصے سے کم لینا، یعنی ایثار کرنا۔

۷۔ نظامِ جہاد:

جہاد اصل میں حسن وحیاتِ کُلّی کی آرزو کے اِتمام کی ایسی مساعیِ جلیلہ وکاملہ سے عبارت ہے، جن میں جسم وجان، جذبات وتمنیات، مال ودولت، مفادات وتحفظات اور

گھر بار کی قربانی دینے سے دریغ نہ کیا جائے۔ اس تعریف کی رُو سے جہاد کو حُسنِ نیت مستلزم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جہاد ایک تو بالارادہ اور برضا و رغبت ہوتا ہے اور دوسرے اپنے الٰہ و ربّ کے دین کے قیام و تحفظ اور تشیع و تشہیر، نیز اس کے بندوں کے حسن و زندگی کے تحفظ اور ان کی اور اپنی آرزوئے حُسن و زندگی کے حُسنِ اِتمام کے لیے ہوتا ہے۔ ان سے اس امر کی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں اسلام نے جہاد کو ایک ازبس اہم فریضۂ حیات قرار دیا ہے۔ تاریخ سے بھی جہاد کی غیر معمولی اہمیت پر استشہاد کیا جا سکتا ہے، کیونکہ وہ حقیقت میں جہاد کے حوالے سے اقوامِ عالم کے عروج و زوال کی بصری و سمعی اور مکتوبی داستان ہے۔ اس داستان کا ماحصل یہ ہے کہ جن اقوام نے جہاد کی غیر معمولی اہمیت کو عملاً تسلیم کیا اور اس کے لیے ہمیشہ اور ہمہ وقت کمربستہ و پا بہ رکاب رہیں، اور حال و مستقبل کے حربی و دفاعی تقاضوں کے مطابق اس کی تیاری بحدِ کمال کرتی رہیں، نیز وہ جہاد سے ہراساں ہوئیں نہ گریزاں، وہ زمانے کی حریف قوتوں کا کامیابی سے مقابلہ کرتی رہیں اور عروج و کمال کی راہ پر گامزن رہیں۔ بخلاف اس کے جن اقوام نے جہاد کی اہمیت کو کما حقہٗ طور سے عملاً تسلیم نہ کیا اور اس کی تیاری میں اس ذوق و شوق اور مستعدی و ایثار کا مظاہرہ نہ کیا، جس کا وہ متقاضی ہے؛ نیز وہ جہاد سے ڈرنے اور کترانے لگیں تو وہ نحیف و کمزور اور زوال پذیر ہو گئیں۔ اس طرح ان میں آرزوئے حُسن و زندگی مردہ ہو گئی اور ولولۂ جہاد رہا نہ آرزوئے شہادت، نتیجتہً وہ زمانے کی حریف قوتوں کا مقابلہ نہ کر سکیں جنہوں نے انہیں اپنا محکوم و غلام بنا لیا یا ہلاک و برباد کر دیا۔

مختصر یہ کہ آرزوئے حُسن و زندگی ہو تو آدمی مجاہد بنتا ہے، اس میں ولولۂ جہاد اور تمنائے شہادت ہوتی ہے اور وہی حقیقت میں زندہ و آزاد ہوتا ہے۔ فلسفۂ آرزو کی رُو سے مُردہ قوم وہ ہوتی ہے جس میں آرزوئے حُسن و زندگی مردہ ہو جائے؛ نیز قدرت اُسے (فرد ہو یا قوم) حسن و زندگی عطا کرتی ہے، جسے اِن کی طلب و آرزو ہو۔ برخلاف اس کے

جسے حسن و زندگی کی طلب و جستجو نہ ہو، اُسے خواہشِ سیئہ و مرگ ہوتی ہے، لہٰذا قدرت اس کے لیے اس کی خواہش کے مطابق محکومی و غلامی یا ہلاکت و بربادی مقدّر کر دیتی ہے۔ "جیسی نیت ویسی مراد" کا مقولہ جتنا معروف ہے، اُتنا سچّا بھی ہے۔ یہ مفہوم یوں بھی بیان ہو سکتا ہے: "جیسی آرزو ویسی مراد"۔ یہ نکتہ جتنا لطیف و دقیق ہے، اُتنا سچّا اور فکر انگیز بھی ہے کہ اکثر اوقات آدمی کو پتا نہیں چلتا کہ اس کے اندر کی دُنیا یا باطن میں کیا ہو رہا ہے؟ آیا حیاتیاتی جرثوموں کے نفسِ کُلّی کو حسن و زندگی کی آرزو ہے یا سیئہ و مرگ کی؟ چنانچہ آدمی اس عالمِ تغافل و بے خبری یا تجاہُلِ عارفانہ میں بن آئی موت مارا جاتا ہے۔ اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ آزاد و زندہ اور مجاہد وہ ہوتا ہے جو ہر لحظہ اپنے نفس کا جائزہ لیتا اور اس کا محاسبہ کرتا رہتا ہے۔ اس اعتبار سے معرفتِ نفس کی اہمیت اس سے بہت زیادہ ہے جو عموماً سمجھی جاتی ہے۔ معرفتِ نفس کا مطلب دراصل اس کی آرزوئے حسن و زندگی سے آگاہی ہے۔ آرزوئے حسن دراصل الحسن والحق کی آرزو ہے، جو اس کا معروضِ حسن و محبت (= اِلٰہ) اور نشو و ارتقا دینے والا آقا (= ربّ) ہے؛ لہٰذا جو شخص اپنی اس آرزوئے نفس سے آگاہ ہو جاتا ہے، وہ اپنے معروضِ آگہی یعنی اِلٰہ و ربّ سے بھی آگاہ ہو جاتا ہے، اسی لیے یہ مقولہ مشہور ہوا: مَنْ عرف نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ۔ جس شخص نے اپنا نفس پہچانا، اُس نے اپنا ربّ پہچان لیا۔

بہر حال، مجاہد اپنے نفس کی آرزوئے حسن و حیات سے آگاہ ہوتا ہے اور اُسے پورا کرنے کی خاطر جہاد کرتا ہے۔ چونکہ جہاد ایک اجتماعی (= قومی و ملّی) ضرورت و فریضہ ہے، لہٰذا اس کی عصری و تقابلی اور ارتقائی و استقبالی مقتضیات کو نظم و ضبط کے ساتھ باحسن لوجوہ پورا کرنے کی اوّلین ذمے داری خلافت پر عائد ہوتی ہے۔ لیکن اس میں خلافت سے حتّی المقدور تعاون کرنا جملہ افرادِ معاشرہ پر لازم ہے۔ چونکہ یہ جہاد حریفانِ خارجہ کے خلاف ہوتا ہے، اس لیے اسے "جہادِ خارجی" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اسی طرح اس جہاد کو

جو ہم داخلی دشمنوں کے خلاف کرتے ہیں، "جہادِ داخلی" کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔ داخلی جہاد دراصل معاشرے میں ظلم وجہل کے خلاف ہوتا ہے۔ ظلم وجہل کے خلاف جہاد کا مطلب ایک تو فرعونوں، ہامانوں، قارونوں اور آزروں کے خلاف جہاد ہے، دوسرے ان تمام ظالموں، مجرموں، سیاہ کاروں اور فتنہ پردازوں کے خلاف جہاد ہے، جو معاشرے میں فتنہ وفساد برپا کرتے، نیز فحشاء ومنکر اور شرک وبت پرستی کی تشہیر وترویج کرتے ہیں۔ جہاد باللسان بھی ہوتا ہے اور جہاد بالقلم وبالسیف بھی۔ یہاں اس نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ فساد کے معنی صرف ہنگامہ برپائی، شوروغل، قتل وغارت اور آتشزنی وغیرہ نہیں، بلکہ اس سے مراد ہر وہ فعل ہے جس سے معاشرے کا توازن بگڑتا ہو، اور افرادِ معاشرہ کی آرزوئے حسن وزندگی کی راہ کو ناہموار و دشوار گزار بناتا ہو۔ اس سے لوگوں سے ناانصافی یا زیادتی ہوتی ہو، نیز اس سے اخوت و محبت، باہمی اعتماد ورواداری اور آزادیِ فکر وعمل کی فضا مکدر ہوتی ہو اور اس پر ظلم کا اطلاق ہوتا ہو۔ فلسفۂ آرزوئے حسن کے حوالے سے فساد کو آرزوئے سیئہ ومرگ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ فساد کے وقت مفسد کے دل میں آرزوئے حسن وزندگی کی جگہ آرزوئے سیئہ و مرگ لے لیتی ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے فساد کی صراحت کر دینا فائدے سے خالی نہ ہوگا:

فساد کی کئی قسمیں ہیں، مثلاً (۱) بہیمی (۲) اقتصادی ومعاشی (۳) سیاسی (۴) عسکری (۵) ثقافتی (علمی، ادبی، فنی، دینی۔ مذہبی اور عصبیتی (قومی، لسانی، علاقائی، جغرافیائی، قبائلی، الوانی، خیلی، نیز رواجی ورسمی)۔ اب اقسامِ فساد کی فرداً فرداً صراحت کی جاتی ہے:

۱۔ بہیمی فساد:

اس کا مطلب لوگوں کا معاشرے میں بلوے، ہنگامے، لوٹ مار، قتل وغارت کرنا، نیز اغوا اور آتشزنی اور خانہ بر اندازی کی وارداتیں کرنا ہے۔ اس کے محرکات وعوامل معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی کوئی بھی ہو سکتے ہیں۔

۲۔ اقتصادی و معاشی فساد:

اس کا محرّک جذبۂ تاروُنی ہوتا ہے اور اس کا مطلب صنعت کاروں، آجروں، تاجروں، دکانداروں، سرمایہ کاروں، جاگیرداروں اور زمینداروں کا ظلم و استحصال اور بد دیانتی و بدکرداری ہے۔ اس کی تین بڑی قسمیں ہیں۔ (ا) زرعی (ب) صنعتی اور (ج) کاروباری فساد۔

(ا) زرعی فساد:

اس سے مُراد ظالم و جابر تارونوں (مثلاً جاگیرداروں، زمینداروں، نیز مہاجنوں، سرمایہ کاروں، آڑھتیوں وغیرہ وغیرہ) کی غیر منصفانہ تقسیم پیداوار ہے جس کے منفی اثرات سے ایک تو معاشرے کی گردشِ دولت میں توازن نہیں رہتا، دوسرے اس میں تضاد و عصبیت، منافرت و مخاصمت اور عداوت و اِنتقام کی آتشِ خاموش سُلگنے لگتی ہے اور جب بھڑک اُٹھتی ہے تو اس کا نتیجہ مظاہروں، بلووں اور ہنگاموں، قتل و غارت اور بالآخر انقلاب کی صورت میں نکلتا ہے، جس طرح روس، چین اور دیگر اشتراکی ممالک میں نکلا ہے۔ غیر منصفانہ تقسیم کی مثال سرمایہ دارانہ ممالک، مثلاً پاک و ہند میں زرعی تقسیم پیداوار ہے۔ یہ اصل میں سودکاری و استحصال ہی کی ایک شکل ہے۔ چونکہ یہ غیر منصفانہ تقسیم آرزوئے حسن و زندگی، جو حقیقت میں روحِ اسلام ہے، کے مطابق نہیں ہوتی، اس لیے یہ حسین و صحت مند نہیں ہوتی، بلکہ قبیح و مضرت رساں ہوتی ہے۔ اس کا محرّک عموماً جذبۂ تکاثُر ہوتا ہے جو جاگیرداروں اور زمینداروں کو معاشرتی سرطان بناتا ہے۔ برخلاف اس کے مزارع و محنت کش ایک تو اپنی آرزوئے حسن و زندگی کے ضعف و اِضمحلال، دوسرے حکومتِ حقیقی یا خلافت کے فقدان اور تیسرے معاشرتی سرطانوں کے جبر و تشدد کے باعث غیر منصفانہ تقسیم بالجبر قبول کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

(ب) **صنعتی فساد** کی علتِ فاعلی بھی زرعی فساد کی طرح آجر و اجیر یا سرمایہ کار و محنت کش کے مابین منافع کی غیر عادلانہ تقسیم ہے۔ پیداوار یا منافع کی تقسیم کا فطری و حقیقی اصل الاُصول

عدل واحسان ہے۔ جو آرزوئے حسن وزندگی کی تکمیل کا واحد ذریعہ ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس اصل الاصول کی رُو سے منافع کی تقسیم محنت کی کمیّت وکیفیت کے مطابق ہونی چاہیئے۔ لیکن کم سے کم حصہ اتنا بہرحال ہونا چاہیے جس سے ہر کارکن اور اس کے کنبے کی کفالت احسن طریق سے، یعنی معاشرے کے عام معیارِ زندگی کے مطابق ہو سکے، نیز سب سے کم اور سب سے زیادہ حصہ لینے والوں کے حصۂ منافع میں کم سے کم عادلانہ تفاوت ہو، جس کے لیے "حسنِ تفاوت" کی تعبیر موزوں رہے گی۔ حسنِ تفاوت اصل میں فطری تفاوت سے عبارت ہے اور اس کی مثال اختلافِ ذوق کی سی ہے۔ یہ ایک مُسلّمہ حقیقت ہے کہ بنی نوع انسان کی جمالیاتی حِس میں وحدت اور جمالیاتی ذوق میں اختلاف پایا جاتا ہے اور اسی میں کائنات کے جمال وجلال اور نظر افروزی وجاذبیت اور انسان کے جمالیاتی سوز وسُرور کا راز مُضمر ہے۔ چنانچہ حسن وزندگی کی آرزوئے کُلّی کے نشوو ارتقا اور اِتمامِ مسلسل کے لیے، نیز زندگی کی لذّت سے زیادہ سے زیادہ لُطف اندوز ہونے اور کائنات کی نعمتوں سے زیادہ سے زیادہ تمتّع کرنے، اور معاشرے کو تضادات وتنازعات سے پاک امن وسلامتی کی جنّت بنانے کے لیے اشیائے آسائش میں حسنِ تفاوت ناگزیر ہے۔

اصولِ عدل واحسان سے، جو ربّ العالمین کی "کتاب الانسان" (= قرآنِ حکیم) سے مأخوذ ہے، زمانۂ حال کے ایک مکتبِ فکر کے اس دعوے کی تردید ہو جاتی ہے کہ قرآنِ حکیم نے صنعتی عدل کا کوئی معیار قائم نہیں کیا یا کوئی اصول نہیں دیا۔ یہ مکتبِ فکر اپنے موقف کے ثبوت میں یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ مشینوں کی ایجاد اور صنعتی انقلاب کے نتیجے میں سرمایہ ومزدور یا آجر واجیر کے درمیان جو نزاعی مسائل واختلافات پیدا ہوئے ہیں اور جنہوں نے افرادِ نسلِ انسانی کو رہینِ خوف وحُزن کر دیا ہے، ان کا قرآنِ حکیم میں کوئی حل نہیں ملتا، کیونکہ اس کا نزول صنعتی انقلاب سے تقریباً گیارہ صدیاں پہلے ہوا تھا۔ اس کا مطلب ایک تو یہ ہوا کہ نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کو ان مسائل واختلافات کا علم نہ تھا۔ لہٰذا اس نے ان مسائل کا

کا کوئی حل نہیں بتایا، اور دوسرے قرآنِ حکیم ایک نامکمل ضابطۂ حیات ہے اور ہر زمان و مکان کے لیے نہیں ہے؛ اور یہ عقیدہ صریحًا کفر ہے۔ اصل یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کا اصولِ عدل و احسان کُل زندگی کو محیط ہے، یعنی اس کے ہر شعبے پر حاوی ہے اور اس کے جُملہ تقاضوں کی تشفی کرتا ہے اور قیامت تک کرتا رہے گا۔ وجہ یہ ہے کہ وہ آرزوئے حسن و زندگی کی طرح فطری ہے اور اس کی تشفی و تکمیل کا واحد ذریعہ ہے۔

یہ اصل یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کُل افرادِ نسلِ انسانی ایک ہی خالق و رب کی مخلوقات ہیں اور اس نے اپنی جُملہ نعمتیں سب کے لیے کائنات کو ودلیعت کی ہیں، اور ان سے اصُولِ عدل و احسان کے مطابق اور حسنِ تفاوت کے ساتھ سب کو متمتع ہونے کا حق ہے۔ چنانچہ سرمایہ کاری ہو یا "زمین کاری" اصل میں سود کاری ہے، اگر پیداوار یا منافع کی تقسیم اصُولِ عدل و احسان کے منافی ہو۔ مثال کے طور پر کسی کارخانہ دار، زمیندار، اجارے دار، تاجر، الغرض ہر قسم کے سرمایہ کار کا پیداوار یا نفع میں سے مروجہ اصُولِ سرمایہ کاری یعنی اصُولِ طلب و رسد کے مطابق اپنا حق یا حصہ لینا، اصولِ عدل و احسان (یا اصُولِ حسنِ تفاوت) کے منافی ہے؛ بلکہ یہ ربٰو یا سود کاری کی گھناؤنی صورت ہے جو حسن و حیات کی آرزوئے کُلّی کا خون کر دیتی ہے۔ آرزوئے کُلّی سے سرمایہ کاروں اور محنت کاروں سب کی آرزو مراد ہے۔

مختصر یہ کہ اصُولِ عدل و احسان عالمگیر اخوّت و حُرّیت اور رحمت و حسنِ تفاوت کا مظہر ہے۔ یہ معاشرۂ انسانی کے امن و سلامتی کی ضمانت فراہم کرتا ہے؛ یہ آرزوئے حسن و حیات کا احیاء اور نشوو ارتقا بھی کرتا ہے۔ چنانچہ اس اصُول کے مطابق ہر فردِ بشر کو اس کی ضروریاتِ زندگی (مثلاً روٹی، کپڑا، مکان، نیز تعلیم و تربیت، علاج معالجہ اور مناکحت) کی سہولتیں بالضرور ملنی چاہئیں؛ لیکن جہاں تک اشیائے آسائش کا تعلق ہے، ان کی فراہمی اصُولِ عدل و احسان کے مطابق ہونی چاہیے اور ان میں حسنِ تفاوت ناگزیر ہے۔

حاصلِ کلام یہ کہ صنعتی فساد کا محرک و سبب تقسیمِ نفع میں حسنِ تفاوت کا فقدان ہے اور صنعتی فساد خود قومی اور بین الاقوامی اضداد و مناقشات اور جنگ و جدال (چاہے سرد ہو یا گرم) کا محرک و سبب ہے۔

(ج) کاروباری فساد کے محرکات و عوامل متعدد ہیں؛ مثلاً چور بازاری، تاجاتی یا سمگنگ، ذخیرہ اندوزی، ناجائز نفع خوری، سود خوری یا سود کاری، کم تولنا، کم ماپنا، کم ناپنا، زیادہ لینا اور کم دینا، دکھانا کچھ اور دینا کچھ، اشیائے صرف میں ملاوٹ کرنا یا کھوٹ ملانا، امانت میں خیانت کرنا، لین دین میں بد دیانتی کرنا، وعدہ خلافی کرنا، جھوٹ بولنا وغیرہ وغیرہ۔ نیز صنعتی فساد کی طرح یہ فساد بھی پہلے کسی قوم کی معیشت کو تنگ کر دیتا ہے، اور پھر اسے معاشی اعتبار سے اس قدر مفلوک و کمزور کر دیتا ہے کہ اس کی مفلوک الحالی و کمزوری اپنی حریف قوتوں کے لیے صلائے عام بن جاتی ہے، یا بالفاظِ دیگر

ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

ان مباحث کا ماحصل یہ نکلا کہ معاشی فساد کسی صورت اور کسی گوشۂ حیات میں ہو، اولادِ آدم کو زندگی اور اس کی لذت سے محروم کر دیتا ہے۔ علاوہ بریں، وہ غارتگرِ امن و سلامتی، دزدِ طمانیت و سعادت، مہلکِ حیات و توانائی اور رہزنِ حسن و حیات ہوتا ہے، اور معاشرے کو خوف و حزن کی آگ لگا دیتا ہے، جس کی اذیتیں سہنا، افراد کا مقدر بن جاتا ہے، اور آتشکدۂ خوف و حزن میں زندگی کرنے والے نہ زندوں میں ہوتے ہیں نہ مردوں میں۔

۳- سیاسی فساد:

افراد کی ہوسِ منصب و مراعات اور تکاثرِ اقتدار کے سبب معاشرتی زندگی تضادات، اختلافات اور تنازعات و مناقشات کی شکار ہو جائے اور اس کے نتیجے میں اس میں

ہم آہنگی و یک جہتی، نظم و ضبط، اتحاد و اتفاق اور موافقت و یگانگت مفقود ہو جائیں تو اس صورتِ حال کو سیاسی فساد سے تعبیر کرتے ہیں۔

فرد کی طرح قوم کا بھی نفس ہوتا ہے اور اُسے بھی طبعاً حُسن و زندگی اور جلالِ سیاسی کی طلب و جستجو ہوتی ہے۔ اگر کسی بیماریِ قلب کے سبب اس کی آرزوئے حسن و زندگی ضعیف و نزار یا مردہ ہو جائے تو اُس کی آرزوئے جلالِ سیاسی رنگِ قبح سے مزیّن ہو کر آرزوئے فرعونی و ہامانی میں بدل جاتی ہے اور اس سے دنیائے سیاست میں فساد برپا ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس سے سیاسی نظام میں اختلال و خرابی اور جمود و تعطّل پیدا ہو جاتا ہے، جس کے منفی اثرات کُل حیاتِ قومی پر مرتب ہوتے ہیں۔ اس طرح اس کے نظامِ کُلّی میں بھی بے نظمی و خرابی پیدا ہو جاتی ہے، جس کے نتائج قوم کے حق میں منفی و تباہ کُن ہوتے ہیں۔

آرزوئے حسن و زندگی زندہ و حرکی ہو تو نفسِ قومی کو آرزوئے جلالِ سیاسی ہوتی ہے؛ بالفاظِ دیگر اسے معاشرے میں صلوٰۃ و زکوٰۃ، تعلیم و تربیت، اخلاقی تادیب و تبلیغ اور اجتہاد و جہاد کے نظام قائم کر کے اُسے خوف و حزن سے محفوظ و مصوّن رکھنے اور امن و سلامتی کی جنّت بنانے کی طلب و جستجو ہوتی ہے۔ بخلاف اس کے اگر آرزوئے حسن و زندگی زندہ و حرکی نہ ہو تو اس کا نتیجہ حیاتِ اجتماعیہ میں فقدانِ وحدت اور اس کی شیرازہ بندی میں انتشار کی صورت میں نکلتا ہے۔ علاوہ ازیں، نفسِ قومی میں فرعون، ہامان، قارون اور آزر بننے کی آرزو نشو و نما پانے لگتی ہے۔ چنانچہ جب قوم کی فکر و نظر میں وحدت نہیں رہتی تو اس کے قول و عمل میں بھی ہم آہنگی نہیں رہتی اور اس کی راہ و منزل بھی ایک نہیں رہتی۔ اس کے نتیجے میں وہ گمراہ ہو کر منزلِ مقصود سے دُور بھٹکنے اور اپنی توانیاں بے مصرف ضائع کرنے لگتی ہے۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ قوم میں وحدتِ فکر و نظر ہو تو اس میں روحِ عسکری ہوتی ہے، جسے "جلالِ عسکری" سے تعبیر کر سکتے ہیں، یہ جلالِ عسکری ہے جس کی بدولت وہ فوج کی طرح منظم و جلیل اور بُنیانِ مرصوص بنتی ہے۔ بخلاف اس کے وحدت نہ ہو

تو قوم میں روحِ عسکری (= جلالِ عسکری یا عسکریت) بھی نہیں رہتی اور وریت کی دیوار کی طرح ہو جاتی ہے، دیکھنے میں مربوط و مضبوط، حقیقت میں نامربوط و کمزور، جو ضربتِ حریفانہ کی متحمل نہ ہو سکے۔

۴۔ عسکری فساد :

فوج میں روحِ عسکری اس اصلِ قوت ہے : یہ نہ رہے تو اس میں نظم و ضبط رہتا ہے نہ رعب و جلال ؛ نیز اس میں جہاد و شہادت کی آرزو بھی نہیں رہتی، جو دراصل آرزوئے حسن و زندگی ہے۔ یہ صورتِ حال عبارت ہے عسکری فساد سے۔ ایسی فوج جہاد کی تیاریاں کرنے اور اس کے لیے تیار رہنے اور اپنا رُخ سرحدوں کی طرف رکھنے کے بجائے ایوانِ حکومت کی طرف کر لیتی ہے ؛ پھر موقع ملتے ہی میدانِ سیاست میں اتر آتی ہے اور حکومت پر قبضہ کر لیتی ہے۔ اس صورتِ حال کے نتائج عموماً یہ نکلتے ہیں :

اوّل، حیاتِ اجتماعیہ کے سیاسی عمل میں جمود و تعطل پیدا ہو جاتا ہے اور قوم کی فکر مفلوج، گراہ اور زبان گنگ ہو جاتی ہے۔

دوم، فوج اپنے فرائضِ منصبی سے غافل ہو جاتی ہے اور آخرِ کار ان سے بطریقِ احسن عہدہ برآ ہونے کے قابل نہیں رہتی۔

سوم، اس میں جذبۂ جہاد سرد پڑنے لگتا ہے اور اس کی جگہ ہوسِ جاہ و منصب اور تکاثرِ قوت و اقتدار لے لیتی ہے۔

چہارم، داخلی سیاست میں ملوث ہونے کے باعث فوج ایک تو لوگوں میں ہر دلعزیز نہیں رہتی اور دوسرے ان کا اعتماد و حمایت کھو بیٹھتی ہے۔

یہ نتائج جو عسکری فساد کے لوازمات ہیں، گھناؤنے، منفی، خوف انگیز و حزن آفریں اور بعض اوقات مُہلک بھی ثابت ہوتے ہیں۔

۵۔ ثقافتی فساد:

آرزوئے حسن و زندگی کے فقدان سے ثقافتی زندگی کے عناصرِ ترکیبی میں وحدت نہ رہے تو اس میں نظم وضبط رہتا ہے نہ ہم آہنگی و یکرنگی، نتیجۃً اس میں جمود و تعطل اور خرابی و پراگندگی کی صورت پیدا ہو جاتی ہے، جسے ثقافتی فساد کہتے ہیں۔ اس کی پانچ بڑی اقسام ہیں: (ا) ادبی و علمی (ب) فنی (ج) دینی و مذہبی (د) رسمی و رواجی اور (ہ) عصبیتی (نسلی، جغرافیائی، لسانی، علاقائی)۔ اب ان کی فرداً فرداً اختصار سے صراحت کر دی جاتی ہے:

(ا) ادبی فساد:

اہلِ قلم میں آرزوئے حسن و زندگی نہ رہے یا وہ سقیم و کمزور ہو جائے تو فکر میں وحدت نہیں رہتی اور وہ پراگندہ ہو جاتی ہے، دوسرے اس میں نور نہیں رہتا، جس کے سبب وہ اندھی اور بے راہ ہو جاتی ہے۔ اس طرح اس کی راہ ایک رہتی ہے نہ منزل، بلکہ وہ مختلف و جداگانہ ہو جاتی ہیں۔ علاوہ بریں، چونکہ اہل قلم کو اپنے ادب میں روحِ حسن و حیات پھونکنے کا دماغ رہتا نہ یارا، لہٰذا ان کا ادب حسین و زندہ ہونے کے بجائے قبیح و مردہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اہلِ قلم میں آرزوئے حسن و حیات اور ادب میں روحِ حسن و حیات کے فقدان کے سبب ادب میں سطحیت و قبح، ناہمواری و بے اعتدالی، پراگندگی و انتشار اور جمود و تعطل پیدا ہو جاتا ہے، جس کے لیے ہم نے ادبی فساد کی تعبیر اختیار کی ہے۔

عرصۂ حیاتِ انسانی میں ادب کی مثال گلستان کی سی ہے جو روح پرور و قرۃ العین صحت بخش و جاں فزا، نیز جمالیاتی ذوق کی تسکین کا سامان ہوتا ہے۔ چنانچہ ادب نہ ہو تو ثقافت بھی اپنے جمال و جلال اور آراستگی و تزئین سے محروم ہوتی ہے۔ اگر ادب ہو لیکن قبیح و مردہ ہو تو اس کے منفی و مہلک اثرات سے ثقافت بھی حسین رہتی ہے نہ زندہ۔

ایسا ادب ایک تو مخرّب الاخلاق ہوتا ہے اور اپنے قارئین کو کور ذوق و حسن کور بنانے میں ابلیسی کردار ادا کرتا ہے، دوسرے وہ اہلِ قلم و قوم کی کور ذوقی و حسن کردی کا مظہر ہوتا ہے جس طرح ثقافت کے نشو و ارتقاء میں حسنِ ادب از بس اہم کردار ادا کرتا ہے، اُسی طرح ادبِ قبیح ثقافت کو اس کے مرکز سے جدا کر کے اس میں تشتّت و افتراق یا فساد پیدا کرنے میں غیر معمولی حصّہ لیتا ہے۔

(ب) فنّی فساد:

فن اپنی جمالیاتی۔ افادی اقدار اور زندگی سے محروم، تیر اپنی جہت و منزل سے دور ہو جائے تو اس کا اپنے مرکز سے رشتہ منقطع ہو جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں اس میں ایک تو نظم و ضبط، ہم آہنگی و مناسبت اور تناسب و اعتدال نہیں رہتا؛ دوسرے اس میں خرابی کی صورت اپنا جلوہ پیدا کرنے لگتی ہے، جس کے لیے ہم نے "فنّی فساد" کی تعبیر اختیار کی ہے۔ فنّی فساد قوم و فنکار کی حسن کوری، کور ذوقی اور حق کوری پر دلالت کرتا ہے، اور ادبی فساد کی طرح رہزنِ حسنِ خلق، غارتگرِ آرزوئے حسن و زندگی اور خانہ براندازِ ثقافت ہوتا ہے۔

ادب کی طرح فن بھی چمنِ ثقافت کی زینت ہے اور اس کے نشو و ارتقاء میں اہم حصہ لیتا ہے؛ لہٰذا ثقافت کے نشو و ارتقاء اور تحسین و تزئین کے لیے فن کا حسین و زندہ ہونا ناگزیر ہے۔ فن سے متعلق یہ نکتہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر اس کی جہت شرک و بت پرستی کی طرف ہو تو اس میں فساد کا پیدا ہونا ایک فطری امر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ شرک سے اس میں وحدت نہیں رہتی اور اپنے تشخص سے محروم ہو جاتا ہے۔ علاوہ بریں، مشرکانہ فن گمراہ کُن، رہزنِ حسن و حیات اور غارتگرِ چمنِ ثقافت ہوتا ہے۔

جمالیاتی تخلیقی فعلیت ادبی ہو یا فنّی، اس کا اصل الاصول یہ ہے کہ یہ آرزوئے حسن و حیات ہے جو ادیب و فنکار کو صاحبِ ذوق و حسن کار بناتی اور اس کے فن میں حسن و زندگی تاثیرِ تزکیہ و احیاء پیدا کرتی ہے، جس سے ثقافت نشو و ارتقاء کرتی ہے۔ بخلاف اس کے،

مردہ و قبیح فن ثقافت کے لیے غارتگرِ حسن و زندگی ہوتا ہے۔ اصل میں ادیب و فنکار ہوتا ہی وہ ہے جو حسن کار بھی ہو، یعنی اس کا ادب و فن صالح ہو۔ بخلاف اس کے جس ادب و فن سے ثقافت میں فساد پیدا ہو، وہ حقیقت میں ادب ہوتا ہے نہ فن؛ نیز اس کا خالق بھی سچا فنکار نہیں ہوتا۔

(ج) دینی۔ مذہبی فساد:

دین آرزوئے حسن و حیات کے احیاء و اتمام کی سعی و جہد سے عبارت ہے؛ اور اس جولانگاہِ سعی و جہد کی فطری حدود کو حدود اللہ اور ان سے تجاوز کرنے کو "غلو فی الدین" کہتے ہیں۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ دین میں غلو کے محرکات عقیدت و محبت اور خوف و رجا کے جذبات ہوتے ہیں۔ غلو ہی سے دین میں فساد پیدا ہوتا ہے، اور اس کی تین بڑی صورتیں ہیں: شرک، بُت پرستی اور بدعات۔ ان صورِ قبیحہ سے معاشرتی سرطان پیدا ہوتے ہیں، جن کے لیے قرآنِ مجید نے فرعون، ہامان، قارون اور آزر کی فکر انگیز و بصیرت افروز تعبیرات اختیار کی ہیں۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ یہ بڑی ہی معنی خیز اور اہم تاریخی تلمیحات ہیں۔

جہاں تک آزری سرطان کا تعلق ہے، اس کا وظیفہ چہار گونہ ہے: اول، شرک و بت پرستی اور بدعات کی تشنیع و ترویج اور تحفظ؛ دوم، فرعونی، ہامانی اور قارونی سرطانوں کی حمایت و معاونت؛ سوم، قوم کی آرزوئے حسن و حیات کو اوہام و خرافات، بدعات اور اسمائے بے مسمّٰی کے ملبے تلے دبا دینا؛ اور چہارم، بنی نوعِ انسان کو ان کے اِلٰہ و ربّ سے غافل و دور اور جدا و مہجور کرنا اور شیاطین کا حلقہ بگوش بنانا۔ اس اعتبار سے دینی۔ مذہبی فساد کی علّتِ تامّہ آزریت ہے اور اس کا مطلب ہے: اوّل آزریت کی نمود اور کارستانیوں (مثلاً شرک و بت گری، اصنام پرستی و بدعات، مرگِ توحید و آرزوئے حسن و حیات کے ہنگاموں) کے نتیجے میں عقائد جلیلہ و محرکہ، نظریات و افکار، عبادات و مناسک اپنے نقطہ ماسکہ (= قبلے یا مرکز) سے جدا ہو جاتے ہیں یا ثانیاً، یا اس سے برائے نام رابطہ رہ جاتا ہے اور ثالثاً، ان میں اختلاف و تضاد

اور تشتت وافتراق پیدا ہو جاتا ہے۔ رابعاً قوم مختلف مذاہب اور فرقوں میں بٹ جاتی ہے۔ خامساً، نفسِ قوم اپنی وحدتِ تشخص سے محروم ہو کر پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ فساد کی یہ صورت حال، جو معاشرتی سرطانوں کے لیے سازگار ہوتی ہے، معاشرے کے لیے خطرناک و مہلک ہوتی ہے، اور قوم کی آرزوئے حسن وحیات کو نفسانی خواہشات میں دفن کرنے میں غیر معمولی کردار ادا کرتی ہے۔ چنانچہ فرعونی حکومت کی ایک پہچان یہ ہے کہ وہ آمریت کی معاون و سرپرست ہوتی ہے، اور اس کی معاونت سے اللہ تعالیٰ کے بندوں کو اپنے محکوم و مطیع بنانے میں کامیاب ہوتی ہے۔ اس سرطانی شیطانی عمل میں ہامانی و قارونی سرطان بھی نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔

دینی۔مذہبی فساد سے قوم کے ایمان بالحق کی قوت اور اس کی آرزوے حسن و زندگی میں اضمحلال و انحطاط کا آغاز ہو جاتا ہے اور یہ صورتِ خرابی اس کی ذلت و مسکنت رجعتِ قہقہری اور مرگِ مفاجات کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں اس فساد سے ثقافت میں بھی بے نظمی و بے ربطی اور ناآہنگی و خرابی کے علاوہ جمود و تعطل پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ اپنے جمال وجلال اور حیات وقیومیت سے محروم ہو جاتی ہے اور پس ماندگی و زوال، ذلت و مسکنت اور ہلاکت و بربادی اس کا نوشتۂ تقدیر بن جاتا ہے۔

(د) رسمی ورواجی فساد:

ثقافت کے عناصرِ ترکیبی میں رسم و رواج کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ رسم ورواج حسین بھی ہوتے ہیں اور قبیح بھی۔ حسین رسم و رواج سے گلزارِ ثقافت کی توسیع بھی ہوتی ہے اور تزئین و تحسین بھی؛ نیز اس کی بوقلمونی و نظر افروزی اور دلکشی و جاذبیت میں اضافہ بھی ہوتا ہے۔ علاوہ بریں حسنِ رسم و رواج سے آرزوئے حسن وحیات کے نشو وارتقا میں بھی مدد ملتی ہے۔ حسین و قبیح رسم ورواج کی ایک پہچان یہ ہے کہ جو رسم و رواج دین کے دائرے یا حدود اللہ کے اندر ہوں، وہ جائز و حسین ہیں اور جو ان سے تجاوز کر جائیں وہ قبیح ہوتے ہیں۔

جمالیاتی نقطۂ نظر سے ان کی تعریف اس طرح کر سکتے ہیں کہ جو رسم و رواج آرزوئے حسن و زندگی کی تکمیل میں ممدّ و معاون ثابت ہوں، یا کم از کم اس کی راہ میں حائل نہ ہوں، تو وہ حسین ہوں گے، ورنہ بصورت دیگر وہ قبیح ہوں گے۔ چنانچہ یہ قبیح رسم و رواج ہیں، جن کے باعث ثقافت میں فساد پیدا ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ رسم و رواج دین کے دائرے یا حدودُ اللہ سے تجاوز کر جائیں تو وہ اسراف و تبذیر، شرک و ہوا پرستی، تکاثر و ریاکاری اور قبح و سیّئہ کے شکار ہو جاتے ہیں؛ نیز ان کا رشتہ اپنے عقائدِ جلیلہ و محرّکہ، خصوصاً عقیدۂ توحید سے منقطع ہو جاتا ہے یا برائے نام رہ جاتا ہے، اس سے نفسِ ثقافت کی آرزوئے حسن و حیات مضمحل و سقیم ہو جاتی ہے اور ثقافت کے عناصرِ ترکیبی میں انتشار پیدا ہونے لگتا ہے اور اس صورتِ خرابی کے لیے ہم نے رسمی و رواجی فساد کی تعبیر اختیار کی ہے۔

(د) عصبیتی فساد کی چار بڑی اقسام ہیں: نسلی، جغرافیائی، لسانی اور الوانی۔

ثقافت کی مثال شجرِ طیبہ کی سی ہے، جس کی اصل ایک اور شاخیں متعدد گوناگوں ہوتی ہیں، لیکن ان کا رابطہ اپنی اصل سے استوار رہتا ہے۔ اگر عصبیت عقیدہ توحید پر غالب آ جائے تو ثقافت کی اصل سے اس کی شاخوں کا رشتہ استوار نہیں رہتا، لہٰذا وہ کمزور یا منقطع ہو جاتا ہے، یا برائے نام رہ جاتا ہے۔ اس سے ثقافت میں انتشار و پراگندگی اور ویسی نظمی و خرابی کی صورت پیدا ہو جاتی ہے، جسے عصبیتی فساد کہتے ہیں۔

چونکہ دینِ اسلام ہی اس وقت اپنی فطری صورت میں دُنیا میں موجود ہے اور وہی انسان کی آرزوئے حسن و حیات کی تکمیل و اتمام کا احسن ذریعہ ہے، لہٰذا سلیم الفطرت انسان اور اس کے فاطرِ ربِّ کریم دونوں کو یہی دین پسند ہے۔ اسلام کی ایک مابہ الامتیاز خصوصیت یہ ہے کہ اس میں خالص توحید کے باعث عصبیت کی گنجائش نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ عصبیت، چاہے نسلی و جغرافیائی ہو یا لسانی و الوانی، اخوّت و تکریمِ انسانی، عدل و احسان، محبّت و وحدت اور توحید کے منافی ہوتی ہے، جن کا اسلام داعی و نقیب ہے۔ اسلامی ثقافت کی ایک امتیازی خوبی یہ ہے کہ

وہ عالمگیر و ہمہ گیر ہے اور اس کا مدار توحید ہے، جس کے اِرد گرد وہ گھومتی رہتی ہے، لہٰذا وہ ہر رنگ و نسل اور زبان و علاقے کے لوگوں کے گلہائے ثقافت سے اپنی آرائشگی و تزئین کرتی ہے اور اس میں اس کے جمال و جلالِ حیات و قیومیت اور عالمگیری و ہمہ گیری کا راز مضمر ہے لیکن اس جگہ اس عبرت آموز واقعیت کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے کہ جب سے ملّتِ اسلامیہ میں توحید ایک زندہ و حرکی عقیدے کے بجائے محض نظریہ بن کر رہ گئی ہے اور اس کا رشتہ عملی زندگی سے برائے نام رہ گیا ہے، عصبیت نے اس کی ثقافت میں فساد برپا کر رکھا ہے اور وہ اپنے جمال و جلال اور زندگی سے بہت حد تک محروم ہو چکی ہے؛ یہ صورتِ حال خطرناک و تشویشناک تو ہے، لیکن مایوس کن نہیں، کیونکہ ثقافت کی اس محرومی کا درماں اس کے پاس ہے اور وہ ہے عقیدہ توحید، جسے وہ اپنی زندگی میں جذب کر کے اپنی تلافیِ مافات کر سکتی ہے؛ نیز ایک جمیل و جلیل اور عظیم و دلکش ثقافت کی صورت میں اہلِ ذوق و نظر کے قلب و نگاہ اور غیر اسلامی ثقافتوں کو مسخر کر سکتی ہے۔

۸۔ نظامِ حسنِ تشہیر:

اس سے مراد حسنِ خُلق کے عناصرِ ثلاثہ — حق، صبر اور مرحمت — کی باہمی پند و نصیحت کا نظام ہے، جسے احسن طریق سے قائم کرنا اور چلانا خلافت یا مثالی حکومت کی اہم ذمہ داری ہے۔ اب حیاتِ انسانی میں حسنِ خُلق کے ان عناصرِ ثلاثہ کی غیر معمولی اہمیت کی صراحت کر دی جاتی ہے:

(۱) حق:

حسنِ خُلق کا یہ بنیادی عنصر آئینہ حسن ہے، اور اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ اہلِ حق کی آرزوئے حسن در زندگی زندہ و فعّال اور حرکی و ارتقائی ہے؛ نیز اس میں ایسی صفاتِ جمیلہ و جلیلہ مضمر ہوتی ہیں، جو آرزوئے حسن و حیات کے نشو و ارتقا اور اِتمام میں از بس اہم

کردار ادا کرتی ہیں۔ آگے بڑھنے سے پہلے حق کے بنیادی عناصرِ امتزاجی کی مختصراً تصریح کی جاتی ہے:

(الف) صدق حق کا ازبس اہم بنیادی عنصر ہے، جو اہلِ حق کو صدّیق اور اس کی زندگی کو سچا یا خالص بناتا ہے۔ سچی زندگی زرِ خالص یا سچے موتی کی طرح آب و تاب رکھتی ہے اور اس کی طرح اہلِ نظر کی نگاہ میں محبوب و دلکش اور نظر افروز و بے بہا ہوتی ہے۔ صدّیق صاحبِ حسن و سرور اور مردِ کامل ہوتا ہے؛ نیز وہ محبوبِ خدا و خلائق اور کمیاب بھی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمان و مکان میں اہلِ حسن و نظر کو اس کی طلب و جستجو رہتی ہے۔ اور اس کا اظہار مولانا رومیؔ اور علامہ اقبالؔ نے اس طرح کیا ہے:

دے شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر
از دام و دد ملولم و انسانم آرزو ست (رومیؔ)

اور

غضب ہے کہ اس زمانے میں
ایک بھی صاحبِ سرور نہیں (اقبالؔ)

(ب) حق کا دوسرا عنصرِ امتزاجی نور ہے۔ نورِ حیاتِ دنیوی و اخروی میں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے، جس کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ یہ نور ہے جو حسّی، عقلی و نفسی نظام کو تاب و تواں دیتا اور اسے زندہ و منیر اور فعال و حرکی، نیز اپنے فطری وظائف احسن طریق سے سرانجام دینے کے قابل بناتا ہے۔ یہ نظام اپنے نور کی بدولت ہی حق و باطل، حسن و قبح، صدق و کذب، حسنہ و سیّئہ اور خیر و شر میں امتیاز کرتا اور اپنی آرزوئے حسن و حیات کی راہِ تکمیل کو دیکھتا اور پہچانتا ہے۔ قرآنِ حکیم کی رو سے اس نور کی بدولت ہی انسان میں "بصیرت" پیدا ہوتی ہے اور وہ حقیقت میں بصیر یا بینا ہوتا ہے، علاوہ بریں قیامت کے دن وہ اپنے اس نور کی بدولت ہی اپنی راہ و منزل کو دیکھ جنت میں پہنچ سکے گا۔[۵۱]

بخلاف اس کے جو شخص اس دُنیا میں اپنے نور سے محروم ہوتا ہے، وہ حقیقت میں اندھا ہوتا ہے اور اندھوں کی طرح زندگی گزارتا ہے، لہٰذا وہ اپنی بے بصری کی پاداش میں قیامت کے دن اندھا اُٹھے گا۔[۴۱] اس کے نتیجے میں وہ اپنے حسنُ المآب کو دیکھ سکے گا نہ اس کی راہ کو؛ اور شرّ المآب میں بھٹکنا اور اپنی حسرتوں کی آگ میں جلنا اور نہ مرنا، اس کا مقدر بن جائے گا۔[۴۲] اصل یہ ہے کہ جو شخص اس دُنیا میں محروم نورِ حیات ہوگا، وہ آخرت میں بھی محروم و نامراد رہے گا۔

(ج) زندگی بھی حق کا عنصرِ امتزاجی ہے۔ یہ یاد رہے کہ حیاتِ حق میں تأثیرِ احیاء ہوتی ہے۔ چنانچہ اہلِ حق ہی حقیقت میں زندہ ہوتے ہیں اور انہیں ہی اپنے معروضِ حسن و عشق کا قرب و رضوان نصیب ہوتا ہے:

زندگی نتواں گفت حیاتے کہ مراست
زندہ آنست کہ با "دوست" وصالے دارد

(د) حیات کی طرح قیومیت بھی حق کا عنصر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک تو خود حق میں صورتِ ثبات و دوام مضمر ہوتی ہے، اور دوسرے وہ نفوسِ حق کو صورتِ ثبات و دوام بخشتا ہے۔

(ہ) جلال عنصرِ حق ہے اور اُسے قوّت و توانائی، ہیبت و جبروت، عظمت و سطوت اور رعب و دبدبہ عطا کرتا اور اُسے ناقابلِ تسخیر بناتا ہے۔

(ط) جمال: حق میں اپنے عنصرِ جمال کی بدولت لطافت و محبوبیت، موزونی و زیبائی، دلکشی و جاذبیت اور دلآویزی و نظر افروزی پیدا ہوتی ہے۔ اہلِ حق کی صفاتِ جمال و جلال کو علامہ اقبال اس طرح بیان کرتے ہیں:

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
معرکۂ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

حقیقت یہ ہے کہ حق خود حُسن کا ایک عُنصرِ امتزاجی ہے اور آرزوئے حُسن میں حق کی آرزو مضمر ہوتی ہے، نیز آرزوئے حُسن اصل میں الحسن والحق کی طلب و جستجو ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے حق کی تبلیغ و تشہیر کو فرض قرار دیا ہے؛ نیز اس نے انسان کو اس حقیقت سے آگاہ کیا ہے کہ حق کی قوت کے ذریعے تاریخی عمل کی جہت کو اپنے لیے صالحہ بنایا اور رکھا جا سکتا ہے اور اس طرح اس کے منفی اثراتِ مسلسل سے بچا جا سکتا ہے۔ اس جگہ اس از بس اہم نکتے کی صراحت کر دی جا سکتی ہے کہ اسلام انفرادی۔ اجتماعی دین ہے[۴۳]، لہٰذا فرد و جماعت دونوں اپنے اپنے مقدور و وسعت کے مطابق اس کے احکام کی تعمیل کے مُکلّف ہیں۔

(ب) صبر[۴۴]: حق کی طرح صبر کی تبلیغ و تشہیر بھی فرد و جماعت پر لازم ہے۔ وجہ یہ ہے کہ صبر کمال و کامیابی کی پیش شرط ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے۔ یہ ایک مُسلّمہ حقیقت ہے کہ حیاتِ انسانی رہینِ محنت و مشقت ہے[۴۵]؛ لہٰذا اس کا نشو و ارتقا اور کمال محنتِ مسلسل کے بغیر ممکن نہیں، اور محنتِ مسلسل کو صبر مستلزم ہے اس سے مستنبط ہوا کہ صبر کامیابی و کمال کی پیش شرط ہے۔

یہ دُنیا انسان کے لیے دار العمل ہے اور عمل و عُمر لازم و ملزوم ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کو عمر بھر عمل کرنا پڑتا ہے اور عملِ مسلسل کے لیے محنت و صبر لازمی ہیں۔ بالفاظِ دگر عمل، محنت اور صبر سلسلۂ حیاتِ انسانی کی تین مضبوط کڑیاں ہیں، لہٰذا کامیابی اور ترقی و کمال حاصل کرنے، نیز فلاح پانے کے لیے عمل، محنت اور صبر لازمی ہیں۔

صبر کے متعدد عناصرِ معنوی ہیں: (۱) ضبطِ نفس (۲) برداشت (۳) قناعت (۴) نظم و ضبط (۵) استقلال و ثبات یا مستقل مزاجی و ثابت قدمی (۶) عزم بالجزم (۷) رجا (۸) حوصلہ (۹) پامردی و مردانگی (۱۰) ایثار و قربانی (۱۱) یقین اور (۱۲) حلم و بُردباری۔

امام راغب اصفہانیؒ اپنی شہرۂ آفاق لغت المفردات میں صبر سے متعلق لکھتے ہیں: صبر کے لغوی معنی ہیں (۱) تنگی زیست یا مصیبت کے وقت نفس کو روک رکھنا اور یہ "جزع" کی ضد ہے۔

(۲) جنگ کی حالتِ خوف وخطر میں نفس کو ڈرنے، بھاگنے یا ہمت ہار دینے سے) باز رکھنا' اور اسے "شجاعت" سے تعبیر کرتے ہیں، جس کی ضد "جُبن" یا بزدلی ہے (۳) کسی ہولناک حادثے میں نفس کو قابو میں رکھنا، اسے رَحْبُ الصَّدْر یا کشادہ دلی کہتے ہیں، جس کی ضد "ضجر" یعنی تنگدلی ہے۔ اصل یہ ہے کہ صبر کو قرآنِ حکیم اور اہلِ عرب مندرجۂ بالا متعدد معانی و مفاہیم میں استعمال کرتے ہیں جن کی فرداً فرداً ایجاز و اختصار سے صراحت کر دی جاتی ہے:

۱۔ ضبطِ نفس:

اپنے نفس کو ہر اُس قول و فعل سے باز رکھنا جو دین و فطرتِ انسانی کے منافی اور قبیح ہو، مثلاً دروغ گوئی، تکذیب و کتمانِ حق، جرم و گناہ، ظلم و استحصال، شرک و بت پرستی اور سیئہ و شر۔ جمالیاتی نقطۂ نظر سے نفس کو ہر اُس قول و فعل سے روکے رکھنا جو قبیح و حسن رُبا، رہزنِ طمانیت و لذتِ حیات اور غارتگرِ آرزوئے حسن و حیات ہو۔

۲۔ برداشت:

اس کا مطلب ہے اپنی آرزوئے حسن و حیات، مشن یا منصوبے کی تکمیل میں یا اُصولِ عدل و احسان اور حق و صداقت کی خاطر مشکلات و مصائب اور طعن و تشنیع کو برداشت کرنا، ہمت نہ ہارنا اور اپنی دھن میں لگے رہنا۔

۳۔ قناعت، ضد ہے طمع کی۔ اس کا مطلب ہے نفس کا اپنے احوال و ظروف سے سمجھوتہ کرنا اور مطمئن رہنا، نیز اس کا طمع نہ کرنا، جزع و فزع نہ کرنا، مضطرب و پریشان نہ ہونا اور نہ شکوۂ ایام ہی کرنا۔ قناعت پیش شرط ہے شکرِ نعمت کی۔ چنانچہ قناعت کا خاصہ شکرِ نعمت اور طمع کا خاصہ کفرانِ نعمت ہے: نیز طمانیتِ نفس قناعت کو چاہتی ہے اور قرآنِ مجید کی رو سے مطمئن نفس ہی اللہ تعالیٰ سے خوش اور اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہوتا ہے؛ نیز وہ وارثِ جنت ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ قناعت انسان کو دولتِ فقر عطا کر کے حرص و ہوا اور طمع سے بے نیاز کرتی اور مستغنی بناتی

ہے۔ چنانچہ کتبِ سیر شاہد ہیں کہ قانع انسان ہی عظیم و عہد آفرین ہوئے ہیں اور انہوں نے عظیم و تاریخ ساز کارنامے سرانجام دیے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ایجاد و اختراع اور تحقیق و تخلیقی مغلیت کے لیے انسان کا قناعت پسند ہونا ضروری ہے۔

۴۔ نظم و ضبط (Discipline ڈسپلن):

صبر کا یہ معنوی عنصر بھی زندگی میں ازبس اہمیت رکھتا ہے۔ چنانچہ یہ نظم و ضبط ہے، جو فوج میں عسکریت پیدا کرتا ہے؛ اور عسکریت عبارت ہے فوج کی قوت و توانائی، رعب و دبدبہ اور ہیبت و سطوت سے۔ فوج میں نظم و ضبط نہ رہے تو وہ عسکریت سے محروم ہو کر بھیڑ کی طرح ہو جاتی ہے۔ نظم و ضبط کسی قوم میں اس کے اتحاد و اتفاق، قوت و توانائی اور رعب و دبدبہ کا ضامن ہوتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو وہ ریت کی دیوار ہوتی ہے۔ کھیل کا میدان ہو یا میدانِ کارزار فتح و کامیابی کے لیے نظم و ضبط کی غیر معمولی اہمیت سے متعلق دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ علاوہ بریں زندگی کا کوئی گوشہ ہو اور کوئی بھی احوال و ظروف ہوں، نظم و ضبط کی افادیت و اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ غور سے دیکھیں تو نظم و ضبط قومی جذبے اور تحمل و ایثار پہ دلالت کرتا اور جلد بازی و خود غرضی سے باز رکھتا ہے۔ اس کا ایک فائدہ جو یقیناً غیر معمولی نوعیت کا ہے، یہ ہے کہ یہ افراد و قوم کی توانائی کے ضیاع کو روکتا، نفس کی تربیت و تہذیب کرتا اور اسے قابو میں رکھنے میں مؤثر کردار ادا کرتا ہے؛ نیز یہ انسان کو جلد بازی و خود غرضی کے منفی اثرات و نتائج سے محفوظ رکھتا ہے۔ جمالیاتی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو نظم و ضبط میں اندازِ جمال و جلال پایا جاتا ہے؛ نیز وہ قوم کے جمالیاتی ذوق کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

۵۔ استقلال و ثبات یا مستقل مزاجی و ثابت قدمی:

یہ صبر کا جزوِ رواں عنصر ہے اور اس کی معنویت میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے بغیر انفرادی و اجتماعی

ترقی وکمال، فتح وکامرانی اور آرزوئے حسن وحیات کی تکمیل کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔

محنتِ مسلسل، جو انسان کا مقدر اور اس کی ترقی وکمال اور کامیابی وکامرانی کی کلید ہے، استقلال وثبات کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ کتبِ تاریخ وسیر شاہد ہیں کہ دنیا میں وہی انسان باکمال ہوئے ہیں جو محنتی وجفاکش اور مستقل مزاج وثابت قدم تھے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں صبر کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور اس کے ابلاغ کو اس نے فرد وقوم پہ لازم قرار دیا ہے تاریخی عمل کا حسنِ نظر سے مشاہدہ کریں تو انسان کو اس حقیقت کا علم الیقین ہوجاتا ہے کہ حیاتِ انسانی دین کے چار اساسی اجزائے لاینفک۔ ایمان وعملِ صالح اور حق وصبر کے بغیر مسلسل زیاں پذیر رہتی ہے اور ان اجزائے اربعہ میں صبر کی روح استقلال وثبات ہے، جو اسے اس زیانِ مسلسل سے تحفظ فراہم کرنے میں نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔

۶۔ عزم بالجزم بھی صبر کا ایک اہم عنصرِ امتزاجی ہے۔ اس کے بغیر انسان کا مصائب ومشکلات اور خوف وخطر کے عالم میں ثابت قدم رہنا انتہائی مشکل ہے۔ علاوہ ازیں، زندگی کا کوئی شعبہ اور گوشہ ہو، وہی شخص محنتِ مسلسل اور مشقتِ پیہم کرسکتا، مصائب وشدائد جھیل سکتا، مشکلات پہ قابو پاسکتا، موانع عبور کرسکتا، خطرات کا مقابلہ کرسکتا اور اس طرح فتح وکامیابی سے ہمکنار ہوسکتا ہے، جو صاحبِ عزیمت ہو۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ نفس پہ قابو پائے بغیر آدمی کا ظلم وشرک اور جرم وگناہ سے بچنے اور عادتِ قبیحہ کو چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور عزم بالجزم کے بغیر نفس پہ قابو پانا محال ہے۔

توبہ کیا ہے؟ جرم وگناہ اور لغزش وخطا سے باز رہنے اور اپنے نفس پر قابو پانے کا عزم بالجزم اور اس کا اظہار ہی توبہ ہے۔ تقویٰ کیا ہے؟ نفس کو قابو میں رکھنے کی طلب وجستجو ہی تو ہے تاکہ وہ بے قابو ہوکر شیطان کے جالیاتی وسوسوں سے دھوکے میں آکر اللہ تعالیٰ کے بجائے اس کا بندہ نہ بن جائے۔ الغرض، عزم بالجزم کے بغیر اپنی آرزوئے حسن وحیات

کی تکمیل تو کیا ایسا کرنے کی سنجیدہ کوشش بھی نہیں کر سکتا، نیز یہ سچ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اہلِ عزیمت یا صابرین کے ساتھ ہوتا ہے۔[۲۷]

۷۔ رَجا، صبر کا اہم عنصرِ امتزاجی ہے۔ یہ انسان کے اندر شمع امید روشن رکھتی اور اسے یاس وقنوطیت سے بچاتی ہے۔ قنوطیت دراصل اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوسی اور کفرانِ رحمت ہے؛ علاوہ بریں، رجا سے اگر آرزوئے حسن و زندگی نشوو ارتقا کرتی ہے تو یاسیت سے انسان میں سیئہ و مرگ کی آرزو پیدا ہوتی اور نشو وارتقا کرتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ کامیابیوں وکامرانی کی امید کے بغیر کوئی شخص محنت و مشقت، سعی و جہد اور جہاد و قتال نہیں کر سکتا اور نہ اپنی آرزوئے حُسن و حیات کی تکمیل کی خاطر شدائد و مصائب برداشت ہی کر سکتا ہے؛ نیز وہ خطرات کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتا۔ رَجا کی مثال اس شمعِ فروزاں کی سی ہے جو انسان کو اس کی کامیابی کامرانی کی حسین صورت دکھاتی، اس کی حوصلہ افزائی کرتی، ہمت بڑھاتی اور اسے معروفِ عمل وثابت قدم رکھنے میں نمایاں کردار ادا کرتی ہے۔ اس سے امر کی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں قرآنِ مجید نے انسان کو لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۝ (الزمر ۳۹ : ۵۳) کا حکم دیا ہے اور قنوطیت کو ضلالت قرار دیا ہے (الحجر ۱۵: ۵۶)۔ ان ارشاداتِ قرآنی سے یہ استنباط کر سکتے ہیں کہ اپنی آرزوئے حسن و حیات کی تکمیل کرنے کے لیے انسان کا رجائیت پسند ہونا ناگزیر ہے۔

۸۔ حوصلہ بھی صبر کا امتزاجی عُنصر ہے۔ دلیل یہ ہے کہ آدمی حوصلہ مند ہو تو وہ صبر کر سکتا ہے؛ یعنی وہ حریف قوتوں اور خطرات کا مقابلہ کر سکتا، نامساعد حالات میں ثابت قدم رہ سکتا، نیز شدائد و مصائب کو برداشت کر سکتا ہے۔ غرضیکہ، اپنی آرزوئے حُسن و حیات کو وہی اُولُوالعزم انسان پورا کر سکتے ہیں جو حوصلہ مند ہوتے ہیں۔

۹۔ پامردی و مردانگی :

حوصلہ و پامردی لازم و ملزوم ہیں اور دونوں صبر کو مستلزم ہیں۔ چنانچہ مشاہدہ گواہ ہے کہ رزم و بزم میں احوال و ظروف کیسے ہی نامساعد خطرناک اور شکیب رُبا و خوفناک کیوں نہ

ہوں، وہ لوگ ثابت قدم رہتے اور پامردی و مردانگی کا مظاہرہ کرتے ہیں جو صابر ہوتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ پامردی و مردانگی صبر کا عنصرِ امتزاجی ہے، اور ماہرینِ حربیات نے اسے ہمیشہ جنگ و قتال میں فیصلہ کن عامل تسلیم کیا ہے۔ مختصر یہ کہ عزتِ نفس کی حفاظت، عصمت و ناموس کی پاسداری، صیانتِ جان و مال اور جہاد میں پامردی و مردانگی کی غیر معمولی اہمیت سے متعلق دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔

۱۰۔ ایثار و قربانی:

صبر اکثر حالتوں میں ایثار و قربانی چاہتا ہے، اس لیے یہ بھی اس کا عنصرِ امتزاجی ہے۔ بے صبری عموماً خود غرضی پر دلالت کرتی ہے۔ چونکہ بے صبر لوگ اکثر خود غرض ہوتے ہیں یا کم از کم بے صبری کے وقت خود غرضی کا مظاہرہ کرتے ہیں، لہٰذا وہ نہ دوسروں کے جذبات و ضروریات کا پاس و احترام کرتے، نہ ان کے لیے ایثار و قربانی کرتے اور نہ نظم و ضبط اور قوانین کا احترام ہی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی عموماً وہ لوگ کرتے ہیں جو اپنے وقت کا ایثار نہیں کرتے اور حادثات کا موجب بنتے ہیں، نیز انہیں ہی قومی جگہوں پر قطار بنانا، اپنی باری کا انتظار کرنا اور نظم و ضبط کا مظاہرہ کرنا گوارا نہیں ہوتا۔ جالیاتی، تخلیقی عمل کسی نوعیت کا ہو، صبر چاہتا ہے اور صبر ایثار و قربانی۔ اللہ تعالیٰ نے متقی و محسن لوگوں کی ایک صفت یہ بتائی ہے کہ "وہ خوشحالی اور مفلوک الحال ہر حالت میں (اس کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں" (آل عمران ۳: ۱۳۴) تنگدستی و مفلوک الحالی میں انفاق بالخصوص "ایثار آمیز صبر" پر دلالت کرتا ہے۔

۱۱۔ یقین بھی صبر کا عنصرِ امتزاجی ہے۔ دلیل یہ ہے کہ اگر آدمی کو اپنی فتح و کامیابی کا یقین نہ ہو تو وہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے جد و جہدِ مسلسل اور محنت و مشقت نہیں کر سکتا اور نہ مشکلات و خطرات کا مقابلہ اور مصائب و شدائد برداشت ہی کر سکتا ہے۔ یہ قوتِ یقین ہے جو آدمی کو صابر بناتی ہے؛ یعنی اسے زندگی کے ہر محاذ پر ثابت قدم اور راہِ عمل میں رواں دواں

رکھتی۔ نیز اُسے ناساعد و صبر آزما حالات کا مقابلہ کرنے کے قابل اور ناساعد و صبر آزما حالات کا مقابلہ کرنے کے قابل اور ناقابلِ تسخیر بناتی ہے۔ غرضیکہ انسان اپنی قوّتِ یقین ہی کی بدولت اپنی آرزوئے حسن و حیات کی تکمیل کر سکتا، کوئی کارِ نمایاں سرانجام دے سکتا، کسبِ کمال کر سکتا اور اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔

۱۲۔ **حلم و بُردباری** کا مطلب ہے کسی بات یا کسی کی زیادتی پہ اشتعال میں نہ آنا؛ غیظ و غضب کی حالت میں نفس کو قابو میں رکھنا، غصّہ پی جانا؛ دوسروں کی خطا و زیادتی اور قصور سے درگزر کرنا اور معاف کر دینا؛ اور یہ شیوۂ اربابِ صبر ہے۔ اصل یہ ہے کہ حلم بھی صبر ہی کا عنصرِ امتزاجی ہے؛ اور اسے مکارمِ اخلاق میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ یہ ایک ایسی جمالیاتی۔ اخلاقی صفت ہے جو آدمی کو صابر و کریم بنانے اور زندگی کے ہر گوشے میں اُسے کامیابی سے ہمکنار کرنے میں مدد دیتی ہے؛ نیز یہ کینہ و انتقام اور عداوت و مخاصمت کی آگ بجھانے اور انسان کو غیظ و غضب کے مُہلک و خطرناک نتائج و عواقب سے محفوظ رکھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

اسلام میں حسنِ خُلق کو اور حسنِ خلق میں حلم کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے؛ اور اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ دین کی غایت تزکیۂ نفس کے ذریعے خُلقِ انسانی کو حسین و عظیم بنانا ہے۔ حسنِ خُلق اللہ تعالیٰ کی ایک صفتِ حسنہ ہے اور اس سے مُتصف بندوں کو وہ محبوب رکھتا ہے۔

ان مباحث سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ صبر کے جُملہ عناصرِ امتزاجی مکارمِ اخلاق ہیں اور وہ خود ایک نہایت اہم جمالیاتی۔ اخلاقی صفت ہے، جسے قرآنِ حکیم نے اسلام کے ان عناصرِ خمسہ (= ایمان، عملِ صالح، حق، صبر اور مرحمت) میں شمار کیا ہے، جو حیاتِ انسانی کو زیانِ مسلسل سے محفوظ و مصئون رکھتے ہیں۔

اب دین کے پانچویں عُنصر مرحمت سے گفتگو کی جاتی ہے تاکہ اجتماعی زندگی میں اس کی

اہمیت اور اس علّتِ غائی کا ادراک ہو سکے کہ اسلام نے کیوں اس کی تلقین و تبلیغ کو فرد و قوم پر لازم قرار دیا ہے۔

(ح) مرحمت (جمع مراحم اور مادّہ ر ح م): اس وسیع المعانی لفظ میں ہمدردی و غمگساری، شفقت و مرحمت، نوازش و عاطفت، لطف و عنایت اور رحم و کرم کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ یہ عظیم اخلاقی۔ جمالیاتی صفت انسان کے خُلقِ عظیم پر دلالت کرتی ہے اور اس میں دین کی غایت مضمر ہے۔

یہ مبالغہ نہیں حقیقت ہے کہ مرحمت سے ایک طرف صلح و آشتی، یگانگت و خیرسگالی اور اخوّت و محبّت کے جذبات پرورش پاتے ہیں اور دوسری جانب کینہ و انتقام اور عداوت و مخاصمت کی آگ سرد پڑتی ہے۔ یہ تلافیِ مافات کا مداوا اور جراحتِ دل کا مرہم ہے۔ فلسفۂ جُرم و ظلم کا لُبِّ لباب یہ ہے کہ جن اشخاص کا شعارِ زندگی مرحمت ہو، وہ شقی القلب نہیں ہو سکتے، لہٰذا وہ جُرم و ظُلم کو روا نہیں رکھتے؛ بلکہ وہ سعید و رقیق القلب اور صاحبِ دل و دردمند ہوتے ہیں۔ تاریخ کی زبان میں اہلِ مرحمت فرعون و ہامان، قارون و آذر یا ابوجہل و ابی لہب نہیں ہو سکتے، بلکہ وہ انبیاءؑ و صدّیقین اور شہداء و صالحین ہوتے ہیں، جیسے حضرت محمد رسول اللہ صَلَّی اللہُ علیہِ وسلّم، نیز صدّیق و فاروق اور عثمان و علی رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ صحابۂ کبائر رضی اللہ عنہم اجمعین صاحبِ خُلقِ عظیم و رحمۃ للعالمینؐ کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی ہی کے تو پیداوار تھے، اور ان کی سیرتِ حسنہ کی ایک نمایاں خوبی ان کا شعارِ مرحمت تھا، جس کا ثمرہ اخوّت و مساوات اور "مُواخات" کی صورت میں نکلا، جس نے مسلمانوں کو ایک عظیم "اُمّت" ناقابلِ تسخیر قوّت اور بنیانِ مرصوص بنا دیا۔

فلسفۂ عمرانیات کا حاصل یہ ہے کہ جس معاشرے میں مرحمت کا قحط ہو وہ "سرطانی" ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں معاشرتی سرطان، مثلاً فرعون و ہامان اور قارون و آذر مختلف صورتوں اور ناموں کے ساتھ متمکن ہوتے ہیں۔ بخلاف اس کے جس معاشرے میں مرحمت

ہو وہ رحمانی ہوتا ہے، جسے اسلامی معاشرے سے تعبیر کرتے ہیں اور جس کی اکمل و احسن مثال وہ معاشرہ تھا، جسے رحمۃ للعالمینؐ نے تشکیل دیا تھا اور اس میں اپنی روحِ رحمۃ للعالمینی پھونکی۔ روحِ مرحمت عالمگیر پھونکی تھی اور وہ معاشرتی سرطانوں سے پاک و صاف تھا۔ اصل یہ ہے کہ آپؐ کا یہ حسنِ خلق ہی آپؐ کا اسوۂ حسنہ ہے۔

جمالیاتی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو مرحمت کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ وہ ایسے جمالیاتی قدر و عاملہ ہے جس کے بغیر آرزوئے حسن و حیات کی تکمیل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مرحمت میں قوتِ احیا ہوتی ہے جو آرزوئے حسن و حیات کو نہ صرف زندہ و حسکی بناتی ہے، بلکہ اس کا نشو و ارتقا اور اتمام بھی کرتی ہے۔ زندہ و فائز المرام ہیں وہ اہلِ ایمان جو اپنی آرزوئے حسن و حیات کا نشو و ارتقا کر کے اس کی تکمیل کرتے ہیں؛ اور مردہ و نامراد ہیں وہ لوگ جو اپنی آرزوئے حسن و حیات کو اپنی خواہشاتِ تبیحہ کے بارِ گراں تلے دبا دیتے ہیں یا نفسِ امّارہ کی قبرِ ہوا و حرص میں دفن کر دیتے ہیں۔

اس گفتگو سے اس امر کی توجیہ ہو جاتی ہے کہ کیوں ربّ۔ رحمٰن و رحیم نے مرحمت کی تبلیغ و تشہیر کو فرض اور خلافت کی ذمے داری قرار دیا ہے۔

9:۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا نظام:

اس نظام کا قیام بھی خلافت کی ذمے داری ہے اور اس میں افرادِ معاشرہ برابر کے شریک ہیں۔ اس بصیرت افروز و جامع مصطلحۂ قرآنی کا مطلب جمالیاتی۔ اخلاقی نظام ہے جس کا قیام معاشرے کی اصلاح و صالحیت کے لیے ناگزیر ہے۔ معروف کا مطلب جمالیاتی۔ اخلاقی قدر اور حسنِ عمل ہے، جسے سلیم الفطرت انسان طبعًا، عقلاً اور شرعًا جانتا اور پہچانتا ہو اور سمجھتا ہو کہ واقعی حسنہ، خیر اور عملِ صالح ہے؛ نیز اس سے اس کا دل لذتِ طمانیت و مسرت سے آشنا ہوتا ہو۔ منکر معروف کی ضد و نقیض ہے اور یہ منفی جمالیاتی۔ اخلاقی قدر اور سوءِ عمل ہے، جس سے

سلیم الطبع انسان اِبا کرتا ہو اور اُسے اس کا اپنی طرف منسوب ہونا یا کرنا گوارا نہ ہو، نیز اس کے ارتکاب سے اس کے دل میں خلش پیدا ہوتی ہو اور وہ اسے طبعاً، عقلاً اور شرعاً سیئہ، شر، ناجائز اور گناہ سمجھتا ہو۔

ان تصریحات کی روشنی میں اگر ہم یہ کہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اصطلاحات نے فلسفۂ خیر و شر کی وسعتوں کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے تو یہ مبالغہ نہ ہوگا۔ اسی طرح یہ کہنا بھی مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت کا اظہار و اعتراف ہوگا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نظام معاشرے کو حسین و صالح رکھنے کا احسن ذریعہ ہے۔ چنانچہ ہم اپنے اس موقف کی تائید میں عہدِ نبویؐ اور خلافتِ راشدہ کے معاشرے کو پیش کر سکتے ہیں، جس سے ایسے اور اس کثرت سے اربابِ حسنِ خُلق اور اربابِ حسن و سرور پیدا ہوئے جنہوں نے تاریخ میں ایک جدید و حسین دور کا آغاز کیا۔ اس حسین و مثالی معاشرے میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نظام قائم اور فعّال تھا۔

اصل یہ ہے کہ یہ نظام حسنِ معاشرت، حسنِ خُلق اور معاشرتی صالحیت و امن کی پیش شرط ہے؛ نیز حسین و صالح معاشرے اور اسلامی حکومت کی پہچان ہے۔

فلسفۂ آرزوئے حسن کے حوالے سے اس نظام پر غور کریں تو اس کی اصل اہمیت کا اِدراک ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ آرزوئے حسن اگر مقصودِ زندگی اور غایتِ دین ہے تو یہ نظام اس کے اتمام کا مثبت و مؤثر ذریعہ ہے۔ اگر بالمعروف سے آرزوئے حسن کا نشو و ارتقا ہوتا ہے تو نہی عن المنکر سے وہ اضمحلال و انحطاط اور زیان و مرگ سے محفوظ رہتی ہے۔ علاوہ بریں، یہ نظام معاشرے کو سیئہ و شر سے پاک و صاف امن و سلامتی کی جنت بنانے میں از بس اہم کردار ادا کرتا ہے، جس کی فضا آرزوئے حسن کے نشو و ارتقا اور اتمام کے لیے انتہائی سازگار و موزوں ہوتی ہے۔

انتخابِ خلیفہ:

اب اس سوال کو لیتے ہیں کہ خلافت کا سب سے زیادہ سزاوار و مستحق کون ہوتا ہے؟ بالفاظِ دیگر، وہ کون سی صفات ہیں جن کی بنا پر کسی شخص کو خلیفہ بنانا چاہیئے؟ اس از بس اہم سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ خلافت ایسے منصبِ جلیلہ کا سب سے زیادہ سزاوار وہ مؤمن و متقی شخص ہوتا ہے جو سب سے زیادہ علم و حکمت، جمال و جلال اور آرزوئے حسن و حیات رکھتا ہو، اور اس میں فرعونیّت و زکاتؓ کا فقدان ہو، نیز وہ ہامانوں، قارونوں اور آزروں میں سے نہ ہو اور نہ ان سے اُنس و رفاقت کے بجائے نفرت و عداوت رکھتا ہو۔ علاوہ بریں، وہ "اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ" پر یقینِ محکم رکھتا اور اپنے سمیت لوگوں کو فقط اللہ تعالیٰ کے بندے سمجھتا ہو۔

رہا یہ سوال کہ انتخابِ خلیفہ کا طریقہ کیا ہونا چاہیے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس انتخاب میں کُل افرادِ معاشرہ حصّہ لینے کے مجاز ہیں، بشرطیکہ انہوں نے اپنے آپ کو اہلِ رائے بنایا ہو۔ ظاہر ہے جس شخص نے اپنے آپ کو انتخابِ خلیفہ میں حصّہ لینے کے قابل ہی نہ بنایا ہو وہ رائے دینے کا سزاوار کیسے ہو سکتا ہے؟ چونکہ علم ہی کی بدولت انسان صاحبِ رائے اور انتخاب میں حصّہ لینے کا اہل بن سکتا ہے اور علم کا سیکھنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے؛ لہٰذا اس فرض سے عہدہ برآ ہونے والے ہی انتخابِ خلیفہ میں حصّہ لینے کے مجاز ہوں گے۔ انتخابِ خلیفہ میں حصّہ لینے اور رائے دینے کے لیے علم کی شرط اگرچہ مغربی طرزِ جمہوریت اور طریقِ انتخاب کے منافی ہے، لیکن اسلامی معاشرے کے لیے یہ شرط نہایت ضروری اور اس کے اصولِ تعلیم کے عین مطابق ہے۔ دلیل یہ ہے کہ اسلام کی رُو سے ہر مسلمان مرد اور عورت کا طالبِ علم اور تعلیم یافتہ ہونا لازمی ہے۔ اگر یہ سچ ہے اور یقیناً سچ ہے کہ ہر مسلمان مرد اور عورت پر علم سیکھنا فرض ہے تو پھر یہ بھی سچ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ برحقؐ کے حکم کی نافرمانی کرتا اور علم نہیں سیکھتا ہے، وہ نافرمان شخص خلافتِ الٰہیہ کے امور اور انتخابِ خلیفہ

میں بالخصوص حصہ لینے اور رائے دینے کا اہل و مجاز نہیں ہو سکتا۔

اسلام کے اصول و حکم تعلیم میں ایک لطیف نکتہ مضمر ہے جس کی نشاندہی کر دی جاتی ہے۔ اسلام آرزوئے حسن ہے، حسنِ انتخاب چاہتا ہے اور اس کا معیار علم ہے، جو ہر مسلمان پر فرض ہے، لہٰذا اسلامی معاشرے کے جملہ مسلم افراد کا تعلیم یافتہ ہونا لازمی ٹھہرا، اس اعتبار سے اس کے کل بالغ افراد اصحاب الرائے ہوں گے اور اس طرح انتخابِ خلیفہ میں حصہ لینے اور رائے دینے کے اہل و مجاز ہوں گے۔

خلافت کا آئین قرآنِ حکیم ہے اور اس کا اطلاق قوانین و اصولِ قرآن سمیت سنتِ رسول اللہؐ کے مطابق ہوگا۔ زندگی کی ہر لحظہ تغیر پذیر شیون سے دم بدم پیدا ہونے والے مسائل اگر ایسے ہوں جنہیں قرآن و سنت کی روشنی میں حل کرنا اہل علم کے مقدور میں نہ ہو تو اس صورت میں انہیں اجتہاد کے ذریعے حل کرنا ہوگا۔ اجتہاد کا مجاز "خلیفہ دشورائی"[۲۳] یا خلیفہ فی الشوریٰ ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ خلیفہ اپنی مجلسِ شوریٰ کے مشورے سے مسائلِ نو کو حل کرنے کا مجاز ہے۔ جہاں تک ہنگامی و فوری نوعیت کے مسائل کو حل کرنے کا تعلق ہے، صوبوں اور شہروں کے والی اپنے مشیروں کے تعاون سے اجتہاد کرنے کے مجاز ہوں گے۔

یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اجتہاد کو علم و حکمت، عقلِ سلیم اور خلوص و تقویٰ مستلزم ہیں، لہٰذا ان صفات سے متصف اہلِ ایمان ہی اجتہاد کا سزاوار و مجاز ہے۔

حواشی

۱۔ ایمان بالباطل ضد و نقیض ہے ایمان بالحق کا۔ اس کا مطلب ہے: باطل یعنی جھوٹے اور غلط نظریات و عقائد پر یقینِ محکم رکھنا اور ان کے مطابق زندگی گزارنا۔ یہ یاد رہے کہ ایمان میں (بالحق ہو یا بالباطل) یقینِ محکم کے علاوہ اطمینان و اعتماد کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

۲۔ وجودی: انگریزی میں (Existentialist) فلسفۂ وجودیت (EXISTEN-TIALISM) کے ماننے والے۔ زمانہ حال کے اس دبستان کے بانیوں میں کرکیگارڈ (Kirkegaard) اور سارتر SARTRE زیادہ مشہور ہیں۔ یہ دبستان عیسائیت کے ردِ عمل کے طور پر معرضِ وجود میں آیا اور ہر دین کو آزادیِ دین کا دشمن قرار دیتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا منکر اور شرع و دین کا دشمن ہے۔

۳۔ آئیڈیالوجسٹ: (Ideologist) ایسی جماعت یا قوم جس کا کوئی نظریۂ حیات یا نظریۂ فکر و عمل (Ideology) ہو۔

۴۔ مارکسزم: (Marxism) جرمن اشتراکی و ماہرِ اقتصادیات کارل مارکس KARL MARX (۱۸۱۸۔۱۸۸۳ء) کا دبستانِ فکر و عمل۔

۵۔ نازی ازم: (Nazism) ہٹلر (Hitler) کی جرمن نیشنل سوشلسٹ پارٹی کا سیاسی فلسفہ۔ اس کی رُو سے جرمن قوم جملہ اقوامِ عالم پر فوقیت رکھتی ہے اور ان پر حکومت کرنے کی سزاوار ہے۔ اتحادی ممالک کے پراپیگنڈے کی وجہ سے اب نازی ازم کو جبر و استبداد اور ظلم و ستم کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

۶۔ فاشزم: (Fascism) اٹلی کی دشمنِ اشتراکیت قومی تحریک کا سیاسی فلسفہ۔ اس تحریک کا آغاز پہلی عالمی جنگ کے دوران اٹلی میں ہوا تھا، اور یورپ کے دیگر ممالک میں بھی مقبول ہو گئی۔ یہ تحریک کئی لحاظ سے نازی تحریک سے گہری مشابہت رکھتی ہے اور اس کی طرح جبر و استبداد اور ظلم و ستم کی نقیب سمجھی جاتی ہے۔

۷۔ سیکولرازم (Secularism) ۔(۱) یہ نظریہ کہ فکر و عمل کی بنیاد دین پر نہیں ہونی چاہیئے۔ (۲) لادینی مکتبِ فکر۔

۸۔ قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے: اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللّٰہِ الْاِسْلَامُ (آل عمران ۳: ۱۹): بلاشبہ دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔ نیز دیکھیے آل عمران ۳: ۸۵؛ النسآء ۴: ۱۲۵؛ اور

وَرَضِيتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ط (المآئدۃ ۵ : ۳) اور ہم نے تمہارے لیے دینِ اسلام کو پسند کیا ہے۔

۹۔ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ہ (التوبہ ۹ : ۳۳) : وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے، جس نے اپنا رسول (= محمدؐ) الہدٰی اور دین الحق کے ساتھ بھیجا تاکہ اُسے (یعنی اسلام کو) کُل دین یعنی جملہ ادیان پر غالب کرے؛ اگرچہ یہ بات مشرکوں کو کتنی ناگوار کیوں نہ گزرے (نیز دیکھیے الفتح ۴۸ : ۲۸ ؛ اور الصّف ۶۱ : ۹)۔

۱۰۔ اس آیت میں ایک قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ اس کائنات کی جملہ اشیاء، جو اللہ تعالیٰ کی تخلیقات ہیں، حسین ہیں۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ یہ قرآن مجید ہے جس نے سب سے پہلے انسان کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ اللہ تعالیٰ کی تخلیقی فعلیت جمالیاتی ہے۔ اس سے یہ جمالیاتی اصول مستنبط ہوا کہ فن کو حُسن مستلزم ہے اور دونوں لازم و ملزوم ہیں، لہٰذا فنکار بیک وقت خالق و حُسن کار ہوتا ہے ؛ یا دوسرے لفظوں میں حقیقی فنکار وہ ہوتا ہے جس کی تخلیقی فعلیت جمالیاتی ہوتی ہے۔

۱۱۔ اہلِ حُسن و سُرور : اس جمالیاتی اصطلاح کا مطلب ایسے لوگ ہیں، جو حُسن، خوف و حُزن سے محفوظ اور مطمئن و مسرور ہوں۔ یہ یاد رہے کہ قرآنِ مجید کی رُو سے اہلِ جنّت کی ایک نشانی یہ ہے کہ ان کے نفس مطمئن ہوں گے (الفجر ۸۹ : ۲۷ تا ۳۰)۔

۱۲۔ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے محبّت و احسان کرنا : اسلام کی رو ح سے کُل بنی نوع انسان کا اِلٰہ یا معروضِ محبّت و پرستش فقط للہ تعالیٰ ہے، جو کُل مخلوقات کا مالک و آقا اور رازق و پروردگار ہے، لہٰذا اسی کے حوالے یا خوشنودی کے لیے اس کی مخلوقات سے محبّت و احسان کرنا چاہیے۔ جہاں تک محبّتِ الٰہی کا تعلق ہے، یہ قدرت کی طرف سے ہر فردِ بشر کو ودیعت ہوتی ہے، چاہے مُنکرانِ خدا اس کا اقرار کریں یا نہ کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان

اپنے حسی، قلبی، نفسی نظام پر تفکر بالحق کرے تو وہ لامحالہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ وہ مخلوق و مربوب اور عبد و فقیر ہے اور اس کا کوئی خالق و پروردگار اور اِلٰہ و حاجت روا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ ہے۔

۱۳۔ معروضِ حسن و پرستش : انگریزی میں Object of beauty and worship

۱۴۔ طفیلی کیڑے : (Parasites)

۱۵۔ توحید عقیدۂ عملی ہے : اس کا مطلب یہ ہے کہ توحید محض نظریہ نہیں، بلکہ یہ ایسا عقیدہ ہے، جسے زندگی میں جذب کر کے اس کے مطابق زندگی کرنا ناگزیر ہے، اور اس پر مندرجہ ذیل آیات سے استشہاد کیا جا سکتا ہے :

(الف) يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ○ (النسآء ۴ : ۱۳۶) : اے لوگو جو (زبان سے) ایمان لائے ہو (عملی طور سے بھی) ایمان لاؤ، اللہ پر، اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول (محمد مصطفیٰ) پر نازل کی ہے، نیز اس کتاب پر جو اس سے قبل نازل کی، اور جو کوئی اللہ کا انکار کرے، اور اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا اور اس کے رسولوں کا، نیز یوم الآخرت کا انکار کرے، یقیناً وہ گمراہ ہوا۔

(ب) اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ (الاحقاف ۴۶ : ۱۳) : بلا شُبہ جن لوگوں نے کہا : اللہ ہمارا رب (یعنی خالق و نشو و نما کرنے والا، آقا و مالک) ہے اور پھر اس (عقیدے پر عملاً) قائم و دائم رہے، اُن پر نہ خوف چھائے گا اور نہ وہ غم ہی کھائیں گے۔ [نیز دیکھیے فصلت ۴۱ : ۳۰]۔

۱۶۔ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (العنکبوت ۲۹ : ۴۵) : بلا شُبہ نماز فحاشی اور گناہ سے باز رکھتی ہے۔

۱۷۔ جمالیاتی نفسیاتی انقلاب: (Aesthetic–psychological revolution)

۱۸۔ جمالیاتی نفسیاتی لمحہ: (Aesthetic–psychological moment)

۱۹۔ حضورِ قلب کا مطلب ہے انسان کا اپنی توجہ کو اللہ تعالیٰ پر مرتکز کرنا اور اس ایقان و اذعان کے ساتھ عبادت کرنا، جیسے وہ اس کی بارگاہ میں حاضر ہے اور اللہ تعالیٰ اُسے دیکھ رہا ہے۔ حضورِ قلب کا ارفع درجہ یہ ہے کہ انسان کو ایسا محسوس ہو جیسے وہ اللہ تعالیٰ کا مشہود بھی ہے اور شاہد بھی۔

۲۰۔ عبادالرّحمٰن کے لغوی معنی تو ہیں، ربّ رحمٰن کے بندے؛ لیکن قرآنِ مجید کی رُو سے یوں تو کُل افرادِ نسلِ انسانی اس کے بندے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے بندے کہلانے کے مستحق و سزاوار اصل میں وہ انسان ہیں جو اس کی طلب و جستجو رکھتے اور اس کے مطیع و فرمانبردار ہیں (نیز عبادالرّحمٰن کی دیگر صفات کے لیے دیکھیے الفرقان ۲۵: ۶۳ بعد)۔ بخلاف اس کے وہ لوگ جو شیطان کے دوست اور مطیع و فرماں بردار ہیں، اور اللہ تعالیٰ کو بھلا بیٹھے ہیں، قرآن مجید انہیں حِزْبُ الشَّیْطٰن سے تعبیر کرتا ہے (المجادلۃ ۵۸: ۱۹)۔

۲۱۔ .... اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوْمًا جَھُوْلًا ہ (الاحزاب ۳۳: ۷۲)۔

۲۲۔ دیکھیے النّسآء ۴: ۶۹۔

۲۳۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ فجر میں اس حقیقت کی نشاندہی کرنے کی خاطر کہ "اس کے بندوں کی صحبت و رفاقت جنّت سے افضل و اولیٰ ہے، از بس فکر انگیز و بصیرت افروز اسلوبِ بیان اختیار کیا ہے، جو ایجازِ بلاغت کا احسن و اکمل نمونہ ہے۔ دیکھیے قیامت کا دن ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے صاحبِ حُسن و سُرور بندے کو مخاطب کر کے فرماتا ہے: "اے مطمئن نفس! اپنے ربّ کے پاس لوٹ آ! تُو اُس سے خوش ہے اور وہ تجھ سے خوش ہے۔ آ! میرے بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنّت میں داخل ہو جا (الفجر ۸۹: ۲۷ تا ۳۰)۔" دیکھیے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو پہلے یہ نہیں فرمایا کہ "میری جنّت میں داخل ہو جا،"

بلکہ فرمایا: "میرے بندوں میں شامل یا داخل ہوجا"؛ حالانکہ پہلے آدمی ظرف مکان میں داخل ہوتا ہے اور پھر وہاں لوگوں میں شامل ہوتا ہے۔ عبارت کا یہ تقدّم و تأخر داخل عباد الرّحمٰن کے تقدّم اور جنّت کے تأخّر پر دلالت کرتا ہے۔

۲۴۔ جلال بازی سے مراد میدانی کھیل ہیں۔ چونکہ انسان کھیلوں میں اپنے جلال یا قوّت و مردانگی اور حوصلہ و شجاعت کا مظاہرہ کرتا ہے، اس لیے ان کے لیے جلال بازی کی تعبیر اختیار کی ہے۔

۲۵۔ حقِ معلوم: اس کے لیے دیکھیے سورۃ المعارج ۷۰: ۲۴-۲۵۔

۲۶۔ دیکھیے البقرہ ۲: ۲۱۹۔

۲۷۔ معاشی سرطان: اس اصطلاح سے مراد استحصالی طبقے ہیں، جو سرمایہ و قوّت کے بل پر لوگوں کا استحصال کرتے اور معاشرے میں فساد برپا کرتے ہیں۔ ان کے لیے قارونی طبقات کی تعبیر بھی اختیار کی جاسکتی ہے۔

۲۸۔ تحریکِ رحمۃ للعالمینی سے مفصّل بحث کے لیے دیکھیے مصنّف کی کتاب پیغمبرِ اعظم و آخر، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور ۱۹۸۲ء۔

۲۹۔ فرعونی۔ قارونی حکومت: اس سے مراد آمرانہ و مستبدانہ اور استحصالی حکومت ہے جو حکمران اور سرمایہ کاروں کے اشتراکِ عمل سے چلتی ہے۔

۳۰۔ یہ اصولِ تعلیم قرآنِ مجید کا ہے، جسے ہم نے سورۂ آل عمران (۳: ۱۶۴) اور سورۂ جمعہ (۶۲: ۲) سے اخذ کیا ہے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے تزکیہ کو تعلیم کتاب و حکمت سے مقدّم رکھا ہے۔

۳۱۔ آگاہیِ اسماء: یہ نتیجہ ہم نے اس آیت سے مستنبط کیا ہے: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا... (البقرہ ۲: ۳۱)۔

۳۲۔ سُلطان: دیکھیے سورۂ رحمٰن ۵۵: ۳۳۔

۳۳۔ مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ: (جس شخص نے اپنے نفس کو پہچان لیا، یعنی اس سے آگاہی حاصل کرلی، اُس نے اپنا رب پہچان لیا۔ یعنی خدا آگاہ ہوگیا)۔ اس مقولے میں یہی اصل مضمر ہے۔

۳۴۔ نفسِ بدنی: یہ نفسِ روحی کا زوج ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے مقام ۲: حسنِ قلبی۔ نفسی نظام۔

۳۵۔ شیطان کا وظیفہ وسوسہ اندازی وجمالیاتی فریب کاری ہے، دیکھیے سورۂ انعام ۶: ۴۳، ۱۲۰، مواضع کثیرہ، نیز سورۂ ناس ۱۱۴: ۴ تا ۵۔

۳۶۔ علم نافع: حدیث شریف میں ہے کہ مُعلّمِ بنی آدم حضرت محمد رسول اللہ علیہ وسلم "علمِ نافع" کی دُعا مانگا کرتے تھے۔ ایک مکتبِ فکر علمِ نافع سے دُنیوی فوائد اور دوسرا محض اُخروی فوائد مراد لیتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ اس سے دُنیوی۔ اُخروی نفع یا حسنہ مراد ہے۔ ہمارے اس استنباط پہ مندرجہ ذیل نصوصِ قرآنی قولِ فیصل کا حکم رکھتی ہیں:

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝

(البقرہ ۲: ۲۰۱ تا ۲۰۲)۔ لوگوں میں سے کوئی یہ کہتا یعنی دُعا مانگتا ہے: ہمارے رب! ہمیں دُنیا (ہی) میں دے دے (جو کچھ دینا ہے۔ چونکہ انہیں اُخروی حسنہ کی آرزو نہیں ہوتی، لہٰذا) آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں اور کوئی ان میں یہ کہتا یعنی دُعا مانگتا ہے: اے ہمارے رب! ہمیں دُنیا میں حسنہ عطا کر اور آخرت میں بھی حسنہ عطا کرنا اور ہمیں آگ کے عذاب سے محفوظ رکھ!

۳۷۔ دیکھیے سورۂ بقرہ ۲: ۲۶۹۔

۳۸۔ دیکھیے سورۂ آلِ عمران ۳: ۱۶۴؛ وسورۂ جمعہ ۶۲: ۲۔

۳۹۔ جہاد وحیاتِ کُلّی: حیاتِ کُلّی سے مراد نہ صرف فرد، قوم، ملّت اور نوعِ انسانی کی

زندگی ہے، بلکہ کُل مخلوقات کی زندگی ہے۔

۴۰۔ نورِ آخرت: دیکھیے سورۂ تحریم ۶۶ : ۸۔

۴۱۔ دیکھیے سورۂ طٰہٰ ۲۰ : ۱۲۴۔

۴۲۔ دیکھیے سورہ اعلیٰ ۸۷ ،۱۲-۱۳۔

۴۳۔ اسلام انفرادی۔ اجتماعی دین ہے۔ یہ خطِ وصل فرد و ملّت کے ربطِ لاینفک پر دلالت کرتا ہے۔ اس فقرے کا مطلب یہ ہے کہ دین نہ تو محض فرد کا ذاتی معاملہ ہے اور نہ محض قوم و ملّت کا معاملہ ہے، بلکہ یہ فرد و قوم کا مشترکہ معاملہ اور ذمے داری ہے چنانچہ انسان فرد و ملّت ہر حیثیت سے دینی احکام و عبادات کا مُکلّف اور ان کے لیے جوابدہ ہے۔

۴۴۔ صبر، قرآن حکیم کی ایک اساسی اور جامع و وسیع المعانی اصطلاح ہے۔ انگریزی میں اس کے معنوی مترادفات یہ ہیں:

Patience, endurance, perseverance, stead-fastness, firmness, stability, steadiness, etc., etc.

۴۵۔ یہ نظریۂ حیات و محنت قرآنِ مجید کی اِس آیتِ جلیلہ سے مأخوذ ہے: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍ (البلد ۹۰ : ۴)؛ یعنی بلاشُبہ ہم نے انسان کو محنت و مشقّت میں پیدا کیا ہے۔

۴۶۔ دیکھیے سورۃ العصر ۱۰۳ : ۱ تا ۳۔

۴۷۔ صابرین: دیکھیے آل عمران ۳ : ۱۴۶؛ الانفال ۸ : ۴۶ و ۶۶۔

۴۸۔ دیکھیے سورۂ یوسف ۱۲ : ۱۱۰۔

۴۹۔ خلیفہ شورائی سے مراد ایسا خلیفہ ہے، جس کی مجلسِ مشاورت ہو اور وہ اس سے مشورہ کرنے والا ہو۔ اس کے لیے ہم نے خلیفہ فی الشوریٰ" کی تعبیر بھی اختیار کی ہے۔

مقام ۱۰

فلسفۂ تقدیر

میں اکثر سوچا رہتا تھا کہ تقدیر کیا ہے؟ اس کا فلسفہ کیا ہے؟ انسان مانے نہ مانے، سمجھے نہ سمجھے، اس کی سوچ کا سفر جاری رہتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ راہوارِ فکر جادۂ مستقیم سے بھٹک کر حرص و آز کی وادیوں میں گم ہو جائے یا اس کی دلدلوں میں غرق ہوتا چلا جائے اور تحت الثریٰ میں پہنچ جائے۔ یہ فکر کی رجعتِ قہقہری ہوتی ہے، جو آدمی کو اس کے ارفع و احسن مقامِ عبدیت سے گرا کر ذلت و مسکنت کے انتہائی قبیح و پست مقام میں لوٹا دیتی ہے، جسے ربّ حلیم نے قرآنِ مجید میں ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ○ (التین ۹۵ : ۵) سے تعبیر کیا ہے۔ اس مقام پہ بھی اس کا رہوارِ فکر پا بسفر رہتا ہے، حتیٰ کہ وہ اس ہولناک آتشکدے میں پہنچ جاتا ہے، جہاں وہ حسرت و پشیمانی، خوف و حزن اور یاس و قنوطیت کی زنداں میں مقیّد ہو جاتا ہے، جہاں سے نکلنا اس کے بس کا روگ نہیں رہتا۔

انسان کے ظلم و جہل کا یہ عالم ہے کہ وہ رجعتِ قہقہری کر رہا ہوتا ہے، لیکن اُسے اس واقعیت کا شعور نہیں ہوتا۔ حد تو یہ ہے کہ وہ اُلٹا اسے عروج و ارتقا سمجھتا ہے۔ انسان عموماً اسی دھوکے میں مارا جاتا ہے۔ یہ دھوکہ دراصل ابلیسی نفسی شیطانی کا جالیاتی فریب ہوتا ہے۔

حرص و آز کی وادیوں میں وارد ہوتے ہی شیطانی چھلاوے اسے سبز باغ و سراب دکھانے لگتے ہیں اور اُسے اس کی حقیقی راہ و منزل سے اتنی دُور لے جاتے ہیں کہ اس پر بازگشت کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں اور منزل نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ اس صورتِ حال کو قرآنِ مجید نے ضَلٰلٍ بَعِیْدٍ سے تعبیر کیا ہے (ابراہیم ۱۴: ۳، ۱۸؛ و بمواضع کثیرہ)۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ اصل یہ ہے کہ قلب میں دریائے افکار موجزن ہو تو راہوارِ فکر بے قابو ہو کر کہاں سے کہاں نکل جاتا ہے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ مجھے رازِ تقدیر معلوم کرنے کی طلب جستجو تھی۔ چنانچہ میں تقدیر کی گھتیاں جس قدر سلجھاتا تھا، اسی قدر وہ اُلجھتی جاتی تھیں اور بات نہ بنتی تھی؛ لیکن اس کے باوجود میری سوچ کا سفر جاری رہا۔ سوچ کی جہت صالحہ، راہ مستقیم اور عقل حسین و منیر ہو تو "دوست" کی رحمت ہدایت بن ہی جاتی ہے ــــــ ندائے سروش آئی:

مبارک ہیں وہ اہلِ فکر جو حُسن و حیات کی آرزو اور علم و حکمت کی طلب و جستجو رکھتے ہیں۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ "تقدیر کی حقیقت وہی ہے جو سعی و آرزو کی ہے۔" بات سہل بھی ہے اور دشوار بھی؛ کُھل جائے تو سامنے کی بات ہے، نہ کُھلے تو عقدہ و راز ہے۔ حجاب ہر چیز کی تقدیر ہے؛ کُھلنا اس کا مقدر ہے اور اس کا کھولنا انسان کے مقدور میں ہے۔ بات کُھلنے اور عقدہ وا ہونے لگے تو گوشِ حق نیوش اور قلب سلیم کو بھی کھول لینا چاہیے۔ یہ راز تو تم پر کُھل چکا ہے کہ انسان کو آرزوئے حُسن ودیعت کی گئی ہے، اس لیے وہ اس کی طلب و جستجو میں رہتا ہے۔ اس حقیقت سے بھی تم آگاہ ہو چکے ہو کہ انسان کو آزادیِ ارادہ و اختیار بھی ودیعت کی گئی ہے۔ انسان جب بشر نہ تھا اور "شئے مذکورہ نہ تھا"، تب بھی وہ عالمِ حُسنِ ذات میں ایک ایسی چیز کی صورت میں تھا جو زندگی کے کسی بھی قالب میں ڈھل سکتی اور کوئی بھی شکل و صورت، قد و قامت اور رنگ و روپ اختیار کر سکتی تھی۔ اسے جو آزادی ودیعت کی گئی تھی، اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ جو چیز بننا پسند کرے بن جائے۔

دوسرے لفظوں میں، وہ اپنی تقدیر جیسی چاہے بنالے۔ قدرت اس کی آرزو وسعی کا احترام کرے گی اور اس کی تائید و نصرت اس کے ساتھ ہو گی۔ اس نے بشر بننا چاہا اور احسن الخالقین نے اسے بشر بنا دیا اور اُسے اس کی آرزو کے مطابق ایک ایسی دنیا میں بسا دیا جس میں اُسے اپنی آرزوئے حسن کی تکمیل کرنے کی آزادی بھی تھی اور موقع و محل بھی؛ لیکن اس کے لیے اُسے سعی و جہد کرنی اور محنت و مشقت اُٹھانی تھی، کیونکہ یہ اس کی تقدیر ہے اور تقدیر کو بنانا اس کے مقدور میں ہے،[۳۲] اور یہ فیضانِ ربّ ذوالجلال والاکرام ہے۔ اس طرح ارض اس کی سعی و جہد اور محنت و مشقت کی جولانگاہ یا دُنیائے تقدیر بن گئی۔

یہ حقیقت بھی تم معلوم کر چکے ہو کہ اپنی پیدائش سے پہلے تم اپنے آباؤ واجداد کے ہیکلوں میں سفر کرتے رہے تھے۔ تمہیں نہ اس سفر کی حقیقت سے آگاہی ہے نہ مدّتِ سفر کا اندازہ ہے۔ تمہیں یہ بھی یاد نہیں کہ اس سفر کے دوران تم کن حوادث و سانحات سے دوچار ہوئے اور تم پر کیا کچھ بیتی؟ تم یہ بھی بھول چکے ہو کہ تمہیں عالمِ ہیکل سے باہر کی دُنیا میں زندگی کرنے کی طلب و جستجو تھی اور قدرت نے تمہاری آرزو پوری کرنے کا فیصلہ کر لیا چنانچہ اُس نے تمہیں ہیکلِ پدر سے رحمِ مادر میں منتقل ہونے کا موقع فراہم کر دیا۔ تم نے رحمِ مادر میں اپنی جائے استقرار میں پہنچنے کیلئے سفرِ نو کا آغاز کیا۔ یہ سفر تمہارے حجم و رفتار کی نسبت سے بڑا طویل و دشوار گذار تھا اور تمہارے کروڑوں ہم وطن و ہمسفر تمہارے حریف تھے، کیونکہ ان کی منزلِ مقصود بھی وہی تھی جو تمہاری تھی، اور وہ اس دوڑ میں تم پر سبقت لے جانا چاہتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ تم وجدانی طور سے جانتے تھے کہ جو پہلے جائے استقرار میں داخل ہو گیا، کامیاب ہو گیا اور اُسے اپنی آرزوئے حسن و حیات کی تکمیل کا موقع مل گیا، لیکن جو اس دوڑ میں پیچھے رہ گیا وہ ہلاک و برباد ہوا، کیونکہ اس میں داخل ہوتے ہی رحم کا دروازہ بند ہو جائے گا اور پھر کوئی بھی اس میں داخل نہ ہو سکے گا۔ اگرچہ یہ مقابلہ بڑا ہی سخت، ہمّت طلب اور صبر آزما تھا، لیکن تم نے صبر و استقلال کی بدولت یہ مقابلہ جیت لیا اور اس ارفع اور مضبوط و مصئون

مقام میں داخل ہو گئے، جہاں تم نے نشوونما پائی اور بصورتِ بشر اپنی تکمیل و تحسین اور صورتگری کرتی تھی اور باہر کی دُنیا میں آنے کے قابل بنتا تھا۔ جہانِ رحم میں کچھ ایسے افرادِ نسلِ انسانی بھی ہوتے ہیں، جن میں بعض وجوہ کی بنا پر آرزوئے حُسن و حیات کم ہو جاتی ہے اور وہ مضمحل و کمزور ہو جاتے ہیں۔ نتیجۃً وہ اپنی تحسین و تکمیل نہیں کر پاتے اور کمزور و معذور پیدا ہوتے ہیں، نیز بعض کی آرزوئے حیات مُردہ ہو جاتی ہے اور انہیں جینے کی تمنا نہیں رہتی تو قدرت ان کی یہ آرزو پوری کر دیتی ہے اور وہ مُردہ پیدا ہوتے ہیں یا پیدا ہوتے ہی مر جاتے ہیں۔ اگر اس عالم میں کسی کی آرزوئے حُسنِ صُوری مضمحل، کمزور یا مُردہ ہو جائے تو وہ بدصورت پیدا ہوتا ہے یا اتنا خوبصورت نہیں ہوتا جتنا ہونا چاہیے تھا۔ اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ آرزوئے حُسن کے مضمحل، کمزور، مفلوج یا مردہ ہو جانے کے باعث اس کے عملِ تسویہ و تعدیل میں زیادہ یا کم نقص رہ جاتا ہے۔ اسی طرح جن میں حُسنِ باطنی کی آرزو میں تاب و تواں نہیں رہتی تو ان میں ظالم و جاہل اور مجرم و مشرک بننے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ ان امکانات کو انسان کا معاشرتی ماحول واقعیت میں بدل دیتا ہے اور ایسا کرنے میں والدین کی تعلیم و تربیت اور احباب کی صحبت اہم ترین کردار ادا کرتی ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے اس جگہ دو اور نکات کی صراحت کر دی جاتی ہے۔ اولاً، یہ حقیقت ہمیشہ پیشِ نظر رہنی چاہیئے کہ یہ سب کچھ قوانینِ الٰہی یا نوامیسِ فطرت کے مطابق ہوتا ہے۔ اس لیے ربِّ کریم انسان کی تخلیق و تحسین کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ ثانیاً، انسان حُسنِ فطرت اور آرزوئے حُسن کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اور اُسے ارادہ و اختیار کی آزادی ہوتی ہے؛ لہٰذا وہ جو چاہے دین و مذہب اختیار کر سکتا، اور اچھا بُرا، حسین یا قبیح، صالح یا طالح جیسا چاہے عمل کر سکتا ہے، خیر و شر، حسنہ و سیئہ، عدل و ظلم، ایمان و کفر، توحید و شرک اور جود و بُخل میں سے جو چاہے اپنے لیے انتخاب کر سکتا ہے۔ اُسے فکر و عمل کی آزادی ہوتی ہے۔ الغرض، اُسے اپنی باطنی دُنیا اپنی مرضی کے مطابق حسین یا قبیح بنانے کا اختیار ہوتا ہے۔

اُسے فکر و عمل کی آزادی ہوتی ہے۔ الغرض، اُسے اپنی باطنی دُنیا اپنی مرضی کے مطابق حسین یا قبیح بنانے کا اختیار ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسان اپنے خُلق کی تشکیل خود کرتا ہے اور پھر اس کے مطابق عمل کرتا ہے۔ چنانچہ خُلق حسین ہوگا تو انسان کے اعمال بھی حسین ہوں گے، ورنہ بصورتِ دیگر وہ بھی قبیح ہوں گے۔ خُلق اصل میں انسان کے باطنی نظام میں قالب کی حیثیت رکھتا ہے، جس میں اس کے خصائل و خصائص، عادات و اطوار اور کردار و مکارم ڈھلتے اور شکل و صورت اور رنگ و روپ اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ حُسنِ خُلق ہے جس سے حسنہ و خیر، عدل و احسان اور محبّت و رحمت کے چشمے پھوٹتے اور مزرعِ حیات کو سرسبز و شاداب کرتے ہیں۔ بخلاف اس کے سُوءِ خُلق سے سیئہ و شر، ظُلم و عدوان اور جرم و گناہ کے سوتے پھوٹتے اور کشتِ حیات کو برباد کرتے ہیں۔

لوگ عموماً یہ سوچتے ہیں کہ ایسا کیوں ہے کہ دُنیا بھر میں کچھ لوگ محلّوں، ایوانوں، بنگلوں اور حویلیوں میں پیدا ہوتے ہیں اور کچھ جھونپڑیوں، خیموں اور رہگزروں میں جنم لیتے ہیں؟ اس کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ اس کا ذمے دار خود انسان ہے۔ دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جملہ مخلوقات کا خالق و ربّ ہے اور سب بنی نوعِ انسان اس کے عیال اور اس کی جمالیاتی تخلیقی فعلیت کے جمیل و جلیل شاہکار ہیں؛ لہٰذا اس نے آسمانوں اور زمین کی جُملہ نعمتوں کو جُملہ افرادِ نسلِ انسانی کے تمتّع و استفادہ کے لیے پیدا کیا ہے، اور اس پر سماوی کُتب خصوصاً قرآنِ مجید جو اس کی آخری اکمل و احسن اور محفوظ و مصؤن کتاب ہے، شاہد ہے یہ خود اولادِ آدم کے گروہ ہیں جو اپنے ظُلم و جہل کے سبب ربّ العالمین کی نعمتوں اور وسائلِ دولت پر ناجائز قبضہ کر کے دوسرے لوگوں کو ان سے محروم کر دیتے ہیں۔ اس طرح انہیں مفلوک الحال و بے سروسامانی کے عالم میں خیموں، جھونپڑیوں، کوٹھڑیوں اور رہگزروں میں زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں اور ان کی کمائی سے انہیں سے اپنے لیے محل، ایوان، بنگلے اور حویلیاں بنواتے اور ان میں دادِ عیش دیتے ہیں۔ یہ تقسیمِ دولت غیر فطری و وضعی ہے اور انسان کے ظلم و جہل اور

اس کی آرزوئے حسن و زندگی کے فقدان اور رجعتِ قہقری پر دلالت کرتی ہے۔

انسان اپنے جسم یا قلب کی صحت سے غافل ہو جائے تو وہ گوناگوں امراض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ غفلت اس کی آرزوئے حسن و زندگی کے ضعف کی علامت ہوتی ہے۔ ربِ ذوالجلال والاکرام، جسے اپنے بندوں کی آزادیِ ارادہ واختیار اور ان کی آرزو کا پورا پورا پاس ہے، ان کے قلوب کو دیکھتا اور ان کی آرزو کی تکمیل کرتا رہتا ہے، چاہے وہ حسن و زندگی کی ہو یا قبح و مرگ کی؛ چاہے وہ حسنہ و خیر کی ہو یا سیئہ و شر کی۔ جہاں تک قلب کا تعلق ہے وہ جمالیاتی۔حیاتیاتی لطیفہ ہے، اور مستوجبِ امراض ہے، اگرچہ اس کی طرح اس کے امراض کی نوعیت بھی مختلف ہوتی ہے۔ اس کی سب سے مہلک بیماری اپنے نورِ حسن سے محرومی ہے، جس کے سبب وہ اندھا، بہرا، ٹیڑھا اور سنگِ خارہ سے بھی زیادہ سخت ہو جاتا ہے۔ ایسا قلب کافروں، مشرکوں، ظالموں، مجرموں، جاہلوں، متکبروں، بخیلوں، سیاہ کاروں اور گناہگاروں کا ہوتا ہے، جس کے لیے قرآنِ مجید نے فرعون و ہامان اور قارون و آذر اور آلِ فرعون کی تلمیحات اختیار کی ہیں۔ بخلاف اس کے حسین و منیر قلب اہلِ حسن و سرور کا ہوتا ہے، جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں نبیین، صدیقین، شہدا اور صالحین کی تعبیریں اختیار کی ہیں۔ یہ یاد رہے کہ خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت کے ساتھ نبوت کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے منقطع ہو چکا ہے۔

فلسفۂ تقدیر کو اس کے صحیح تناظر میں دیکھنے اور سمجھنے کے لیے یہ اصل ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ یہ دنیا انسان کے لیے دارالامتحان اور آخرت دارالجزا ہے؛ نیز وہ مستوجبِ قانونِ مکافاتِ عمل اور رہینِ محنت و مشقت ہے۔ یہ فیصلہ خود انسان نے کیا تھا۔ دلیل یہ ہے کہ اس نے اپنی مرضی سے آزادیِ ارادہ واختیار کے ساتھ خلافتِ ارضی کا بارِ امانت اٹھایا تھا اور اس کے عوض کسب و سعی کے ذریعے اپنی زندگی بسر کرنے اور اس کے معجّل و موجّل نتائج بھگتنے پر اپنی خواہش و رضامندی کا اظہار کیا تھا۔ زندگی رہینِ محنت و مشقت ہے تو یہ کوئی بری

بات نہیں، بلکہ زندگی کے نشوو ارتقاء کے لیے ناگزیر ہے۔ وہ لوگ جو محنت نہیں کرتے اور دوسروں کی محنت کے ثمرات پر زندگی کرتے ہیں، وہ زندگی کی لذت سے محروم رہتے ہیں، لیکن بہت کم لوگ اس حقیقت کا شعور رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ اولادِ آدم کے دشمن ہوتے ہیں اور ساہنیں چار طبقوں میں تقسیم کر کے فرعونی، ہامانی، قارونی اور آزری طبقات سے موسوم کر سکتے ہیں۔ یہ لوگ دراصل معاشرتی سرطان ہوتے ہیں۔ یہ معاشرتی سرطان مثال کے طور پر اس طرح پیدا ہوتے ہیں، جس طرح قلبی و جسمانی امراض پیدا ہوتے ہیں۔ کسی معاشرے میں سرطانوں کی نمود افرادِ معاشرہ کی آرزوئے حسن و حیات کی ضعیفی و موت یا ان کی آرزوئے سیئہ و مرگ پر دلالت کرتی ہے۔

جیسا کہ تم معلوم کر چکے ہو انسان نے ارادہ و اختیار اور اکتساب و عمل کی آزادی اور قدرت کے قانونِ مجازات کے ساتھ برضا و رغبت اس دُنیا میں زندگی کرنا اور خلافت کا بارِگراں اُٹھانا منظور کر لیا تھا۔ چونکہ ربِّ علیم و حکیم جانتا تھا کہ ابلیس و نفسِ امّارہ کے ساتھ رہتے ہوئے اُسے اپنی انفرادی و اجتماعی ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہونا ازبس دشوار بلکہ محال ہے، لہٰذا اس کی حکمت و رحمت کا فیصلہ یہ ہوا کہ اُسے کرۂ ارضی میں حسنِ فطرت و آرزوئے حسن تفویض کر کے پیدا کیا جائے تاکہ وہ وہاں اپنی فطرت کے حسین تقاضوں کے مطابق اپنی باطنی دُنیا کی تشکیل کر کے حسین و مطمئن زندگی بسر کرے، نیز اپنی انفرادی و اجتماعی ذمے داریاں کو احسن طریق سے پورا کر کے اور امتحانِ زندگی میں کامیاب گزر کر بُراقِ موت کے ذریعے خوشی خوشی اپنے الٰہ و ربّ کے پاس لوٹ جائے اور الحیوان کے جہانِ حسن و سرور میں ربِّ کریم کے انعام یافتہ بندوں (یعنی نبیین، صدیقین، شہدا، اور صالحین) کی صحبت و رفاقت میں سُرور انگیز و لذت آفرین حیاتِ ارتقائی گزارنے پہنچ جائے۔ جنّت کی حقیقت و ماہیت تو ربِّ علیم ہی جانتا ہے، لیکن اُس نے جو کچھ بتایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ ایسا بےمثال و بےنظیر، نظر افروز، دلکش اور اتنا وسیع و عریض اور حیرت افزا و روح پرور عالمِ رنگ و نور اور جہانِ حسن و حیات ہے کہ کوئی متنفس اس کا تصور تک نہیں کر سکتا۔ اس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ ربِّ ذوالجلال والاکرام

کا انسان کے لیے مہمان خانہ بھی ہے اور حسن المآب بھی، اس لیے قرۃ العین بھی ہے۔[۳]
یہ تو تھا جملہ معترضہ۔ چونکہ انسان اللہ تعالیٰ کا ایک منفرد و عظیم جمالیاتی تخلیقی شاہکار ہے؛ دوسرے اس نے اسے اپنی مخلوقاتِ ارضی کا خلیفہ بنانا تھا؛ تیسرے اس نے رحمت کو اپنے اوپر لازم کیا ہوا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُسے بشر سے محبت بھی اتنی ہی ہے جتنی اس کی رحمت ہے، لہٰذا اُس نے انسان کو امتحانِ زندگی سے کامیاب گزارنے کی خاطر اُسے موضوعی معروضی ہدایت سے احسن و اکمل طریق سے اس طرح نوازا کہ موضوعی ہدایت اس کی فطرت میں ودیعت کردی، یعنی اس کے باطن میں جبلتی قلبی نفسی نظام قائم کر دیا جو حقیقت میں موضوعی ہدایت کا نظام ہے، اور خارج میں نبوت و رسالت اور وحی و تنزیل کا نظام قائم کر دیا جو معروضی ہدایت کا نظام ہے۔ دونوں نظام ہدایت ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں، اور دونوں مل کر انسان کو حقیقت کا ادراک کرنے اور حُسن و قبح، خیر و شر، اور سود و زیاں میں تمیز کرنے، نیز اُسے اس کے معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود کی راہ پہچاننے اور اس کا قرب و وصال اور دوستی و رضوان حاصل کرنے کے قابل بناتے ہیں۔

اس ضمن میں یہ از بس اہم نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس طرح سورج کی روشنی سے وہی آنکھ مستفید ہو سکتی ہے جو خود نورانی و بینا ہو، اس طرح "آفتابِ ہدایت" کی روشنی سے وہی شخص مستفیض ہوتا ہے، جس کا قلب سلیم یعنی زندہ و منیر ہو۔ چنانچہ یاد رکھنا چاہیے کہ معروضی ہدایت کے آفتابِ تازہ قرآنِ مجید سے وہی زندہ و متقی انسان اکتسابِ نور کر سکتے اور مستفیض ہو سکتے ہیں، جن کی عقل زندہ و حرکی اور حسین و منیر ہو۔ عقلِ سلیم کا وظیفہ انفس و آفاق میں تدبرِ مدام اور خاصّہ ادراکِ حقیقت ہے۔ اس سے یہ استنباط کر سکتے ہیں کہ آیاتِ الٰہیہ کو دیکھنے اور سمجھنے کے لیے نورِ عقلِ سلیم ناگزیر ہے۔ علاوہ بریں، جس طرح نبوت و رسالت کو اپنی تصدیق و تائید کے لیے "صدیق" کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح وحی و تنزیل اپنی تصدیق و تائید کے لیے "عقلِ سلیم" کو چاہتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ عقلِ سلیم وحی و تنزیل کی عارف و مصدق بھی ہے اور اس کی مؤید و

معادن بھی۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ عقلِ سلیم میں حکمت اور ملکۂ اجتہاد مضمر ہوتے ہیں، جنہیں علم و تدبر قوت سے فعل میں لاتے ہیں۔ چنانچہ عقلِ سلیم کے بغیر کوئی شخص خواہ کتنا بڑا عالم و فلسفی کیوں نہ ہو، اجتہاد کا اہل نہیں ہوتا۔ الغرض عقلِ سلیم اجتہاد کی ایک پیش شرط ہے، لہٰذا اربابِ علم و عقلِ سلیم ہی مجتہد ہو سکتے ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ اجتہاد کو عقلِ سلیم مستلزم ہے۔ یہ اصل نہیں بھولنی چاہیے کہ قلبِ سلیم ہی میں عقلِ سلیم ہوتی ہے، لہٰذا عقلِ سلیم کی ہماری زندگی میں غیر معمولی اہمیت کے پیشِ نظر قلب کو سلیم یا حسین بنانا اور رکھنا ضروری ہوا اور اس کے لیے اس کا تزکیۂ مسلسل ناگزیر ہے۔ تزکیہ سے قلب نہ صرف اپنی بیماریوں سے پاک و صاف ہو کر حسین و منور بنتا ہے، بلکہ اس کے نور کا نشوو ارتقاء بھی ہوتا ہے۔ اس ارتقائے نور کی بدولت ہی انسان میں آرزوئے حسن و زندگی اپنے منتہائے کمال کو پہنچتی اور اُسے صاحبِ نظر و دانائے راز اور اہلِ حسن و سرور بناتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ ارتقائے نور، جس کو ہم جمالیاتی ارتقائ سے بھی تعبیر کرتے ہیں، قرآنِ حکیم کے نظامِ تعلیم کی غایت الغایات اور زندگی کا مقصود ہے۔

اس حقیقت کا اعادہ فائدے سے خالی نہ ہوگا کہ قرآنِ حکیم نور و ہدایت ہے، لہٰذا اس کی روحِ معانی کو نورِ قلب ہی کے ذریعے دیکھا جا سکتا ہے اور اس کی بدولت ہی ایک زندہ و متقی شخص اس کتابِ منیر کے مطالب و مفاہیم، اسرار و غوامض اور مجازاتِ بلاغت و متشابہات کا ادراک و تعقّل کر سکتا ہے۔ بخلاف اس کے جس شخص کا قلب زندہ و فعّال ہو نہ اس میں حق و صداقت کی طلب و جستجو ہو، نیز وہ حسن و زندگی کی لذت سے آشنا ہو نہ اس میں آرزوئے حسن و زندگی ہی ہو، وہ اس زندہ و حسین اور مُطہر و منیر کتاب اللہ سے ہدایت حاصل کرنے کے قابل ہی نہیں ہوتا، اس لیے کہ اس میں اکتسابِ نور و ہدایت کی صلاحیت مفلوج و مردہ ہو چکی ہوتی ہے۔ ساتھ ہی اس بصیرت افروز نکتے کی صراحت بھی کر جاتی ہے کہ جس طرح مردہ زمین بارش سے جو اس کے لیے آبِ حیات ہے، دوبارہ زندہ ہو جاتی ہے اور اس میں اپنے اندر بیجوں

کو نشو و نما دینے اور بارآور کرنے کی قوت کا احیا ہو جاتا ہے، اسی طرح قلبِ مردہ کی بھی جالیاتی۔نفسیاتی لمسے سے نشاۃِ ثانیہ ہو جاتی ہے اور اس میں آرزوئے حسن و زندگی کے بیج کو نشو و نما دینے اور اسے بارآور کرنے کی قوت عود کر آتی ہے۔

اس دنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اس غلط فہمی کے شکار ہیں کہ اگر ربّ العزت کی مشیت میں نہ ہوتا تو ابلیس آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیوں کرتا؟ بالفاظِ دیگر، ابلیس کا انکار مشیتِ الٰہی میں تھا۔ یہ دراصل ابلیس کا عقیدہ ہے اور اس کا مطلب ہے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ نے کرایا تھا تاکہ عزازیل کو ملائکہ کے زمرے سے نکال کر ذلیل و خوار کرے اور اسے ابلیس (= رحمتِ الٰہی سے مایوس و ناامید) و شیطان (شر آفریں و فریب باز) بنا دے۔ ایسے لوگ نہیں جانتے کہ ان کے اس قول و عقیدے سے لازم آتا ہے کہ ربِّ رحمٰن و رحیم (نعوذ باللہ) ظالم و مکّار ہے اور اس نے ناحق عزازیل کو ذلیل و مردود اور مقہور و مغضوب بنا دیا۔ ظاہر ہے ربِّ سبحان و قدوس سے متعلق کوئی اہلِ ایمان کبھی ایسا گمان نہیں کر سکتا۔ یہ سوءِ ظن انسان کے ظلم و جہل پر دلالت کرتا ہے۔ اگر استدلال کی خاطر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ابلیس کا انکار اللہ تعالیٰ کی مشیت میں تھا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ابلیس کو کب معلوم ہوا کہ اس کا آدم کو سجدے سے انکار کرنا اللہ تعالیٰ کی مشیت میں تھا؟ انکار سے پہلے یا بعد؟ ظاہر ہے اگر اسے اس کا علم انکار کرنے سے پہلے ہوتا تو وہ اس کا اظہار برملا کر سکتا تھا، نیز وہ سجدے سے انکار کر کے ملعون و مغضوب نہ بنتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابلیس کو علم تو کیا؟ گمان تک نہ تھا کہ اس کا انکار مشیتِ الٰہی میں تھا۔ اگر اسے اس کا گمان بعد میں ہوا تو اس سے لازم آتا ہے کہ اس نے اپنی مرضی سے انکار کیا تھا اور اس میں جبر و اکراہِ الٰہی کا قطعاً دخل نہ تھا۔ اصل سوال یہ ہے کہ ابلیس یا اس زمانے کے لوگوں کو معلوم کیسے ہوا کہ اس نے سجدے سے انکار اس لیے کیا کہ ایسا کرنا مشیتِ الٰہی اور اس کے مقدر میں تھا؟ ان کا جواب عموماً یہ ہوتا ہے کہ "اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اس کی مشیت کے بغیر کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کا مطلب

یہ ہوا کہ ابلیس انکار کرنے پر مجبور تھا۔ اس لیے کہ یہ مشیّتِ الٰہی تھی" غور سے دیکھیں تو اس جواب میں منطقی مغالطہ پوشیدہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس جواب کی اساس اس غلط مفروضے پر قائم کی گئی ہے کہ ابلیس کو ارادہ و اختیار کی آزادی حاصل نہ تھی، جس طرح کہ جن و انس کے علاوہ کائنات کی دیگر جماداتی، نباتاتی اور حیواناتی اشیاء کو حاصل نہیں ہے؛ حالانکہ امرِ واقعی یہ ہے کہ ابلیس جنوں میں سے ہے اور انہیں انسانوں کی طرح ارادہ و اختیار کی آزادی حاصل تھی اور ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ابلیس نے اپنے ارادہ و اختیار سے انکار کیا تھا نہ کہ مشیّتِ الٰہی سے۔ یہ اصل ہمیشہ ہمارے پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ انس و جان دونوں کو قدرت کی طرف سے ارادہ و اختیار کی آزادی ودیعت کی گئی ہے اور وہ کائنات کی دیگر چیزوں کی طرح مجبورِ محض نہیں، جو اپنی مجبوری کے باعث وہی کچھ کرتے ہیں جو مشیّتِ الٰہی میں ہوتا ہے، لہٰذا وہ قدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل کے متوجب نہیں، بلکہ نوامیسِ قدرت کے متوجب ہیں۔

اللہ تعالیٰ بیشک عزیز و قدیر ہے اور ہر چیز پہ قدرت رکھتا ہے، لیکن اسے ایک تو انس و جان کی آزادیِ ارادہ و اختیار کا پاس ہے، دوسرے وہ اپنے ان آزاد بندوں پہ ظلم و جبر نہیں کرتا اور نہ انہیں ناحق سزا ہی دیتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ ربِّ رحمٰن و رحیم کی رحمت سے بعید اور اس کی شانِ کریمی و معدلت گستری کے منافی ہے۔ ربِّ ذوالجلال والاکرام کی ذات سرچشمۂ حُسن ہے، لہٰذا اس سے جو کچھ صادر ہوتا ہے، حُسن و نور اور خیر و حسنہ ہی ہوتا ہے، ظُلم و قُبح یا سیئہ و شر کے صدور کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی سُنّتِ حسنہ عدل و احسان، محبّت و رحمت، فضل و کرم اور کریمی و مغفرت ہے، اور یہی اس کی مشیّت ہے، جس پر قرآنِ مجید سے استشہاد کیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنے جملہ بندوں کا ربّ ہے، لہٰذا وہ انہیں ہدایت تو دیتا ہے، مگر کسی کو گمراہ نہیں کرتا۔ بندہ اس کی مشیّت سے نہیں، بلکہ اپنے ارادہ و اختیار سے گمراہ ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جب کوئی فرد یا قوم اللہ تعالیٰ اور اس کے قانونِ مکافاتِ عمل کو جھٹلا کر اس کے اوامر و نواہی اور تعلیمات کی

خلاف ورزی کرتی ہے تو گمراہی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ چونکہ جن وانس کے رشد و ہدایت کا دارو مدار اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کے احکام کی اطاعت پر ہے، اس لیے وہ لوگوں کی ہدایت و ضلالت اور کامیابی و ناکامی کو اپنے قوانین کے بجائے اپنی طرف منسوب کرتا ہے؛ نیز یہ اسلوبِ بیان حکیمانہ و بلیغ اور سریع الفہم بھی ہے۔

بہر حال، ایک تو اللہ تعالیٰ ربِ رحمٰن و کریم اور عادل و محسن ہے، دوسرے لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ اس کی سنت ہے جو نا آشنائے تغیر و تبدل ہے اور تیسرے اس نے انسان کو آزادیِ ارادہ و اختیار ودیعت کی ہے، لہٰذا اسے اس کی آزادی کی قدر و پاس ہے، اور وہ اس پر کبھی ظلم و جبر نہیں کرتا۔ اس حقیقت کو ماننا، عقیدۂ قدر کہلاتا ہے، اور یہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۥ (البقرہ ۲:۲۵۶) کی ایک بصیرت افروز تفسیر ہے۔ اس حقیقت کا دوسرا رخ یہ ہے کہ انسان بلاشبہ کسب و عمل کرنے اور اپنی راہِ فکر و عمل کو متعین کرنے پر قادر ہے، لیکن اس آزادی و قدرت کے باوجود وہ قدرت کے طبیعی قوانین اور قانونِ مکافاتِ عمل کا مستوجب ہے، اس اعتبار سے وہ مجبور ہے، اور اس مجبوری کو "جبر" سے تعبیر کر سکتے ہیں؛ لیکن یہ حقیقت ذہن سے پھسلنے نہ پلئے کہ نہ تو انسان کی آزادی و قدرت اور نہ اس کی مجبوری و محکومی مُطلق ہے، بلکہ دونوں اضافی ہیں۔ یہ جبر و قدر انسان کی تقدیر ہے اور یہ بیان فلسفۂ جبر و قدر کا ماحصل ہے۔

اس ضمن میں ایک اور اہم نکتے کی مزید صراحت کر دی جاتی ہے کہ یہ دُنیا دار العمل و امتحان گاہ ہے اور دار الآخرت دار الجزا ہے، نیز قیامت کا دن روزِ حساب ہے، جس کے لیے قرآنِ مجید نے "یَوْمِ الدِّیْنِ" کی فکر انگیز تعبیر اختیار کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قیامت حشر اور اجتماعی حساب اور آخری فیصلے کا دن ہے اور اس دن افرادِ نسلِ انسانی اپنے معتقدات و اعمال کے حق و باطل اور حسن و قبح کے مطابق جنت یا دوزخ میں بھیجے جائیں گے، لیکن قانونِ مکافاتِ عمل کے نتائج کی نوعیت دُہری ہے، یعنی تعجیلی۔ دُنیوی اور تاخیری۔

اُخروی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ہر فردِ بشر کے اعتقادات و اعمال کے حسن و قبح کے مطابق اس کے نتائج یا اثرات فوری طور پر اس کے قلب پر مرتسم ہوتے اور اُسے طمانیت و مسرّت کی جنّت یا خوف و حزن کا دوزخ بناتے رہتے ہیں۔ یہ اثرات دراصل افرادِ نسلِ انسانی کے ایمان و عمل کے فطری نتائج ہوتے ہیں، جو اس دنیا میں محسوس صورت میں بھی زود یا بدیر ظاہر ہوتے رہتے ہیں، جن کے دفترِ مرقوم و غیر مرقوم کو بالترتیب تاریخ اور العصر[۸] سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اقوامِ عالم کے اعمال و نتائج کے اس سلسلے کو قدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل کے حوالے سے "تاریخی عمل" کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے ہر لمحۂ زندگی انسان کے لیے "یوم الدین" ہے جہاں تک تاخیری۔ اُخروی نتائجِ عمل کا تعلق ہے، اُن کی نوعیت بھی دُہری ہے: برزخی اور الحیوانی[۹]۔ برزخ اس عالمِ زمان و مکان کو کہتے ہیں، جو دنیا اور آخرت کے مابین ہے اور جہاں نفوسِ انسانی کو موت کے بعد روزِ قیامت تک ٹھہرایا جاتا ہے۔ یہاں کے زمان و مکان اور حیات و ممات کا کسی متنفّس کو شعور نہیں؛ البتہ مثال کے طور پر برزخ کی زندگی کو خواب کی زندگی پر قیاس کر سکتے ہیں۔ خواب کے عالم میں انسان جو کچھ کرتا، دیکھتا، سُنتا اور محسوس کرتا ہے، اُسے حقیقی سمجھتا ہے اور اس حقیقت کا شعور نہیں ہوتا کہ وہ محض خواب دیکھ رہا ہے؛ اسی طرح عالمِ برزخ میں نفوس جو کچھ کرتے، سنتے، دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں، انہیں حقیقی ہی سمجھتے ہیں۔ چنانچہ جس طرح خواب سے بیدار ہونے پر انسان کو پتا چلتا ہے کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے، کچھ اسی طرح قیامت کے دن عالمِ برزخ سے محشر میں نشاۃِ ثانیہ پانے کے بعد انہیں ایسا محسوس ہوگا جیسے وہ خواب سے بیدار ہوئے ہیں اور خواب بھی گھڑی بھر کا تھا۔[۱۰]

یہ اصل یاد رکھنے کی ہے کہ محشرِ حقیقی یوم الدّین ہے اور اس دن "المیزان"[۱۱] قائم ہوگی اور وہ جدید ترین کمپیوٹر سے بھی کہیں زیادہ درست کار و خودکار اور حیرت انگیز و محیّر العقول سمعی و بصری کوئی شے ہوگی، جس میں ہر شخص اپنی ہر آواز کو سن اور ہر عمل کو دیکھ سکے گا،

اس لیے کہ اس میں اس کی دُنیوی زندگی کی ہر متحرک تصویر اس سے لاکھوں گنا بہتر اور کامل طور سے دکھائی دے گی، جس طرح بیج میں درخت انتہائی طاقتور خوردبین میں دکھائی دیتا ہے چنانچہ اس "المیزان" کے فیصلے کے مطابق لوگوں کو الحیوان کے حسین و منوّر اور قبیح و تاریک جہانوں میں ان کے حسبِ حال جگہوں میں بھیجا جائے گا۔ اس جگہ اس صورتِ حال کی صراحت کردی جاتی ہے کہ جنّت ہر حال میں جنّت ہونے کے باوجود اس میں ارفع و اعلیٰ جمالیاتی درجات ہوں گے اور ہر درجے میں جمالیاتی ارتقائی احوال و مقامات کے امکانات ہوں گے، نیز ایک درجے سے ارفع تر درجات میں ترقی کر جانے کے مواقع بھی ہوں گے چنانچہ اس جمالیاتی ارتقاء و صعود کی خاطر اہلِ جنّت ہمیشہ یہ دُعا مانگتے رہیں گے: رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ○ (التحریم ۶۶:) ہمارے نشوو ارتقاء دینے والے آقا! ہمارے نور کی ہمارے لیے تکمیل کر دے اور ہمیں (غفلت و لغزش وغیرہ سے) محفوظ رکھنا۔ بلاشبہ تو ہر چیز پر کامل قدرت رکھنے والا ہے۔

جہاں تک دوزخ کا تعلق ہے، اس میں بھی طبقات ہوں گے، جو قبیح سے قبیح تر اور پست سے پست تر ہوں گے، لیکن ان میں اہلِ دوزخ کے تزکیہ کا اہتمام بھی ہوگا تاکہ اس کے نتیجے میں ان میں آرزوئے حسن و زندگی زندہ و فعّال ہو جائے؛ ان کے نفوس کا نشوو ارتقاء ہو اور ان کے قلوب حسین و منیر بن جائیں، نیز وہ اپنے نور کی تکمیل کر کے الحیوان کی حسین و ارفع دُنیا یعنی جنّت میں زندگی کرنے کے قابل بن جائیں۔ اس اعتبار سے دوزخ ایک ایسی زنداں ہے جو حقیقت میں دار التزکیہ ہے، اور اس میں نشوو ارتقاء کرنے کے مواقع اور ارتقائی مدارج بھی ہیں، سب سے بڑھ کر یہ کہ اس سے رہائی پانے کے مواقع بھی ہیں۔

فلسفۂ تقدیر یا فلسفۂ جبر و قدر کو جامع طور سے سمجھنے کی خاطر یہ اصل ہمیشہ مدّنظر رہنی چاہیے کہ اللہ جلّ شانہٗ کُل عوالم اور کُل افرادِ نسلِ انسانی کا خالق و ربّ اور الٰہ ہے اور

سب سے بے حد محبت و احسان اور ان پر رحم و کرم کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی حال میں یہ پسند نہیں کرتا کہ کوئی فرد، جماعت یا قوم کسی دوسرے فرد، جماعت، قبیلے یا قوم پر ظلم و جبر روا رکھے یا کسی کا استحصال یا استیصال کرے، یا قتل و غارت کی وارداتیں کرے، یا کسی کو اپنا محکوم و غلام بنائے یا ملک میں فساد کرے۔ الغرض، وہ اپنے بندوں کے لیے سلب و نہب، استحصال و استیصال، جبر و اکراہ، جبر و اکراہ، ظلم و فساد؛ نیز محکومی و غلامی، مقہوری و مظلومی اور احتیاج و محرومی کو قطعاً پسند نہیں کرتا اور ان سے دنیا کو پاک صاف دیکھنا چاہتا ہے۔ یہی اس کی مشیّت اور غایتِ دین ہے۔

اللہ تعالیٰ ہر انسان کو آزادیِ ارادہ و اختیار ودیعت کر کے پیدا کرتا ہے۔ یہ خود انسان کے ہم جنس ہیں جو اُسے محکوم و غلام بناتے ہیں۔ دین، جو آرزوئے حسن ہے، آزادیِ انسان کا نقیب و علمبردار ہے۔ وجہ یہ ہے کہ آزادی بڑی ہی حسین شے ہے، نیز یہ زندگی کا مقتضیٰ و خاصّہ اور آرزو ہے؛ لہٰذا محکوم و غلام شخص فرد ہو یا قوم، زندہ نہیں ہوتا۔ علاوہ بریں، محکومی و غلامی میں انسان کی آرزوئے حسن و زندگی بھی مردہ ہو جاتی ہے۔ اس اعتبار سے اگر یہ کہا جائے کہ انسان کی آزادی دین کا تقاضا ہے تو یہ مبالغہ نہیں، اظہارِ حقیقت ہوگا۔ چنانچہ اسلام کو غلامی سے شدید نفرت ہے اور وہ اسے کسی حال میں بھی روا نہیں رکھتا، اس لیے کہ یہ فرعونیت و ہامانیت اور قارونیت و آزریت کی علامت ہے اور ان کے لیے "سرطانیت" کی تعبیر اختیار کر سکتے ہیں۔ اس سے یہ استنباط کر سکتے ہیں کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے بندوں کو محکوم و غلام بناتے ہیں، وہ ان سے ان کے ربّ العالمین کی عطا کردہ آزادی ایسی نعمتِ عظمیٰ کو سلب کرتے اور اللہ تعالیٰ کے بجائے اپنے آپ کو ان کا آقا و مالک، حاکم و مطاع اور رازق و پروردگار یا ربّ و اِلٰہ سمجھتے ہیں۔ ایسے ظالم لوگوں کے لیے فرعون و ہامان اور آزر و قارون کی تلمیحات اختیار کی جا سکتی ہیں۔ یہ طبقاتِ اربعہ دراصل معاشرتی سرطان ہیں، جو کسی قوم میں اس کی آرزوئے حسن و حیات کے ضعف و اضمحلال یا مرض و مرگ کے سبب

پیدا ہو جاتے ہیں۔ وجودِ معاشرہ سرطان زدہ ہو جائے تو یہ صورتِ حال خارجی یا غیر ملکی سرطانوں کو دعوتِ سلب و نہب دیتی ہے۔ غلامی دراصل آرزوئے حسن و زندگی کے ضعف و موت پر اور آزادی آرزوئے حسن و زندگی کے فعّال و حرکی ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ غلامی نہ انسان کی تقدیر ہے نہ مشیّتِ الٰہی۔ بخلاف اس کے آزادی تقدیرِ انسانی اور مشیّتِ الٰہی بھی ہے اور ربِّ ذوالجلال والاکرام کی نعمتِ عظمیٰ بھی۔ چنانچہ جو قوم اپنی آزادی کی قدر نہیں کرتی، اس کے اس کُفرانِ نعمت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ آزادی نہیں چاہتی، لٰہذا قدرت اس کی خواہش کے مطابق سلبِ آزادی کا سامان پیدا کر دیتی ہے۔ یہ کُفرانِ نعمت کا فطری نتیجہ ہوتا ہے، جس کے لیے جزا کی تعبیر بھی اختیار کی جاتی ہے۔ اس تاریخی عمل کی روش کچھ اس طرح ہوتی ہے کہ پہلے قوم کے جمالیاتی ذوق میں خرابی پیدا ہوتی ہے اور وہ کور ذوق و حسن کور بن جاتی ہے؛ پھر اس کی آرزوئے حسن و زندگی بتدریج ضعیف و مفلوج ہونے لگتی ہے، اس کے نتیجے میں وہ گوناگوں قسم کی جمالیاتی۔قلبی اور معاشرتی۔سرطانی بیماریوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ جمالیاتی۔قلبی بیماریوں کی قبیح ترین محسوس صورتوں کو شرک و بت پرستی اور ظلم و بدخُلقی سے تعبیر کیا جاتا ہے، جبکہ معاشرتی۔سرطانی امراض کی قبیح ترین محسوس شکلوں کے لیے فرعونیت و ہامانیت اور قارونیت و آزریت کی تلمیحات اختیار کر سکتے ہیں۔ یہ چار معاشرتی سرطان وجودِ قوم کا خون چوس چوس کر دورانِ خون کے نظام میں خرابی و ناہواری اور جمود و تعطّل پیدا کر دیتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں قوم کے ساتھ اس کی آرزوئے حسن و حیات بھی نحیف و مردہ ہو جاتی ہے۔ ایسی قوم شکارگاہِ دنیا میں شاہین سے صید بن جاتی ہے اور یہ صورتِ حال حریفانِ معصر کو دعوتِ صید افگنی دیتی ہے۔ چنانچہ ان میں سے جو حریف زیادہ طاقتور و دُوربین اور مستعد و تیار ہوتا ہے وہ بڑھ کر اپنے شکار کو محکوم و غلام بنا لیتا ہے یا اُسے ہلاک و برباد کر دیتا ہے۔ اس سے مستنبط ہوا کہ ہر قوم اپنی محکومی و غلامی کی خود ذمے دار ہوتی ہے۔ اگر یہ سچ ہے اور یقیناً سچ ہے کہ کسی قوم کی ذلّت و مسکنت، محکومی و غلامی یا ہلاکت و بربادی

کے ذمے دار معاشرتی سرطان ہوتے ہیں تو پھر یہ بھی سچ ہے کہ ان سرطانوں کی پیدائش اور نشوونما کی ذمے دار خود قوم ہوتی ہے، جوان کے جور و جفا، جبر و اکراہ اور ظلم و استحصال کو محبوبانِ جفا کیش کے جور و جفا کی طرح برداشت کرتی رہتی ہے۔

تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے شروع میں ایک غور طلب بات کہی تھی اور وہ یہ تھی کہ "تقدیر کی حقیقت وہی ہے جو سعی و آرزو کی ہے"۔ کیا تم نے اس پر غور کیا کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ سمجھو تو اس جملے کی لفظی تنگنا میں معنویت کا ایک جہان سمٹ آیا ہے۔ تمہاری یاد تازہ کرنے کی غرض سے اس کی مختصراً صراحت کیے دیتا ہوں۔ تم اس حقیقت سے آشنا ہو گے کہ قرآنِ مجید اللہ تعالیٰ کی "کتاب الانسان" ہے؛ یعنی اس کا موضوع انسان ہے اور یہ حیاتِ انسانی کے جملہ مہماتِ مسائل پر قولِ فیصل و حرفِ آخر کا حکم رکھتی ہے۔ دیکھیے اللہ تعالیٰ کس فکر انگیز پیرائے میں انسان کو قرآنِ مجید کے موضوع و اہمیت سے آگاہ کرتا ہے:

لَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ كِتَابًا فِيهِ ذِكْرُكُمْ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ (الانبیاء ۲۱: ۱۰):

ہم نے تم پر کتاب نازل کی، جس میں تمہارا ذکر ہے۔ کیا یہ تم یہ بات نہیں سمجھتے؟

اس آیۂ جلیلہ میں یہ لطیف نکتہ ہے کہ جب قرآنِ مجید کا موضوع انسان ہے اور میں اس کی دُنیوی و اُخروی زندگی کے مہماتِ مسائل کو احسن طریق سے بیان کیا گیا ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ بنی نوعِ انسان اپنے مسائل حل کرنے کے لیے اس طرف رجوع نہ کریں اور اس سے صرفِ نظر کر کے دوسرے غیر یقینی و غیر معتبر مآخذ کی طرف رجوع کریں۔ یہ تو سراسر نادانی کی بات ہوئی؛ عقل و انصاف کی بات تو نہ ہوئی۔ اگر ان کی عقل حسین و سلیم ہوتی تو وہ یقیناً زندہ خدا کی زندہ کتاب سے رُشد و ہدایت حاصل کرتے۔ جب عقلِ سلیم کا یہ فتویٰ ہے تو ہم کیوں نہ اس سے رہنمائی حاصل کریں؟ اللہ تعالیٰ حیاتِ انسانی سے متعلق ہمیں اس بنیادی حقیقت سے آگاہ کرتا ہے کہ انسان خلقی طور سے رہینِ محنت و مشقت ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍ ؕ (البلد، ۹۰: ۴): ہم نے انسان کو مشقت میں (یعنی محنت و مشقت کے لیے) پیدا کیا ہے۔

اس آیتِ جمیلہ میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ انسان کی تقدیر وابستۂ محنت و مشقت ہے، یعنی انسان کی تقدیر اس کی محنت و مشقت کی مرہونِ منت ہے؛ لہٰذا اس نے جو کچھ حاصل کرنا ہے، محنت و مشقت کے ذریعے ہی حاصل کرنا ہے؛ نیز کسبِ کمال بغیر سعی و جہد کے ممکن نہیں۔ بالفاظِ دیگر، انسان محنت و مشقت سے اپنی تقدیر کی تخلیق کرتا ہے اور تقدیر ویسی ہوگی جیسی محنت و مشقت ہوگی۔ قرآنِ حکیم نے اپنے فلسفۂ محنت و تقدیر کو بانداز دیگر اس طرح بیان کیا ہے: كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ؕ (الطور ۵۲: ۲۱): ہر شخص اپنے اکتساب کے عوض رہن ہے۔ سورۂ مدثر میں یہی حقیقت اس طرح آشکارا کی گئی ہے: كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ؕ (المدثر ۷۴: ۳۸): ہر شخص اپنے اکتساب کا مرہون ہے۔

ان دونوں آیات کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی تقدیر اس اکتساب یعنی محنت و مشقت اور سعی و جہد کے حاصل کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ چنانچہ تقدیرِ انسانی کی نوعیت ویسی ہی ہوتی ہے جیسی اس اکتساب یا سعی و جہد کی ہوتی ہے۔ اسی مفہوم کو اس نے دوسری جگہ قطعیت کے ساتھ بیان کیا ہے: وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰىۙ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ؕ (النجم ۵۳: ۳۹-۴۰) اور یہ کہ انسان کے لیے کچھ نہیں ہے بجز اس کے جس کی وہ کوشش کرتا ہے اور اس کی کوشش ظاہر ہو کر رہے گی۔

ان آیاتِ جلیلہ سے یہ بات قطعی طور سے ثابت ہوگئی کہ انسان کو ربِّ کریم کی طرف سے وہی کچھ ملتا ہے جس کے لیے وہ محنت و مشقت اور سعی و عمل کرتا ہے۔ ظاہر ہے انسان اسی چیز کو حاصل کرنے کی سعی و جہد کرتا ہے جس کی اسے طلب و آرزو ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کی اسے سچی آرزو ہوتی ہے۔ اس سے تین نتائج

مستخرج ہوتے ہیں: اوّل، آرزو ہی سعی و عمل کی محرک و عامل ہوتی ہے۔ دوم، تقدیر اس وقت تک نہیں بدلتی جب تک آرزو نہیں بدلتی۔ سوم، آرزو بدل جائے تو تقدیر بھی بدل جاتی ہے، اور جیسی آرزو ہوتی ہے ویسی تقدیر ہوتی ہے۔ دلیل کے طور پر دو نصوصِ قرآنی پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ (الرّعد ۱۳:۱۱) "حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی نفسی حالت یا آرزو کو نہیں بدل دیتی۔"

۲۔ ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ لَمْ یَکُ مُغَیِّرًا نِّعْمَۃً اَنْعَمَھَا عَلٰی قَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ وَاَنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۝ (الانفال ۸:۵۳): اللہ کی سُنّت یہ ہے کہ جو نعمت وہ کسی قوم کو عطا فرماتا ہے اسے اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنی نفسی حالت یعنی آرزو نہ بدل ڈالے۔

ان آیات کی روشنی میں ہم ان نتائج پر پہنچتے ہیں: اوّل، انسان کے نفس (یعنی حسّی قلبی یا نفسی نظام) میں انقلاب آئے اور اس کی آرزو بدلے تو اس کی خارجی دنیا میں انقلاب آتا ہے اور اس کی حالت بدلتی ہے۔ نفسی انقلاب دراصل معاشرتی انقلاب کی پیش شرط ہے۔ چونکہ نفسی انقلاب آرزو کے بدلنے سے عبارت ہے اور اپنی آرزو خود انسان (قوم ہو یا فرد) ہی بدلتا ہے، لہٰذا اس کی خارجی دُنیا یا زندگی میں اس وقت تک انقلاب نہیں آتا جب تک کہ اس کے نفس میں انقلاب نہ آئے، یعنی وہ اپنی آرزو نہ بدل ڈالے۔

دوم، کسی نعمت کا فقدان یا اس کا سلب ہو جانا آرزوئے نعمت کے فقدان یا اس کے کمزور و مضمحل ہو جانے کی دلیل ہے۔ چنانچہ ربِّ کریم کی عطا کردہ نعمتوں سے وہی فرد یا قوم ہاتھ دھو بیٹھتی ہے، جسے اس کی سچی طلب و آرزو نہیں رہتی۔

سوم، انسان اپنی حالت کے سنوارنے اور بگاڑنے کا ذمہ دار خود ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ

حاصل کرتا ہے، اپنی محنت و مشقت اور سعی و عمل، نیز فضلِ الٰہی سے حاصل کرتا ہے اور جو کچھ گنواتا ہے حسنِ آرزو و سعی کے فقدان کے سبب گنواتا ہے۔ یہ یاد رہے کہ فرد ہو یا قوم اس کی ترقی و کمال اور کامیابی و کامرانی کا دار و مدار اس کی سچی آرزو پہ ہوتا ہے اور آرزو محنت و مشقت اور سعی و عمل سے سچی بنتی ہے، جب کہ اس کی محرومی و ناکامی کا سبب حسنِ آرزو و سعیِ جمیلہ کا فقدان ہوتا ہے اور اس کا وہ خود ذمے دار ہوتا ہے۔

یہ حقیقت ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ انسان کو حسن و حیات کی سچی آرزو ہو تو اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت اس کے ساتھ ہوتی ہے؛ لٰہذا فرد و قوم کی ترقی و کمال اور فتح و کامیابی اپنی سچی آرزو و سعیِ جمیلہ اور ربِ رحیم کے فضل و کرم کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ بخلاف اس کے انسان اپنی شکست و ناکامی اور محرومی و نامرادی کا ذمے دار خود آپ ہوتا ہے۔

ان تشریحات سے ثابت ہوا کہ "تقدیر کی حقیقت وہی ہے جو سعی و آرزو کی ہے۔"

دُعا و تقدیر:

لوگ عموماً یہ سوچتے اور پوچھتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ نے انسان کے نوشتۂ تقدیر میں سب کچھ لکھ رکھا ہے تو پھر دُعا سے کیا حاصل اور فائدہ؟ یہ سوال بلاشبہ اہم و معرکۃ الآراء ہے اور دشوار بھی دکھائی دیتا ہے، لیکن اگر اسے 'فلسفۂ آرزوئے حسن' کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو یہ اتنا ہی آسان معلوم ہوگا۔ سب سے پہلے یہ حقیقت واضح طور سے سمجھ لینی اور ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب والشّہادۃ ہے اور اس کے علم میں ماضی و مستقبل کی حیثیت حال کی سی ہے۔ اُسے کلّیات و جزئیات کا علم ہے اور اس امر کے باوجود کہ انسان صاحبِ ارادہ و اختیار ہے، وہ ہر فردِ بشر کے متعلق جانتا ہے کہ وہ دنیا میں کیا کرے گا؟ کن احوال و ظروف میں زندگی گزارے گا؟ نیز وہ دُنیا میں کتنا عرصہ رہے گا؟ کہاں رہے گا، کہاں مرے گا؟ اس سے معلوم ہوا کہ علمِ الٰہی کی نوعیت

وہ نہیں جو علمِ انسانی کی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ غیب تو پھر غیب ہے، انسان کو تو موجودات (= شہادۃ) کا بھی علمِ کُلّی نہیں۔ پھر اس کے علم کی نوعیت مطلق نہیں اضافی ہے، ذاتی نہیں صفاتی ہے، نیز حسّی وقلبی ہے، لٰہذا اگر اس کا حسّی۔ قلبی۔ نفسی نظام درست نہ رہے تو وہ جو معلومات فراہم کرے گا، معتبر نہیں ہوں گی، اس لیے کہ ان میں غلطی ونسیان اور نقص وخطا کا احتمال ہوگا۔ علاوہ بریں، انسان کا علم مستعار وقلیل ہے۔ بخلاف اس کے اللہ تعالیٰ کا علم ذاتی، مطلق، کُلّی۔ جزئی اور حقیقی ہے۔ چنانچہ دہر یا زمانِ مُطلق اور اس کی جُملہ شیُون ۔ زمانہ، عصر، قرن، سال وماہ، شب وروز اور آنات، نیز مکان اور اس کے جملہ عوالم؛ کوہ و بیاباں کا ایک ایک ذرّہ، بحر و دریا کا ایک قطرہ قطرہ، عالمِ نباتات کا ایک ایک بیج؛ عالمِ حیاتیات کا ایک ایک جرثومۂ حیات اور سمٰوٰت کا ایک ایک عالم۔ اس کی لوحِ علم میں مرقوم ومستحضر ہے۔

چونکہ انسان وجن کے علاوہ کائنات کی دیگر مخلوقات کو ارادہ واختیار کی آزادی حاصل نہیں، لٰہذا وہ نوامیسِ فطرت کی تابع ومحکوم اور مجبورِ محض ہیں اور اسی بنا پر وہ قدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل کی مستوجب نہیں؛ نیز ان کے متعلق پیش گوئی کی جاسکتی ہے۔ بخلاف اس کے انسان کو ارادہ اختیار کی آزادی حاصل ہے، لٰہذا اس کے رویے سے متعلق حتمی طور پر پیش گوئی نہیں کی جاسکتی۔ خود آدمی اپنے متعلق نہیں جانتا کہ مستقبل میں اس کے جذبات و احساسات اور خواہشات کی نوعیت کیا ہوگی اور ان میں کیا کیا تبدیلیاں آئیں گی؟ علاوہ بریں' اُسے یہ علم بھی نہیں ہوتا کہ دوسرا لمحہ اس کے لیے حسنہ وسیّئہ، خیر وشر، صحت وبیماری، سعادت و شقاوت، کامیابی وناکامی اور حیات وموت میں سے کیا کیا کچھ لے کر آئے گا؟ لیکن یہ سب کچھ علمِ الٰہی میں ہوتا ہے، کیونکہ وہ عالم الغیب والشہادۃ ہے۔

"لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ" سنّتِ الٰہی ہے،[۱۲] لٰہذا وہ انسان (فرد ہو یا قوم) پہ جبر واکراہ نہیں کرتا، یعنی وہ اسے کوئی کام کرنے یا نہ کرنے پر مجبور نہیں کرتا۔ اگر اللہ تعالیٰ انسان کی

آزادیِ ارادہ و اختیار سلب کر لے تو پھر اُسے قانونِ مکافاتِ عمل کا مستوجب گردانا، اس پر حدِّ شرعی جاری کرنا اور اس کے لیے دنیا کو دار العمل یا دار الامتحان اور آخرت کو دار الجزا قرار دینا ظُلم ہوگا، اور ربّ رحمٰن و رحیم اور سُبحان و قدّوس سے متعلق یہ گمان کرنا کہ وہ (نعوذ باللہ) ظالم و جابر ہے، ظُلمِ عظیم اور گناہِ کبیرہ ہے۔ فلسفۂ تقدیر سے متعلق یہ دو نکات ہمیشہ یاد رکھنے چاہییں: اوّلاً، اللہ تعالیٰ نے انسان کو صاحبِ ارادہ و اختیار بنایا ہے۔ اس لیے اسے سوچنے اور عمل کرنے کی آزادی حاصل ہے۔ چنانچہ اُسے اپنے لیے تنہا اللہ تعالیٰ کو یا اپنی نفسانی خواہشات کو اپنا اِلٰہ و ربّ بنانے، ہدایت و ضلالت، موت و حیات، سعادت و شقاوت، خیر و شر، حسنہ و سیئہ اور حُسن و قُبح میں سے جو بھی چاہے اُسے اپنے لیے منتخب کرنے کا اختیار ہے؛ علاوہ بریں اُسے اپنے ربّ کریم کی نعمتوں سے تمتّع کرنے یا نہ کرنے، خصوصاً اپنے حسّی، قلبی، نفسی نظام سے کام لینے یا نہ لینے کی آزادی ہے۔ چنانچہ وہ اپنی اس آزادی کی بنا پر قدرت کے قانونِ کُفرانِ نعمت اور قانونِ مکافاتِ عمل کا مستوجب ہے، نیز وہ نہیں جانتا کہ آئندہ لمحے اس کی آرزو کی نوعیت اور اس کے فکر و عمل کا روّیہ کیا ہوگا؟ لہٰذا قدرت کا ردِّ عمل کیا ہوگا؟ یہاں اس نکتے کی بھی صراحت کر دی جاتی ہے کہ انسان اپنی آرزو کے مطابق سوچتا اور عمل کرتا ہے اور اس کے عمل کے مطابق نتیجہ نکلتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں قدرت اس کی آرزو کے مطابق اس کے ساتھ سلوک کرتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے اور "لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ" (یعنی وہ وعدہ خلافی نہیں کرتا) اس کی سُنّتِ حسنہ ہے۔

ثانیاً، جو چیز انسان خود نہیں جانتا، ربِّ علیم جانتا ہے، لہٰذا جسے انسان نوشتۂ تقدیر کہتا ہے، وہ دراصل علمِ الٰہی ہے۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ انسان کو سوچنے، سمجھنے اور طلب و سعی کی جو آزادی ہے وہی اصل میں اس کی آزادیِ تقدیر سازی ہے۔ قرآنِ حکیم کے اس ارشاد میں کہ "کُلٌّ یَّعْمَلُ عَلٰی شَاکِلَتِہٖ" (بنی اسرائیل ۱۷: ۸۴ یعنی ہر کوئی اپنے بنائے ہوئے خلق کے مطابق عمل کرتا ہے) یہ حقیقت مضمر ہے کہ

انسان اپنے فکر و خیال اور طلب و آرزو کا قالب خود تیار کرتا ہے اور اس کے مطابق عمل کرتا اور اپنے فکر و عمل کی راہ و منزل کی تعیین کرتا ہے۔ چنانچہ اگر اس کی آرزو اپنے حقیقی اِلٰہ کی ہوگی تو اس کے فکر و عمل کی راہ حسین و مستقیم ہوگی، جو سیدھا اُسے اس کی منزلِ مقصود تک لے جائے گی۔ بخلاف اس کے اگر اللہ تعالیٰ کے سوا اس کے اور بھی اِلٰہ ہوں گے، جو ظاہر ہے وضعی اور محض نام کے ہوں گے، اس لیے اس کے فکر و عمل کی راہ حسین و مستقیم نہ ہوگی، بلکہ ٹیڑھی ترچھی، قبیح اور متعدد راہیں ہوں گی، جو اسے گمراہ کر کے منزلِ مقصود سے دُور لے جائیں گی۔ ایسی راہیں ہی انسان کو اس کے مقامِ عبدیت سے گرا کر طاغوتیت کے تحت الثریٰ میں پہنچا دیتی ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ یہ انسان کے اپنے ارادہ و اختیار میں ہے کہ وہ اپنے خالق و ربّ کو اپنا اِلٰہ بنا کر صاحبِ حسن و سُرور بن جائے یا اپنی خواہشات کو اپنے آلِہَہ (اِلٰہ کی جمع) بنا کر اہلِ نار بن جائے۔ اسی بنا پر کہتے ہیں اور سچ کہتے ہیں کہ انسان اپنے لیے جنّت یا جہنّم خود بناتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، انسان خود خالقِ تقدیر ہے۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان اپنی تقدیر کا آپ خالق ہے اور قدرت اُسے وہی کچھ دیتی اور اس کے ساتھ وہی سلوک کرتی ہے، جس کی اُسے طلب و آرزو ہوتی ہے، نیز وہ قدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل اور قانونِ کفرانِ نعمت کا مُکلّف و مستوجب ہے تو پھر دُعا کا فائدہ؟ اس سوال کا جواب دُعا کی حقیقت میں مضمر ہے اور دُعا حقیقت میں بندے کی اپنے ربِّ رحمٰن و مستجیب الدعوات کے حضور اپنی سچی آرزو کا اظہار ہوتا ہے جو اس کے دریائے رحمت و احسان کو جوش میں لاتا ہے اور وہ اس آرزو کو حُسنِ اِتمام بخشتا ہے۔ یہ حُسنِ اتمام تعجیلی، مجازی بھی ہوتا ہے اور اُخروی بھی۔ تعجیلی۔ مجازی حُسنِ اِتمام کی دو صورتیں ہیں؛ مطلوبۂ انسانی اور مطلوبۂ اِلٰہی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ربِّ حکیم انسان کی آرزو کو یا تو اُسی صورت میں پورا کر دیتا ہے جس کی اُسے طلب و جستجو ہوتی ہے؛ یا پھر اس صورت میں جو اس کی حکمت اس کے لیے پسند کرتی ہے اور وہی بندے کے حق میں بہتر ہوتی ہے۔ اگر

علم و حکمتِ الٰہی میں اس آرزو کا حسنِ اتمام انسان کے حق میں موجبِ خیر و حسنہ نہیں ہوتا، اگرچہ اس کا شعور انسان کو عموماً نہیں ہوتا، تو اس کے عوض وہ اس کے لیے ایسی نعمت لکھ دیتا ہے جو حیاتِ اُخروی میں اس سے کہیں اعلیٰ و احسن صورت میں اُسے ملے گی جس کی طلب و آرزو اُس نے دنیا میں کی تھی۔ یہ نعمت اسے دُنیا میں بھی کسی نہ کسی صورت میں مل جاتی ہے، اگرچہ بہت کم اس کا شعور رکھتے ہیں۔

دُعا دو قسم کی ہوتی ہے: سچّی اور جھوٹی۔ سچّی دُعا وہ ہوتی ہے جو اُس چیز کی ہو جس کی آرزو سچّی ہوتی ہے، اور سچّی آرزو وہ ہوتی ہے جو دل کی گہرائی سے نکلی ہو اور دل کا ہمنوا انسان کا پورا نظامِ باطنی ہو، جو عبارت ہے حواسِ خمسہ، دل و دماغ اور نفس بدنی۔ روحی کے نظام کُلّی سے، نیز سعی و عمل سے دُعا میں صدق پیدا ہوتا ہے اور وہ سچّی بنتی ہے۔ دُعا سچّی نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آدمی کو اس چیز کی سچّی طلب و جستجو نہیں ہے جو وہ اپنے ربِّ علیم و قدیر سے مانگتا ہے، لہٰذا وہ قبول اور بار آور نہیں ہوتی اور لاحاصل رہتی ہے۔ مولانا حالیؔ کا مندرجۂ ذیل شعر فلسفۂ دُعا کے اسی پہلو کا آئینہ دار ہے:

ہوتی نہیں قبول دُعا ترکِ عشق کی
دل چاہتا نہ ہو تو دُعا میں اثر کہاں؟ (حالیؔ)

اگر انسان خود آگاہ نہ ہو تو اُسے اپنے نفس کی سچّی اور جھوٹی آرزو کی تمیز نہیں ہوتی، اور وہ ان میں فرق محسوس نہیں کرتا، لہٰذا وہ انجانے میں خواہشاتِ کاذبہ کے حسنِ اتمام کے لیے دُعا مانگتا ہے چونکہ یہ دُعا سچّی نہیں ہوتی، لہٰذا وہ بے اثر و بے فائدہ اور ناقابلِ قبول ہوتی ہے۔ بخلاف اس کے آرزو سچّی ہو اور دل کی گہرائی سے نکلی ہوئی دُعا میں دل کا ہمنوا اس کا پورا نظامِ باطنی ہو تو اس میں تاثیرِ قبولیت ہوتی ہے۔ معلوم ہوا کہ آرزو کی سچّائی اجابتِ دُعا کی پیش شرط ہے۔ اگر سچّی دُعا اور سچّی آرزو لازم و ملزوم ہیں اور یقیناً ہیں، کیونکہ اسے جھٹلانے کی کوئی وجہ معقول دکھائی نہیں دیتی تو اس سے یہ مستنبط ہوا کہ سچّی دُعا میں تقدیر بنانے یا بگاڑنے

کی تاثیر ہوتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ دل چاہتا ہو تو دعا میں اثر ہوتا ہے، اس لیے کہ

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے (علامہ اقبال)

سچی دُعا آرزوئے دل کی ترجمان ہوتی ہے اور آرزوئے دل انسان کی آزادیِ ارادہ و اختیار پہ دلالت کرتی ہے، لہٰذا وہ قبول ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ربِّ رحمٰن نے انسان کو یہ آزادی ودیعت کی ہے اور اس کے بدلے اُسے مکافاتِ عمل و کفرانِ نعمت کے قوانینِ قدرت کا مکلّف و مستوجب بنایا ہے، لہٰذا اُسے آزادیِ انسان کا بڑا ہی پاس و لحاظ ہے، اور یہ اس کی سُنّت ہے اور اس کی سُنّت بدلا نہیں کرتی۔ چنانچہ اگر قدرت انسان کی سچّی آرزو کو پورا نہیں کرتی اور اس کی سچّی دُعا قبول نہیں کرتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کی آزادی کا پاس نہیں کرتی بلکہ اس پہ جبر کرتی ہے جو سلبِ آزادی کے مترادف ہوا؛ لہٰذا انسان کو مجبور کر کے اس پہ قانونِ مکافاتِ عمل کا اطلاق نہیں ہو سکے گا، اس لیے کہ یہ عدل نہیں ظلم ہو گا جو ربِّ سبحان و صمد کی شانِ اقدس کے سراسر منافی ہے، اور ایسا سوچنا بھی ظلمِ عظیم ہے۔

جس طرح یہ حقیقت ہے کہ انسان اپنے لیے ہمیشہ دُعائے خیر کرتا ہے، اُسی طرح یہ بھی سچ ہے کہ وہ یہ نہیں جانتا کہ جسے وہ خیر سمجھتا ہے اس کے حق میں واقعی خیر ہے یا شر؟ چنانچہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جسے وہ خیر سمجھتا ہے، اس کے حق میں شر ہوتا ہے وعلیٰ ہٰذالقیاس۔[۱۴۱] علاوہ بریں، جو لوگ خود آگاہ نہیں ہوتے، انہیں تو اس بات کا بھی شعور نہیں ہوتا کہ ان کے نفسِ روحی کی آرزو کیا ہے؟ انہیں زیادہ سے زیادہ اپنے نفسِ بدنی کی خواہشات کا علم ہوتا ہے، جن کی تکمیل کی وہ دُعا کرتے ہیں۔ اس ضمن میں یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بعض دُعائیں دُعاگو کی شخصیت کے لحاظ سے اور بعض مطلوبہ شے یا اشیاء کے حوالے سے محال، ناروا یا عدلِ الٰہی کے منافی ہوتی ہیں، اس لیے ایسی آرزوئیں اور دُعائیں جھوٹی اور بے اثر ہوتی ہیں۔

مثال کے طور پر ایک شخص جس کی طبع موزوں نہیں یا اس کی آواز میٹھی اور سُریلی نہیں، وہ لاکھ شاعر یا مغنّی بننے کی آرزو و دُعا کرے، اس کی آرزو پوری ہوگی نہ دُعا مستجاب ہوگی، اس لیے کہ شاعر یا مغنّی بننے کی اس میں قابلیت ہی نہیں، یا بالفاظِ دیگر، اس کے مقدور ہی میں نہیں؛ جس طرح مثال کے طور پر سوئی کے ناکے سے اونٹ کا نکلنا محال ہے یا اس کے مقدور ہی میں نہیں، اس پر اس قبیل کی دوسری دعاؤں کو قیاس کرنا چاہیے، چاہے وہ فرد کی ہوں یا قوم کی۔ مقدور کے اس مفہوم میں یہ کلیہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ آرزو یا دُعا وہ سچی ہوتی ہے، حسنِ اتمام یا اجابت جس کے مقدور میں ہو۔

یہاں اس لطیف نکتے کی بھی صراحت کر دی جاتی ہے کہ افراد و اقوام کے مقابلہ و مسابقت میں سبھی کو اپنی کامیابی کی آرزو ہوتی ہے اور اس کے لیے سب دُعا مانگتے ہیں، لیکن اللہ جلّ شانہٗ چونکہ سب افرادِ نسلِ انسانی کا خالق و ربّ، عادل و مقسط اور سبحان و صمد ہے، لہٰذا وہ ان فریقوں کو کامیابی عطا کرتا ہے جن کی آرزو زیادہ سچی اور وہ کامیابی کی زیادہ سزاوار ہوتی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ آرزو بدل جائے تو دُعا سے نوشتۂ تقدیر بھی بدل جاتا ہے۔ اس کی عبرت آموز و بصیرت افروز مثال حضرت یونس علیہ السلام کی قوم میں ملتی ہے۔[15] آپؑ کو بذریعہ وحی الٰہی علم ہوا کہ آپؑ کی قوم پر فلاں دن عذابِ الٰہی آنے والا ہے، لہٰذا آپ نے اس سے اپنی قوم کو متنبہ کر دیا اور اس کے ردِّ عمل کا انتظار کیے بغیر شہر چھوڑ کر چلے گئے۔ اس تنبیہ یا وارننگ کا آپؑ کی قوم پر مثبت اثر ہوا، جس سے اس کی زندگی میں جالیاتی۔ نفسیاتی لمحہ وقوع پذیر ہو گیا اور اس کی آرزو بدل گئی اور اس نے اپنے مشرکانہ عقائد اور مجرمانہ افعال کو چھوڑنے اور ان سے تائب ہونے کا مصمّم ارادہ کر لیا۔ چنانچہ اپنی آرزوئے نو کے اظہار و اتمام اور اپنے ارادے پر ثابت و قائم رہنے کی خاطر افرادِ قوم نے مل کر دُعا کی چونکہ آرزو اور دُعا دونوں سچی تھیں، اس لیے وہ پوری اور یہ مستجاب ہوئی۔ نوشتۂ تقدیر بدل گیا، عذاب ٹل گیا اور قوم کی تقدیر بدل گئی۔ اس تاریخی واقعیت سے ثابت ہوا کہ سچی دعا میں نوشتۂ تقدیر

بدلنے کی تاثیر ہوتی ہے۔

انگریزی زبان کا یہ محاورہ جتنا مشہور ہے اتنا سچا بھی ہے کہ First deserve then desire. یعنی "پہلے مستحق بنو، تب آرزو کرو۔" کسی چیز کا مستحق بننے کا مطلب اس چیز کے قبول وحصول کا اپنے اندر مقدور پیدا کرنا ہوتا ہے۔ چنانچہ آدمی پہلے اپنے اندر مقدور پیدا کرے اور پھر دعا مانگے تو وہ سچی ہوتی ہے اور مطلوبہ شے کے حصول کو ممکن بنا دیتی ہے، بظاہر وہ ناممکن کیوں نہ ہو۔ اس اعتبار سے کہتے ہیں کہ دعا ناممکن کو ممکن بنا دیتی ہے۔ علاوہ بریں آدمی کے اپنے اندر مقدور پیدا کرنے کی سعی وجہد میں بھی دعا مثبت و مؤثر کردار ادا کرتی ہے۔ دعا بلاشبہ آرزو کا اظہار اور تکمیلِ آرزو کی التجا ہوتی ہے، لیکن آرزو کے نشوو ارتقاد اور تکمیل و اتمام کے سلسلے میں بڑی ہی ممد ومعاون ثابت ہوتی ہے۔ لیسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان جس چیز کی دعا مانگتا ہے، اس کی آرزو اسے ہوتی تو ہے، مگر نقش برآب کی صورت ہوتی ہے، جسے نقش فی البحر بنانے میں دعا ازبس اہم کردار ادا کرتی ہے۔

آرزو و دعا سچی ہوں تو ان میں تاثیرِ مسیحائی ہوتی ہے جس سے زندگی سے بیزار و مایوس مریضوں میں آرزوئے حسن و زندگی کا احیاء اور نشوو ارتقاء ہوتا ہے اور ان میں بحالیِ صحت و تندرستی کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ انسان کا وجود اربوں خلیوں سے مرکب ہوتا ہے جو زندہ وفعال ہوتے ہیں اور اپنا وظیفۂ حیات سرانجام دینے میں جان دے کر نئے خلیے پیدا کرتے رہتے ہیں اور موت وحیات کا یہ عمل وجود کی حیات وبقا اور صحت وتندرستی کے لیے ناگزیر ہے۔ ہر خلیہ متنفس ہوتا ہے اور اپنا نفس رکھتا ہے جس کے لیے علامہ اقبال نے خودی کی تعبیر اختیار کی ہے۔ ان خلیاتی نفوس یا خودیوں کا ایک اپنا نظام ہوتا ہے جس کی سائنٹیفک دریافت طبی ونفسیاتی شعبوں میں حسین انقلاب لائے گی۔ بہر حال انسان کی بیماری و صحت اور موت وحیات کا انحصار بہت حد تک خلیاتی نظام کی آرزوئے حسن و زندگی کی نوعیت پر ہوتا ہے چنانچہ جب اس میں آرزوئے حسن وحیات مضمحل ونحیف ہوجاتی ہے تو وجودِ نفسی سقیم و

کمزور ہوجاتا ہے اور اگر آرزو مردہ ہوجائے تو وجودِ نفسی بھی مرجاتا ہے۔ یہ خلیاتی نظام ایسے پُر اسرار طریقوں سے کام کرتا ہے کہ آدمی کو اس کی خبر تک نہیں ہوتی۔ اصل یہ ہے کہ اس خلیاتی نظام میں تعطل و جمود کے وقوع پذیری کا نام موت ہے اور اس کی خودکاری و فعالیت عبارت ہے زندگی سے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر فلسفۂ آرزو سچا ہے تو پھر ایک لڑکا یا نوجوان جس میں بظاہر جینے کی اُمنگ یا آرزو ہوتی ہے، کیوں مرجاتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب کسی شخص کے خلیات کے نفسِ کُلّی میں جینے کی آرزو نہیں رہتی تو خلیاتی نظام اپنا کام کرنا چھوڑ دیتا ہے اور آدمی چاہے بچہ ہو یا لڑکا، جوان ہو یا بوڑھا، بیمار و نحیف ہو یا تندرست و شہ زور، مرجاتا ہے۔ اسی اصولِ آرزو پر اس کی بیماری کو قیاس کرنا چاہیے۔ یہی اصول اقوام پر بھی صادق آتا ہے افراد کی طرح اقوام کے حوادث و بلّیات اور ہلاکت و بیماری کی علّتِ فاعلی بھی یہی ہے۔ اس جگہ اس لطیف نکتے کی صراحت کردی جاتی ہے کہ جس طرح افراد کی زندگی میں باہمی آہنگی و معاونت ہوتی ہے، جن کے امتزاج کو قومیت سے تعبیر کرتے ہیں، اُسی طرح خلیاتی افراد میں ربط و ضبط اور ہم آہنگی و معاونت ہوتی ہے، جس کے لیے "خلیاتی وحدت" کی تعبیر اختیار کر سکتے ہیں۔ قومیت کا فقدان ہو یا خلیاتی وحدت کا، دلیلِ مرگ ہوتا ہے۔ چنانچہ کسی شخص کے مفلوج ہونے کی علّتِ فاعلی یہ ہوتی ہے کہ اس سے خلیاتی نظام میں ضعفِ آرزوئے حسن و حیات کے سبب جزوی تعطل واقع ہوجاتا ہے۔ اسی طرح جب کسی خلیاتی نظام کے بعض عناصر سرکش ہوجاتے ہیں اور جان سے گزر کر دوسرے خلیوں کو پیدا کرنے کے بجائے خود جینا چاہتے ہیں اور اپنی نشوونما کی خاطر اپنے ہم نفسوں ہی کو اپنی غذا بنانا شروع کردیتے ہیں تو ان کے نفسِ کُلّی کو سرطان یا کینسر کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس مہلک سرطانی بیماری کا علاج جراحت و طبابت کے علاوہ ایک یہ بھی ہے کہ کسی طرح ان باغی و سرکش اور سفاک و خون آشام سرطانی خلیوں کے نفسِ کُلّی میں آرزوئے حیات وارتقاء کو فنا کرکے اس میں آرزوئے مرگ پیدا کی جائے۔

اس کا ایک علاج سچی دُعا ہے۔

سرطان میں بلاشبہ آرزوئے زندگی ہوتی ہے، اگر صرف یہی آرزو ہوتی تو وہ مہلک نہ ہوتا۔ ستم تو یہ ہے کہ اس میں اپنے ہم نفسوں کی خون آشامی و ہلاکت کی آرزو بھی پائی جاتی ہے، جو اُسے مہلک بنا دیتی ہے۔ یہی صورتِ حال معاشرتی سرطانی طبقوں کی ہے، جن میں بھی اپنے ہم نفسوں کا خون پینے اور انہیں ہلاک و برباد کرنے کی آرزو ہوتی ہے، اس لیے وہ اپنی قوم کے لیے بالخصوص اور جملہ افرادِ نسلِ انسانی کے لیے بالعموم انتہائی مضرت رسان و مہلک ہوتے ہیں۔ چونکہ سرطانی قسم کی بیماریوں کا پتا عموماً اس وقت چلتا ہے جب سرکش و سفاک خلیے اپنا کام کر چکے ہوتے ہیں، لہٰذا ان کا علاج نہ دوا و جراحت سے ہوتا ہے اور نہ دعا ہی کام کرتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جب جسم میں شفا پانے کی قابلیت ہی نہ رہے، یا بالفاظِ دیگر، شفا اس کے مقدر ہی میں نہ رہے تو پھر دُعائے شفا سچی ہوتی ہے نہ مؤثر۔ مختصر یہ کہ اس حالت میں نہ اجابت دُعا کے اور نہ شفا مریض کے مقدر میں رہتی ہے۔

کیونکہ دُعا میں آرزو کو بدلنے کی تاثیر ہوتی ہے، اس لیے اگر خود مریض، نیز اس کے اعزہ و اقارب ہر وقت دُعا مانگیں اور صرف اللہ تعالیٰ سے مانگیں، نیز خشوع و خضوع اور پورے اعتماد و امید سے مانگیں تو اس سے سرکش و آشام خلیوں کی آرزوئے نشو و نما بدل سکتی اور مسلمان و سلیم الفطرت خلیوں میں ان موذی و خون آشام خلیوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت بڑھ سکتی ہے، نتیجۃً مریض کے شفایاب ہونے کا امکان پیدا ہو سکتا ہے۔ حرفِ آخر یہ ہے کہ دُعا کوئی مانگے اور کسی کے لیے مانگے، اگر خلوص و یقین سے مانگے اور فقط ربّ العزت سے مانگے اور وہ سچی بھی ہو تو وہ ہر حال میں نتیجہ خیز ہوتی ہے، چاہے اس نتیجے کی صورت مطلوبۂ انسانی ہو یا مطلوبۂ الٰہی۔

حواشی

۱۔ ابلیسی نفسی شیطان: اس کے لیے ہم نے معروضی موضوعی شیطان کی تعبیر بھی اختیار کی ہے شیطان دو قسم کا ہے ایک شیطان ذریتِ ابلیس میں سے ہے، جسے ہم نے ابلیسی یا موضوعی شیطان سے تعبیر کیا ہے۔ دوسری قسم کا شیطان جسے ہم موضوعی یا داخلی کہتے ہیں، نفس اِمّارہ ہے۔ چونکہ یہ دونوں شیطان باہم مل کر انسان کو اپنی وسوسہ اندازی اور رجایاتی فریب کاری کے ذریعے اس کی قبیح خواہشات وجذبات اور نظریات واعمال کو خوشنما ودلکش بنا کر دکھاتے ہیں، لہٰذا ان کے لیے ابلیسی نفسی شیطان کی تعبیر اختیار کی ہے۔ درمیانی خطِ وصل (۔) دونوں کے تعاونِ باہمی کی علامت ہے۔ مفصّل بحث کے لیے دیکھیے مصنّف کی کتاب فلسفۂ حسن، مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور ۱۹۸۴ء۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا ٥ (الدھر ۷۶: ۱)؛ یقیناً دھر میں سے انسان پر ایک وقت ایسا بھی آیا ہے کہ وہ کوئی ایسی چیز نہ تھا کہ اس کا ذکر ہوتا ہو۔

۳۔ دیکھیے السجدۃ ۳۲: ۱۷؛ نیز دیکھیے الکہف ۱۸: ۳۱؛ الفرقان ۲۵: ۷۶؛ الرّعد ۱۳: ۲۹ وبمواضع کثیرہ۔

۴۔ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ: کے لیے دیکھیے آل عمران ۳: ۹؛ والرّعد ۱۳: ۳۱۔

۵۔ سُنَّتُ اللّٰهِ: دیکھیے الاحزاب ۳۳: ۶۲؛ فاطر ۳۵: ۴۳۔

۶۔ يَوْمِ الدِّيْنِ: دیکھیے الفاتحہ ۱: ۳ وبمواضع کثیرہ۔

۷۔ اَلْعَصْرِ: دیکھیے العصر ۱۰۳: ۱۔

۸۔ برزخ کے لیے دیکھیے المؤمنون ۲۳: ۱۰۰۔

۹۔ الحیوان کے لیے العنکبوت ۲۹: ۶۴۔

۱۰۔ اس کیفیت موت کے لیے دیکھیے یونس ۱۰: ۴۵۔

۱۱۔ المیزان: دیکھیے الاعراف ۷ : ۸-۹؛ الشوریٰ ۴۲ : ۱۷؛ نیز دیکھیے الانبیآء ۲۱ : ۴۷۔
۱۲۔ درجات: دیکھیے آل عمران ۳ : ۱۶۳؛ الانفال ۸ : ۴؛ طٰہٰ ۲۰ : ۷۵، و بمواضع کثیرہ۔
۱۳۔ لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ: دیکھیے البقرہ ۲ : ۲۵۶۔
۱۴۔ دیکھیے البقرۃ ۲ : ۲۱۶؛ الاسراء ۱۷ : ۱۱۔
۱۵۔ قومِ یونسؑ کی دُعا: دیکھیے یونس ۱۰ : ۹۸؛ الصافات ۳۷ : ۱۳۹ تا ۱۴۸۔

مقام ۱۱

لوازمِ ارتقاء

میں سوچتا رہا، سوچتا رہا اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ تفکرِ مسلسل، آرزوئے حسن ، داعیۂ پیدائی اور شوقِ سیر و سفرِ زندگی کا مقدر ہے، جو درحقیقت موزونیٔ تقدیر ہے۔

مہد سے کنارِ لحد تک سوچتا چلا آیا ہوں۔ سوچنا میرا وظیفۂ حیات بن چکا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہر مسئلہ حیات کا

کرشمہ دامنِ دل میکشد کہ جا اینجاست

جمالیاتی۔تخلیقی فکر محنت طلب ہوتی ہے، لیکن ذوقِ محنت میں شوق کا عنصر شامل ہو جائے تو اس سے جمالیاتی طمانیت و مسرت ملتی ہے۔ عبادت ذوق و شوق سے قُرّۃُ العین بنتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں چلتے پھرتے، بیٹھے، لیٹے، ہر وقت سوچتا رہتا ہوں۔ ذہن تربیت یافتہ و خوگرِ تفکر ہے اس وقت بھی سوچتا رہتا ہے جب میرا حسّی نظام سو رہا ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک روز میں قلم بدست صنفِ جمیلہ کے حوالے سے ارتقاء سے متعلق سوچ رہا تھا کہ نوائے سروش آئی:

فکر جمالیاتی تخلیقی ہو تو مفکر کے لیے مبارک ہوتی ہے، لیکن اگر وہ قبیح و تخریبی اور سلبی ہو تو سوچنے والوں کے لیے نحوست و شقاوت کا موجب ہوتی ہے۔ انسان کے ظلم و جہل کی حد یہ ہے کہ دنیا میں بالعموم اور تمہارے ملک میں بالخصوص ان لوگوں کی اکثریت ہے، جن کی سوچ

قبیح و تخریبی اور منفی ہے اور اس کے نتیجے میں زندگی کے گوشے گوشے میں فساد برپا ہے؛ لیکن کم اس کا شعور رکھتے ہیں۔ جمالیاتی تخلیقی فکر کی ایک پہچان یہ ہے کہ وہ الحسن کے حوالے سے حسن و حسنہ اور خیر و احسان کے لیے ہوتی ہے۔ بہرحال، اِرتقاء کی حقیقت جاننا چاہتے ہو تو سنو!

زندگی کے ہیولے میں صورتِ ارتقاء مضمر ہے اور زندہ خدا کی ہر تخلیق زندہ ہے؛ گو جوہرِ حیات کی کمیت و کیفیت مختلف ہوتی ہے، لیکن ہر چیز میں اِرتقاء کا امکان اور اس کی آرزو مضمر ہوتی ہے۔ جہاں تک انسان کا تعلق ہے، اس کی آرزوئے اِرتقاء جملہ اشیائے ارضی سے شدید تر اور اکمل و احسن ہے؛ نیز حیاتِ انسانی میں اِرتقاء کے امکانات بھی سب سے زیادہ اور لامتناہی ہیں، اور ان امکانات کو حقائق میں بدلنا، انسان کا وظیفۂ حیات ہے۔ علاوہ بریں، یہ غایتِ زندگی بھی ہے اور مشیّتِ الٰہی بھی۔ زندہ ہیں وہ جو ایسا کرتے ہیں، اور جو ایسا نہیں کرتے وہ مردہ ہوتے ہیں۔ ایسی ہی مردہ اقوام کو قدرت ذلّت و مسکنت میں دفن یا عدمیّت میں گم کر دیتی ہے۔ امکاناتِ ارتقاء کو حقائق میں بدلنے کے علم و منہاج کو "حکمت" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اسی لیے "حکمت خیرِ کثیر ہے۔"[۱]

عالمِ دہر میں انسان پہ ایک دور ایسا بھی گزرتا ہے، جب وہ عالمِ ماء و طین میں حیاتیاتی نفسی ارتقائی مراحل طے کر رہا تھا[۲] اور ابھی صورتِ بشر میں نہیں آیا تھا، لہٰذا شئے مذکور بھی نہ تھا، لیکن اُس نے آخرِ کار صدیوں کی سعی و جہد اور تجربات کے بعد اپنی آرزوئے حسن کی تکمیل کا پہلا مرحلہ طے کر لیا۔ بالفاظِ دیگر، اُس نے اپنے حیاتیاتی نفسی ارتقاء کی تکمیل کر لی۔ وہ خَلق و خُلق کے لحاظ سے اکمل و احسن بن گیا تو اس کی جمالیاتی حِسّ فعّال ہو گئی اور اس میں حُسن کی آرزو نشو و نما پا گئی جو کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَاْنٍ[۳] کے باعث خوب سے خوب تر کی طلب و جستجو میں بدل گئی۔ اِس "تغیّرِ اِرتقائی" ہی میں انسان کے شرف و کمال، ترفیعِ درجات اور اِرتقائے دوام کے امکانات مضمر ہیں۔ یہ نکتہ صراحت طلب ہے۔ ربّ ذوالجلال والاکرام

ازل سے اپنے حسن کی شانِ ارتقائی میں جلوہ پیدا کرتا رہتا ہے جس کے باعث صاحبِ ذوق وشوق انسان میں حسن کے مشاہدۂ مدام کی آرزو پیدا ہو گئی۔ چونکہ آرزوئے حسن کے اتمام کے لیے حسنِ ذاتِ انسانی کے نور کا ارتقائے مدام ناگزیر تھا، لہٰذا اس میں اس کی طلب وجستجو پیدا ہو گئی۔ غور کریں تو انسان کی اس طلب وجستجو میں اپنے الٰہِ جمیل وجلیل کی دید ولقاء اور قرب وحضوری کی آرزو بھی مضمر ہے۔ انسان کی ذات کا مطلب اس کا حسی، قلبی نفسی نظام ہے اور نور اصل میں حسن کا عنصرِ امتزاجی اور اصلِ شہود وشاہد ومشہود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نور ہی کی بدولت حسن کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ حسن بسیط وبحت اور لطیف ومنزّہ ہونے کے باوصف ہمیشہ صورت میں مشہود ہوتا ہے اور یہ اس کی تقدیر ہے۔ اسے حسن کی موزونیِ تقدیر سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ حاصلِ کلام یہ کہ انسان کا ارتقاء دراصل اس کی ذات یا حسی قلبی نفسی نظام کے نورِ حسن کا ارتقاء ہے جس میں اس کی ترفیعِ درجات اور کمالاتِ نو بنو کے لامحدود امکانات مضمر ہیں۔

اب رہا سوال صنفِ جمیلہ کے لوازمِ ارتقاء کا جو اگرچہ متعدد ہیں، لیکن ان میں سے چار سے گفتگو کریں گے جو اہم ترین ہیں اور وہ یہ ہیں: (۱) تقویٰ (۲) حیا (۳) حجاب اور (۴) نکاح۔

(۱) تقویٰ

تقویٰ کا مادّہ و ق ی ہے۔ یہ قرآنِ حکیم کی اہم ترین اصلاحات میں سے ہے، جس کے معنی میں مثبت ومنفی مفہوم پایا جاتا ہے۔ مثلاً ایک تو اس میں حق وصداقت، حسن ونور، رشد وہدایت، حسنہ وخیر اور رضائے الٰہی کی طلب وجستجو کا مثبت، اور دوسرے اس میں باطل وکذب، قبح وظلمت، شقاوت وضلالت، سیئہ وشر سے محفوظ رہنے، نیز خشیتِ الٰہی یا قدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل کے خوف کا منفی مفہوم پایا جاتا ہے۔ اس کی غیر معمولی اہمیت

کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کو قرآنِ مجید سے رشد و ہدایت حاصل کرنے کی پیش شرط قرار دیا ہے۔[۵] اس کا مطلب یہ ہوا کہ تقویٰ ہو تو انسان قرآنِ مجید سے جو آفتابِ نور و ہدایت، سرچشمۂ علم و حکمت، خزینۂ حسنہ و خیر اور آئینۂ حسن و حق ہے، علم و حکمت، رشد و ہدایت، حسن و نور اور جالیاتی ثروت حاصل کر سکتا ہے۔ اس کا نقیض یہ ہوا کہ تقویٰ نہ ہو تو انسان اس سے کچھ حاصل نہیں کر سکتا، جس طرح اندھا سورج سے روشنی حاصل نہیں کر سکتا۔ علاوہ بریں، تقویٰ میں حیاتِ محض حاصل کرنے کی طلب و جستجو کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے، چنانچہ متقی وہ زندہ و صالح انسان ہوتا ہے جس میں آرزوئے حسن و زندگی زندہ و فعّال ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ تقویٰ ہی صدق و ایمان، شہادت و صالحیت اور عدل و احسان کا مبدء ہے۔ جہاں تک عورت کی ذات کا تعلق ہے، تقویٰ ہی دراصل اس کا حجاب و حاجب ہے اور وہی اس کی عزتِ نفس، ناموس و آبرو اور عفت و عصمت کی ضمانت فراہم کر سکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ تقویٰ ہو تو بظاہر بے پردہ عورت حقیقت میں باپردہ ہوتی ہے اور تقویٰ نہ ہو تو وہ ہزار پردوں میں بھی بے پردہ اور ہزار پہروں میں بھی بے پہرا ہوتی ہے، اور ایسے ایسے گل کھلا سکتی ہے جن کا بظاہر ایک بے پردہ و آزاد متقی عورت تصور بھی نہیں کر سکتی۔

نفسیاتی نقطۂ نظر سے غور کریں تو تقویٰ نفس کی تین حالتوں پر دلالت کرتا ہے:

(۱) نفس کی حیات و فعالیت (۲) خشیتِ الٰہی اور (۳) حسن و حیات اور حق و صداقت کی طلب و جستجو۔ اب ان کی مختصراً صراحت کی جاتی ہے۔

۱۔ نفس کی حیات و فعالیت:

اس سے مراد یہ ہے کہ باطنی نظام اپنی فطری حالت پر ہے، یعنی انسان کا حسی۔ قلبی۔ نفسی نظام جمیل و جلیل، زندہ و فعّال اور منیر و قوی ہے اور اپنے فطری وظائف احسن طریق سے سرانجام دے رہا ہے۔ ایسے نفس ہی کو حسن و حق کی طلب و جستجو ہوتی ہے اور

وہ متقی ہوتا ہے۔

۲۔ خشیتِ الٰہی:

یہ ذو معنی مصطلحۂ قرآنی ہے۔ اس کا ایک معنٰی تو قدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل کا خوف ہے، یعنی اس بات کا ڈر کہ کہیں آدمی اپنے جرم وگناہ اور ظلم وبخل کی پاداش میں اپنے باطنی حسن ونور، طمانیت وسرور اور دُنیوی واُخروی حسنہ سے محروم نہ ہوجائے؛ نتیجۃً آتشِ خوف وحزن کے عذاب کا اسیر نہ بن جائے، یہاں بھی اور الحیوان میں بھی۔ اس کا دوسرا معنٰی یہ ہے کہ کہیں بندہ اپنے اِلٰہ ورب کو ناراض کر کے اس کی رحمت و مغفرت اور فضل وکرم سے محروم نہ ہوجائے۔ علاوہ بریں، خشیّتِ اِلٰہی اس حقیقت کے ایقان واذعان پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ سمیع وبصیر، علیم وخبیر بھی ہے اور جبّار وقہّار اور ذو انتقام وسریع الحساب بھی ہے، لہٰذا ظالم وسرکش اور مجرم وگناہگار اس کی پکڑ سے بچ نہیں سکتا۔

۳۔ حُسن وحیات اور حق وصداقت کی طلب وجستجو:

(ا) حُسن کی طلب وجستجو انسان کے محسن یا صاحبِ حُسن وسُرور بننے کی آرزو پر دلالت کرتی ہے۔ بالفاظِ دیگر، متقی شخص میں حُسن وحسنہ اور احسان کا ذوق وشوق ہوتا ہے۔

(ب) حیات کا جوہر حُسن ہے اور حُسن کی تأثیر جمالیاتی لذّت ومسرت اور طمانیت وحیرت ہے؛ نیز حیات کو بقائے دوام، حرکتِ جاویداور اِرتقائے مدام بھی مستلزم ہے۔ زندگی اصل میں "حیاتِ محض" سے عبارت ہے، جو جمیل وجلیل، منیر وارتقائی اور مطمئن ومسرور ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ متقی انسان میں صاحبِ حُسن وسُرور بننے اور اپنے ارتقائے دوام کی سچّی آرزو ہوتی ہے۔ یاد رہے کہ آرزو سعی وعملِ صالح سے سچّی بنتی ہے اور یہی اسے جانچنے کا معیار ہے۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تقوٰی اور حیا لازم وملزوم ہیں، لہٰذا متقی شخص ہی باحیا اور باحیا شخص ہی متّقی ہوسکتا ہے۔ اس کا نقیض یہ ہوا کہ بےحیا کبھی متّقی نہیں ہوتا۔

حقیقت یہ ہے کہ بے حیائی راہزنِ تقویٰ ہے اور چونکہ تقویٰ کی ضد ہے اور اجتماعِ ضدین محال ہے، اس لیے بے حیا ہرگز متقی نہیں ہوسکتا، چاہے مرد ہو یا عورت۔

اس گفتگو کا ماحصل یہ نکلا کہ تقویٰ عورت کے نورِ حسن ذات کے اِرتقاء کے لیے ناگزیر ہے (دوسرے لفظوں میں لازمۂ اِرتقاء ہے اور اس کے بغیر صنفِ جمیلہ کے نورِ ذات کا اِرتقاء محال ہے۔

تقوے کی ایک صفت، جو اس کی پیداوار بھی ہے "حیا" ہے؛ اور یہی ہماری گفتگو کا اگلا موضوع ہے۔

(۲) حیا

حیا، حیات، حیوان اور الحیوان کا مادّہ ایک ہی ہے اور وہ ہے ح ی ی؛ لٰہذا اپنی اصل کی نسبت سے حیا میں حیات کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ جہاں تک حیا اور صنفِ جمیلہ کا تعلق ہے، قرآنِ حکیم کے اسلوبِ بیاں کے تتبع میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ "عورت حیا میں پیدا کی گئی ہے"؛ اس کا مطلب یہ ہے کہ حیا عورت کی موزونیِ تقدیر ہے؛ لٰہذا اس کے تزکیۂ نفس یا مکارمِ اخلاق اور نورِ ذات کے اِتمام و اِرتقائے مدام کا لازمہ ہے۔ اس سے مستنبط ہوا کہ حیا میں صنفِ جمیلہ کی حیاتِ محض، جمال و جلال، دلکشی و جاذبیت کے علاوہ اس کی جمالیاتی ثروت، کامیابی اور اِرتقاء کا راز پایا جاتا ہے۔ بخلاف اس کے بے حیا عورت نور و حیات اور جمالیاتی ثروت سے محروم ہوتی ہے، لٰہذا اس کے ارتقاء کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چونکہ حیا حسن کو چاہتی ہے، اس لیے اس میں قبائح سے انقباض و نفرت اور ان سے باز رہنے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔[۱] باحیا عورت کا قبائح یعنی سیّئات، فحشآء، و منکرات سے نفرت کرنا، ڈرنا اور باز رہنے کا بنیادی سبب یہ بھی ہے کہ وہ حسن و حیات اور جمالیاتی ثروت کے چور اور رہزن ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ عورت، بے حیا ہو جائے تو اُسے قبائح سے نفرت و خشیت نہیں

رہتی اور نہ ان سے اپنے آپ کو باز رکھتی ہے۔ اس کے نتیجے میں قبائح اُسے کورِ ذوقِ حسن کو بنا دیتے ہیں اور اس میں "جنسی قردیت" نشوونما پانے لگتی ہے اور وہ قرآنِ مجید کی زبان میں اسفل سافلین ہو جاتی ہے۔

تم حیا محسوس کرتے اور جانتے ہو، لیکن اس کی حقیقت سے کم آشنا ہو۔ ایک حیا ہی پہ کیا موقوف ہے، قریب قریب سب جمالیاتی اقدار سے متعلق تمہارے علم کی یہی نوعیت ہے۔ تم محسوس تو کرتے ہو، لیکن ان کی ماہیت سے کم آگاہ ہو۔ دلیل یہ ہے کہ تم تو اُن اشیاء یا اقدار کی بھی صحیح و جامع تعریف نہیں کر سکتے جن کے متعلق تمہیں زعم ہوتا ہے کہ تم ان کا علم رکھتے ہو، یقین نہ ہو تو خود آزما کر دیکھ لو۔ حیا ہی کی تعریف کر کے دیکھ لو۔ انسان کی محرومی و گمراہی کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ "وہ نہ جاننے کے باوجود یہ سمجھتا ہے کہ وہ جانتا ہے اور اپنی کم آگاہی کو تسلیم نہیں کرتا" اور دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ "جانتا ہے پر مانتا نہیں"۔ انسان یہ نکتہ سمجھ لے تو گمراہ و محروم ہونے سے بچ جائے کہ "قدرت نے انسان کو علمِ قلیل ودیعت کیا ہے"۔ لہٰذا وہ اس علم کا محتاج ہے جو کامل ہے اور وہ ربِّ علیم و حکیم کی وحی و تنزیل ہے جس کی آخری، احسن و اکمل اور محفوظ و مصئون صورت کا نام قرآنِ حکیم ہے۔

فلسفۂ آرزو کے حوالے سے سوچنے والے سنو، میں تمہیں بتاتا ہوں کہ حیا کیا ہے؟ حیا دراصل آرزوئے حسن و زندگی ہی کی ایک صورت ہے۔ اس کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے جمال میں جلال کی قوت مضمر ہوتی ہے جو اسے ناقابلِ تسخیر بنا دیتی ہے۔ چنانچہ باحیا عورت غیر مرد کے لیے ناقابلِ تسخیر ہوتی ہے۔ صنفِ جمیلہ اسی صورت میں قابلِ تسخیر ہوتی ہے جب وہ حیا کے ناقابلِ تسخیر حصنِ حصین سے باہر نکل آتی ہے۔

انسان کو طبعًا تین ہستیوں سے حیا آتی ہے: (ا) اپنے نفس (ب) اپنے اِلٰہ و رب اور (ج) اپنے ہم نفسوں سے۔ اس اجمال کی تفصیل سنو!

(ا) نفس سے حیا: ہر سلیم الطبع انسان کو سب سے پہلے "اپنے آپ" سے حیا آتی ہے اور

اُپنا آپ "نفسِ انسانی ہے۔ اگرچہ تم معلوم کر چکے ہو کہ نفس کیا ہے، لیکن انسان نسیان کا موجب ہے، لہٰذا تمہاری یاددہانی کے لیے جتا دینا چاہتا ہوں کہ روحِ انسانی کو آرزوئے حُسن و حیات ودیعت ہوتی ہے جس کے نتیجے میں اس میں اپنی نمو اور اِرتقائے مدام کی آرزو بھی مضمر ہوتی ہے، جسے پورا کرنے کے لیے وہ ہیکلِ پدری سے رحمِ مادر میں آتی ہے اور کُرۂ ارضی میں شایانِ شان اپنے پیکرِ بدن کی تخلیق و حُسن کاری کرتی ہے۔ روح کی اس جمالیاتی تخلیقی فعلیت کے نتیجے میں جو ربِّ رحمٰن و رحیم کی ہدایت و توفیق کی مرہونِ منّت ہوتی ہے، ایک تیسری شے معرضِ ظہور میں آتی ہے اور روح و بدن پر حاوی ہونے کے باعث "میں" بن جاتی ہے، جس کے لیے قرآنِ حکیم نے "نفس" کی تعبیر اختیار کی ہے۔ اپنے ظہورِ ہستی کے اعتبار سے نفس دو اجزائے لاینفک سے ممزوج ہے۔ ان میں سے جس جُزء کا تعلّق بلا واسطہ روح سے ہے اور رُوح کے زیرِ اثر ہے، اُسے نفسِ لوّامہ کہتے ہیں جبکہ دوسرے جُزء کو جس کا تعلّق براہِ راست بدن سے ہے اور وہ مغلوب البدن ہے، نفسِ امّارہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ نفسِ امّارہ کا طبعی وظیفہ خواہشات پیدا کرنا اور شیطانِ معروضی کے تعاون سے انہیں مزیّن کر کے دکھانا اور نفسِ کُلّی کو انہیں پورا کرنے کی تحریک کرتے رہنا ہے۔ چنانچہ نفس جب بھی کسی خواہشِ قبیحہ مثلاً فحشآء و منکر اور جرم و گناہ کا ارتکاب کرنے لگتا ہے تو اُسے اپنی روح سے حیا آتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ روح کو قبحٗ و سیّئہ سے سخت نفرت ہے اور وہ فحشآء و منکرات سے گریزاں و ترساں رہتی ہے، اس لیے کہ وہ غارت گرِ حُسن و حیات اور رہزنِ لذّت و طمانیّت ہیں۔ یہ یاد رہے کہ لذّت سے مراد لذّتِ حیات و جمالیاتی حظ ہے اور طمانیت کا مطلب قناعت و سکینت اور قرار و رضا ہے۔ اس سلسلے میں یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حواس، قلب اور نفس تینوں ہی انسان کو قبحٗ و سیّئہ سے حیا دلاتے ہیں، مثلاً جمالیاتی حِسّ، ضمیر اور نفسِ امّارہ۔

فحشآء و منکر کے ارتکاب سے انسان آپ اپنی نظروں سے گر جاتا ہے اور قبیح دکھائی دینے لگتا ہے، خواہ وہ ایسا بات کی تاریکی میں کرے یا دوسروں کی نظروں سے چھُپ کر۔ وہ کسی

عالم میں جرم وگناہ کرے اس کا حسّی قلبی نفسی نظام اُسے دیکھتا ہوتا ہے۔ وہ اپنے ہم نفسوں کی نظروں سے چھپ سکتا ہے، مگر اپنی نظروں سے نہیں چھپ سکتا۔ کاش! انسان یہ سمجھتا کہ دوسروں کی نظروں سے گرنے سے پہلے وہ خود اپنی نظروں سے گر جاتا ہے؛ اور اپنی نظروں سے گرنا نفس کے لیے دوسروں کی نظروں سے گرنے سے کہیں زیادہ مضرّت رساں و مہلک ہوتا ہے۔

جہاں تک جنسی بے حیائی یا فحاشی کا تعلق ہے، مرد و زن کا اختلاط ناگزیر ہے، لٰہذا اس فعل سے ایک تو وہ ایک دوسرے کی نظروں سے اور دوسرے اپنی نظروں سے گر جاتے ہیں۔ علاوہ بریں، چونکہ عشق و مُشک چھپائے سے چھپ نہیں سکتا، اس لیے وہ ہم جنسوں کی نظروں سے بھی گر جاتے ہیں۔ جہاں تک انسان کے اپنے حقیقی الٰہ و ربّ کا تعلّق ہے، وہ تو ہے ہی عالم الغیب والشّہادۃ، لٰہذا عاصی اس کی نظروں سے بھی گر جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ پستیوں کی طرف رجعتِ قہقہری کرنے لگتا ہے اور جب تک اس کے دل میں آرزوئے حسن و زندگی زندہ و فعّال نہیں ہو جاتی اور وہ حُسنِ فکر و عمل کی بدولت اپنی نظروں میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل نہیں کر لیتا، وہ بہیمیّت کی پستیوں کی طرف گرتے گرتے تحت الثّریٰ میں پہنچ جاتا ہے، اور اس کی انسانیت قردیّتِ خسیسہ[۱۱] میں بدل جاتی ہے۔ بالفاظِ دیگر اس کے نفس کی خو لوۂ ذلیل ترین بوزنہ کی سی ہو جاتی ہے اور اس کی خواہشات "بوزنی" بن جاتی ہیں۔ اس قبیح نفسیاتی صورتِ حال کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ایجازِ بلاغت سے از بس فکر انگیز و عبرت آموز اسلوب میں بیان کیا ہے: ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝ (التّین ۹۵: ۵)
پھر ہم اسے رذیل ترین حالت کی طرف لوٹا دیتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ اپنے نفس سے حیا انسان کے لیے، چاہے وہ صنفِ جمیلہ ہو یا صنفِ جلیلہ، ایسا حصنِ حصین ہے جو اُسے موضوعی معروضی شیطان کی جمالیاتی وسوسہ اندازی و فریب کاری اور بے حیائی کی باتوں اور کاموں سے محفوظ رکھتا ہے چنانچہ وہ اس سے باہر

نکلتا ہے تو شیاطین کے پیچھے چڑھتا اور بے حیائی کے کام کرتا ہے۔ اس اعتبار سے اگر یہ کہا جائے کہ اپنے نفس سے حیا تقوے کی روح اور عزّتِ نفس کی محافظ ہے تو بیجا نہ ہوگا۔

(ب) اللہ تعالیٰ سے حیا آنے کا سبب یہ ہے کہ وہ ہمارا خالق و پروردگار اور آقا و حاکم (= ربّ) بھی ہے اور معبود و معروضِ حُسن و عشق (= اِلٰہ) بھی، چاہے ہم یہ حقیقت زبان سے تسلیم کریں یا نہ کریں؛ نیز انسان طبعاً جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ہر فعل کو دیکھتا اور دل کے احوال و خواہشات کو جانتا ہے۔ چنانچہ اس حقیقت کے احساس و ایقان کی بدولت انسان کو اپنے اِلٰہ و ربّ سے حیا آتی ہے کہ کہیں وہ اس کی نظروں سے گر کر اس کی محبّت و رحمت سے محروم نہ ہو جائے اور اس کے احکام کی خلاف ورزی کر کے قانونِ مجازات کی زد میں آکر ملعون و مغضوب نہ بن جائے۔ اس اعتبار سے حیا نصف ایمان بھی ہے اور خشیتِ الٰہی بھی۔ خشیت ایک تو اللہ تعالیٰ سے اپنی محبّتِ شدیدہ پر، دوسرے اس کی محبّت و رحمت سے محرومی کے اور تیسرے اس کے قانونِ مکافاتِ عمل کے خوف پر دلالت کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے حیا انسان کو فحشآء و منکر سے باز رکھنے میں از بس اہم کردار ادا کرتی ہے، اور یہ تقوے کی ایک حسین صورت ہے۔

(ج) ہم نفسوں سے حیا کا ایک سبب یہ ہے کہ انسان کو طبعاً اپنی عزتِ نفس کا پاس ہوتا ہے، لٰہذا وہ نہیں چاہتا کہ فحشآء و منکر کا کوئی کام کر کے ان کی نظروں سے گر جائے اور اس کی عزتِ نفس مجروح ہو جائے۔ اصل یہ ہے کہ جراحتِ عزّتِ نفس جراحتِ جسم سے زیادہ اذیّت ناک ہوتی ہے۔ اسی لیے یہ مقولہ مشہور ہے کہ تلوار کا زخم تو مندمل ہو جاتا ہے، لیکن زبان کا زخم مندمل نہیں ہوتا۔ جب تک انسان کو عزّتِ نفس کا پاس رہتا ہے، اُسے اپنے ہم نفسوں سے حیا رہتی ہے اور یہ دونوں چیزیں فحشآء و منکر کی راہ میں اُس کے مانع رہتی ہیں۔

بنظرِ غائر دیکھیں تو حیا تقوٰی و حُسنِ خُلق کی اصل ہے اور اس میں آرزوئے حُسن و زندگی اس طرح مضمر ہوتی ہے جس طرح بیج میں اس کا شجر بالقوہ موجود ہوتا ہے۔ اس سے

اِس ارشادِ نبوی ﷺ کی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ "حیا نصف ایمان ہے۔"[۱۲]

یہاں اس لطیف نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ حیا کا مادّہ ح ی ی ہے، یعنی وہی ہے جو اَلْحَیَاۃُ یا حیات کا ہے، اور اس بنا پہ حیا میں حسن و زندگی کی آرزو کا مفہوم پایا جاتا ہے، اور باحیا آدمی وہ ہوتا ہے جس میں آرزوئے حسن و حیات زندہ و حرکی ہوتی ہے۔ بخلاف اس کے جس میں یہ آرزو نحیف و نزار یا مردہ ہو جائے وہ بے حیا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ باحیا شخص ہی اصل میں زندہ اور بے حیا مُردہ ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے حیا آرزوئے حسن و زندگی کی علامت ہوئی۔

حیا کی ایک منفرد امتیازی خوبی یہ ہے کہ یہ بیک وقت جمال و جلال کی مظہر ہوتی ہے۔ صنفِ جمیلہ میں حیا نہ رہے تو اس میں تاثیرِ حسن بھی نہیں رہتی؛ یعنی جمال رہتا ہے نہ جلال۔ بالفاظِ دیگر، اس میں جمال کی لطافت و نظافت اور آب و تاب اور نہ جلال کی قوت و ہیبت اور رعب و سطوت ہی رہتی ہے۔ اس طرح وہ اپنے اس معتبر و ناقابلِ تسخیر محافظِ عزّت و آبرو سے محروم ہو جاتی ہے، جسے قدرت اس کی فطرت میں ودیعت کر کے اُسے دُنیا میں بھیجتی ہے۔ مرد میں حیا نہ رہے تو اس کی شخصیت میں بھی تاثیرِ برقِ حسن نہیں رہتی، لہٰذا اس کا جمال شیطنت سے مزیّن ہو جاتا ہے اور جلال سنہرے ناگ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ عورت ایک پھول ہے جس کی رنگت و خوشبو اس کی حیا ہے۔

چونکہ حیا میں حُسن و حیات کی آرزو مضمر ہوتی ہے، اس لیے باحیا صاحبِ حُسنِ خُلق اور بے حیا بد خُلق ہوتا ہے؛ یعنی اس کا قول و فعل حُسن و صدق سے عاری ہوتا ہے۔ حیا اگر زندگی کی آب و تاب ہے اور یقیناً ہے تو پھر اس رعایت سے اسے آبِ حیات اور تاب و توانِ حسن کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ حیا ان معنی میں آبِ حیات ہے کہ اس سے گلشنِ شخصیت شاداب و ثمرور اور نظر افروز و جاں پرور رہتا ہے۔ اس کا نقیض یہ ہوا کہ حیا نہ رہے تو گلشنِ شخصیت کے گلہائے جمال و جلال مرجھا جاتے ہیں۔ حیا کے متعدّد رنگ

ہیں اور ہر رنگ دلکش و نظر افروز اور معصوم و پاکیزہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پہ حیا میں شوخی بھی بہ رنگِ معصومیت و حُسنِ طلب ہوتی ہے۔ عشوہ و غمزہ اور ناز و ادا ایک زنِ بےحیاو بیباک کے بھی ہوتے ہیں اور باحیا و عفت مآب کے بھی، لیکن دونوں میں واضح فرق ہوتا ہے۔ پہلے میں رنگِ شیطنت ہوتا ہے اور دوسرے میں رنگِ معصومیت؛ نیز دونوں کی تاثیر بھی جداگانہ نوعیت کی ہوتی ہے، چنانچہ ایک میں تاثیرِ قبح اور دوسرے میں تاثیرِ حُسن ہوتی ہے۔

حاصلِ کلام یہ کہ حیا اصلِ حیات و حُسن ہے اور اس کا مبدء و حاجب تقویٰ ہے، لہٰذا تقویٰ حیا کو اور حیا حجاب کو چاہتی ہے، جس سے اب گفتگو کی جاتی ہے۔

۲۔ حجاب

"حجاب کا مادّہ ح ج ب ہے۔ الحَجْب و الحِجابُ کے معنی ہیں: کسی چیز تک پہنچنے سے روکنا اور درمیان میں حائل ہوجانا" (المفردات، بذیلِ مادّہ)۔ اس لحاظ سے صنفِ جمیلہ کے حجاب کا مطلب یہ ہوا کہ وہ صنفِ جلیلہ کی نظروں کو ایک تو اپنے جسم، اس کے گلہائے شباب، خط و خال، انداز و ادا، اور زیب و زینت تک پہنچنے سے روکے؛ دوسرے انہیں اپنی نظروں سے متصادم ہونے اور دل تک رسائی حاصل کرنے نہ دے؛ نیز اپنے حُسنِ تکلم، حرکات و سکنات اور رقص و سرود سے مردوں کے جنسی جذبات کو تحریک دینے سے احتراز کرے۔ دزدیدہ نگاہی ہو یا غمزہ و ادا، تبسمِ زیرِ لب ہو یا اشکِ تابندہ، آوازِ لطیف ہو یا خرامِ ناز، سب سے جمالیاتی جنسی لمحۂ پیدا ہونے کا امکان ہوتا ہے؛ لہٰذا ان سے مجتنب رہنا، تقاضائے حجاب ہے۔ عورت اگر متقی و باحیا ہو اور حجاب کے یہ تقاضے پورے کرتی ہو تو وہ رواجی پردے میں یعنی نقاب پوش و برقع پوش نہ بھی ہو تو بے حجاب یا بے پردہ نہ ہوگی۔ بتقاضائے احتیاج و ضرورت عورت کا تقویٰ و حیا

کے لباس میں گھر سے باہر نکل کر معروف طریقے سے کاروبار، ملازمت یا کام کاج کرنے، نیز قومی و انسانی فلاح و بہبود کے امور میں حصہ لینے میں کوئی مضائقہ نہیں، بلکہ بعض احوال و ظروف میں ایسا کرنا اسلام کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی میں حصہ لینے کے مترادف ہوگا، بلکہ خود عورت کے جمالیاتی ارتقاء کے لیے سود مند ہوگا۔ بہرحال اگر عورت کو اس شرطِ حجاب کے ساتھ اسلام کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی میں عملاً حصہ لینے اور اس مقصد کے لیے اپنی وہبی۔ اکتسابی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا موقع ملتا ہے تو اسے ضرور اس موقع سے فائدہ اُٹھانا چاہیے اور اس کے لیے اپنے ربِّ کریم کا شکر بجا لانا چاہیے، ورنہ ایسا موقع ضائع کرنا، اس کے حق میں کفرانِ نعمت کے مترادف ہوگا۔

یہ تقویٰ ہے جو عورت میں خود اعتمادی پیدا کرتا اور اسے جلالت مآب بناتا ہے، جس کی حریف شیلنت نہیں ہوسکتی؛ نیز تقویٰ و حیا کا اجتماع قرانُ السّعدین اور عورت کے حسنِ ذات کا حصنِ حصین ہے اور اس کی ایک خوبی یہ ہے کہ مانعِ نظر بھی ہے اور نظر شکن بھی۔ چنانچہ عورت اپنے آپ کو اس حصنِ حصین میں محفوظ کرلے تو وہ حقیقی معنوں میں حجاب یا پردے میں ہوتی ہے۔ بخلاف اس کے اگر عورت میں تقویٰ و حیا نہ ہو تو اس کا حجاب یا پردہ نظر شکن ہوتا ہے نہ مانع نظر، بلکہ دعوتِ نظّارہ و فتنہ ساماں بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عورت کو بھی مرد کی طرح ارادہ و اختیار کی آزادی ودیعت کی ہے اور اس کی اپنی انفرادیت و تشخص ہے، لہٰذا تقویٰ و حیا کے لباس میں محجوب ہو کر اکتسابِ علم و ہنر اور سعی و عمل کرنے، نیز اسلام کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی میں عملاً حصہ لینے کی آزادی اس کا حقِ بشریت ہے، جس سے اسے محروم کرنا، اُسے غلامی کے سلاسل و طوق میں جکڑ رکھنا ہے، جن سے اُسے آزاد کرانا اسلام کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی کے اوّلین مقاصد میں ہے۔ اصل یہ ہے کہ اکتساب و عمل کی آزادی انسان (مرد ہو یا عورت) کا پیدائشی حق، شرفِ انسانیت اور اس کی مابہ الامتیاز خصوصیت ہے، لہٰذا اس سے اُسے محروم کرنا، فطرتِ انسانی ،

مشیتِ الٰہی اور قدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل کے منافی ہے ؛ نیز یہ سلب ونہب ظلم و استحصال اور توہین وتذلیلِ انسانیت ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات ہمیشہ پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ عورت چونکہ صنفِ جمیلہ ہے، لہٰذا اس کی سعی وعمل کی جولانگاہ محفوظ ومصئون ہو اور وہاں ایسا کام ہوتا ہو جو اس کی عزتِ نفس، حیا اور تقدسِ ذات کے منافی اور تقویٰ شکن ہو ؛ نیز ایسے ماحول میں وہ اپنے آپ کی حفاظت کرنے کی اہل ہو۔ یہ ہے حجاب کی حقیقت اور اس کی علتِ غائی۔ لیکن یہ اجمال تفصیل طلب ہے۔

سب سے پہلے اس بصیرت افروز جمالیاتی جنسی نکتے کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے کہ عورت صنفِ جمیلہ ہونے کے باعث اپنے زوجِ جلیل مرد کی معروضِ جنس ومحبت ہے اسے اس سے طبعاً وعقلاً حیا آتی ہے، اور حیا حجاب چاہتی ہے، اس لیے عورت طبعاً حجاب پسند ہے ؛ اور بہتر حجاب لباسِ تقویٰ وحیا ہے۔[۱۴]

اصل یہ ہے کہ حجاب زینتِ حیات اور آبروئے نسوانیت ہے۔ نازو ادا ہو یا عشوہ وغمزہ حیا وحجاب ہی کے تو دلکش وجاذبِ نظر مظاہر ہیں۔ چنانچہ تبسم زیرِ لب ہو یا نگاہِ دزدیدہ، جنبشِ بدن ہو یا اندازِ مستانہ، نمودِ حجابانہ ہو یا مستوری شوق افزا، انکارِ اقرار آمیز ہو یا اقرارِ انکار نما مظاہرِ حجاب وحیا تو ہیں اور سبھی حظ انگیز وشوق افزا اور ذوقِ جمال کی تسکین کے سامان ہیں۔ بخلاف اس کے بے حجابی وبیباکی اور عریانی وبے حیائی میں یہ مظاہرِ نظر افروز ودلآویز کہاں ؟ انسان سمجھے تو یہ واقعیت آئینہ دارِ سترِ حجاب ہے۔ اصل یہ ہے کہ جس عورت کی ذات ان مظاہرِ حجاب وحیا کی جلوہ گاہ نہیں، وہ محرومِ جمال ؛ گوہرِ بے آب اور گلِ بے رنگ وبو ہے۔

یہ درست ہے کہ حسن آرزوئے نمود وپیدائی رکھتا ہے، لیکن حجاب وحیا کے ساتھ۔ وجہ یہ ہے کہ وہ انسان ہے اور انسانیت اپنی مقتضیات رکھتی ہے۔ وہ اپنا تشخص وتقدس اور غیرت وعزتِ نفس رکھتی ہے۔ وہ خود آگاہ ہے، جانتی ہے کہ وہ گوہرِ بے بہا ہے ؛

لہٰذا نمود و شہرت اس کی بہا ہے نہ زر و جواہر۔ اُسے طبعاً گوارا نہیں کہ اہلِ ہوس اس کے جمالِ تقدّس کو مجروح کریں۔ اُسے اپنی عصمت و آبرو اتنی عزیز ہے کہ وہ جان سے کھیل کر بھی اس کے تحفظ کا داعیہ رکھتی ہے۔ چونکہ اپنی جسمانی کمزوری و نزاکت اور طبعی خصائص کے سبب تنہا اپنی حفاظت نہیں کر سکتی، لہٰذا وہ طبعاً و عقلاً جلال کو چاہتی ہے جو اس کا زوج ہے تاکہ وہ اس کی ذات کی حفاظت و کفالت کرے اور وہ بے خوف و خطر اپنے حُسنِ ذات کی نشوونما اور تکمیل کر سکے۔

حجاب اشتیاق انگیز و تجسس آفریں ہے؛ اس بنا پر یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ عورت کی دلکشی و جاذبیت اور قدر و قیمت بہت حد تک حجاب کی مرہونِ منت ہے۔ عورت حجاب میں ہو تو گوہرِ تابدار و رحیقِ مختوم[۱۵] ہوتی ہے، بے حجاب و عریاں ہو جائے تو گوہرِ بے آب اور بادہ بے سرور بن جاتی ہے۔ صنفِ جمیلہ لباسِ حیا و حجاب میں ہو تو صیرفیِ نظر میں جنسِ بے بہا ہے، تقویٰ و حیا کے بغیر بزم و بازار میں آجائے تو جنسِ کاسد و ارزاں بن جاتی ہے۔

شیطان بلاشبہ انسان کا دشمن ہے۔ انسان اپنے ظلم و جہل کے باعث جانتا ہے یہ مانتا نہیں۔ اس دور میں بالخصوص شیطان اپنی جالیاتی فریب کاری و وسوسہ اندازی کے ذریعے عورت کو اس کی ذات سے بیگانہ کرنے میں بہت حد تک کامیاب ہو گیا ہے۔ چنانچہ عورت بھول گئی ہے کہ وہ صنفِ جمیلہ ہے جلیلہ نہیں، لہٰذا اس کا مردوں کی طرح فیشن اور زندگی کرنا غیر فطری فعل ہے اور اس کی آرزوئے حُسن کے منافی بھی ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ وہ گھر سے جلوت میں آکر اپنا وقار و مقام کھو بیٹھی ہے۔

اگر یہ سچ ہے اور یقیناً سچ ہے کہ ہر شے اپنے زوج کو چاہتی ہے تو پھر یہ کہنا بھی سچ ہے کہ حیا جو باطنی حجاب ہے، اپنے زوج کو چاہتی ہے، جو ظاہری حجاب ہے: بدن، گھر اور ماحول کی پردہ داری۔ عورت کی فطرت اس لیے بھی پردہ داری چاہتی ہے کہ وہ جالیاتی جنسی معروض ہے اور جنس حجاب چاہتی ہے۔ حیا سے مزیّن حجاب عورت کا اعتبار و

وقار ہے اور بے حجابی و عریانی رہزنِ حیا اور غارت گرِ وقار و آبروئے نسوانیت ہے۔ چونکہ عورت پیکرِ لطافت و نزاکت اور سراپا معروضِ جنس و محبوبیت ہے اور مرد کے بغیر اہلِ ہوس سے اپنی عزت و آبرو اور عصمت و عفت کی حفاظت نہیں کر سکتی، لہٰذا اُسے ایک ایسے مردِ جلیل کی طلب و جستجو ہوتی ہے جو بیک وقت اس کا حاکم و محکوم، مدّاح و پرستار، محافظ و جانثار اور محبوب و کفیل ہو، اس کے جذبۂ امومیت کی تشفی اور اس کی حیاتیاتی تخلیقات کی پرورش و نگہداشت کرے۔ مناکحت مرد کو اس کے لیے ایسا بناتی ہے، جسے شوہر کہتے ہیں۔ یوں بھی دیکھا جائے تو جس گلبدن کو لمسِ غیر بھی گوارا نہ ہو اور اس کے لیے وہ رہزنِ ایمان و تقویٰ اور غارتگرِ عزتِ نفس ہو، وہ گرگانِ ہوس اور سدا تشنہ کار رہنے والے مردوں سے کیسے اپنا تحفظِ ذات کر سکتی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ وہ ان سے محفوظ و مصئون رہنے کی خاطر اپنے گھر میں اپنے محافظ و کفیل شوہر کی زیرِ سرپرستی رہنے کی طبعاً طلب و جستجو رکھتی ہے۔ عورت کا گھر اس کا حسنُ المآب بھی ہے اور اس کا مقامِ جمال و محبوبیت بھی، جس پر متمکن رہ کر وہ اپنے نورِ حسنِ ذات کا نشو و ارتقاء اور اتمام کر سکتی اور نفسِ مطمئنہ بن سکتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ کوئی سلیم الطبع صنفِ جمیلہ اپنے اس مقامِ حقیقی سے اُترنا پسند نہیں کرتی، بلکہ اس پر متمکن رہ کر اپنی شانِ محبوبیت میں جلوہ گر ہونا اور اپنے مردِ جلیل کا دل مسخر کر کے اس پر حکومت کرنا چاہتی ہے۔ جمالِ زن یکتائی پسند ہے، لہٰذا عورت فقط ایک ہی مردِ جلیل کو اپنا شریکِ حیات اور ہمسفر بنا کر زندگی کرنے اور اپنی ذات کی تکمیل کرنے کی طلب و جستجو رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے کسی اور مرد یا مردوں کی مطیع و محکوم یا کنیز بننا گوارا نہیں ہوتا، اگرچہ احتیاج و مجبوری کی دوسری بات ہے۔ معاشرہ صالح ہو اور اس میں اہلِ احتیاج کی ضروریاتِ زندگی کی کفالت کا معقول انتظام ہو تو عورت کو اپنے مقامِ محبوبیت و حکمرانی سے نیچے اُتر کر گھر سے باہر نکلنے اور غیر محرموں کی چاکری و ناز برداری کرنے کی حاجت نہیں ہو سکتی۔

قدرت کی طرف سے عورت کو جذبۂ امومیت ودیعت ہوتا ہے، جو جنسی جذبے کی طرح شدید ہوتا ہے۔ چونکہ وہ اپنے اس جذبے کی تسکین اپنے گھر میں احسن طریق سے کر سکتی ہے، لہٰذا اُسے اپنے گھر کی آرزو ہوتی ہے، جو فطری و شدید ہوتی ہے اور اس کے لیے وہ ہر ممکن ایثار و قربانی کرنے کا داعیہ رکھتی ہے۔ گھر ہی عورت کی سرگرمیوں کی جولانگاہ اور لذّت و مسرّت کی جنّت ہے۔ بظاہر گھر تنگ و محدود اور عورت کی سرگرمیوں کے لیے ناکافی دکھائی دیتا ہے، لیکن وہ حُسنِ ذوق و شوق اور حُسنِ خُلق کے ذریعے اس کی وسعت و پہنائی اور دلکشی و نظر افروزی میں خاطر خواہ اضافہ کر سکتی ہے۔ علاوہ بریں، اس میں رہ کر وہ نہ صرف اپنی ذات کی، بلکہ اپنے شوہر اور اولاد کی شخصیتوں کی تعمیر و تحسین بھی کر سکتی ہے۔ اس اعتبار سے گھر کی دُنیا اسے خوش و مطمئن رکھنے کے لیے کافی ہے۔ یہ مقولہ جتنا مشہور اُتنا سچا بھی ہے کہ "گھر جنّت ہے"، اور کون صاحبِ عقلِ سلیم اس سے باہر نکلنا پسند کرتا ہے!

یہاں ایک معرکۃ الآراء مسئلے کا مختصر و آسان حل بتا دینا ضروری ہے، اور وہ یہ ہے کہ عورت کو روزگار کی خاطر گھر سے باہر نکلنا چاہیئے یا نہیں؟ احتیاج و ضرورت اگر عورت کو گھر سے نکلنے پر مجبور کرے تو اسے معروف طریقے سے گھر سے نکلنا چاہیے؛ یعنی تقویٰ و حیا کے لباس کے ساتھ نکلنا چاہیے اور اس کا روّیہ معصوم و جلالی ہو تاکہ اس سے اہلِ ہوس کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائیں۔ جمالیاتی، جنسی معروض بن کر باہر نکلنا اور اس جیسا روّیہ اختیار کرنا، عورت کے جمال و تقدّس، طہارت و نظافت اور عفّت و عصمت کے منافی ہے۔ مرد کے تیرِ نظر اگر صنفِ جمیلہ کا دل گھائل یا اس میں خلش پیدا نہ بھی کر سکیں تب بھی اس کے تقدّس و طہارت اور آب و نور کو نقصان ضرور پہنچاتے ہیں۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ صنفِ جمیلہ کے لیے سب سے زیادہ خطرناک و مہلک چیز مرد کا تیرِ نظر ہے، اور نظر اس وقت دل کے لیے تیرِ نیمکش بنتی ہے، جب اس کا

"تصادمِ جنسی" ہوتا ہے؛ مثال کے طور پر جب مرد و زن کی جذبی و نجذابی نظریں متصادم ہوتی ہیں۔ حجاب اس تصادمِ جنسی سے بچنے کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ بہر حال، جنسی نظری تصادم سے دل میں جنسی محبت کا سوتا پھوٹ پڑتا ہے، جس میں عورت کے حسنِ حیا کو خورد و بُرد کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے مرد و زن کے نظری تصادم کو حرام قرار دیا ہے اور اس سے بچنے کی تاکید کی ہے اور اس کا بہترین طریقہ اختیار کرنے کا حکم دیا ہے اور وہ ہے نظروں کو نیچا رکھنا اور ملانے سے گریز کرنا، نیز حجاب میں رہنا۔

بے حجابی عصرِ حاضر کا فیشن بھی ہے اور ضرورت بھی، لہٰذا عورت بے حجابی کا شوق بھی رکھتی ہے اور احتیاج بھی، لیکن یہ شوق غیر فطری اور احتیاج وضعی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ عورت شوقِ "آزادی" میں بے حجاب ہوئی۔ بلاشبہ، اس شوق میں عنصرِ مجبوری بھی شامل تھا۔ وہ مرد کے جبر و اکراہ سے اپنے حقوقِ انسانی سے محروم تھی اور اس کے ظلم و استحصال سے اس قدر تنگ آچکی تھی کہ وہ گھر سے باہر نکلنے اور اپنے حقوق و آزادی کی خاطر مرد کی کفالت سے نکلنے پر مجبور ہوگئی۔ وہ خود کفیل تو ہوگئی، لیکن اس کے لیے اسے ناقابلِ تلافی نقصان اٹھانا پڑا۔ اگر کہا جائے کہ اس وجہ سے عورت "زیاں" میں ہے تو مبالغہ نہیں، اظہارِ حقیقت ہوگا۔

عورت پر اسلام کا احسانِ عظیم ہے کہ اس نے عورت کو اس کے جملہ حقوق دلوائے اور اسے اس کے حقیقی مقام پر متمکن کیا، جہاں وہ اپنی ذات کی تکمیل کر سکتی اور صاحبِ حسن و سرور بن سکتی ہے۔ بلاشبہ یہ اسلام ہے جس نے عورت کو اس کے حقوق و مقامِ حقیقی سے آگاہ کیا اور اسے مرد کی غلامی سے چھڑایا؛ نیز مرد کو اس کے حقوق دینے پر شرعاً و اخلاقاً مجبور کیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اسلام کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی ہسپانیہ کے ذریعے یورپ کے دیگر ممالک میں پہنچی تو عورت میں اپنے حقوقِ انسانی کا شعور بیدار ہوا اور اس نے مردوں سے اپنے حقوق

حاصل کرنے کے لیے متحد ہو کر جد و جہد کرنا شروع کر دی اور بالآخر کامیاب ہو گئی۔ آرزو سچی ہو تو فتح و کامیابی اس کی منتظر رہتی ہے۔ مغرب کی عورت نے آزادی تو حاصل کر لی، لیکن مرد نے اس سے یہ انتقام لیا کہ حریت و مساوات کے نام پر اس کی کفالت سے ہاتھ کھینچ لیا، اور اُسے گھر سے باہر روزی کمانے اور مقامِ محبوبیت سے نیچے اُترنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے نتیجے میں عورت اپنے نورِ ذات کا اِرتقاء و اِتمام کرنے کے قابل نہیں رہی۔ علاوہ بریں، وہ اپنی اولاد اور شوہر کے جمالیاتی اِرتقاء میں "ماں" اور "بیوی" کا کردار احسن طریق سے ادا نہیں کر سکتی۔ اس میں رفتہ رفتہ اپنا کردار ادا کرنے کا جذبہ سرد پڑتا جا رہا ہے۔ خود کفالت کی ذمے داری کے بارِ گراں میں اس کا "نفس" اس طرح دب کے رہ گیا ہے کہ اس کے نشو و ارتقاء کے امکانات کم سے کم ہوتے جا رہے ہیں۔[16] مغرب کی عورت کو اپنے اس "زیاں" کا احساس ہو چلا ہے اور اس میں پھر اپنی "جنتِ گم گشتہ" کی بازیابی کی آرزو بیدار ہو رہی ہے، جسے اسلام ہی پورا کر سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام ہی مغرب کی عورت کو اس کی گم گشتہ جنت واپس دلا سکتا اور حورِ جنت بنا سکتا ہے۔

قرآنِ مجید کی رُو سے اللہ تعالیٰ احسن الخالقین ہے اور اس کی تخلیقی فعلیت جمالیاتی تزدیجی ہے، لہٰذا اس کی ہر تخلیق حسین و زوجین ہے۔ جہاں تک انسان کا تعلق ہے، انسان کا ظاہر اور باطن دونوں حسین ہیں۔ اس اعتبار سے انسان کی ذات احسن و اکمل ہے لیکن یہ اس کے حُسنِ ذات کا نور ہے جو ارتقائی ہے اور اس میں اِرتقاء کے لامحدود امکانات مضمر ہیں۔ ان امکاناتِ ارتقاء کو بتدریج وقوع میں لانا، مرد و زن کا اہم ترین فریضۂ زندگی ہے جس سے عہدہ برآ ہونے پر ہی اس کی "حقیقی کامیابی" کا انحصار ہے۔ قرآنِ حکیم کی رُو سے حقیقی کامیابی کا مطلب حصولِ جنت ہے اور انسان اپنے نورِ حُسن ہی کے ذریعے جنت کو دیکھ کر وہاں پہنچ سکے گا۔ اسی نور کو بصیرت سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ اربابِ نور ہی اہلِ نظر ہوتے ہیں اور وہی حق و باطل، حُسن و قبح، حسنہ و سیئہ، خیر و شر، سود و زیاں، عدل و ظلم اور

معروف و منکر میں امتیاز کرنے والے ہوتے ہیں۔ اسی نور کے ذریعے انسان وحی و تنزیل یا ورود ہدایت کو پہچانتا اور اس کی تصدیق کرتا ہے۔

یہاں اس لطیف نکتے کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے کہ ارتقائے انسانی درحقیقت حسنِ ذاتِ انسانی کے نور کا ارتقاء ہے، جسے کے لیے ہم جمالیاتی ارتقاء کی تعبیر بھی اختیار کرتے ہیں۔ حسن چونکہ نور کا مبدء ہے، اس لیے اپنے ارتقاء کے لیے انسان میں آرزوئے حسن پائی جاتی ہے، اور آرزوئے حسن ہی اس کی ارتقاء کی قوتِ جلیلہ و محرکہ ہے۔ جہاں تک صنفِ جمیلہ کی اپنے ارتقائے نور کی آرزو کا تعین ہے، وہ اس کے لیے فطرۃً اس مردِ جلیل کی مرہونِ منت ہوتی ہے جو اس کا شرعاً یا قانوناً شریکِ حیات ہو۔ وجہ یہ ہے کہ وہی اس کے جسم و جان اور قلب و نفس کی حفاظت کر سکتا ہے۔ اسی لیے نکاح کی ناگزیریا اہمیت ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔

(۴) نکاح

طاہرِ فکر اپنے افکار کی دنیا میں محوِ پرواز تھا کہ ندائے سروش آئی:

زمانہ ایک حال ہے اور حال سیلِ گزراں ہے اور صاحبِ حال وہ ہے جو "حال" میں رہتا ہے۔ حال میں رہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے قلب کی دنیا میں زمانہ آنِ دہر کی صورت اختیار کر لیتا ہے، اور قلب اپنے نور اور آرزوئے حسن کی کیفیت و کمیت کے مطابق آئینۂ آنِ دہر بن جاتا ہے۔ قافلہ حیات زمان و مکان کی لوحِ محفوظ میں گزرتا رہتا ہے اور اس کا عکس آئینۂ قلب کی وسعت کے مطابق اس پر پڑتا رہتا ہے۔ انسان اسے دیکھے، محسوس کرے اور سمجھے تو صاحبِ حال بنتا ہے اور صاحبِ حال ہی صاحبِ نظر و دانائے راز ہوتا ہے۔ چشمِ قلب جتنی منیر ہوتی ہے اتنی ہی دوُر نظر ہوتی ہے۔ چنانچہ نورِ قلب کے ارتقاء و اتمام ہی پر صاحبِ حال کے احوال و مقامات کا وارد مدار ہوتا ہے۔ صاحبِ قال تو ہر زمان و مکان میں بہت ہوتے ہیں، مگر صاحبِ حال خال خال ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ

اہلِ نظر کو ہمیشہ صاحبِ حال کی طلب و جستجو رہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نورِ قلب بہت بڑی شے ہے۔ یہی "دوست" کی راہ و منزل دکھاتا اور اس تک پہنچاتا ہے۔ اس نور کی بدولت ہی اہلِ ذوق و شوق احسان و رضوان کے حُسن المقام پر متمکن ہوتے ہیں، جو "دوست" کے قرب و حضوری، ہم نظری و ہمکلامی اور محبّت و ہم رضائی کا ارتقائی مقامِ حُسن ہے۔ اصل میں اس نور کا ارتقا ہی ارتقائے حیات ہے، اور یہ تزکیہ ہے جو اس نور کو قوّت سے فعل میں لاتا اور اس کا نشوو ارتقاء کرتا ہے۔ یہی تزکیہ کی غایت الغایات ہے؛ اور اس کا مطلب قلب کی تطہیر و تصفیہ اور تحسین و تنویر ہے جس سے وہ منیر بنتا اور اس کے نور میں اِرتقاء کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔

انسان بیک وقت دو دنیاؤں میں رہتا ہے۔ ان میں سے ایک آفاقی اور دوسری نفسی دُنیا ہے۔ یہ دونوں باہم مربوط و لاینفک ہیں اور ایک دوسری پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس بنا پر ان دونوں کے لیے آفاقی نفسی دنیا کی تعبیر اختیار کر سکتے ہیں۔ دُنیا کوئی ہو، انسان کو حُسن کی آرزو رہتی ہے، جسے پورا کرنا، اس کی غایتِ حیات، مقصودِ دین اور مشیّتِ الٰہی ہے۔ ظاہری اور باطنی دُنیا ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں اور دونوں ایک دوسری کے اثرات قبول کرتی ہیں؛ لہٰذا اولوالالباب یا اہلِ عقلِ سلیم وہ انسان ہوتے ہیں جو اپنی دونوں دنیاؤں کو حسین بنانے اور حسین و مطمئن زندگی گزارنے میں لگے رہتے ہیں، نیز نہ اس سے غافل رہتے ہیں اور نہ اپنی سعی و جہد میں کمی ہی کرتے ہیں۔ الغرض ان کی زندگی اس ارشادِ الٰہی کی عملی تفسیر ہوتی ہے۔

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝ (الشرح ۹۴: ۷۔۸) جب ایک کام سے فارغ ہو جاؤ تو دوسرے کام میں جُٹ جاؤ اور اپنے نشوو اِرتقاء دینے والے مالک کی طلب و جستجو میں لگے رہو۔

یہ نکتہ از بس اہم و بصیرت افروز ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تخلیقی فعلیت جمالیاتی۔ تدریجی ہوتی

ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو چیز بھی تخلیق کرتا ہے، ایک تو ائسے حسین اور دوسرے اس کا جوڑا یعنی نر اور مادّہ بناتا ہے۔ یہ حقیقت بھی فکر انگیز ہے کہ اس کی طرف سے پہلے قرآنِ حکیم نے انسان کو آگاہ کیا تھا، اور اس سے سائنس اور ٹیکنالوجی میں جو ترقی ہوئی ہے، اس کی غیر معمولی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بہر حال، اگر احسن الخالقین کی تخلیقی فعلیت کا شاہکار انسانی جوڑا ہے (یعنی صنفِ جلیلہ و صنفِ جمیلہ) تو اس جوڑے کی جمالیاتی۔تخلیقی فعلیت کا شہکار ثقافت ہے۔ ثقافت کا نشو و ارتقاء اور جمال و جلال ان اصنافِ جمیلہ و جلیلہ کے جمالیاتی ذوق کے اختلاف و تنوع اور "حسنِ تعاون" کے مرہونِ منت ہیں۔ علاوہ بریں، حیاتِ انسانی کے موضوعی و معروضی پہلوؤں کی تطہیر و تحسین بھی اسی "حسنِ تعاون" کے طفیل ہوئی ہے اور ہو رہی ہے۔ یہ بات ازبس اہم اور یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حسنِ تعاون سے مراد "تعاون بذریعہ مناکحت" ہے اور یہ مناکحت ہے جو تعاون کو پاکیزہ و حسین بناتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ "تعاون بذریعہ مناکحت" میں ہر مرد و زن کی باہمی رضامندی و خوشنودی کے علاوہ معاشرے اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی و خوشنودی اور اذن بھی شامل ہوتا ہے۔ غور کریں اور سمجھیں تو یہ بڑی ہی خوش آئند، مبارک، اہم اور دُور رس نتائج کی حامل بات ہے۔ اصل یہ ہے کہ "حسنِ تعاون" کے بغیر انسان نہ تو پاکیزہ و حسین اور مطمئن و مسرور زندگی بسر کر سکتا، نہ اپنی آرزوئے حسن و حیات کی تکمیل اور نہ اپنا جمالیاتی ارتقاء ہی کر سکتا ہے۔

نکاح کی اہمیت اس سے بہت زیادہ ہے جو عام طور سے سمجھی جاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ عقد معاشرتی زندگی کے سلسلے کی ایک کڑی ہوتا ہے، جو متاہل زندگی کے ساتھ قومی زندگی کو بھی مربوط و محکم بناتا ہے۔ نکاح خاندان کی اور خاندان قوم کی تشکیل و تحسین اور تحکیم کرتا ہے۔ اس کا نقیض یہ ہوا کہ عقد کے بغیر نہ تو خاندان بن سکتا ہے اور نہ قوم۔ اصل یہ ہے کہ خاندان ہی قوم کے عناصرِ ترکیبی ہوتے ہیں اور حسنِ مناکحت سے خاندان اور قوم میں جمال و جلال، حیات و قومیت اور طمانیت و مسرت کی جمالیاتی اقدار پیدا ہوتی ہیں۔ اشتراکی روس کی تاریخِ عمرانیات

شاہد ہے کہ انقلاب کے بعد اس میں نکاح کا ادارہ قائم نہ رہا اور سلسلۂ مناکحت کے ختم ہونے سے خاندان و قوم کی تشکیل و شیرازہ بندی کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا تو اس کے نتیجے میں قوم کا شیرازہ تیزی سے منتشر ہونے لگا۔ چنانچہ چند ہی برسوں میں معاشرے کی صورتِ حال اس حد تک تشویشناک ہو گئی کہ روس کی لادینی یا اشتراکی حکومت پھر سے نکاح یا شادی بیاہ کا ادارہ قائم کرنے پر مجبور ہو گئی۔ روس کے اس تلخ تجربے کے پیشِ نظر بعد میں اشتراکیت قبول کرنے والے ممالک بھی نکاح کا ادارہ قائم رکھنے پر مجبور ہو گئے چنانچہ اس وقت دنیا میں کوئی ایسا ملک نہیں جس میں نکاح کا ادارہ قائم نہ ہو۔ یہ صورتِ حال اس حقیقت کا زندہ ثبوت ہے کہ نکاح خاندان و قوم کی تشکیل و شیرازہ بندی اور بقا و ترقی، نیز معاشرتی امن و سلامتی کے لیے ناگزیر ہے۔

اصل میں نکاح زوجین کے مابین ایک مقدس معاہدہ ہوتا ہے جو وہ اللہ تعالیٰ یا کم سے کم معاشرے کے سامنے کرتے ہیں اور اس کی غایت حُسنِ تعاون کے ذریعے آرزوئے حسن و حیات کی تکمیل ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ نکاح کے بغیر انسان نہ اس دُنیا میں حُسن و سرُور اور محبّت و حیات حاصل کر سکتا ہے نہ آخرت میں۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ یہ نکاح ہے جس کی بدولت عورت گھر بناتی ہے اور گھر کے بغیر آرام و راحت اور طمانیت و مسرّت ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ علاوہ بریں، نکاح ہی کے طفیل عورت اپنے مرد کا اور مرد اپنی عورت کا لباس بنتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، بیوی اپنے شوہر کے اور شوہر اپنی بیوی کے عیوب کی پردہ پوشی کرتا ہے، اور دونوں ایک دوسرے کے معروضات محبّت و طمانیّت، ان کی زینتِ حیات اور ایک دوسرے کے لیے رحمت بنتے ہیں۔ جمالیاتی لذّت ملتی ہے تو نکاح سے نفس کو قرار ملتا ہے تو گھر میں اور جمالیاتی ذوق و جنسی جذبے کی تسکین ہوتی ہے تو منکوحہ بیوی سے۔ جس طرح یہ سچ ہے کہ نسل کشی بغیر نکاح کے بھی ممکن ہے، اُسی طرح یہ بھی سچ ہے کہ اولاد کی احسن طریق سے پرورش اور تعلیم و تربیت نکاح کے بغیر ممکن نہیں، اس لیے کہ نکاح ہی سے گھر اور ماں باپ میسّر آتا ہے۔

طمانیت و مسرت کا راز زوجین کے حُسنِ تعاون میں پنہاں ہے اور حسنِ تعاون سے مسرت کے متعدد جہانِ نو پیدا ہوتے ہیں، جو وسعت پذیر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر مناکحت سے چھ جہانِ نو معرضِ وجود میں آتے ہیں اور وہ یہ ہیں: (۱) متاہلی (۲) سسرالی (۳) ددھیالی (۴) ننھیالی (۵) نسلی (۶) سمدھیالی۔ ان جہانوں کی اہمیت یہ ہے کہ ان میں محبت و مسرت کے گلزار ہوتے ہیں، جن میں رہنے سے انسان کو سوز و سازِ زندگی ملتا ہے اور اس میں آرزوئے حسن و حیات نشوونما پاتی ہے۔ علاوہ بریں فرد کو اپنی دنیا کی خلوت و تنگنا سے نکل کر ان محبت بھری دنیاؤں میں زندگی کرنے، ان کے افراد کی خوشیوں میں شریک ہونے اور انہیں اپنی خوشیوں میں شریک کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اس طرح فرد کی مسرتوں کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے، نیز اعزہ و اقرباء کی ہمدردی و غمگساری اور اخلاقی و مادّی مدد سے اس کے دکھوں اور خوف و حزن کا درماں بھی ہوتا ہے؛ اور احساسِ تنہائی کی اذیتوں سے اسے تحفظ بھی ملتا ہے۔ جہاں تک شیطان کا تعلّق ہے ان دُنیاؤں میں اُسے زوجین کو ورغلانے کے امکانات بہت حد تک کم ہو جاتے ہیں چنانچہ ان بھری دُنیاؤں میں وہی شخص شیطان کے دامِ تزویر میں پھنستا ہے جو متّقی نہیں رہتا اور بے حیا و بیباک ہو جاتا ہے۔

اگر انسان نکاح نا آشنا معاشرے کو تصوّر میں لائے اور غور کرے تو اُسے اس کی غیر معمولی اہمیت کا یقین محکم ہو جاتا ہے۔ ایسے معاشرے میں انسان ایسا ہوتا ہے جیسے تنہا و بے یار و مددگار ہو اور اس کا خدا نہ ہو۔ جس شخص کا خدا نہ ہو، اس ناکام و نامراد کی حالت کی غمّازی غالبؔ کا یہ شعر کرتا ہے:

گفتنی نیست کہ بر غالبؔ ناکام چہ رفت
اینقدر ہست کہ ایں بندہ خداوند نداشت

غور کرو! جس شخص کا باپ ہو نہ دادا، چچا ہو نہ پھوپھی، نانا ہو نہ ماموں، سسر ہو نہ ساس، سالے ہوں نہ سالیاں، بیوی یا شوہر ہو نہ بچے، الغرض جس شخص کی ددھیال ہو نہ ننھیال،

سسرال ہو نہ اہل و عیال مختصر یہ کہ گھر بار ہو نہ اعزہ و اقارب، نیز اس کا دین و ایمان ہو نہ اِلٰہ و رب، اس سے بڑھ کر اور کون شخص نامراد و ناکام ہو سکتا ہے؟ ایسے ہی شخص کی زندگی طہارت و نظافت، حُسن و نور، طمانیت و مسرت اور کیف و سرور سے محروم ہوتی ہے اور وہ قعرِ مذلت کی اتھاہ گہرائیوں اور یاس کی تاریکیوں میں بھٹکتا پھرتا ہے اور اپنے آتشکدۂ خوف و حزن میں اس طرح زندگی کرتا ہے جیسے مردہ ہو نہ زندہ۔ ایسے شخص کو قرآن حکیم نے اسفل سافلین کہا ہے۔

اگر اللہ تعالیٰ کے رسل و انبیاء علیہم السلام دُنیا میں مناکحت یا شادی بیاہ کا مقدس ادارہ قائم نہ کرتے تو حیاتِ انسانی جالیاتی۔ اخلاقی اقدار سے محروم اور پلید و نجس ہوتی، نیز بنی نوعِ انسان میں خوئے قِردیت پیدا ہو جاتی اور وہ خُو بُو میں بقول قرآنِ حکیم "قِرَدَۃً خٰسِئِیْنَ" یعنی بے حیا و ذلیل بندر بن جاتے اور انہیں نہ مقدس رشتوں کا پاس و احترام ہوتا اور نہ انہیں شرم و حیا ہوتی۔ آدمی جب نکاح کے ذریعے متاہل زندگی میں داخل ہوتا ہے تو اس کا رشتہ اپنی نفسی دُنیا کے علاوہ آفاقی دُنیا سے بھی استوار ہو جاتا ہے۔ اس طرح اس کی نفسی دنیا میں وسعت و آفاقیت پیدا ہو جانے کے امکانات زیادہ ہو جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس رابطے سے انسان کی دُنیا میں محبتِ انسانی کی شمع فروزاں ہو جاتی ہے جس کی تب و تاب سے اس کا نورِ باطنی (یعنی حِسّی، قلبی، نفسی نور) نشو و ارتقاء کرتا ہے، نیز اس کے دل میں نہ صرف عالمِ انسانی بلکہ دیگر عالموں کے لیے بھی رحمت بن جانے کی آرزو نشو و نما پانے لگتی ہے، جو دراصل آرزوئے حُسن و حیات ہوتی ہے۔ اس گفتگو سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ نکاح آرزوئے حُسن و حیات کی تکمیل کے لیے ازبس اہم معاشرتی ضرورت ہے۔

ان تمام مباحث کا ماحصل یہ نکلا کہ انسان کے ارتقاء سے مراد اس کا جمالیاتی ارتقاء ہے اور اس کا مطلب اس کے حُسنِ ذات کے نور کا ارتقاء ہے، جس میں لامتناہیت و سرمدیت کا امکان مضمر ہے، نیز صنفِ جمیلہ کے ارتقاء کے لیے تقویٰ و حیا اور حجاب و نکاح ناگزیر

ہیں۔ لہٰذا ان کے لیے لوازمِ ارتقاء کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔

حواشی

۱۔ حکمت خیرِ کثیر ہے: البقرہ ۲: ۲۶۹۔

۲۔ حیاتیاتی نفسی ارتقاء: اس اصطلاح کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے ارتقاء کی نوعیت اس اعتبار سے جداگانہ اور منفرد ہے کہ وہ جسمانی بھی ہے اور حسی، قلبی، نفسی بھی۔ انسان کے اوّلین جرثومۂ حیات میں قدرت کی طرف سے جوہرِ انسانی ودیعت کیا گیا تھا، جس طرح اب بھی ہر فردِ بشر کے مادۂ منویہ کے جرثوموں میں انسان بننے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں انسان نے ترقی کر کے بشر کی احسن و اکمل صورت اختیار کر لی تو اس کا جسمانی ارتقاء پورا ہو گیا، لیکن اس کے نفس کا سلسلۂ ارتقاء جاری رہا اور ہمیشہ جاری رہے گا، کیونکہ اس کے نورِ حسن ذات میں ارتقاء کے لامتناہی امکانات مضمر ہیں اور اس کی علتِ غائی کُلَّ یَوۡمٍ هُوَ فِیۡ شَاۡنٍ ۚ (الرحمٰن ۵۵: ۲۹) ہے۔ ڈارون اور اس کے ہمنوا علمائے حیاتیات کا یہ نظریہ بے بنیاد ہے کہ انسان بھی اسی جرثومۂ حیات سے تدریجی ترقی کر کے بشر بنا ہے جس سے دیگر حیوانات نکلے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بشر کی اصل خالصتاً انسانی تھی۔ اس کی ایک دلیل یہ ہے کہ انسان میں جو حسی۔ قلبی۔ نفسی نظام ہے، وہ اس کے سوا کسی اور نوعِ حیوانی میں نہیں۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ انسان کے اس باطنی نظام کے ارتقاء کا سلسلہ جاری ہے اور اس کی لامتناہیت پر سائنس ٹیکنالوجی کی ترقیِ مسلسل برہانِ قاطع کی حیثیت رکھتی ہے۔

۳۔ دیکھیے الرحمٰن ۵۵: ۲۹۔

۴۔ موزونی تقدیر: اس سے مفصل بحث کے لیے دیکھیے مصنف کی کتاب فلسفۂ حسن،

مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور، ۱۹۸۴ء۔

۵۔ دیکھیے البقرہ ۲: ۲۔

۶۔ حیا: دیکھیے راغب اصفہانیؒ: المفردات، بذیلِ مادہ ح ی ی۔

۷۔ جنسی قردیت: بندر کی ایک نوع جو اس قدر بے حیا اور جنسی اشتہار رکھتی ہے کہ ہر وقت اور کھلے بندوں، جنسی فعلیت میں مشغول رہتی ہے، لیکن سیر نہیں ہوتی۔ اس کی اس جنسی خصلت کے لیے "جنسی قردیت" کی تعبیر اختیار کی ہے۔

۸۔ اسفل سافلین: دیکھیے التین ۹۵: ۵۔

۹۔ جمالیاتی اقدار: انگریزی میں Aesthetic values۔ اس سے مفصل بحث کے لیے مصنف کی مندرجہ ذیل کتب (۱) جمالیات، قرآنِ حکیم کی روشنی میں، طبع اول مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور ۱۹۵۸ء؛ طبع دوم نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد ۱۹۷۶ء ص ۱۰۸ بعد؛ فلسفۂ حسن، مجلسِ ترقی ادب، لاہور، ۱۹۸۴، ص ۳۹۵ بعد۔

۱۰۔ علم قلیل: دیکھیے الاسراء ۱۷: ۸۵۔

۱۱۔ قردیتِ خسیئہ: یہ اصطلاح ماخوذ ہے آیتِ قرآنی سے: دیکھیے البقرۃ ۲: ۶۵؛ والاعراف ۷: ۱۶۶؛ نیز دیکھیے حاشیہ نمبر ۷۔

۱۲۔ دیکھیے المشکوٰۃ، کتاب الآداب، بابُ الرِّفقِ وَالحَیَاءِ وَحُسنُ الخُلق جلد دوم، کراچی۔

۱۳۔ جمالیاتی ر جنسی لمحہ: Aesthetic—psychological moment اس سے مفصل بحث کے لیے مصنف کی کتاب فلسفۂ حسن، لاہور ۱۹۸۴ء، ص ۴۴، ۸۶ بعد۔

۱۴۔ لباسِ تقویٰ: الاعراف ۷: ۲۶۔

۱۵۔ رحیقِ مختوم: اصطلاحِ قرآنی ہے۔ دیکھیے المطففین ۸۳: ۲۵۔

۱۶۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (الشمس ۹۱: ۹-۱۰)۔

۱۷۔ دیکھیے البقرہ ۲: ۶۵۔

مقام ۱۲

حیات و چشمۂ حیوان

دل نے پوچھا: زندگی کیا ہے؟ آواز آئی:

زندگی سرّ الاسرار ہے۔ اس کا افشا نہ زندگی کا مقدّر ہے اور نہ اس کا ادراک عقلِ انسانی کے مقدور میں ہے۔ تمہارے لیے یہ جاننا ہی کافی ہے کہ زندگی "دوست" کے حسنِ آوازِ "کُن" کی صدائے بازگشت، یعنی "فیکون" کا نغمۂ سرمدی ہے۔ یہ حسنِ متحرک بھی ہے اور سیرِ سرمدی بھی؛ حسنِ صورت بھی ہے اور صورتِ حسن بھی۔ یکتا و بمثل الحُسن کے کلمۂ کُن کا اثر ہے کہ زندگی میں جذبۂ پیدائی و یکتائی بھی ہے اور صورت پذیری کی آرزو و صلاحیت بھی، سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں حسنِ "دوست" کی آرزو بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سدا اس کے حسنِ آواز و دید کی طلب و جستجو میں سیر و سفر میں رہتی ہے اور صورت بدل بدل کر اسے ڈھونڈتی رہتی ہے۔ ہر صورت شے ہے اور ہر شے صورتِ زندگی اور اس کی آرزوئے حسن کی مظہر ہے۔ زندگی کی طلب و جستجو کا حاصل دید و شنید ناتمام ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ جو اس کا معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود ہے، ہر آن ایک نئی شان میں اپنا جلوہ پیدا کرتا رہتا ہے۔ یہ شیوۂ اُلوہیت ہے، جو بدلا نہیں کرتا؛ اسی لیے زندگی خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتی ہے۔

تم جو انسان ہو، زندگی کی ایک صورت ہی تو ہو۔ تمہاری امتیازی خوبی یہ ہے کہ تم اس کی ایک اکمل و احسن صورت ہو، ظاہری و باطنی ہر لحاظ سے، اور "دوست" کی تین منفرد و عظیم نعمتوں کے امین ہو، اور وہ یہ ہیں: عقل، آزادی اور اختیار۔ کُل مخلوقات میں سے صرف تمہیں ہی اس امانت کی آرزو تھی، لہٰذا تمہیں مل گئی اور اس کے صلے میں تم نے قانونِ مکافاتِ عمل کا مکلف و سزاوار ہونا قبول کر لیا اور کرۂ ارضی میں، جو تمہاری سعی و جہد کی جولانگاہ بننا تھا، زندگی کرنے پر رضامند ہو گئے۔ امانت کا یہ بارِ گراں تم نے اُٹھایا تو "دوست" کو ترس آیا۔ کاش! تمہیں اس حقیقت کا ایقان و اذعان ہوتا کہ "دوست" سبحان و صمد ہونے کے باوصف تم سے اتنا پیار کرتا ہے کہ تم تصوّر نہیں کر سکتے۔ "اُس" کی رحمتِ بے پایاں کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟ "وہ" جانتا تھا کہ تم سے یہ بارِ گراں اُٹھایا نہ جائے گا۔ اُس نے تمہاری نصرت و رہنمائی کے لیے وحی و تنزیل اور بعثتِ انبیاء و رسل علیہم السلام کا سلسلہ شروع کر دیا۔ غایت یہ تھی کہ تمہیں یہ بارِ گراں اُٹھانے کے قابل بنایا جائے۔ جب تم اس قابل بن گئے تو اس سلسلے نے منقطع ہونا تھا، سو ہو گیا۔ سمجھو تو اس میں علم و حکمت کے رموزِ بصیرت افروز ہیں جو نہیں سمجھتا وہ شاخِ بریدہ گل کی طرح اپنی اصل سے کٹ جاتا ہے۔

پوچھتے ہو زندگی کیا ہے؟ زندہ بنو اور لذتِ زندگی سے آشنا ہو جاؤ۔ مردہ شخص لذتِ زندگی سے کیسے آشنا ہو سکتا ہے؟ زندہ وہ ہوتا ہے جو اپنے اِلٰہ و ربّ کا بندہ و دوست اور صاحبِ حسن و سرور ہوتا ہے۔ زندگی، حسن اور سرور ایک ہی سلسلۂ حقیقت کی تین مربوط و لاینفک کڑیاں ہیں۔ دیکھو! جنّت حسن المآب ہے تو اس میں زندگی اور لذّت و سرور ہے۔ بخلاف اس کے دوزخ جو شر المآب ہے، اس میں حسن نہیں تو زندگی بھی نہیں اور لذّت و سرور بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں پر اہلِ نار حسن سے محروم اور موت و حیات کی لذّت سے نا آشنا ہوگا۔ "دوست" کی زبان میں لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَلَا یَحْیٰی ○ (الاعلیٰ ۸۷ : ۱۳) [اس (نارِ کبریٰ) میں وہ (اہلِ نار) مرے گا نہ زندگی کرے گا]۔

اہلِ حسنِ نظر کے لیے اس آیۂ جمیلہ میں فلسفۂ حیات اپنی نمود رکھتا ہے۔ کاش! تم جانتے کہ قرآنِ مجید زندہ خدا کا زندہ کلام ہے۔ یہ چشمۂ آبِ حیات ہے اور زندگی بخشتا ہے۔ لیکن انہیں جو اس کی سچی آرزو رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آرزوئے صادقہ کے بغیر بات نہیں بنتی۔ وجہ یہ ہے کہ آرزوئے صادقہ کا اظہار ربِّ مستجیب الدعوات کے حضور عبادت ہے دعائے جمیلہ ہے، جو قدرت کے قانونِ احترامِ آرزو کی رُو سے اجابت کی سزاوار ہے۔

اگر تم نے زندگی کو سمجھنا، محسوس کرنا اور اس کی لذت سے محظوظ ہونا ہے تو اپنے اندر حسن و زندگی کی آرزو کو زندہ و فعّال کرو اور محسن و زندہ بنو۔ زندہ انسان صاحبِ نظر ہوتا ہے۔ صاحبِ نظر بنو اور محبت و یقین کی نظر سے دیکھو کہ تمہارے اِلٰہِ جمیل و ربِّ کریم نے تمہارے گلستانِ زندگی کو سرسبز و شاداب اور ثمرور رکھنے کے لیے تمہیں چشمۂ حیواں دیا ہے، جو قرآنِ حکیم ہے۔ اس سے وہی زندگی حاصل کرتے ہیں، جنہیں اس کی سچی طلب و جستجو ہوتی ہے، جس کے لیے قرآنِ حکیم نے تقوٰی کی تعبیر اختیار کی ہے۔ تمہیں حسن و زندگی کی آرزو ہوتی تو اس چشمۂ طیّب سے آبِ حیات حاصل کرتے اور زندہ و حسین ہو جاتے۔ تم لذّتِ زندگی سے آشنا ہوتے تو جانتے کہ زندگی کیا شے ہے؟ کاش! تمہیں یقین ہوتا کہ زندگی نعمتِ بے بہا و سرمدی ہے اور انہیں ملتی ہے جنہیں اس کی سچی آرزو و جستجو ہوتی ہے۔

ایک رازِ زندگی جو متاعِ جان و دل سے عزیز تر ہے، تم سے کہنا چاہتا ہوں۔ دلِ آرزو مند سے سنو! زندگی کو حسن سے، جو اس کا جوہر ہے، محروم کر دیا جائے تو اس میں کچھ بھی نہیں رہتا۔ اس میں جمال و جلال، نور و نزہت، شادابی و نظافت، رنگ و بو، لذّت و حیرت اور طمانیت و مسرّت، کچھ بھی تو نہیں رہتا۔ باقی اگر کچھ رہ جاتا ہے تو احساسِ درد و الم رہ جاتا ہے، جو آتشِ خوف و حزن بن کر خرمنِ زندگی کو جلاتا رہتا ہے۔ یاد رکھو! یہ "ذکرِ دوست" ہے جو اس آگ کو ٹھنڈا کرتا ہے۔ علاوہ ازیں، خوف و حزن میں شرک مضمر ہوتا ہے جو ظلمِ عظیم اور بلحاظ تاثیر جاودانی ہے۔ زندہ و موحّد اور صاحبِ حسن و سرور بن کر

زندگی کرنا چاہتے ہو تو اپنے اندر آرزوئے حسن وحیات کو زندہ وفعال کرو اور اس کا طریقہ "ذکرِ دوست" ہے۔

انسان کا حسی، قلبی، نفسی نظام، جو ذاتِ انسانی سے عبارت ہے، اس کی مزرعِ حیات ہے۔ اس میں کشتِ ارضی کی طرح نشوونما پانے اور برگ وبار لانے کی استعداد بالقوہ ودیعت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر جس طرح بارش مردہ زمین کو زندہ کرتی اور اس کی تطہیر کر کے اسے برگ وبار لانے کے قابل بناتی ہے، اسی طرح ذکرِ الٰہی، جو حقیقت میں بارانِ رحمت ہے، مردہ مزرعِ حیات کا اِحیا و تزکیہ کرتا اور اسے برگ وبار لانے کے قابل بناتا ہے۔ اس بارانِ رحمت میں اہلِ آرزو کے لیے تاثیرِ حسنِ "دوست" بھی ہوتی ہے، جو آتشِ خوف وحزن کو ٹھنڈا اور قلب وجاں کو نورِ حسن وسرور سے منور کرتی ہے۔

قرآنِ حکیم نے تاریخی عمل اور مشاہدۂ انفس وآفاق کے حوالے سے انسان کو اس حقیقت سے آگاہ کیا ہے کہ اس کی زندگی مستوجبِ زیانِ مسلسل ہے اور اسے مستقل خسارے سے محفوظ رکھنے کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے "ذکرِ الٰہی" جس کی چار بڑی صورتیں ہیں: ایمان، عملِ صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر[1]۔ اصل یہ ہے کہ ذکرِ الٰہی کا معیار ہی اس کی یہ چار صورتیں ہیں، جن کے بغیر وہ معتبر نہیں، کیونکہ یہ اس کا اعتبار ہیں۔ چونکہ قرآنِ مجید "دوست" کا آخری ومحفوظ، اکمل واحسن اور زندہ وناطق کلام ہے، اس لیے اس نے اسے "الذکر" سے تعبیر کیا ہے[2]۔ یہ بلاشبہ دوست کی یاد دلاتا ہے لیکن اس کے حوالے سے خود انسان کو اس کی یاد دلاتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ انسان کو مخاطب کر کے اس حقیقت سے اس طرح آگاہ کرتا ہے: لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (الانبیآء ۲۱: ۱۰): ہم نے تمہارے لیے کتاب نازل کی ہے جس میں تمہارا ذکر ہے، کیا تم (یہ بھی) نہیں سمجھتے؟

اس بنا پر قرآنِ مجید کو اللہ تعالیٰ کی "کتاب الانسان" کہتا ہوں۔ بہرکیف، ربِّ علیم وحکیم

نے اس آیۂ جلیلہ میں فلسفۂ حیاتِ انسانی کا ایک دفتر سمو دیا ہے جس کا ملخص برنگِ ایجاز و اختصار یہ ہے: انسان خود فراموش ہو جائے تو خدا فراموش ہو جاتا ہے۔ اس طرح خود آگاہ رہتا ہے نہ خدا آگاہ۔ چنانچہ اس کا نتیجہ چار بڑی صورتوں میں نکلتا ہے: ایک یہ کہ وہ اپنے نورِ قلب سے محروم ہو جاتا ہے اور حقیقت میں اندھا ہو جاتا ہے: بے عقل و حق کور اور کور ذوق و حسن کور۔ دوسرے، اس کی معیشت تنگ ہو جاتی ہے؛ یعنی اس پہ عرصۂ حیات تنگ ہو جاتا ہے، اور زندگی اجیرن بن جاتی ہے۔ تیسرے، آتشِ خوف و حزن اس کے قلب و جاں کو محیط ہو جاتی ہے اور وہ لذّتِ زندگی، سرورِ حسن، طمانیتِ قلب و جان، نیز دنیوی و اُخروی حسنہ سے محروم ہو جاتا ہے۔ چوتھے، وہ اپنے آپ اور اپنے اِلٰہ یا معروضِ حسن و پرستش سے دور و مہجور ہو جاتا ہے، اس کے نتیجے میں اس کے اندر محبتِ کُلّی کا چشمہ خشک ہو جاتا ہے، اس میں حسن و حیات کے بجائے مرگ و سیّئہ کی آرزو نشو و نما پانے لگتی ہے اور وہ احساسِ تنہائی کے کرب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اہلِ آرزو جانتے ہیں کہ قرآنِ مجید حیاتِ انسانی کی حسین و منیر تفسیر ہے، اور جتنی سچی ہے اتنی جامع و مانع بھی ہے۔ اس میں روحِ الٰہی ہے جو ان پہ اپنا جلوہ پیدا کرتی اور ان سے ہمکلام ہوتی ہے۔ لیکن یہ کتنی عبرتناک حقیقت ہے کہ اوّل تو لوگ اس کا مطالعہ ہی نہیں کرتے، اور جو کرتے بھی ہیں وہ اس پہ نورِ قلب سے تفکّر بالحق نہیں کرتے۔ کیا یہ ظُلم و جہل نہیں کہ جو لوگ اُسے پڑھتے ہیں انہیں پتا ہی نہیں ہوتا کہ وہ کیا اور کیوں پڑھ رہے ہیں، نیز قرآنِ مجید کیا چیز ہے اور کیوں نازل ہوا ہے؟ یعنی اس کے نزول کی غرض و غایت کیا ہے؟ "مسلمان" ہوں یا غیر مسلم، اوّل تو وہ جانتے نہیں اور جو جانتے ہیں وہ مانتے نہیں کہ قرآن مجید علم و حکمت کے نور و توانائی، دُنیوی و اُخروی حسنہ کا خزینۂ لازوال، نیز شفائے قلب و تزکیۂ نفس کا نسخۂ مجرب و بے مثال ہے۔ اگر وہ مانتے ہوتے تو اس سے مستفید ہوتے اور یوں تہی دست و محروم، داخلی و خارجی معاشرتی سرطانوں کے محکوم و غلام

اغیار کے محتاج و دست نگر اور ذلّت و مسکنت میں مستغرق نہ ہوتے۔ منہ سے تو کہتے ہیں کہ وہ آفتابِ رشد و ہدایت ہے، لیکن اس سے اکتسابِ نور کرتے ہی نہیں؛ اندھے جو ہوئے؟ اور اندھوں کو آفتاب کی روشنی کی ضرورت و حاجت ہوتی ہے نہ طلب و جستجو۔ اصل یہ ہے کہ نورِ قلب ہو تو نورِ قرآن کی حاجت اور طلب و جستجو ہوتی ہے، ورنہ نہیں۔ قرآنِ مجید چشمۂ آبِ حیات ہے، جس میں زندگی اور شفا ہے، لیکن ان کے لیے جنہیں حیات و صحتِ قلب کی آرزو ہوتی ہے۔

قرآنِ مجید کی مثال ایسے زندہ و حقیقی سیر بین کی سی ہے، جس میں حیاتِ انسانی اپنے ماضی، حال اور مستقبل کے ساتھ "آنِ دھر" کی صورت موجود ہے، لیکن مشہود ان پر ہوتی ہے جو اہلِ نظر آرزوئے حسن و حیات رکھتے ہیں۔ "آنِ دھر" کی مثال درخت کے بیج کی سی ہے، جس میں درخت بالقوہ موجود ہوتا ہے اور خورد بین کے ذریعے اہلِ علم و نظر پہ مشہود ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآنِ مجید میں "آنِ دھر" کو دیکھنے کے لیے بھی اہلِ آرزو کو موضوعی۔ معروضی نور کی حاجت ہوتی ہے۔ نور جس شے میں بھی موجود و مشہود ہو، اصلاً ایک ہی ہوتا ہے اور اس کی اصل حسن ہے۔ بہر حال، موضوعی۔ معروضی نور کا مطلب ہے: حسیّ قلبی نفسی نظام کے نور اور حسنِ کلامِ الٰہی کے نور کا حسنِ تعامل، جس کے نتیجے میں قرآنِ مجید اپنے شاہدِ آرزو مند پہ مشہود ہوتا ہے۔ قرآنِ مجید کے مشہود ہونے کا مطلب یہ بھی ہے کہ اس میں مستور "آنِ دھر" اپنے شاہدِ آرزو مند پہ مشہود ہو جائے۔

ہر چیز کے شہود کا ایک وقت ہوتا ہے۔ اگر استراحت و خواب کا وقت رات ہے تو سعی و عمل کا وقت دن ہے۔ جشن و طرب کا موسم اگر بہار ہے تو درد و سوز کا سماں خزاں ہے۔ جانتے ہو بے موسم کا پھل، بے وقت کی راگنی اور بے موقع بات کیوں مزہ نہیں دیتی؟ اپنے بے وقت شہود کی وجہ سے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر چیز کے شہود کا وقت ہوتا ہے، جسے "موزونیِ شہود" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ غنائیت و شعریت ہو یا بلاغت و تصویریت

"موزونیِ شہود" کی مرہونِ منت ہوتی ہیں۔ ربِّ ذوالجلال والاکرام کا ارشاد ہے: اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْهُوْدًا ۝ (الاسراء ۱۷: ۷۸) : بلاشبہ قرآنِ فجر مشہود ہوتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآنِ مجید کی موزونیِ شہود کا وقت سحر ہے۔ سحر نورِ جمال ہے تو قرآن نورِ جلال ہے، اس لیے روحِ قرآن اس وقت اپنی نمود چاہتی ہے۔ وہ تو اپنا جلوہ پیدا کرتی رہتی ہے، لیکن انسان اہلِ طلب و نظر ہو تو سہی۔ لذتِ خوابِ سحر کا ایثار کرو تو جاویداتی ثروت حاصل کرو، جس کا خزینہ لامتناہی قرآن ہے، جو نعمتِ غیر مترقبہ اور سرچشمۂ حیوان و شفا ہے۔ زندگی ملتی ہے تو اس سے، تسکینِ دل و طمانیتِ نفس ملتی ہے تو اس سے، آتشِ خوف حزن بجھتی ہے تو اس آبِ چشمۂ حیواں سے۔ مختصر یہ کہ آرزو و جستجو ہو تو جو چاہو اس سے ملتا ہے۔

یہ تو تھا جملہ معترضہ۔ بات موزونیِ شہود کی ہو رہی تھی۔ مثال کے طور پر جس طرح بچہ بطنِ مادر کی ظلمتوں سے حسنِ فطرت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے، اُسی طرح سحر بطنِ شب کے اندھیروں سے جمال و نظافت لے کر اپنی نمود دکھاتی اور نفوس کو بیدار کرتی ہے۔ قلب نیند یا مجازی موت کے بعد اس حالت میں زندہ و بیدار ہوتا ہے جو حالت بطنِ مادر سے نکل کر بچے کی ہوتی ہے۔ اس وقت اس کا قلب حسین ہوتا ہے اور اس میں قبولیتِ حق و حسن کی استعداد بدرجۂ اتم ہوتی ہے، نیز اس کا نفس نشوو ارتقا کا طلبگار ہوتا ہے۔ سحر اگر تحسین و احیائے قلوب کا وقت ہے تو وہی قلب میں آرزوئے حسن و حیات کے زندہ و بیدار ہونے کا وقت ہوتا ہے، لہٰذا قرآن، جو زندہ خدا کا زندہ کلام اور رحمت و حیات و حسنہ کا خزینہ، نیز اہلِ آرزو کا طلبگار ہے، اس وقت اپنے خزینے وا کیے ان کا منتظر ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سحر ہی قرآنِ مجید کے میخانۂ حسن و حیات کے کھلنے اور رندانِ باصفا و وفاکیش کے "رحیقِ مختوم" پینے کا وقت ہے۔

زندگی کی حقیقت جاننے کی آرزو ہے تو لذتِ خوابِ سحر کو ترک کر کے اور "رحیقِ مختوم"

کی لذّت سے آشنا ہو کہ دیکھو۔ پھر تم پہ زندگی کی حقیقت کُھلے گی اور جان لوگے کہ زندگی کیا ہوتی ہے اور زندہ انسان (فرد ہو یا قوم) کسے کہتے ہیں؟ بہت کم یہ حقیقت عملاً تسلیم کرتے ہیں کہ قرآنِ مجید انسان اور اس کے اِلٰہ و ربّ کے درمیان ایسا قابلِ اعتماد وسیلہ یا حبل اللہ ہے، جو اسے مضبوطی سے پکڑ لیتا ہے، وہ اپنے مطلوب و مقصود کو پالیتا اور اپنے معروضِ حسن و عشق تک پہنچ جاتا ہے۔ جانتے ہو "حبل اللہ" کو مضبوطی سے پکڑنے کا مطلب کیا ہے؟ اس کا مطلب ہے قرآنِ مجید سے اپنی فکر و نظر اور سعی و عمل کا رشتہ اس طرح استوار کر لینا کہ پھر ٹوٹنے نہ پائے، نیز اُسے اپنا معلّم و مربّی، ہادی و مزکّی اور حکم و حاکم بنا لینا اور جو وہ کہے اسے ماننا اور اس پہ عمل کرنا، اس کے بتائے ہوئے راستے پہ چلتے رہنا، نیز کسی حال میں بھی اس کے احکام و ہدایات سے منہ نہ موڑنا۔ "حبل اللہ" سے متعلق ایک راز کی بات سنو! ربِّ جلیل و عزیز کی یہ رسّی اس قدر مضبوط و ناقابلِ شکست ہے کہ زمانے کی کوئی حریف و شیطانی قوّت اسے توڑ نہیں سکتی؛ نہ تو ٹوٹنا اس کے مقدّر میں ہے اور نہ اسے توڑنا کسی کے مقدور میں ہے۔ البتہ شیاطین اسے تمہارے ہاتھ سے چھڑا سکتے ہیں، وہ بھی اس صورت میں کہ تم نے اسے مضبوطی سے تھاما نہ ہو یا کسی وجہ سے تمہاری گرفت کمزور یا ڈھیلی پڑ جائے۔ اصل یہ ہے کہ انسان خود "حبل اللہ" کو چھوڑنا نہ چاہے تو وہ چھوٹ سکتی ہے نہ کوئی شیطانی قوّت اسے چھڑا ہی سکتی ہے۔ حرفِ آخر یہ ہے کہ آرزوئے حسن و زندگی زندہ و فعّال ہو تو قرآنِ مجید سے رشتہ استوار رہتا ہے اور آرزو نحیف و مردہ ہو جائے تو رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ نہ تو زندہ و مُردہ کا اور نہ نور و ظلمت کا رشتہ کبھی قائم رہا ہے، نہ قائم رہ ہی سکتا ہے۔ جانتے ہو کہ اجتماعِ ضدین محال ہے۔

کاش تم جانتے کہ اس سفرِ زندگی میں قرآن تمہارا رفیقِ سفر، دلیلِ راہ اور حُدی خواں بھی ہے تاکہ تم اپنے آپ کو تنہا محسوس نہ کرو، راہِ راست سے بھٹک نہ جاؤ یا سُست رَو نہ جاؤ۔ علاوہ ازیں، سفرِ زندگی میں وہ تمہارے ہمسفر و نگہبان معروضِ حُسن و عشق کا راہوارِ حُسن

بھی ہے، جس کے عمل میں وہ مستور ہوتا ہے، لیکن اہلِ آرزو پہ اپنا جلوہ بھی پیدا کرتا ہے، خصوصاً موزونیٔ شہود کے وقت۔

اب یہ تمہیں ایک ایسی بات بتانا چاہتا ہوں جسے جانتے ہو پر مانتے نہیں، اگرچہ وہ جالیاتی ثروت یا دنیوی و اُخروی حسنہ کے خزینے کی کلید بھی ہے۔ سنو اور گوشِ حق نیوش سے سنو! اسے حرزِ جاں بنانے اور اس پہ عمل کرنے کے لیے سنو! بلاشبہ قرآنِ مجید نور و ہدایت، شفا و حیات اور حسنہ و خیر کا سرچشمہ ہے، لیکن اس سے وہی لوگ مستفیض ہو سکتے ہیں، جو اس کے پاس آئیں تو نورِ قلب اور آرزوئے حسن و حیات کے ساتھ آئیں۔ وجہ یہ ہے کہ قرآنِ مجید کے گوہر ہائے معانی کو نورِ قلب ہی کے ذریعے دیکھا اور نکالا جا سکتا ہے؛ اور یہ نور اس قلب میں پیدا ہوتا ہے جو حسین و منیر اور زندہ و مُطہر ہو۔ یہ اجمال تفصیل طلب ہے۔ (ا) قلب کے حسین ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ جمیل و جلیل ہو۔ چونکہ ہر بچہ حُسنِ قلب کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے قرآنِ مجید نے اسے "قلبِ سلیم" سے تعبیر کیا ہے۔[۵۴] (ب) قلبِ منیر کا مطلب یہ ہے کہ ایک تو وہ ظلمتوں سے مبرّا ہو اور دوسرے اس کا نور فعّال و حرکی اور ارتقائی ہو۔ (ج) قلبِ زندہ وہ ہوتا ہے جو سعید و مطمئن، تندرست و توانا اور فعّال و حرکی ہو؛ اس کا ضمیر زندہ و بیدار ہو، دردمند و محبّت آشنا ہو اور آرزوئے حسن و حیات رکھتا ہو؛ نیز اس کی عقلِ سلیم تفکّر و تدبّر کرتی اور کرنا جانتی ہو۔ الغرض، وہ اپنے وظائفِ فطری احسن طریق سے سرانجام دینے کے قابل ہو۔ (د) قلبِ مُطہر وہ ہوتا ہے جو قبائح و امراض، مثلاً فکری و نظری اور دینی و مذہبی تعصّبات، جماعتی و قومی اور لسانی و جغرافیائی عصبیّات، تیرہ بصری و قساوت، کجی و زنگ آلودگی اور ظلمت و بیماریٔ لادوا سے مبرّا اور پاک و صاف ہو۔ اصطلاحِ قرآنی میں اس پہ طبع و ختم نہ لگی ہو۔

کیا یہ حقیقت نہیں کہ دُنیا بھر میں مسلمان مُردہ اور ذلّت و مسکنت میں مدفون ہیں؟ اگر یہ حقیقت ہے اور یقیناً ہے تو پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کی علّتِ تامہ قرآن سے

مہجوری ہے، جس کی چھ بڑی اقسام ہیں : اوّل، قرآنِ مجید اور حیاتِ مسلم کا رابطہ برائے نام تو ہے، لیکن حقیقت میں ٹوٹ چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی مسلم مملکت میں قرآنِ حکیم کا آئین نافذ نہ اس کی حاکمیت ہے اور اس کے نتیجے میں کسی بھی مسلم قوم کا معاشی و تعلیمی نظام اور ثقافت اپنے وسیع ترین مفہوم میں قرآنی یا اسلامی نہیں۔

دوم، قرآنِ مجید اور مسلمانوں کے درمیان نظری و فکری اور مذہبی و جماعتی تعصبات کے ایسے نظر فریب پردے حائل ہو گئے ہیں، جن سے قرآنِ مجید میں وہی کچھ نظر آتا ہے جو کچھ آدمی دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ پردے قرآنِ مجید کی معنویت کو قلب پر مشہود نہیں ہونے دیتے، اس طرح دونوں کے درمیان بُعد و مغائرت پیدا کرتے ہیں۔

سوم، مسلمانوں کی اکثریت قرآنِ مجید سے بیگانہ و دوُر ہے اور اسے اس طرح چھوڑ رکھا ہے، جیسے (خاکم بدہن) جنسِ کاسد اور کام کی چیز نہ ہو۔ اکثر مسلمان اسے سمجھنا تو درکنار، ناظرہ پڑھنا بھی نہیں جانتے اور یہ بھی نہیں جانتے کہ اس میں لکھا کیا ہے اور اس کی غرض و غایت کیا ہے؟

چہارم، مسلم اقوام میں ایسے افراد بھی ہیں جو بس ناظرہ قرآن پڑھتے یا پڑھ سکتے ہیں، لیکن اس کے معانی و مطالب سے نابلد ہیں۔ وہ اس چشمۂ حیواں سے مستفید ہوتے نہ کسبِ فیض کی آرزو ہی رکھتے ہیں۔

پنجم، ایک قلیل تعداد بیشک ایسے لوگوں کی ہے جو اپنے آپ کو علمائے دین اور دانشور سمجھتے ہیں اور انہیں قرآن دانی کا زعم بھی ہے، لیکن وہ اسے نورِ قلب اور نورِ قرآن کے ذریعے نہیں پڑھتے، بلکہ اپنے اپنے فرقہ وارانہ معتقدات و نظریات اور ذاتی خواہشات کی عینک لگا کر اس کا مطالعہ کرتے ہیں، نتیجۃً وہی کچھ دیکھتے اور سمجھتے ہیں، جس کے وہ آرزو مند اور پہلے سے قائل و معتقد ہوتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ انہیں نہ قرآنِ مجید کے مشاہدے کی سچّی آرزو ہوتی ہے اور نہ وہ ان پر مشہود ہی ہوتا ہے۔

ششم، مذہبی پیشوائیت اس درجہ روایت پسند ہے کہ درایت کو شجرِ ممنوعہ سمجھتی ہے، لہٰذا وہ نہ خود قرآنِ مجید پہ تدبّر کرتی ہے اور نہ دوسروں کو ایسا کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ چنانچہ کوئی مسلم مفکّر یا عالم ایسا کرتا ہے تو اس کی فکری کاوشوں کے حاصل پہ تفسیر بالرائے کا فتوٰی لگا کر اسے مسترد کر دیتی ہے۔ اس کے نتیجے میں اُمّتِ مُسلمہ روحِ قرآنی سے دور اور قرآن اس سے مہجور ہو گیا ہے۔ کاش مسلمان سمجھیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد تدبّر فی القرآن کی صریح خلاف ورزی ہے جس کی پاداش میں اُمّتِ مسلمہ زیاں مدام میں ہے جو ناقابلِ تلافی بھی ہے۔

پوچھتے ہیں "کچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں؟" اس سوال کا جواب ایک لفظ میں چاہتے ہو تو وہ ہے: "قرآن سے وابستگی و وفاداری بشرطِ استواری"۔ لیکن قرآن سے وابستگی بجز اس کے ممکن نہیں کہ تمہیں اس حقیقت پہ ایمان ہو کہ قرآنِ مجید ربِّ ذوالجلال کا عظیم و کریم اور زندہ و حسین کلام ہے، جو ہر درد کی دوا، ہر مرض کی شفا، ہر خوف کا علاج، ہر غم کا درماں اور ہر زیاں کا مداوا ہے، نیز یہ حُسن و زندگی کی طلب و جستجو رکھنے والوں کے لیے چشمۂ حیواں، آفتابِ نور و ہدایت، چشمۂ حسنہ و رحمت اور خزینۂ طمانیت و سلامتی ہے، اور اس میں ہر مسئلۂ حیات کا حل ہے۔ علاوہ بریں تمہیں اس حقیقت کا بھی ایقان و اذعان ہونا چاہیے کہ نہ صرف تمہارے ملک میں بلکہ ساری دُنیا میں قرآنِ حکیم ہی ایسے حسین و مثالی معاشرے کی تشکیل کر سکتا ہے، جو پائیدار و مستقل امن و سلامتی کی جنّت ہو اور جس میں لوگ آتشِ خوف و حزن کی اذیّتوں سے محفوظ و مصئون اور لذّتِ زندگی سے سرشار ہوں۔ پھر تمہیں اس "زندہ ایمان" کی قوّتِ جلالی کے ساتھ روحِ قرآن کو اپنی زندگی میں اس طرح جذب کر لینا ہوگا، جس طرح بدن خون کو جذب کر لیتا ہے اور خون اسے زندگی اور تاب و توانائی دیتا ہے کلامِ الٰہی بھی اسی طرح انسان کو حیات و توانائی، تاب و تواں، جمال و جلال اور آرزوئے "ارتقاء" بخشتا ہے۔ قرآنِ مجید کو اپنی زندگی میں جذب کر لینے کا وہی مطلب ہے جو "اسلام میں پورے طور سے داخل ہو جانے کا مطلب ہے"۔ اسلام میں پورے طور سے داخل ہونے کے

معنی یہ ہیں کہ انسان مسلمان بن کر اس کے جملہ عقائدِ جلیلہ و محرّکہ کو اپنی زندگی کے اجزائے لاینفک بنا لے اور ان کے مطابق انفرادی و اجتماعی زندگی کرے۔ بالفاظِ دگیر اس کی زندگی، موت اور عبادت اور قربانی فقط اللہ تعالیٰ کے لیے ہو۔ مختصر یہ کہ وہ صرف اپنے الٰہ و ربّ کی محبّت و پرستش اور اطاعت و بندگی کے لیے جیے اور اس کے احکام کی بجا آوری میں اپنی جان اور مال و دولت تک قربان کر دے۔ یہ یاد رہے کہ جو مسلمان ایسا نہیں کرتے، قرآنِ مجید نے ان کے لیے "منافقین" کی تعبیر اختیار کی ہے۔ منافق چونکہ کاذب ہوتا ہے اور اس میں صدق و اخلاص کا فقدان ہوتا ہے اور دوسرے اپنے عقائدِ جلیلہ و محرکہ اور احکامِ الٰہی کے مطابق عمل نہیں کرتا، لہٰذا اس کا ایمان اپنی قوّت و توانائی اور طمانیت و سکینت سے محروم و غیر معتبر اور مردہ ہوتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید منافقین کو ان کے نفاق کے سبب نہ تو حیات و توانائی دیتا ہے نہ جمال و جلال اور نہ نور و رنگِ الٰہی ہی عطا کرتا ہے؛ نیز ان میں آرزوئے حسن و حیات کا احیاء و اتمام بھی نہیں کرتا۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ نفاق نفس کا سرطان ہے، جس کے سبب اس میں قرآنِ مجید کی قوّتِ جلالی قبول کرنے کی استعداد ضائع ہو جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں انسان رہینِ زیاں ہو جاتا ہے؛ یا بالفاظِ قرآن: اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ (العصر ۱۰۳: ۲)۔

چونکہ نفاق نفس کا سرطان ہے، لہٰذا نفس اور جسم کے سرطانوں کے طریقِ کار میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ سرطانِ بدنی کا کام رازداری سے حیاتیاتی جرثوموں اور خلیوں کو مارنا اور انہیں اپنی غذا بنا کر نشو و نما پانا اور تیزی سے بدن میں پھیل جانا ہے۔ نفسی سرطان بھی اسی طرح رازداری سے ایمانیات یا عقائدِ جلیلہ و محرّکہ کو خورد برد کرتا، پھلتا پھولتا اور تیزی سے نفسِ اجتماعیہ میں سرایت کر جاتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس وقت مسلم اقوام نفاق کی سرطانی مریض ہیں اور یہ مرض سرعت سے ان کا استیصال کر

رہا ہے تو یہ مبالغہ نہیں، بلکہ ایسی حقیقت کا اعتراف ہوگا، جسے قبول کر لینے اور اس مہلک مرض سے جلد از جلد نجات پا لینے ہی میں ان کی زندگی و بقا اور ترقی و آزادی کا راز پنہاں ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس مرضِ نفاق کا درماں بھی قرآن ہے؛ یعنی اس سے وابستگی و وفاداری بشرطِ استواری ہے۔ اس سے پہلے کہ تمہارا مرضِ سرطانی مرضِ لادوا بنے اور تم اس کا مداوا نہ کر سکو، قرآن کے چشمۂ حیواں سے اس کا علاج کرو، شفا و صحت پاؤ، اور حیات و توانائی حاصل کرو۔

زندگی کا سرّ الاسرار حسن ہے۔ چنانچہ حسن نہ رہے تو زندگی میں کچھ باقی نہیں رہتا: لذت و طمانیت، نہ درد و سوز، کیف و سرور، نہ وجد و حال، حیرت و مستی، نہ جذب و شوق اور نہ آرزوئے حسن و ارتقاء ہی رہتی ہے لیکن حسن سے معمور ہو جائے تو وہ نور سے جگمگا اٹھتی اور رجایاتی ثروت سے معمور ہو جاتی ہے؛ نیز اس کی آرزوئے حسن و ارتقاء فعال و متحرک ہو جاتی ہے۔ جانتے ہو زندگی میں حسن کیسے پیدا ہوتا ہے؟ روحِ قرآن کو اپنی ذات میں اس طرح جذب کر لینے سے جس طرح بدن روحِ حیات کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ روحِ قرآن کو اپنے اندر جذب کر لینے سے "وصالِ دوست" یا الٰہ و ربّ کا قرب و حضور اور رضوان میسر آتا ہے۔ چنانچہ حقیقت میں زندگی ان اہلِ جذب و شوق کی ہوتی ہے جو روحِ قرآن کے وسیلے سے "دوست" کا قرب و حضور اور رضوان حاصل کر لیتے ہیں۔ اس حقیقت کو کسی صاحبِ حال شاعر نے اس طرح بیان کیا ہے:

زندگی نتواں گفت حیاتے کہ مراست
زندہ آنست کہ با "دوست" وصالے دارد

قرآنِ مجید کو اپنے اندر جذب کر لینے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ اہلِ ایمان اس کے سانچے میں اپنے خُلق کی تعمیر و تحسین کریں۔ اسے اپنے اندر اخلاقِ الٰہی پیدا کرنا یا اپنے آپ کو رنگِ الٰہی میں رنگنا کہتے ہیں۔ یہی محسن و صالح اور شہید و صدّیق بننے کا احسن

طریقہ ہے، جسے قرآنِ مجید "صراط المستقیم" سے تعبیر کرتا ہے۔ مومنین کے یہ گروہ قرآنِ مجید کی نظر میں اللہ تعالیٰ کے مقرّب و انعام یافتہ بندے، اولیاء اللہ، اہلِ حسن و سرور، کامیاب و کامران اور اہلِ جنّت ہوتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ خُلقِ قرآنی ہی سے تقویٰ و ایمان، حق و صداقت، عدل و احسان، ایثار و قربانی، محبت و رحمت اور حسنہ و خیر کے چشمے نکلتے اور مزرعِ حیات کو سرسبز و شاداب اور بارآور کرتے ہیں؛ نیز اس سے ہر وہ چیز نکلتی ہے جو "دوست" کی جنّت، اس میں اس کے انعام یافتہ بندوں کی رفاقت، اس کے قرب و حضوری اور دید و رضوان کے حصول کے لیے سازگار ہے۔ علاوہ بریں خُلقِ قرآنی ہی میں آرزوئے حسن و حیات پیدا ہوتی اور اپنے اِتمام و ارتقاء کے لیے فعّال و حرکی رہتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ زندگی کھیتی کے اور قرآنِ مجید اس کے لیے چشمۂ حیواں کے مثل ہے، اور دونوں ربِّ کریم کی عظیم و غیر مترقبہ نعمتیں ہیں۔ اگر انسان عمر بھر ان دو نعمتوں کا شکریہ ادا کرتے رہے تو اس کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ بہت کم لوگ زندگی کی قدر جانتے اور اس کی قدر کرتے ہیں اور اس سے بھی کم لوگ قرآنِ مجید کی قدر جانتے اور اس کی قدر کرتے ہیں جیسا کہ قدر کرنے کا حق ہے۔ یہ انسان کے ظلم و جہل کی دلیل ہے۔ بہر حال، جو لوگ ان دونوں نعمتوں کی قدر کرتے اور ان سے استفادہ کرنے کی حتی الامکان سعی و جہد کرتے رہتے ہیں، وہی اللہ تعالیٰ کے شکر گزار و انعام یافتہ بندے اور حقیقت میں زندہ و مطمئن ہوتے ہیں اور ان کی آرزوئے حسن ہی اپنے اِتمام و ارتقاء کے لیے فعّال و حرکی ہوتی ہے۔ بخلاف اس کے جو لوگ ان نعمتوں کی قدر نہیں کرتے، وہ کفرانِ نعمت ایسے گناہِ کبیرہ کے مرتکب ہوتے ہیں، اور اس کے نتیجے میں ان میں آرزوئے حسن و زندگی بھی دم توڑ دیتی ہے۔ ظاہر ہے جس چیز کی آرزو ہی نہ ہو، وہ ملے تو کیسے؟ چنانچہ وہ حسن و زندگی سے محروم ہو کر رہینِ خوف و حزن اور اہلِ نار ہو جاتے ہیں۔

قرآنِ مجید کی مثال آفتابِ جہانتاب کی سی ہے۔ جس طرح ربِّ کریم نے آفتاب کو

کُل مخلوقات کے لیے چشمۂ حیات و آب و تاب بنایا ہے، اُسی طرح اُس نے قرآنِ مجید کو چشمۂ حیات و نور بنایا ہے تاکہ کُل بنی نوع انسان اس سے تاب و تواں اور زندگی حاصل کریں، اور ان میں آرزوئے حسن زندہ و فعّال رہے۔ یہ حقیقت ازبس فکر انگیز ہے کہ ربِّ کریم ہر بچے کو حسن و زندگی اور ان کی آرزو ودیعت کر کے پیدا کرتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، پیدائش کے وقت انسان کی مزرعِ حیات سرسبز و شاداب اور اس میں نشو و نما پانے اور بار آور بننے کی استعداد بالقوہ موجود ہوتی ہے چنانچہ جب وہ پھلنے پھولنے لگتی ہے اور اس میں خواہشات و جذبات کے شگوفے پھوٹنے اور رنگ و بو کے طوفان اُٹھنے لگتے ہیں تو نفسی۔ ابلیسی شیطان کو، جو اس کے خون میں گھات لگائے ہوتا ہے، گُل کھلانے کا موقع مل جاتا ہے، اور وہ اُسے اس کی جنّتِ حیات سے نکالنے کی خاطر سرگرم عمل ہو جاتا ہے۔ موسمِ بہارِ زندگی کی مناسبت سے وہ اپنی جمالیاتی فریب کاری و وسوسہ اندازی سے اولادِ آدم کو اس کے مورثِ اعلیٰ کی طرح "شجرِ ممنوعہ" کی لذّت سے آشنا ہونے کی ترغیب و تشویق دینے لگتا ہے۔ شیطان کا یہ جمالیاتی فریب رہزنِ ایمان و آگہی اور غارتگرِ آرزوئے حسن و حیات ہوتا ہے اور اس سے بچنا اگر محال نہیں تو ازبس دشوار ضرور ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ شیطان کے جمالیاتی فریب سے محفوظ و مصؤن رہنے کی احسن و معتبر پناہ گاہ قرآنِ مجید ہے تو یہ مبالغہ نہیں بلکہ اظہارِ حقیقت ہوگا۔

غالباً اس لیے کہ اللہ تعالیٰ زندہ بالذّات (= الحیّ اور قائم بالذّات (القیّوم) ہے، اس کی ہر تخلیق زندہ ہے اور زندہ رہنا چاہتی ہے، چنانچہ انسان بھی زندہ رہنا چاہتا ہے، لیکن اس کی اور دیگر مخلوقات کی آرزوئے حیات میں بہت فرق ہے؛ مثلاً انسان کو "حیاتِ محض" کی جبکہ دیگر مخلوقات کو فقط حیات کی آرزو ہوتی ہے۔ دوسرے، انسان کی آرزوئے حیاتِ محض اشد و اکمل اور تیسرے ارتقائی ہوتی ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے دو نکات کی صراحت کر دی جاتی ہے۔ اوّل "حیاتِ محض" کا معنیٰ ہے خالص زندگی، یعنی ایسی زندگی جو ایک تو سیّئات و قبائح

اور خوف و حزن کے آتش انگیز اثرات سے منزّہ و مطہر اور شاداب و نورانی اور حسین و مطمئن ہو، دوسرے لافانی ولازوال ہو، اور تیسرے اِرتقائی ہو۔

ثانیاً، آرزو کے ارتقائی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ترقی و کمال مطلق نہیں، اضافی ہے، لہٰذا اس کا کمال اپنے نقطۂ متناہیت پر نہیں، بلکہ کمالِ نو کے نقطۂ آغاز پہ دلالت کرتا ہے، اسے ہم "فلسفۂ اضافیتِ اِرتقاء" سے تعبیر کرسکتے ہیں، جس سے بحث اپنے مقام پر کی جائے گی۔ یہاں اس اہم نکتے کی صراحت کردی جاتی ہے کہ اضافیتِ اِرتقاء کا فلسفہ کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِىْ شَاْنٍ (یعنی اللہ تعالیٰ اپنے حسن کے نوبنو مظاہر میں ہر لحظہ جلوہ افروز ہوتا رہتا ہے) کی تفسیر ہے۔ بہر حال، اس گفتگو سے اس امر کی توجیہہ ہوجاتی ہے کہ کیوں انسان کی آرزوئے حیاتِ محض کے اِتمام و اِرتقاء کی خاطر ربّ ذوالجلال والاکرام نے اس کے لیے ایک تو الحیوان بنایا ہے، جو موت ناآشنا جہانِ زندگی ہے، دوسرے اس میں اس کے لیے حسن المآب ہے؛ اور تیسرے موت کے بعد انسان کا اِحیاء ہوگا اور یہ نشاۃ الثّانیہ اس کی حیاتِ آخری ہوگی جو ہمیشہ موت ناآشنا رہے گی۔ ہندی زبان میں انسان "امر" ہوجائے گا۔

اس گفتگو کا ماحصل یہ نکلا کہ قرآنِ مجید اس اعتبار سے چشمۂ حیواں ہے کہ وہ انسان کی آرزوئے حسن وحیات کو زندہ و فعّال کرتا اور ارتقائی رکھتا ہے؛ نیز اہلِ آرزو کو حیاتِ محض عطا کرتا ہے۔

حواشی وتشریحات

۱۔ دیکھیے سورۃ العصر ۱۰۳: ۱ تا ۳۔

۲۔ الذکر: دیکھیے آل عمران ۳: ۵۸؛ الاعراف ۷: ۶۳ بمواضع کثیرہ۔

۳۔ حبل اللہ: دیکھیے آلِ عمران ۳: ۱۰۲۔

۴۔ قلبِ منیب: دیکھیے قٓ ۵۰: ۳۳۔

۵۔ ثقافت (اپنے وسیع ترین مفہوم میں): دیکھیے مصنّف کی کتاب اسلامی ثقافت، فیروز سنز لمیٹڈ لاہور، ۱۹۸۴ء۔

۶۔ اِرتقاء سے مراد جمالیاتی ارتقاء ہے اور اس کا مطلب انسان کے حُسنِ ذات کے نور کی درجہ وار ترقی ہے جس کا سلسلہ لامتناہی اور کُلَّ یَوۡمٍ هُوَ فِیۡ شَاۡنٍ (الرحمٰن ۵۵: ۲۹) کا مرہونِ منت ہے۔ اس سے مفصّل بحث "اِضافیتِ اِرتقاء" کے عنوان کے تحت متن میں کی گئی ہے۔

۷۔ دیکھیے البقرہ ۲: ۲۰۸۔

مقام ۱۳

فلسفۂ اضافیتِ ارتقاء

اشیائے کائنات جو بظاہر ساکن و جامد ہیں، ان میں بھی حرکت و تغیر بہ رنگِ ثبات ہے۔ ایسا تو نہیں کہ گردشِ تقدیرِ اشیائے کائنات ہے؟ اگر ایسا ہے تو کیوں ہے؟
میں اس سوچ میں مستغرق تھا کہ ندائے سروش آئی:

اے جویائے رازِ زندگی! سنو، قلب زندہ و فعّال ہو تو مثبت انداز میں سوچتا ہے اور اس کی سوچ تفکر بالحق ہوتی ہے، نیز وہ مزید چار حقائق کی مظہر ہوتی ہے: اوّلاً، سوچنے والا صاحبِ عقلِ سلیم، مفکّر اور حکیم ہے۔ ثانیاً، سوچ کی جہت صالحہ ہے۔ ثالثاً، وہ تخلیقی و تعمیری اور تحسینی و احیائی ہے؛ اور رابعاً، مفکّر خود بھی زندہ و بیدار ہے اور اس کی آرزوئے حسن و حیات بھی زندہ و فعّال ہے۔ ایسا تفکر و تجسّس مبارک و خوش آئند اور مشاطۂ ناظورۂ حیات ہوتا ہے۔ اسی نے عرصۂ حیات میں ثقافت کے باغ لگائے ہیں اور یہی اشجارِ ثمرور اور گلہائے رنگ رنگ سے ان کی آراستگی و تزئین اور آبیاری کرتا ہے۔ انسان اس طرح سوچنا چھوڑ دے تو یہ باغ اُجڑ جائیں اور مزرعِ حیات بھی ویران ہو جائے۔

بہر حال، سب سے پہلے یہ نکتہ ذہن نشین کر لو کہ زندگی بھی موت اور دیگر اشیائے کائنات

کی طرح ربِّ کریم کی تخلیق بالحق ہے۔ اور اس کا خاصہ اپنے اِلٰہ و ربّ کی جمالیاتی تخلیقی نمودِ نو بنو کے باعث خوب سے خوب تر کی جستجو میں نو بنو صور و اشکال میں اپنا جلوہ پیدا کرنا ہے۔ یہ امر اس کی آرزوئے "دوست" و بقائے دوام پہ دلالت کرتا ہے۔ زندگی جوہرِ لطیف ہے جو ظاہر بھی ہے اور باطن بھی؛ محسوس بھی ہے اور نا محسوس بھی؛ نیز یہ ہیولیٰ نہیں لیکن اپنی نمود کی خاطر ہیولیٰ بن جاتی ہے، اور جس صورت میں چاہتی ہے اپنی شان دکھاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر صورت میں زندگی ہوتی ہے اور ہر چیز صورت رکھتی ہے، اس لیے زندہ ہوتی ہے۔ اگرچہ مختلف اشیاء کی زندگی میں بلحاظِ کیفیت و کمیت فرق ہوتا ہے۔ چونکہ زندگی کی طرح حُسن بھی صورت میں اپنی نمود دکھاتا ہے، لٰہذا ربِّ حیّ و قیّوم "الظاہر" بننے کی خاطر ایک تو خالق و مصوّر ہے اور دوسرے اس کی ہر تخلیق زندہ و حسین ہے۔ بالفاظِ دیگر، احسن الخالقین کی تخلیقی فعلیت جمالیاتی۔ احیائی ہے، اور اس کی تخلیقات میں آرزوئے حسن و حیات پائی جاتی ہے، اور جہاں تک بالخصوص انسان کا تعلق ہے اس میں خوب سے خوب تر کی جستجو بھی پائی جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے زندگی پیدا کی تو اس کی روح میں ایک تو اپنی آرزو اور دوسرے گوناگوں صور و اشکال میں اپنا جلوہ پیدا کرنے کی طلب و جستجو اور استعداد ودلیعت کر دی۔ یہ علّتِ غائی ہے حیاتیاتی ارتقاء کی، جس کا منہاج خواہ کچھ ہو، لیکن اس کی واقعیت کا علم معترف ہو چکا ہے، جس کی نشاندہی قرآنِ حکیم نے چودہ صدیاں پہلے کر دی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ روزِ آفرینش ہی سے روحِ حیات اپنے معروضِ حسن و پرستش (اِلٰہ و ربّ) کے جمالیاتی مشاہدے کی طلب و جستجو میں طرح طرح کی بے قیاس صورتیں اختیار کرنے کی سعی و جہد کرتی رہی اور ہر صورت میں قیام کر کے اپنی ذات کی توسیع بھی کرتی رہی کہ یہ اس کا خاصہ ہے۔ طلب و جستجو اور سعی و جہد کے بے قیاس زمانوں کے بعد بالآخر وہ ظاہری و باطنی اعتبار سے ایک اکمل و احسن صورت اختیار کرنے میں کامیاب ہو گئی جو لبشر

کی صورت تھی۔ یہ صورتِ جمیل وجلیل اس کی جمیل وجلیل اس کی جمالیاتی حِسّ کے عین مطابق تھی اور اس سے اس کے ذوقِ ارتقائے صُوری کی تشفّی ہوگئی۔ اس کے نتیجے میں اُسے شوقِ ارتقائے صوری نہ رہا تو حیاتیاتی صوری اِرتقاء[2] کا سلسلہ بھی منقطع ہوگیا۔ یہ ارتقائے صوری دُنیا کی نسبت سے تو مطلق تھا، لیکن آخرت کے لحاظ سے اضافی تھا۔ اس انقطاع کی علّت قدرت کا "قانونِ احترامِ آرزو" ہے۔

یہ ازبس اہم و فکر انگیز حقیقت ہمیشہ ذہن نشین رہنی چاہیے کہ احسن الخالقین کی تخلیقی فعلیت جمالیاتی و تدریجی اور اِحیائی و غایتی ہوتی ہے، لہٰذا اس کی ہر تخلیق زندہ و حسین بھی ہے اور اس کے حسن و زندگی کی مقصدیت و افادیت اور غرض و غایت بھی ہے۔ اس کے لیے قرآنِ حکیم نے "تخلیق بالحق" کی فکر انگیز تعبیر اختیار کی ہے۔ زندگی بھی ربِّ کریم کی تخلیق بالحق ہے اور اس کا ایک مقصد اپنی آرزوئے حُسن کی تکمیلِ مسلسل ہے، جس کے حصول کے لیے اُسے صبر آزما تحولات و تطوّرات اور ہمّت طلب تجربات و امتحانات سے گزر کر اپنی ذات کی توسیع و ترفیع کرنا تھی۔ چنانچہ اس دُنیا میں جو اس کی ذات کی توسیع و ترفیع کا پہلا مرحلہ ہے (اور آخری مرحلہ آخرت ہے)، وہ جُملہ عوالم کو محیط ہوگئی اور اس کی گوناگوں بے شمار و بے قیاس صور و اشکال سے دُنیا نظر افروز و دلکش مرقع بن گئی۔ باوجود اس کے زندگی اپنی آرزوئے حُسن کی تکمیل کی خاطر اپنی ذات کی توسیع و ترفیع میں سعی و جہد کرتی رہی اس لیے کہ یہ اس کی تقدیر ہے۔ چونکہ اس کی سعی و آرزو سچّی تھی، لہٰذا زندگی نے ایسی صورت حاصل کر لی جو اس کی ذات کی توسیع و ترفیع کے لیے موزوں ترین اور اس کے جمالیاتی ذوق کا احسن و اکمل معروضِ تسکین بھی تھی۔ یہ صورتِ بشر تھی، جو اس کی موزونیِ تقدیر بھی تھی۔

زندگی صورتِ بشر میں جلوہ گر ہوئی تو اس میں تسویہ و تعدیل کی جمالیاتی اقدار نے جہاں اسے راست قامت اور ظاہری طور سے اکمل و احسن بنا دیا، وہاں انہوں نے اس

کے باطن میں ایک حسین و منیر حسی قلبی نفسی نظام پیدا کر دیا۔ اس نظام کے نور کی بدولت اس میں چراغِ عقل فروزاں ہوا اور اُسے اپنے باطنی نظام کی قوت و توانائی اور اس میں مضمر ممکناتِ ارتقاء کا شعور ہوا تو اس کی آرزوئے ارتقاء میں ایک حسین انقلاب آیا۔ اس پر یہ راز کھلا کہ اُس کی آرزوئے حسن جو در اصل آرزوئے دیدِ الحُسن ہے، اس کی تکمیل اس کے اپنے نورِ حسنِ ذات کی تکمیل پر منحصر ہے، لہٰذا اُسے اپنے باطنی نظام کو حسین سے حسین تر بناتے رہنا چاہیے تاکہ اس کا نور حرکی وارتقائی رہے اور "کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ" کی نسبت سے درجہ وار اپنی تکمیل کرتا رہے۔ چونکہ زندگی کا اِلٰہ و ربّ اللہ تعالیٰ ہے جو الحسن ہے، اور وہ ہر لحظہ اپنی جمالیاتی تخلیقی فعلیت میں اپنی نمودِ نو رکھتا ہے، لہٰذا زندگی ہر صورتِ نو میں اپنا جلوہ پیدا کرتی اور خوب سے خوب تر کی طلب و جستجو میں رہتی ہے۔ اس میں فلسفۂ اضافیتِ ارتقاء پنہاں ہے۔

تمہاری یاد تازہ کرنے کی خاطر اس اصل کی مختصراً صراحت کر دی جاتی ہے کہ ربِّ حکیم و قدیر کے حکم سے زندگی معرضِ ظہور میں آئی تو ساتھ ہی اس کے لیے زمان و مکان بھی تخلیق ہوئے اور اس کی جمالیاتی تخلیقی فعلیت کا یہ سلسلہ جاری ہے اور جاری رہے گا۔ وجہ یہ ہے کہ زندگی کو اپنے معروضِ حسن و عشق کی طلب و جستجو اور آرزوئے دید ہے، جس کی تشفی کی خاطر الحُسن اپنی جمالیاتی تخلیقی فعلیت کے مظاہر میں اپنی حُسن نمائی کرتا رہتا ہے۔ چونکہ حرکت و تغیّر زندگی کا خاصہ بھی ہے اور تقاضا بھی، لہٰذا الحُسن جو زندہ بالذات اور خالقِ حیات ہے، اپنی جمالیاتی تخلیقی فعلیت کے تازہ بتازہ، نو بنو مظاہر میں ہر آن اپنا جلوہ پیدا کرتا رہتا ہے، جس سے اہلِ نظر و آرزو ہی جمالیاتی ثروت حاصل کرتے ہیں۔ مشاہدۂ حسنِ اِلٰہ سے جمالیاتی ثروت حاصل کرنے کی خاطر حیاتِ انسانی کو اپنے حسنِ ذات کے نور کی حاجت ہوتی ہے۔ قلب جو اپنے فطری حُسن کی بدولت منوّر ہے، نور آفرین بھی ہے، بشرطیکہ اُسے حُسنِ یقین (=ایمان) اور حسنِ عمل کی توانائی ملتی رہے۔ چنانچہ وہ نور آفرینی

کے عمل ہی کے ذریعے منیر بنتا ہے، جسے "قلبِ بینا" اور انسان کو "اہلِ نظر" کہتے ہیں۔ چونکہ الحسن ہر آن نو بنو مظاہرِ ارتقائی میں اپنی نمود رکھتا ہے، لہٰذا روحِ حیاتِ انسانی کو بھی حرکی وارتقائی نور کی آرزو رہتی ہے تاکہ وہ ہر آن متغیر وارتقائی مظاہر کا مشاہدہ کر سکے، اور اس خاطر ہر دم نفسِ انسانی سے حُسنِ یقین وحسنِ عمل کا مطالبہ کرتی رہتی ہے۔ اس اعتبار سے ہر لمحۂ حیات جمالیاتی ثروت کا خزینہ ہے اور جو "دم غافل سو دم کافر" کا مقولہ اپنے اندر فکر انگیز معنویت اور عبرت کا سامان رکھتا ہے۔

اس گفتگو سے ایک تو ارتقاء کی حقیقت منکشف ہوئی کہ وہ جماداتی سے حیوانی درجات تک صوری حیاتیاتی تھا، لیکن انسانی درجے میں پہنچ کر صوری حیاتیاتی ارتقاء کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور اس کی جگہ نورِ حسنِ ذاتِ انسانی نے لے لی۔ اب ارتقاء کا مطلب انسان کے حُسنِ ذات کے نور کا ارتقاء ہے۔ یہ نور قلبِ حسین ومنیر اپنے حُسنِ یقین وعمل کے نور وتوانائی کے ذریعے پیدا کرتا ہے، جس طرح مثال کے طور پر روشنی وتوانائی پیدا کرنے والی مشین پہلے خود توانائی کے ذریعے چلتی اور پھر نور وتوانائی پیدا کرتی ہے۔ دوسرے، ارتقاء مطلق نہیں بلکہ ربِ کریم کی جمالیاتی تخلیقی فعلیت کے مظاہرِ ارتقائی سے وابستہ اور ان کا مرہونِ منت ہونے کی بنا پر اضافی ہے۔ اس ارتقائے نور کے لیے ہم نے جمالیاتی ارتقاء کی تعبیر اختیار کی ہے۔

یہاں اس اہم نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ صوری وحیاتیاتی ارتقاء کا انقطاع ہر عالم کی نوع کی اشیاء کی آرزوئے ارتقاء کے فقدان کے باعث ہوا۔ اس کی علتِ غائی یہ ہے کہ جب کسی نوع کو ربِ ذوالجلال والاکرام کی کسی نعمت کی قدر نہیں رہتی تو وہ اس سے وہ نعمت واپس لے لیتا ہے۔ اسی طرح اگر اُسے کسی نعمت یا ترقی وکمال کی آرزو نہیں رہتی تو قدرت اس کے فقدانِ آرزو کا بھی پاس کرتی ہے اور اُسے وہ چیز عطا نہیں کرتی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سُنّت ہے، جسے ہم نے قدرت کے قانون احترامِ آرزو سے تعبیر کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو اپنی تخلیقات کے انواع کی آرزو کا پاس و لحاظ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اُس نے خود ہی انہیں طلب و جستجو کی آزادی ودیعت کی ہے، اور اسے "آزادی" بڑی محبوب ہے خصوصاً آزادیِ انسان۔ غور سے دیکھیں تو صرف انسان ہی صحیح معنوں میں "آزادی" کا امین ہے اور اُس نے یہ "آزادی" اپنی حیاتِ جاوداں کو انتہائی خطرے میں ڈال کر حاصل کی تھی۔ آزادی جو ارادہ و اختیار کی آزادی تھی، دراصل امتحان زندگی تھی، جس کے نتائج و عواقب ایمان و عمل کے حُسن و قبح کی نوعیت کے مطابق دو طرح کے تھے؛ مثبت، مثلاً حسین و طمانیت انگیز اور منفی، جیسے قبیح، خوف انگیز اور غم آفرین۔ سب مخلوقات ڈر گئیں اور انہوں نے آزادی کا بارِ امانت اُٹھانے سے معذوری کا اظہار کر دیا۔ قدرت نے ان کی آرزو کا پاس کیا اور انہیں آزادی کی امانت تفویض نہ کی، لیکن انسان میں آزادی کی آرزو اتنی شدید تھی کہ اُس نے شرالمآب کے عذاب النار کی بھی پروا نہ کی۔ علاوہ ازیں، اُس نے اس کے لیے دُنیا میں اپنے دشمنِ حُسن و جان کی موجودگی میں زندگی کے صبر آزما بلکہ شکیب رُبا امتحان سے گزرنا، ایک ایک لمحۂ حیات کا حساب دینا اور قدرت کے قانونِ مُجازات و احترامِ آرزو کا مستوجب ہونا قبول کر لیا۔ ربِّ کریم کو روحِ حیاتِ انسانی کی آرزوئے آزادی کا اس قدر پاس و لحاظ تھا کہ اُس نے اُسے آزادیِ فکر و عمل امانت کے طور پر تفویض کر دی۔ عالم الغیب والشہادۃ کو علم تھا کہ اکثر بنی آدم اپنی آزادی کا استعمال غلط کریں گے اور اس کے نتیجے میں دُنیا اور آخرت میں حسنہ و لذّتِ زندگی سے محروم رہنا اور عذاب النار میں زندگی کرنا، اُن کا مقدر بن جائے گا' لہٰذا اس سے انسان کی یہ محرومی و نفس سوزی اور نادانی و خود ظلمی دیکھی نہ گئی اور جوشِ محبّت میں اسے انسان کو ظَلُوْمًا جَهُوْلًا کہنا ہی پڑا۔

چونکہ قدرت کو اپنی مخلوقات کی آرزو کا پاس و احترام ہے، لہٰذا انسان کے سوا جب دیگر مخلوقات کو آرزوئے ارتقاء نہ رہی تو اس کے نتیجے میں ان کی زندگی میں صلاحیتِ ارتقاء رہی نہ ممکناتِ ارتقاء ہی رہے؛ نیز ان میں حیاتِ ابدی و نشاۃُ الثّانیہ کی آرزو بھی نہ رہی تو

فانیت و عدمیت ان کا مقدر بن گئی۔ بخلاف ان کے یہ نوعِ بشر تھی، جسے اپنی آرزوئے حسن و حیات، جمالیاتی ذوق اور نورِ ذات کے ارتقاء کے باعث حیاتِ ابدی، نشاۃ الثانیہ اور "دوست" کی دید و رضوان اور قرب و حضوری کی آرزو مائل بہ ارتقاء رہی تو الحیوان کی حیاتِ ابدی اس کا مقدر ہو گئی۔ الغرض، نوعِ انسانی کو اپنی آرزوئے حسن و حیات کی بدولت ابدیت نصیب ہو گئی۔

اب ایک از بس اہم و لطیف نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ نوعِ انسانی کو جمالیاتی حس ودیعت ہوئی ہے جو ترقی کر کے جمالیاتی ذوق بن گئی۔ اس کا نتیجہ ہے کہ ایک تو اُسے خوب سے خوب تر کے مشاہدے کی اور دوسرے اسے خود بھی خوب سے خوب تر شان میں اپنی نمود رکھنے کی آرزو ہے۔ چنانچہ ربِّ ذوالجلال والاکرام نے اس کی اس "موضوعی۔ معروضی آرزو" کی تکمیلِ مسلسل کے لیے اس کے لیے ایک تو الحیوان بنایا ہے، جو دُنیا کی طرح عالمِ حیات و ممات نہیں، بلکہ موت و زوال سے ناآشنا جہانِ حیات و دہر ہے، اور اس میں اس کے جمالیاتی ذوق کی تسکین کی خاطر جنّت بنائی ہے، جو اس کے اِلٰہِ جمیل کی دید و لقا، قرب و حضوری اور ہم نظری و ہمکلامی کا حُسنُ المآب ہے۔ علاوہ بریں، اس میں ہر فردِ بشر اگرچہ اپنی پہلی صورت میں ہو گا، لیکن ایک تو وہ اپنی تقدیری موزونی کے مطابق اکمل و احسن ہو گی، دوسرے اضمحلال و انحطاط، عیب و نقص، پیری و بیماری اور مرگ و فانیت سے منزہ رہے گی۔ مختصر یہ کہ وہ صورتِ حسن ہو گی اور صدا عنفوانِ شباب میں رہنا اس کی تقدیر ہو گی۔

بلاشبہ جنّت میں اہلِ حسن و آرزو کی زندگی رنگِ ثباتِ دوام سے مزیّن ہو گی، لیکن ایک تو وہ حیاتِ محض ہو گی، دوسرے اس کی خوب سے خوب تر کی آرزو روز افزوں ہو گی، لہٰذا ایک تو وہ جمود و تعطّل سے ورا ہو گی، دوسرے وہ سدا ارتقائی حالت میں رہے گی۔

یہ یاد رہے کہ خوب سے خوب تر کی آرزو کی علّتِ غائی كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ الحسن جو الٰہ ہے، ہر آن اپنی خوب سے خوب تر شان میں جو اس کی

جمالیاتی تخلیقی فعلیت کا مظہر ہوتی ہے، جلوہ پیدا کرتا رہے گا۔ اس کے نتیجے میں جنت نو بنو و گوناگوں، جمیل و جلیل اور زندہ و متحرک صوتی و بصری نظاروں کی ایسی بے مثال و بے نظیر اور عقل و فکر سے ماوراء سیر بن ہے، جس میں ابعادِ ثلاثہ ہونے کے باوجود اہلِ جنت کے لیے "بُعدِ مطلق" نہ ہوگا، لہٰذا وہ جس منظر سے لطف اندوز ہونا اور جمالیاتی ثروت حاصل کرنا چاہیں گے، غایت درجہ بُعد کے باوصف اپنے نورِ ذات کی بدولت اپنے آپ کو وہاں موجود پائیں گے۔ چونکہ ارتقائے شانِ الٰہی نورِ ذاتِ انسانی کا ارتقاء چاہتا ہے، لہٰذا اہلِ جنت کو ہمیشہ اپنے ارتقائے نور کی آرزو رہے گی اور یہ آرزو ان کے لبوں پر یہ دُعا بن کر جنت و عرش کی فضاؤں میں گونجتی رہے گی: رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ○ (التحریم ۶۶ : ۸) ہمارے نشوونما دینے والے مالک! ہمارے لیے ہمارے نور کا اِتمام اور ہماری حفاظت فرما۔ تو بلاشبہ ہر شے کرنے پر قدرت رکھنے والا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب قرآنِ مجید سے ثابت ہے کہ اہلِ جنت کی ہر آرزو پوری اور ہر دُعا قبول ہوگی تو پھر وہ اپنے نور کی تکمیل و اِتمام کی دُعا کیوں بار بار مانگتے رہیں گے؟ اس سوال کا جواب خود اس دُعا میں مضمر ہے۔ بہر حال، اس میں شک نہیں کہ اہلِ جنت کی ہر آرزو پوری اور ہر دُعا مستجاب ہوگی (اگرچہ وہ اپنے حُسنِ طبیعت کی بدولت وہی دُعا مانگیں گے قبولیت جس کے مقدور میں ہوگی)، لیکن اِدھر ان کی آرزو و دُعا کے مطابق ان کے نور کی تکمیل ہوگی اور وہ اپنے کمال کو پہنچے گا، اُدھر الحُسن اپنی شانِ نو یعنی اپنی جمالیاتی تخلیقی فعلیت کے مظاہرِ نو میں جلوہ افروز ہو جائے گا۔ ظاہر ہے ان نو بنو مظاہر کے مشاہدے کے لیے اہلِ آرزو کو اپنے نور کے اِرتقاء و کمالِ نو کی حاجت ہوگی اور وہ یہ دُعا مانگنے پر مجبور رہیں گے۔ اس طرح ایک طرف ربِّ کریم کی جمالیاتی تخلیقی فعلیت کے اِرتقائے مطلق کا اور دوسری جانب اہلِ جنت یا اہلِ حُسن و آرزو کے اِرتقائے اضافی کا سلسلہ ہمیشہ قائم و دائم رہے گا۔ یہ ہے فلسفۂ اِضافیتِ اِرتقاء۔

حواشی

۱۔ فلسفۂ اضافیتِ ارتقاء: Philosophy of relativity of evolution

۲۔ حیاتیاتی صوری ارتقاء: Biological–formal evolution

۳۔ انواع SPECIES

۴۔ الاحزاب ۳۳: ۷۲

۵۔ موضوع مذکور

مقام ۱۴

فلسفۂ محنت

سوچتے سوچتے مجھ پر استغراق کی حالت طاری ہوگئی اور کیا دیکھتا ہوں کہ ایک کوہِ فلک شگاف پر چڑھ رہا ہوں۔ کہ کوہ اُفقی و دشوار گزار اور ہمت طلب و صبر آزما ہے، لیکن میرے ہاتھوں میں ایک مضبوط رسّی ہے، جس کے سہارے میں اوپر چڑھ رہا ہوں۔ اس رسّی کا ایک سرا میرے ہاتھوں میں ہے اور دوسرا سرا اوپر آسمانوں میں کہاں ہے معلوم نہیں۔ ہر منظر حسین و دلکش اور ہر نظارہ جنّتِ نگاہ تھا۔ نیچے وادیِ رشکِ فردوسِ بریں میں دریا رواں دواں تھا۔ سبزہ اشجار کی بہار تھی؛ گُل و لالہ کے رنگین نظارے سحر انگیز تھے۔ ہر منظر اور ہر نظارہ قرّۃ العین وجانِ آرزو تھا۔

منزلِ مقصود بظاہر دُور تھی۔ جسم تکان سے چُور اور طلبگارِ استراحت تھا، دل نے وہاں ٹھہر کر ان جمیل و جلیل نظّاروں سے لُطف اندوز ہونا چاہا۔ ہمت بھی جواب دینے والی ہی تھی کہ ندائے سروش آئی:

اے نوردِ شوق! ہمت ہار بیٹھے تو زندگی کی بازی بھی ہار بیٹھو گے۔ بڑھتے اور اوپر چڑھتے رہو گے تو منزلِ مقصود کو بھی پالو گے، لیکن شرط یہ ہے کہ اس رسّی کو تھامے رکھنا! اسے کسی حال میں نہ چھوڑنا۔ اسے چھوڑ دو گے تو سنبھل نہ سکو گے؛ پھسلو گے، گِرو گے اور گرتے

چلے جاؤ گے۔ راہِ منزل مقصود اور دوست سے بھی دور بہت دور ہوتے جاؤ گے۔ اس کے نتیجے میں یہ حسین و دلکش وادی تمہارے لیے وادیٔ خوف و حزن بن جائے گی۔

سنو! منزل کی آرزو سچی ہو تو منزل قریب آجاتی ہے۔ آرزوئے منزل جھوٹی ہو تو وہ دور ہوتی جاتی ہے۔ عارف یا دانائے راز وہ ہوتا ہے جسے اپنی آرزوئے منزل کی نوعیت کا پتا ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کی آرزو سچی ہے یا جھوٹی؟

یاد رکھو! آرزو سچی ہو تو انسان محنت طلب و جفاکش ہوتا ہے۔ جو شخص محنت طلب و جفاکش نہیں، اس کی آرزو سچی اور معتبر نہیں ہوتی۔ جانتے ہو حیاتِ انسانی کا اصل الاصول کیا ہے؟ سنو! اسے حرزِ جاں بنا لو۔ یہ اصل الاصول اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب الانسان، قرآنِ مجید میں باندازِ ایجازِ بلاغت اس طرح لکھا ہے: لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي كَبَدٍ ۝ (البلد ۹۰:۴): بے شک ہم نے انسان کو محنت و مشقت میں پیدا کیا ہے۔ بالفاظِ دیگر حیاتِ انسانی کا اصل الاصول یہ ہوا کہ

"انسان رہینِ محنت و مشقت ہے!"

اس اصل الاصول سے متعدد نتائج کا استنباط کر سکتے ہیں، مثلاً

۱۔ حیاتِ انسانی اور محنت لازم و ملزوم ہیں۔

۲۔ انسان کو محنت سے مفر نہیں، لہٰذا جو شخص (بھی فرد ہو یا قوم) محنت سے راہِ فرار اختیار کرتا ہے وہ درحقیقت ایک تو زندگی سے اور دوسرے قانونِ قدرت سے راہِ فرار اختیار کرتا ہے، اور اس کے نتیجے میں حسن و زندگی سے محروم اور ناکام و نامراد رہتا ہے۔

۳۔ محنت کے بغیر منزلِ مقصود پہ پہنچنا، کوئی معرکہ سر کرنا، کوئی ادبی و فنی شہکار تخلیق کرنا، کوئی یادگار کارنامہ سرانجام دینا یا کوئی کمال حاصل کرنا، محال ہے۔

۴۔ محنت ہی نصرتِ الٰہی کی سزاوار ہے۔ وجہ یہ ہے کہ محنت صبر چاہتی ہے اور صبر کلید

نصرتِ الٰہی و فتح باب ہے۔ علاوہ بریں، محنت طلب و جفاکش لوگوں ہی کو نصرتِ الٰہی کی سچی آرزو ہوتی ہے اور قدرت اپنے قانونِ احترامِ آرزو کے مطابق ان کی مدد کرتی ہے۔ یہ سُنّتِ الٰہی ہے، جو غیر مبدل اور اٹل ہے۔

۵۔ محنت نہ کرنا یا محنت کی تحقیر و تذلیل کرنا اور محنت سے عار محسوس کرنا کفرانِ محنت ہے۔ دلیل یہ ہے کہ ربِّ رحیم نے انسان میں بے شمار ملکات بالقوہ ودیعت کیے ہیں، جنہیں محنت و مشقّت کے بغیر قوّت سے فعل میں نہیں لایا جا سکتا، لہٰذا جو شخص محنت و مشقّت نہیں کرتا وہ حقیقت میں ربِّ رحمٰن کی نعمتوں سے محروم رہتا اور ان کی تکفیر کرتا ہے؛ اور اس کا نتیجہ قدرت کے قانونِ احترامِ آرزو کے مطابق زوالِ نعمت اور محرومی و ناکامی کی صورت میں نکلتا ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ ربِّ جلیل نے یہ دُنیا انسان کے لیے بنائی ہے اور اس کے تمتّع و استفادے کے لیے اس میں بے قیاس نعمتوں کے خزائن و دفائن ودیعت کر رکھے ہیں، جن کا سراغ لگانا اور ان کی تسخیر کر کے ان سے مستفید و مستفیض ہونا انسان کا کام ہے۔ ظاہر ہے انسان یہ سب کچھ محنت و مشقّت کے بغیر نہیں کر سکتا، لہٰذا جو قوم محنت و مشقّت کی عادی اور جفاکش نہیں ہوتی وہ ان نعمتوں سے محروم رہتی اور ان کی دریوزہ گری پہ مجبور ہوتی ہے اور یہ کفرانِ نعمت ہے۔ ایسی ہی قوم گمراہ و مغضوب اور اللہ تعالیٰ کے انعامات سے محروم ہوتی ہے۔

اکثر لوگ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ انسان عبقری، مردِ کامل یا باکمال کیسے بنتا ہے؟ اس کا سچا اور مختصر جواب یہ ہے کہ یہ محنت ہے جو انسان کو عبقری، باکمال یا مثالی انسان بناتی ہے۔ مثال کے طور سے ایک شخص کو قدرت کی طرف سے موزونیِ طبع ودیعت ہوئی ہے۔ یہ درست ہے کہ موزونیِ طبع کے بغیر کوئی شخص سچا شاعر نہیں بن سکتا اور موزونیِ طبع موہبتِ الٰہی یا وہبی ہوتی ہے، لیکن یہ بھی اتنا ہی سچ ہے کہ سچا اور عظیم شاعر بننے کے لیے موزونیِ طبع کے علاوہ "تقدیری محنت" کی بھی حاجت ہوتی ہے۔ تقدیری محنت کا مطلب

بلحاظِ کیفیت وکمیت اس قدر محنت ہے جس قدر سچا، عظیم اور باکمال شاعر بننے کے لیے لازمی ہے۔ اس اِجمال کی تفصیل یہ ہے کہ چونکہ فکر بھی ذہنی کاوش یعنی محنت ہوتی ہے، لٰہذا تقدیری محنت سے مراد یہ ہے کہ ایک تو فکر و عمل جمالیاتی تخلیقی ہوں اور دوسرے ان کی جہت صالحہ ہو، اور تیسرے محنت شاعر کی موزونیِ طبع وقابلیت اور کیفیت وکمیت کے لحاظ سے اس قدر اور ایسی ہونی چاہیے، جس قدر اور جیسی کسبِ کمال کے لیے ناگزیر ہو۔ اس حقیقت کے متعلق دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ کسبِ کمال کے لیے مشاہدہ وتجربہ، مشق ومزاولت اور ریاض وتقابل کی حاجت ہوتی ہے اور سب محنت ہی کی تو شکلیں ہیں۔ بالفاظِ دیگر، یہ سب ایک ہی مسمّٰی کے مختلف نام ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ علم وحکمت، ادب وفن، صنعت وہنر، سائنس وٹیکنالوجی، الغرض زندگی کا کوئی گوشہ ہو، انسان تقدیری محنت کے بغیر عظیم، باکمال اور عبقری نہیں بن سکتا۔

تاریخی عمل کا حُسنِ نیت کے ساتھ مشاہدہ اور حقائق کا اِستقصاد اور ان پر تفکّر بالحق کرنے سے یہ بصیرت افروز حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ معاشرۂ انسانی میں ظلم واستحصال کا آغاز ان لوگوں نے کیا جو محنت ومشقت سے کنارہ کش ہو گئے اور اس کے نتیجے میں محنتی وجفاکش نہ رہے اور دوسروں کی محنت کے ثمرات پر زندگی کرنے لگے۔ بیکار لوگوں کا پہلا استحصالی طبقہ "آزروں" کا تھا۔ انھوں نے تسمیہ بالباطل کے ذریعے شرک وبت پرستی کو رواج دیا اور دین ومذہب کے نام پر لوگوں کو پہلے اپنا معتقد، مرید اور پھر مطیع ومنقاد بنالیا۔ لوگوں سے نذر ونیاز، نذرانے، صدقات وخیرات وصول کرنے اور طرح طرح سے ان کا استحصال کرنے کی خاطر "آزروں" نے دین میں طرح طرح کی رسوم وبدعات کو رواج دیا۔ اس کے نتیجے میں لوگ ان کے حلقہ بگوش بن کر رہ گئے۔ چنانچہ ہر زمان ومکان میں نبوّت کا بنیادی مقصد اللہ تعالیٰ کے بندوں کو آزروں کے طوقِ بندگی اور سلاسلِ رسوم سے رہائی دلانا تھا۔ آذری طبقہ اپنے خصائلِ خمسہ سے بآسانی پہچانا جاتا ہے، اور وہ یہ ہیں؛

ایک یہ کہ وہ مشرک اور اسمآء پرست ہوتا ہے۔ اسمآء پرستی سے مراد اکابر پرستی، بت پرستی، مزار و آستانہ پرستی، مظاہر پرستی اور نفس پرستی ہے۔

دوسرے، خرقۂ سالوس میں ملبوس ہوتا ہے۔

تیسرے، بیکار و تن آسان اور خوشامد پسند ہوتا ہے، محنت سے عار محسوس کرتا اور اسے بنظرِ حقارت دیکھتا ہے۔

چوتھے، اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا اور معزز و مخدوم اور دوسروں کو اپنا خادم و محکوم اور حقیر و ذلیل سمجھتا ہے۔

پانچویں، مزاروں کی مجاوری کرنا، چڑھاوے اور نذر و نیاز وصول کرنا، لوگوں سے بیگار لینا اور ان کا طرح طرح سے استحصال کرنا، اِن کا شعار ہوتا ہے۔

آذری طبقے سے تین دوسرے استحصالی سرطانی طبقوں کا ظہور ہوا، جن کے لیے ہم نے قرآنِ مجید سے فرعونی، ہامانی اور قارونی طبقات کی تعبیریں مستعار لی ہیں۔ ان چاروں استحصالی سرطانی طبقوں نے محنت کی تذلیل و تحقیر کی، محنت کشوں کو اپنا محکوم و غلام بنایا، ان کا استحصال کیا اور ان کے خون سے اپنی پرورش کی اور دادِ عیش دی۔ اصل یہ ہے کہ یہ چاروں طبقے معاشرتی سرطان ہیں اور سود خور ہیں، اگرچہ ان کے سود کی صورتیں اور نام مختلف ہیں اور یہ بھی ان کے فنِ تسمیہ بالباطل کا کرشمہ ہے مثال کے طور سے آذروں کا سود "نذرانہ" ہوتا ہے اور اس کے متعدد نام ہیں۔ بقول علّامہ اقبال

نذرانہ نہیں سود ہے پیرانِ حرم کا
ہر خرقۂ سالوس کے اندر ہے مہاجن

قارون بھی مختلف ناموں سے سود لیتے ہیں۔ مثلاً اراضی کے ذریعے "مزارعت" کے نام سے، جائیدادِ غیر منقولہ کے ذریعے کرائے، ٹھیکے، پگڑی، کاروباری شہرت کے معاوضے (GOOD WILL) اور صنعتی و حرفتی اور تجارتی ہنرمندی کے معاوضے کے نام سے، بینکاری و سرمایہ کاری کے ذریعے

مضاربت و منافع کے نام سے ۔ ہامانِ عموماً رشوت، جاگیروں ، مناصب و مراعات کی صورت میں سود لیتے ہیں۔ فرعون خزانۂ عامرہ سے شاہی وظائف و مراعات کی شکل میں سود لیتے ہیں۔

کسی معاشرے میں ان چار استحصالی ۔ سرطانی طبقوں کی موجودگی اس حقیقت کی غماز ہوتی ہے کہ قوم کا وجود سرطان زدہ ہے ۔ یہ سامنے کی بات ہے کہ سرطان زدہ شخص کو ایک تو خوفِ مرگ اور دوسرا غمِ ذات ہوتا ہے، اور تیسرے کربِ مسلسل کے سبب زندگی اس کے لیے سوہانِ روح بن جاتی ہے ۔ علاوہ بریں ، چونکہ سرطان کا علاج ہی یہ ہے کہ سرطان زدہ اجزائے بدن کو بیخ و بُن سے کاٹ کر نکال باہر کیا جائے، لہٰذا اس کے لیے عملِ جراحی ناگزیر ہوتا ہے، جس کے لیے ہم نے "حُسنِ انقلاب" کی تعبیر اختیار کی ہے ۔ حُسنِ انقلاب سے مراد یہ ہے کہ معاشرے میں ان چاروں سرطانی طبقوں کا استیصالِ کُلّی کر دیا جائے اور ہر فرد کو اس کے طبعی تقاضے اور مشیّت الٰہی کے مطابق محنت کش بنا دیا جائے ، چاہے ایسا کرنے کے لیے طاقت کا استعمال ہی کیوں نہ کرنا پڑے ۔ جس طرح فرسودہ اور کار از رفتہ عمارت کی تعمیرِ نو کے لیے اس کی تخریب و بیخ کنی ناگزیر ہوتی ہے ، اسی طرح کسی فرسودہ و سرطان زدہ معاشرتی نظام کی تشکیلِ جدید کے لیے اس کا بیخ و بُن سے اُکھاڑنا لابدی ہوتا ہے تاکہ وہ معاشرتی سرطانوں سے پاک و صاف ہو جائے اور ان کے دوبارہ نشوونما پانے کے امکانات مفقود ہو جائیں ۔ یہ انقلاب خونچکاں کیوں نہ ہو، چونکہ اپنے ساتھ حُسنِ زندگی اور امن و سلامتی لاتا ہے، اس لیے حسین ہوتا ہے ۔

کیا یہ ظُلم و جہل نہیں کہ جو لوگ محنت و مشقّت کریں ، ربّ ذوالجلال والاکرام کی ودیعت کردہ پیداواری صلاحیتوں کو کام میں لائیں ، کارکنانِ قدرت کے ساتھ تعاون کریں اور زرعی اور صنعتی و حرفتی دولت پیدا کریں وہ تو محروم و مفلوک الحال رہیں ، آب و نان اور لباس و مکان کو ترسیں ، نیز اپنے بچوں کی پرورش کر سکیں نہ انہیں تعلیم و تربیت ہی دلا سکیں ، لیکن قومی پیداوار اور دولت پر قبضہ و تصرّف ان کا ہو جو خود محنت کریں نہ کچھ پیدا کریں ، بلکہ دولت آفریں محنت کشوں کو

ذلیل و حقیر اور اپنا خادم و حلقہ بگوش سمجھیں۔ ایسے ہی غاصب و بیکار لوگ اصطلاحِ قرآنی میں ظلوم و جہول ہیں، جن کے لیے ہم نے فرعون و ہامان اور قارون و آزر کی قرآنی تلمیحات اختیار کی ہیں۔

یا در کھو! ظلم و استحصال کا آغاز اگر فقدانِ محنت سے ہوا تھا تو ان کا اختتام بیکار و خون آشام معاشرتی سرطانوں کے استیصال و فقدان سے ہوگا، اور ایسا حسنِ انقلاب ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ حسنِ انقلاب کے لیے سب سے پہلے محنت کشوں کے دلوں میں شعورِ ظلم و احساسِ زیاں پیدا کرنا، نیز ان میں حسن و زندگی کی آرزو کو زندہ و فعال کرنا ہوگا۔ بعد ازاں، عصائے کلیمیؑ سے کام لینا ہوگا یا سیفِ رحمۃ للعالمینؐ سے۔

تاریخ شاہد ہے کہ حضرت محمدؐ رسول اللہ علیہ وسلم ہر زمان و مکان کے عظیم، کامل اور مثالی انسان ہیں۔ قرآنِ مجید کی زبان میں آپؐ رحمۃ للعالمین اور صاحبِ خُلقِ عظیم ہیں اور آپؐ کی سیرتِ طیبہ میں ہر زمان و مکان کے انسان کے لیے زندگی کرنے کا مثالی نمونہ (= اسوۂ حسنہ) ہے۔ آپؐ کی سیرتِ حسنہ ہمیں اس حقیقت کی یاد دلاتی ہے کہ "انسان کی عظمت و کامیابی اور رحمۃ للعالمینؐ کا راز محنت ہے، پیہم و مدام محنت و مشقت"۔

حاصلِ کلام یہ کہ محنتی و جفاکش اور مجاہد و صابر انسان ہی صالح، بندۂ رحمٰن اور حیات و اِلٰہ کی راہِ مستقیم پر گامزن ہوتا ہے؛ نیز وہی فاتحِ کائنات اور معمارِ جہان ہوتا ہے۔

مقام ۱۵

فلسفۂ ترجیحات

کتاب میری ناظورۂ حیات اور قلم میرا ہمدم و ہمراز ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کتاب مجھے "دوست" کی باتیں سناتی ہے تو قلم "دوست" کی باتیں لکھتا ہے۔ "دوست" کی "الکتاب" آئینۂ "دوست" بھی ہے اور آئینۂ حسن و حیات بھی ہے۔ "دوست" مخاطب ہو تو قلم کلیم ہوتا ہے۔ یہ راز دانایانِ راز ہی جانتے ہیں کہ "الکتاب" و "قلم" "دوست" کی ہم نظری و ہمکلامی کا وسیلہ ہیں؛ نیز ان سے ذوقِ سمع و نظر کی تسکین ہوتی اور جمالیاتی ثروت ملتی ہے۔ ایک اور بھی میری رفیقۂ حیات و ہمسفر ہے اور وہ ہے میری تخلیقی فکر، جو مجھے عالمِ معانی کی سیر کراتی ہے۔

ایک دن میں عالمِ حسنِ معانی میں اس کے ساتھ سیر میں مشغول تھا کہ عقل نے پوچھا: ایسا کیوں ہے کہ زندگی کے ہر موڑ اور چوراہے پر انسان کو سوچنا پڑتا ہے کہ اُسے کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیے؟ ہر مرحلے پر وہ سوچتا ہے کہ اُسے پہلے کیا کرنا چاہیے؟ انتخاب کا مرحلہ ہو تو وہ سوچتا ہے کہ اُسے کون سی چیز منتخب کرنی چاہیے؟ انتخاب کے وقت آدمی عموماً ڈرتا ہے کہ

کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ایسا نہ ہو جائے

سوچ نے مجھے اندیشہ ہائے گوناگوں میں مبتلا کر دیا۔

کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں اس دُنیا تنہا ہوں۔ آج بھی مجھے ایسا محسوس ہوا، جیسے میرا کوئی کوئی ہم زبان و ہمراز نہیں، رفیقِ سفر نہیں، حُدی خوان و دلیلِ راہ نہیں۔ دل کی بات کروں تو کس سے؟ کچھ پوچھوں تو کس سے؟ کوئی دانائے راز ملتا نہیں۔ ایسا کیوں ہے کہ میں دُنیا میں اکیلا ہوں؟ میں سوچنے لگا۔ سوچ کی جہت بدل گئی، لیکن اتنے میں سروش کی آوازِ جانفزا آئی:

اے رہ نوردِ شوق! تم تنہا نہیں ہو۔ تنہا وہ ہوتا ہے جو اپنے نفس اور اپنے اِلٰہ و ربّ سے بیگانہ و دُور ہو، لیکن جو شخص خود آگاہ و خود دوست اور خدا آگاہ و خدا دوست ہو، وہ اپنی ذات میں انجمن ہوتا ہے، ویرانہ ہو یا کُنجِ عزلت، وہ تنہا نہیں ہوتا۔ جس خوش نصیب کی دُنیا الحسن سے، جو اس کا معروضِ حُسن و محبّت اور ربِّ ذوالجلال والاکرام ہے، معمور ہو اور وہ خود بھی اس میں آباد ہو، وہ ویران و خالی کیسے ہو سکتی ہے؟ اس میں رہنے والا تنہا کیسے ہو سکتا ہے؟ انسان تنہا تب ہوتا ہے جب وہ اپنے آپ اور اپنے اِلٰہ و ربّ سے دُور ہو جائے یا اپنی دُنیا سے خود بھی نکل جائے اور اُسے بھی نکال دے۔ ایسی خالی و بے آباد دُنیا شیطنت اور خوف و حزن کے چھلاووں کی جولانگاہ بن جاتی ہے۔ انسان یہ راز سمجھ لے تو تنہائی کے عذاب سے بچ سکتا ہے۔ آدمی کا دل "دوست" کی محبت سے آباد ہو تو وہ اس کے قرب و وصال کی خاطر "تنہائی" چاہے گا، کیونکہ بقول شاعر ؎

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اپنے معروضِ حُسن و محبّت سے باتیں کرنے کے لیے تنہائی بھی ضروری ہے۔ اس کے ساتھ باتیں کرنے سے جمالیاتی ثروت ملتی ہے، اس لیے کہ وہ الحسن ہے۔ آدمی اپنے آپ سے بھی باتیں کرنا چاہتا ہے اور کرتا ہے، لیکن اس سے وہ کچھ ملتا ہے جو اس کی دنیا میں ہوتا ہے۔ اس کی دنیا حسین ہو تو حسنہ اور قبیح ہو تو سیّئہ ملتی ہے

حسنہ اگر طمانیت و مسرّت اور قرّۃ العین ہے تو سیئہ آتشِ خوف و حزن ہے، جو محسوس تو ہوتی ہے مگر دکھائی نہیں دیتی۔ معلوم ہوا "محسوس" غیر مادّی و غیر مرئی بھی ہوتا ہے۔ آوازِ سروش بند ہوئی تو رہوارِ فکر اپنی پہلی جہت پر آگیا اور میں سوچنے لگا: انتخاب کا مرحلہ عقل و فکر کے لیے زبردست چیلنج اور زندگی کے لیے انتہائی خطرناک ہوتا ہے۔ یہ درست ہے کہ صحیح انتخاب انسان کے لیے وجۂ مسرّت و کامیابی ہوتا ہے، لیکن غلط انتخاب کا نتیجہ تو ناکامی و نامرادی اور بعض اوقات انتہائی مضرت رساں اور مہلک ہوتا ہے۔ بعض اوقات غلط انتخاب کا خمیازہ عمر بھر اور دارالآخرت میں بھی بھگتنا پڑتا ہے؛ نیز اس کے نتیجے میں مسافر اپنی منزل سے دور اور بہت دور نکل جاتا ہے۔ دفعتاً مجھے قمی کا یہ شعر یاد آگیا:

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

یہ شعر گنگناتے میرے دل میں یہ سوال پیدا ہوا: "کیا انتخاب ابتلائے زندگی نہیں؟ اگر ہے تو کیا یہ جبر نہیں؟ آواز آئی:

"نہیں، "انتخاب" جبر نہیں، آزادی ہے۔ یہ آزادی انسان کی مابہ الامتیاز خصوصیت ہے جو اسے دیگر مخلوقات سے ممیز کرتی اور ان پر فوقیت دیتی ہے، نیز وجۂ شرفِ انسانی ہے۔ یاد رکھو! آزادیِ انتخاب کا مسئلہ دراصل ترجیحات کا مسئلہ ہے۔ اسے سمجھنے کی خاطر پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ انسان کو انتخاب یا ارادہ و اختیار کی آزادی جبر و اکراہ سے نہیں بلکہ اس کی رضا و رغبت سے ودیعت کی گئی ہے۔ تم معلوم کر چکے ہو کہ ارادہ و اختیار، فکر و عمل اور انتخاب و ترجیح کی آزادی اللہ تعالیٰ کی امانت ہے، جس کے منفی نتائج و عواقب سے ڈر کر سب مخلوقات نے اس کے بارِ گراں کو اٹھانے سے معذرت کر لی، لیکن عجلت پسند، جائع آزما اور خطر پسند انسان نے اپنی آرزوئے حسن و زندگی کے سبب اسے اٹھانا منظور کر لیا۔ بلاشبہ اس آزادی کے نتائج و عواقب جتنے حسین و سرور انگیز ہیں، اتنے قبیح اور خوف آفرین و

غم انگیز بھی ہیں، لہٰذا آزادی کے استعمال میں جلد بازی سے نہیں، بلکہ انتہائی حزم و احتیاط اور دوُر اندیشی سے کام لینا لابدی ہے۔ یہ سنّتِ پیغمبریؐ ہے۔ بالفاظِ دیگر، یہ اللہ تعالیٰ کے انعام یافتہ بندوں (= نبییّن، صدیقین، شہدآ اور صالحین) کا شعارِ زندگی ہے، جو حقیقت میں مردانِ کاملؒ اہلِ حسن و سرور، عظیم و کامیاب اور مثالی انسان ہیں۔

انتخاب و ترجیح ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں اور ان کا ایک ہی مسئلہ ہے، جو حیاتِ انسانی کا اہم ترین مسئلہ ہے۔ جیسا کہ تم جانتے ہو یہ مسئلہ انسان کو سب سے پہلے جنّت میں "شجرِ ممنوعہ" کی لذّت سے آشنا ہونے کے وقت پیش آیا۔ اس کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ اس واقعیت سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس سے انسان کی حیاتِ ارضی کا آغاز ہوا تھا اور انسان میں اس مسئلے کی غیر معمولی اہمیت کا شعور پیدا کرنا مقصود تھا۔ بہر کیف، اس وقت آدم کے سامنے ایک تو اللہ تعالیٰ کا حکمِ امتناعی تھا اور دوسری چیز اس حکم کی تاویلِ ابلیسی تھی۔ ان دو میں سے ایک چیز کو منتخب کرنا تھا۔ بالفاظِ دیگر، کسی ایک چیز کو دوسری پر ترجیح دینا تھی۔ آدم کا انتخاب، فیصلہ یا ترجیح غلط تھی۔ اس کا نتیجہ اس کا ہبوط تھا، جنّت کی کُلفت ناآشنا، معصوم و حسین زندگی کے بدلے، خوف و خطر، جنگ و جدال اور رنج و محن کی دُنیا کی محنت طلب و صبر آزما زندگی تھی۔ دیدۂ نصیحت آموز سے دیکھو تو ہبوطِ آدم کی داستانِ عبرت آموز فلسفۂ ترجیحات کی آئینہ دار ہے۔ ایک غلط ترجیح، ایک غلط انتخاب اور ایک غلط فیصلہ اور ایک غلط اقدام حیاتِ انسانی کو جنّت سے محروم اور رہینِ محنت و آلام کر گیا۔ پہلے کی طرح انسان اب بھی ایسا کرتا ہے اور ہمیشہ کرتا رہے گا۔ یہی قصۂ ہبوطِ آدم کا مرکزی خیال ہے۔

ماں بچہ جنتی ہے تو اس کے سامنے دو متبادلات ہوتے ہیں: بچے کی پرورش یا اپنا آرام۔ ان میں سے اُسے ایک کو ترجیح دینا ہوتی ہے۔ یہ مسئلہ معمولی نہیں از بس اہم ہے، کیونکہ یہ بچے کی معنوی حیات و موت کا مسئلہ ہے؛ نیز یہ والدین، معاشرے، قوم و ملّت اور بنی نوع انسان کے لیے بھی از بس اہمیت رکھتا ہے۔ یہ دراصل ترجیحات کا مسئلہ ہے، جو اس سے

بہت زیادہ اہم ہے، جتنا سمجھا جاتا ہے۔ ماں کی یہ ایک غلط ترجیح یا ایک غلط انتخاب اور اقدام ازیں دُور رس منفی نتائج کا حامل ہوسکتا ہے۔ مغرب میں بالخصوص اور مشرق میں بالعموم نژادِ نو کی دین سے بیگانگی، خدا و خودی سے کم آگاہی، قدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل اور آخرت سے بے پروائی و بے نیازی، نیز اس کی جنسی بے رہروی و عریانی، فحشا و منکرات سے دلبستگی، کوروذوقی و حسن کوری، اور بدکرداری و سیاہ کاری کا ایک اہم سبب ماں کا پرورشِ اولاد پہ اپنے دیگر مشاغل کو ترجیح دینا ہے۔ ماں کی اس غلط ترجیح کے باعث معاشرۂ انسانی میں فحشا و منکرات اور جرائم و فساد کی گرم بازاری ہے؛ نیز انسان کا رشتہ اپنے والدین، خاندان، معاشرے، خدا اور خودی سے قریب قریب منقطع ہوگیا ہے یا برائے نام رہ گیا ہے۔ اسی کے نتیجے میں وہ اس بھری دُنیا میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا اور خوف و حزن کا شکار ہوگیا ہے۔ اس کا ضمنی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ وہ آتشِ خوف و حزن اور احساسِ تنہائی کی اذیتوں سے چھٹکارا پانے کے لیے ہوش و خود آگاہی پہ مدہوشی و بےخودی کو ترجیح دینے لگا ہے چنانچہ دُنیا میں مُسکّن ادویہ و منشیات اور دیوانگی و خودکشی کے فروغ کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے۔

اس گفتگو سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بیجا نہ ہوگا کہ ماں کی اس غلط ترجیح کا مطلب اپنی اولاد کی آرزوئے حسن و زندگی کو زندہ و فعّال کرنے کی ذمے داری سے دستبردار ہونا ہے اور یہ اقدام قتلِ انسانی کے مترادف ہے۔

اس میں شک نہیں کہ بچوں میں آرزوئے حسن و حیات پیدا کرنا والدین اور اساتذہ کی ذمے داری ہے، لیکن بچوں میں آرزوئے حسن و حیات قدرت کی طرف سے استعداد کے طور پر ودیعت ہوتی ہے اور ان میں اپنی ذمے داری کا احساس و شعور اور ارادہ و اختیار کی آزادی بھی ہوتی ہے، لہٰذا جو بچے تعلیم و تربیت حاصل کرنے پہ کھیل کود کو اور محنت کرنے پہ کاہلی و تضییعِ اوقات کو ترجیح دیتے ہیں، وہ اپنی ناخواندگی و بے ہنری اور محرومیِ عقل و دانش

کے خود بھی ذمے دار ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں اس زیاں کاری کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑتا ہے۔

شباب ایک تو جذبات کی گرمی و توانائی اور معانی و ہیجان خیزی کا اور دوسرے جنسی وازدواجی ترجیحات کے مسائل کے پیدا ہونے کا عہد ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے عہدِ شباب انتہائی خطرناک، صبر آزما اور بعض اوقات تشکیب رُبا بھی ہوتا ہے۔ اس کی مثال پلصراط ایسی ہے۔ جو شخص صحیح ترجیح و اقدام کی بدولت اس سے کامیاب گزر گیا وہ اپنی منزلِ مقصود پہ پہنچ گیا، اور جو اپنی غلط ترجیح و اقدام کے سبب پھسل گیا، وہ ناکامی و نامرادی کے جہنم میں گر گیا۔ اس عہد میں ہر مسئلہ ترجیح کو جذبات کے بجائے عقل سے حل کرنے میں سلامتی و کامیابی کا راز مضمر ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جذبات کے تلاطم میں پلصراط سے پھسل کر گر جانے کا ہر دم خطرہ لاحق رہتا ہے۔ چنانچہ جذباتی ترجیح نہ صرف شباب بلکہ کسی عہد میں بھی معتبر نہیں ہوتی۔

میں اس سلسلے میں ایک فکر انگیز نکتے کی طرف اشارہ کر دینا چاہتا ہوں۔ انسان اور حیوان میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ صرف انسان میں قدرت نے حسّی، قلبی، نفسی نظام ودیعت کیا ہے جو اس میں بالقوہ موجود ہوتا ہے اور اس میں ارتقاء کے لامحدود امکانات ہوتے ہیں۔ یہاں جملہ معترضہ کے طور پہ ایک اور فکر انگیز نکتے کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے کہ توحید، جو دین کا اصل الاصول ہے، اس کی رُو سے صرف اور فقط اللہ ہی واحد ہے؛ یعنی ایک اور تنہا ہے۔ اس کی ضد یہ ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی مخلوق تنہا نہیں، بلکہ زوجین ہے، یعنی جوڑا جوڑا ہے۔ اپنے موقف پہ ہم اللہ تعالیٰ کے قانونِ تزویج اور اس کی تخلیقی فعلیت سے بھی استشہاد کر سکتے ہیں جو جالیاتی تزویجی ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ انسان کا اوّلین جرثومہ حیات جس کی نمو پانی میں ہوئی، صوری اعتبار سے تو فردِ واحد تھا، لیکن اصل میں ایک نہ تھا، بلکہ اس میں اس کا زوج موجود تھا، جس میں اپنی انفرادیت و آزادی

کی آرزو و جستجو تھی۔ چنانچہ قدرت نے اپنے قانونِ احترامِ آرزو کے مطابق اُسے اپنی اصل سے جدا ہونے کی ہدایت و توفیق عطا کردی۔ اس طرح ایک اصل سے دو منفرد و مشخص وجود بصورتِ بشر منصۂ شہود پر آئے اور آدم و حوّا یا مرد و زن کہلائے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ انسان کے اوّلین جرثومۂ حیات میں ایک تو وحدت میں ثنویت اور دوسرے حسّی، قلبی، نفسی نظام ودیعت تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انسان ہر شکل و صورت اور زمان و مکان میں اپنے آپ کو عاقل و دانا بلکہ دوسروں سے زیادہ عقلمند سمجھتا رہا ہے، سمجھتا ہے اور سمجھتا رہے گا اور اسی بنا پر وہ اپنی ترجیح یا انتخاب کو جذباتی نہیں، عقلی فیصلہ سمجھتا ہے، یا کم سے کم جذباتی۔عقلی سمجھتا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں اُسے یہ باور کرانا محال نہیں تو ازلیس دشوار ضرور ہوتا ہے کہ اس کی ترجیح یا ترجیحات محض جذباتی ہیں، لہٰذا قابلِ تغیّر و تبدّل تو ہیں، لیکن قابلِ اعتماد و معتبر نہیں۔ انسان جانتا ہے پر مانتا نہیں کہ احوال و ظروف کے بدلنے کے ساتھ جذبات میں بھی تغیّر و تبدّل ہوتا رہتا ہے، جو شدید و مفاجاتی ہو تو وہ اپنی اہم سے اہم ترجیح کو غلط یا ناموزوں سمجھ کر بدل ڈالتا ہے، چاہے اس کا یہ فیصلہ طلاق و فراق، منافرت و مخاصمت اور خودکشی و بربادی پر ہی منتج کیوں نہ ہوتا ہو۔

جذباتی معروضات متعدّد اقسام کے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور سے وہ معروضاتِ حُسن و محبّت بھی ہوتے ہیں اور معروضاتِ قُبح و نفرت بھی، اور ان سب میں عقل کو ماؤف کردینے کی قابلیت ہوتی ہے۔ چنانچہ شدّتِ محبّت و عصبیّت ہو یا شدّتِ نفرت و غضب، شدّتِ طمع و ہوس ہو یا شدّتِ بُخل و غیظ، یہ جذبات کی ہیجان خیزی و تموّج کی حالت ہوتی ہے، جس میں عقل مغلوب الجذبات ہو کر صحیح فیصلہ کرنے کے قابل نہیں رہتی، لہٰذا اس قسم کی صورتِ حال میں، اپنی ترجیحات سے متعلق کوئی فیصلہ کرنا قرینِ صواب نہیں ہوتا اور نہ اسے دانشمندی پر محمول ہی کرسکتے ہیں۔ عائلی و خاندانی تنازعات و مناقشات ہوں یا معاشرتی برائیاں

فحشاء و منکرات ہوں یا ظلم و جرم کی وارداتیں ان کے محرکات و عوامل عموماً غلط ترجیحی فیصلے ہوتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر، جرم و گناہ اور ظلم و فساد کا محرک و عامل عموماً غلط ترجیحی فیصلہ ہوتا ہے۔ اسے جزئیات ؐ کا اصل الاصول کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔

موقع و محل کے مطابق صحیح ترجیحی فیصلے ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی میں غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں اور ایسے فیصلے کرنے کے لیے جذبات میں سکون اور ٹھنڈک کا ہونا ناگزیر ہے۔ ایک صحیح ترجیحی فیصلے سے جہاں انسان کی انفرادی، خاندانی اور قومی زندگی ظفر و کامیابی اور خوشحالی و ترقی سے ہمکنار ہو سکتی ہے، وہاں ایک غلط ترجیحی فیصلے سے وہ خوف و حزن، ذلت و مسکنت اور ہلاکت و بربادی کا شکار ہو جاتی ہے۔ ٹریفک کے حادثات کا سبب عموماً غلط ترجیحی فیصلہ ہوتا ہے۔ طلباء و طالبات کی کامیابی و ناکامی کے ذمے داران کے صحیح و غلط ترجیحی فیصلے ہوتے ہیں۔ قلم و کتاب پر اپنے جذباتی معروضات کو ترجیح دینے والے علم سے محروم اور بے نیلِ مرام رہتے ہیں، جبکہ قلم و کتاب کو ترجیح دینے والے امتحانوں میں کامیاب ہوتے، علم کی ثروت حاصل کرتے اور نام پیدا کرتے ہیں۔

جنسی آزادی اور تعیش پسندی کے اس دور میں آناً فاناً امیر بن جانے کی خواہش اور تکاثر کی بیماری نے عالمگیر وبا کی صورت اختیار کر لی ہے۔ دولت کی طلب و جستجو میں جب کوئی شخص وقت کا راستہ کاٹ کر غلط سمت یا غیر صالحہ جہت سے اس کے آگے نکل جانے کا فیصلہ کرتا ہے، وہ کامیاب ہو جائے یا ناکام رہے، مجرم ضرور بن جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کا یہ ترجیحی فیصلہ غلط ہوتا ہے۔ غلط اور سیدھے راستوں میں یہ فرق ہے کہ غلط راستے نشیبی، سرابی، دلدلی، خطرناک، خوف افزا و غم انگیز ہوتے ہیں، جبکہ سیدھا راستہ ہمت طلب و صبر آزما ہونے کے باوجود صعودی و ارتقائی اور طمانیت انگیز ہوتا ہے۔ جمالیاتی تخلیقی فعلیت محنتِ شاقہ، تفکرِ مسلسل اور خونِ جگر چاہتی ہے، لیکن جہالِ قلم و فن راتوں رات مشہور ہو جانے کی طلب و جستجو میں جمالیاتی تخلیقی فعلیت کے ان لوازم پر تن آسانی ؔ

خوشامد پسندی اور قلم فروشی وضمیر فروشی کو ترجیح دیتے ہیں، وہ سستی اور ہنگامی شہرت حاصل کرنے میں کامیاب ہو بھی جائیں، لیکن کوئی ادبی وفنی شہکار تخلیق کر سکتے ہیں، نہ کامیاب و عظیم اہلِ قلم وفن ہی بن سکتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان کا یہ ترجیحی فیصلہ غلط ہوتا ہے۔

دُنیا کے عظیم انسانوں کے سوانح حیات ہمیں یہ حقیقت یاد دلاتے ہیں کہ ان کی عظمت و کامیابی کا راز یہ تھا کہ وہ صحیح اور برمحل ترجیحی فیصلے کرنے کا داعیہ و ملکہ رکھتے تھے۔ بخلاف اس کے شکست و ناکامی، ظلم و جرم اور غدّاری وفساد کے عبرتناک واقعات غلط ترجیحی فیصلوں کے نتائج وعواقب ہوتے ہیں۔ انسان سوچے تو خیر و شر، حسنہ وسیّئہ، کامیابی و ناکامی اور فتح و شکست کے مسائل دراصل ترجیحات کے مسائل ہیں۔ چونکہ یہ غایت درجہ اہم ہوتے ہیں، لہٰذا انہیں حل کرتے وقت ایک تو انسان مغلوب الجذبات نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اس کے جذبات میں سکون و خنکی ہونی چاہیے۔ دوسرے، اسے قائم بالقسط ہو کر سوچنا اور ترجیحی فیصلہ کرنا چاہیئے۔ تیسرے خود غرضی و بخل سے کام لینے کے بجائے اسے ایثار و قربانی اور اولوالعزمی وفتوّت کا مظاہرہ کرنا چاہیے، اور چوتھے، اس کے دل میں آرزوئے حسن و زندگی زندہ و فعّال اور دماغ میں عقلِ سلیم ہونی چاہیے۔

جملہ معترضہ کے طور سے یہاں ایک اہم نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ اگر علم انسان میں زندگی کی مثبت ومنفی اقدار کے شعور سے عبارت ہے تو حکمت یہ ہے کہ اس میں صحیح اور برمحل ترجیحی فیصلے کرنے کا ملکہ و داعیہ ہو۔ چونکہ یہ ملکہ بغیر علم کے پیدا نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ حکمت کو علم مستلزم ہے۔ دوسرے لفظوں میں، انسان بغیر علم کے حکیم نہیں بن سکتا اور علم ہر حال میں حکمت کی پیش شرط ہے۔

حاصلِ کلام یہ کہ حیاتِ انسانی میں ترجیحی فیصلوں کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور انسان کو صحیح اور برمحل ترجیحی فیصلہ کرنے کے لیے حکمت ناگزیر ہے اور حکمت کو علم مستلزم ہے لہٰذا انسان کو دُنیوی و اُخروی کامیابی و حسنہ حاصل کرنے کے لیے علم و حکمت کا سیکھنا ناگزیر

ہے۔ اس سے یہ از بس اہم ضمنی نتیجہ مستنبط ہوتا ہے کہ تعلیم کا مقصد انسان میں آرزوئے حسن و زندگی کو زندہ و فعال کرنا، اس میں خیر و شر، حسنہ و سیئہ، سود و زیاں اور کامیابی و ناکامی کا شعور بیدار کرنا اور اس میں صحیح اور برمحل ترجیحی فیصلے کرنے کا داعیہ و ملکہ پیدا کرنا ہے۔

اقوامِ عالم کے عروج و زوال کے عوامل کا تجزیہ کریں تو اس حقیقت کا سراغ ملتا ہے کہ جو قومیں جب تک مقابلۃً اہم تر امور کو ترجیح دیتی رہیں اور ترجیحات سے متعلق درست فیصلے کرتی رہیں، وہ خوشحالی و ترقی کی راہ میں گامزن رہیں، لیکن جب وہ غیر ضروری یا کم ضروری امور کو اہم یا اہم تر امور پر ترجیح دینے لگیں اور ترجیحات سے متعلق غلط فیصلے کرنے لگیں تو ان کے انحطاط و زوال کا آغاز ہو گیا۔ اسلام سمیت ادیانِ عالم کی تاریخ اس حقیقت کی آئینہ دار ہے کہ شریعت میں غیر اہم یا کم اہم امور کو اہم یا اہم تر امور پر ترجیح دینے سے ان میں تشتّت و افتراق پیدا ہوا، فرقہ سازی کا آغاز ہوا اور دین کے عقائدِ جلیلہ محرّکہ پر اوہام و ظنون کو فرائض پر نوافل و بدعات کو تفوّق حاصل ہو گیا۔ اس کے نتیجے میں توحید جو دین کا اصل الاُصول ہے، اس کی جگہ شرک، بدعت اور بت پرستی کی مختلف صورتوں نے لے لی۔ اصل یہ ہے کہ اسلام میں فرقوں، بدعتوں اور شرک و بت پرستی کی مختلف صورتوں (مثلاً قبر و پیر و اکابر پرستی اور شبیہ پرستی وغیرہ وغیرہ) کا ظہور بھی ملّتِ اسلامیہ کی غلط ترجیحات کا نتیجہ ہے۔ دین کے اِحیاء و اصلاح کا مسئلہ دراصل ترجیحات کا مسئلہ ہے، لہٰذا ملّتِ اسلامیہ کو سب سے پہلے یہ مسئلہ قرآن و سنّت کی روشنی میں خارجی و داخلی احوال و ظروف کی مقتضیات کے مطابق حل کرنا ہو گا۔

حواشی

۱۔ جرمیات : Criminology

مقام ۱۶

تسمیہ بِالباطل

جس شخص کے شب و روز تفکّرِ پیہم میں گزریں وہ تو یہی سوچے گا کہ زندگی بجز فکرِ مسلسل کچھ بھی نہیں۔ فکر حقیقت میں آرزو ہی تو ہے۔ آرزو ہو تو فکر بھی ہوتی ہے۔ نفس کا کام پیہم تخلیقِ آرزو ہے، لہٰذا وہ مسلسل سوچتا رہتا ہے، کبھی کچھ، کبھی کچھ۔ فرخندہ و سعید ہے وہ نفس جو آرزوئے حسن و زندگی رکھتا ہے اور اسے حُسن و زندگی کی فکر ہوتی ہے۔ صحت و تندرستی کی آرزو ہو تو آدمی بیماریوں سے بچاؤ کے متعلّق سوچتا ہے۔ حسنہ کی آرزو ہو تو وہ سَیّئہ سے بچنے کی فکر کرتا ہے۔ ایک دن میں حسن و حیاتِ طلب کے دُزدِ سرطانی شرک سے متعلق سوچ رہا تھا کہ وہ یعنی شرک کیا ہے؟ اس کا آغاز کب، کیوں اور کیسے ہوا؟ یہ ظُلمِ عظیم اور ناقابلِ معافی جُرم کیوں ہے؟ اس کے نتیجے میں کیوں جہنم کی آتشِ سوزاں میں اس اذیت سے جلنا ہے کہ نہ مرنا ہے نہ جینا ہے۔ آدمی اللہ تعالیٰ کو اپنا اِلٰہ و ربّ مانتے ہوئے کیوں غیر اللہ کی پرستش کرتا، اُسے سمیع و مستجیب الدّعوات سمجھتا اور اس سے امداد اور مرادیں مانگتا ہے؟ میں اس سوچ میں مستغرق تھا کہ ندائے سروش آئی:

اے سوچنے والے! سنو! تمہیں راز کی بات بتاتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ اسے

سن کر تم حیران ہو گے اور تمہاری حیرت رنگِ تشکیک و عرفان سے مزین ہو گی، لیکن بات حق و اہم ہے، لہٰذا سزاوارِ التفات و تفکر ہے۔ گوشِ حق نیوش سے سنو! شرک ذاتِ انسانی کا سرطان ہے۔ ایک تو وہ اس کے حسن و حیات کو کھا جاتا ہے، اور دوسرے اسے پارہ پارہ کر دیتا ہے، جس کے نتیجے میں اس کے احیاء و ارتقاء کے امکانات مفقود ہو جاتے ہیں؛ نیز آتشِ خوف و حزن میں جلنا، پھر مرنا نہ جینا انسان کا مقدر بن جاتا ہے۔ شرک حقیقت میں خود ظلمی و خود سوزی اور نفیِ خودی و خدا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ربّ العالمین نے اسے ظلمِ عظیم اور ناقابلِ عفو جرم قرار دیا ہے۔

شرک و بت پرستی کی ابتداء اس وقت سے ہوئی جب انسان کو "تسمیہ بالباطل" کا فن آیا۔ اس اصطلاح سے مراد اسم بے مسمّٰی رکھنے کا فن ہے، یعنی کسی شخص یا چیز کو ایسے نام سے موسوم کرنا جس کا وہ مسمّٰی نہ ہو، بالفاظِ دیگر، اس کی ذات میں اس نام کی معنویت نہ ہو، مثال کے طور پر سورج دیگر اجرامِ فلکی کی طرح ایک سیارہ ہے۔ انسان نے اپنے عہدِ طفولیت میں اس کی عظمت و رفعت اور جلالت و آب و تاب کو دیکھا اور سوچا تو اس سے مرعوب ہو کر ڈر گیا۔ اگرچہ اس کی یہ مرعوبیت و خشیت بے اصل و باطل تھی، لیکن انسان کے دل میں گھر کر گئی اور اس کے نتیجے میں وہ اسے مافوق الفطرت ہستی سمجھ کر اس کے آگے سربسجود ہو گیا۔ یہ شرک تھا، جو انسان کے ظلم و جہل کا نتیجہ تھا۔ انسان فطرۃً عبد ہے اور عبودیّت و عبادت اس کا طبعی خاصہ ہے، لیکن اس کا ایک ایسی ہستی کی پرستش کرنا اور اس کے آگے سجدہ کرنا، جو مخلوق و غیر اللہ ہو اور جس کا مسجود وہ خود ہو، نیز جو خود اس کے لیے بنائی اور مسخر کر دی گئی ہو، خود اس کی فطرت کے منافی اور اس کے لیے منکر تھی۔ چونکہ انسان کی توحید پرست و حق پسند طبع شرک و باطل سے مفاہمت نہ کر سکتی تھی، لہٰذا اس نے اپنے آپ کو جمالیاتی فریب میں مبتلا رکھنے کی خاطر خود ہی سورج کو خدائی صفات سے متّصف کر کے اسے اللہ تعالیٰ کی صفاتِ الوہیت و ربوبیّت میں شریک سمجھ لیا۔ پھر اپنے اس

وہم وگمان کو رنگِ یقین سے مزیّن کرنے کی خاطر سورج کو "دیوتا" کے نام سے موسوم کر دیا۔ چونکہ سورج میں اُس سے منسوب خدائی صفات کا فقدان ہے اور وہ اسمِ دیوتا کا مسمّٰی نہیں، یعنی حقیقت میں دیوتا نہیں، لہٰذا یہ تسمیہ بالباطل ہوا؛ نیز سورج کے حوالے سے اسمِ دیوتا صفاتِ موہومہ و باطلہ کا مظہر ہے۔ اس مختصر سی گفتگو سے تین بصیرت افروز نتائج مستنبط ہوئے: اوّلاً، خشیتِ غیر اللہ سے انسان میں شرک و بت پرستی کا داعیہ پیدا ہوتا ہے۔ ثانیاً، اس جذبے کی تسکین کی خاطر اس نے تسمیہ بالباطل کا فن ایجاد کیا جس نے ثالثاً، اسے مشرک و بُت پرست بنا دیا۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ غیر اللہ کے ڈر میں شرک کی صورت اور شرک میں بت پرستی کی صورت مضمر ہوتی ہے۔ چنانچہ قدیم انسان نے اللہ تعالیٰ کی جلیل و عظیم اور مہیب و خطرناک تخلیقات سے، جو دراصل اس کے کام کے لیے پیدا و مسخّر کی گئی ہیں، مرعوب و خوفزدہ ہو کر جذباتی طور سے انہیں خدائی صفات کا مالک مان لیا، لیکن عقلِ سلیم کو یہ باور نہ تھا۔ چنانچہ اسے باور کرانے کی خاطر انسان نے ان جلیل و مہیب ہستیوں کو تسمیہ بالباطل کے ذریعے مختلف ناموں سے موسوم کر دیا، جس کے نتیجے میں ہر ہستی متشخّص و منفرد تو ہو گئی، لیکن اس نام یا صفت سے موسوم ہوئی، جس کی وہ مسمّٰی نہ تھی۔ بالفاظِ دیگر، ہر ہستی یا چیز اس خدائی صفت سے عاری تھی، جو تسمیہ بالباطل کے ذریعے اس سے منسوب کی گئی تھی، لہٰذا وہ اسمِ بے مسمّٰی تھی۔ الغرض، وہ تمام ہستیاں، جنہیں مشرکوں نے محض تسمیہ بالباطل سے اپنا معبود بنا لیا تھا، مسمّیات سے عاری تھیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ محض اسمائے بے مسمّیات کی عبادت کرتے تھے، لیکن انہیں اس کا شعور نہ تھا۔ عقل مغلوب الجذبات ہو کر بے نور ہو جائے تو اُسے شعور نہیں رہتا۔

چونکہ شرک حریفِ توحید ہے اور اس میں کثرت مضمر ہوتی ہے، لہٰذا قدیم انسان نے خدائے وحدہٗ لاشریک کی صفاتِ حسنہ کی وحدت کو واہمہ کے ذریعے پارہ پارہ کر کے

کثرت میں تبدیل کر دیا، اور ہر صفت کو تسمیہ بالباطل کے ذریعے مشخص و منفرد کر دیا، اور اسے ایک زندہ بالذات و قائم بالذات مشخص و منفرد و مافوق الفطرت ہستی خیال کر کے اسے کسی خدائی صفت کے حامل نام سے موسوم کر دیا اور اپنا الٰہ بنا لیا۔ اس اعتبار سے یہ تمام ہستیاں مشرکوں کے معبودانِ باطل تھے، اور مشرک بھی جھوٹے پجاری تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ شرک میں صورتِ باطل مضمر ہے، جس میں مختلف شکلیں اختیار کرنے کی قابلیت ہے۔

شرک نے ظن و توہمات کے ذریعے عقل کو اس کے فطری نور و توانائی سے محروم کر دیا تو وہ مغلوب الجذبات ہو کر موضوعی یعنی معروضی شیطان کی حلقہ بگوش ہو گئی۔ نتیجۃً خود بھی طاغوتی بن گئی۔ پھر اس تثلیثِ طاغوتی (یعنی (۱) شیطان موضوعی یا نفسِ اَمّارہ (۲) شیطانِ معروضی یا ابلیس اور (۳) عقلِ طاغوتی) نے انسان کو اپنے جذبۂ عبودیت کی تشفی کے لیے اس کی موہومہ مافوق الفطرت ہستیوں کی شبیہیں بنانے کی ترغیب دی۔ چنانچہ خوگرِ محسوس انسان جو ایک خدائے برگزیدہ و برتر کا عقیدہ رکھنے کے باوجود تثلیثِ طاغوتی کی جالیاتی وسوسہ اندازی کی فریب کاری کے سبب محسوس و مشہود معبودانِ باطل کی عبادت کی ہمیشہ سے طلب و جستجو رکھتا ہے۔ اس نے تثلیثِ طاغوتی کی تجویز کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے پہلے اپنے ذہن میں ان موہوم ہستیوں کی تصویریں بنائیں اور پھر ان کی مورتیاں بنانے کی مسلسل کوششوں کے نتیجے میں بت گری و مصوّری کے فنون ایجاد کر لیے۔ اس ایجاد سے بت پرستی نے منظّم صورت اختیار کر لی اور "آزریت" پیدا ہو گئی، جس نے بت پرستی کو اجتماعیت و دین کے قالب میں ڈھالنے کی سعی و جہد میں بتکدے بنوائے اور ان میں مختلف ناموں کے بت رکھ کر ان کی پوجا پاٹ کا انتظام و انصرام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ مختصر یہ کہ شرک و بت پرستی اور آزریت تینوں فنِ تسمیہ بالباطل کی ایجادات اور ایک ہی سلسلۂ باطل کی تین مربوط و لاینفک کڑیاں ہیں۔

آزریت زہد و ورع اور تحفظِ دین کا خرقۂ سالوس پہن کر اپنے دینِ آزری کی اجارہ دار

بن گئی، اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کا استحصال کرنے کی خاطر اُس نے ایک طرف اپنے آپ کو اور دوسری طرف بت گری و بت پرستی کو اجتماعی دین کے طور پر منظّم کرلیا۔ اس کے نتیجے میں لوگ بتکدوں کے پروہتوں اور آزروں کی بھی اپنے معبودانِ باطل کی طرح عزت و تکریم اور تعظیم و اطاعت کرنے اور انتہائی عقیدت سے اپنی کمائی کا ایک حصہ بتوں کے نام پر ان کی نذر کرنے لگے۔ اس طرح آزریت خود بھی معبود بن گئی اور لوگوں پر خدائی کرنے لگی۔

غور کرو تو اس گفتگو سے متعدد اہم فکر انگیز نکات کا استنباط کر سکتے ہو، مثال کے طور پر

اوّل، خشیتِ باطلہ یا غیر اللہ کا خوف شرک کا عامل و محرّک تھا اور ہے۔

دوم، شرک سے انسان کو تسمیہ بالباطل کی تحریک ہوئی، اور

سوم، اس فن کے ذریعے اس نے اپنے لیے معبودانِ باطلہ وضع کر لیے؛ نیز

چہارم، اپنی خوگرِ محسوس طبع کے جذبۂ عبودیت کی تشفی کی خاطر اس نے اپنے معبودانِ خیالی کی تجسیم و تمثیل کی کوشش کے نتیجے میں بت گری و مصوّری کے فن ایجاد کر لیے۔

پنجم، اس ایجاد سے مورتی پوجا کا رواج ہوا اور "آزریت" پیدا ہوئی جس نے بت کدے بنائے اور بت پرستی کو اجتماعی طور پر منظّم کیا اور "دینِ آزری" کی داغ بیل ڈالی، اور خود ہی اس کی محافظ و اجارہ دار بن بیٹھی۔ اس طرح معاشرے میں اس کی سیادت قائم ہو گئی، اور بتوں کی طرح خود بھی لوگوں کی معبود بن گئی اور ان پر خدائی کرنے لگی۔

ششم، آزروں نے لوگوں کا زیادہ سے زیادہ استحصال کرنے اور جلبِ منفعت کی خاطر بت خانے بنائے، چڑھاوے چڑھانے، منّتیں ماننے، نذر و نیاز دینے اور ہر خوشی اور غمی کے موقع پر انہیں نذرانے پیش کرنے کو دینِ آزری کی روایات اور اجزائے لاینفک بنا دیا۔

یہ بات رکھنے کے قابل ہے کہ آزریت نے لوگوں پر اپنی سیادت قائم رکھنے، انہیں

اپنا مطیع و معتقد بنائے رکھنے اور ان کا مستقل طور سے استحصال کرتے رہنے کی خاطر تسمیہ بالباطل کے فن کو ترقی دی، جس سے فنِ تاویل متفرع ہوا۔ اب اس نکتے کی توضیح کی جاتی ہے۔ ذہنِ انسانی کے نشو و ارتقاء اور تاریخی عمل کی ترقی پذیر مقتضیات کے پیشِ نظر آذریت تسمیہ بالباطل کے فن کے ذریعے نئے نئے مشرکانہ نظریات و بدعات ایجاد کرتی اور انہیں ایسی اصطلاحات سے موسوم کرتی رہی، جو مسمیات سے عاری تھیں، لیکن آذریت لوگوں کے جذبۂ عقیدت و تقلید پسندی اور اپنے علم و فنِ تاویل، اثر و نفوذ اور دینی ہیبت و جبروت کی بدولت انہیں رائج کرتی اور مقبول بناتی رہی۔

ہمارے اس موقف کی تائید قرآنِ حکیم سے بھی ہوتی ہے۔ اس نے شرک و بت پرستی کو اس منطقی بنیاد پر بے اصل و باطل قرار دیا ہے کہ شرک و بت پرست ان ناموں کی پرستش کرتے ہیں جو اُن کے تسمیہ بالباطل کا نتیجہ ہونے کی وجہ سے اپنے مسمیات سے عاری ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ فرماتا ہے:

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ (یوسف ۱۲ : ۴۰) "جن ہستیوں کی تم اللہ تعالیٰ کے سوا عبادت کرتے ہو وہ محض نام ہی نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ لیے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی۔ فرماں روائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔ اس کا حکم ہے کہ صرف اسی کی عبادت کرو اور کسی کی نہ کرو۔ یہی راست اور قائم رہنے والا دین ہے، لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کا) علم نہیں رکھتے۔"

قرآنِ مجید کے حوالے سے لفظ اسم کی لغوی بحث کرتے ہوئے امام راغب اصفہانیؒ اس آیت جلیلہ کی تفسیر اس طرح کرتے ہیں: "اس کے معنی یہ ہیں کہ جن اسماء (یا ناموں) کی تم عبادت (پرستش و بندگی) کرتے ہو ان کے مسمیات نہیں ہیں، کیونکہ وہ اصنام ان اوصاف

سے عاری تھے، جن کا کہ وہ ان اسماء کے اعتبار سے ان کے متعلق اعتقاد رکھتے تھے۔
اور آیۂ جلیلہ وَجَعَلُوۡا لِلّٰہِ شُرَکَآءَ ؕ قُلۡ سَمُّوۡہُمۡ ؕ (الرّعد ۱۳ : ۳۳) : "اور ان لوگوں نے اللہ کے شریک مقرر کر رکھے ہیں۔ ان سے کہو کہ ذرا ان کے نام تو لو" میں سَمُّوۡہُمۡ سے یہ مراد نہیں کہ لات، عزّیٰ وغیرہ نام بیان کرو، بلکہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ جن کو تم اِلٰہٌ (معبود) کہتے ہو ان کے متعلق تحقیق کر کے بتاؤ کہ آیا ان میں ان اسماء کے معانی بھی پائے جاتے ہیں، جن کے ساتھ تم انہیں موسوم کرتے ہو؟ (یعنی نہیں)، اسی لیے اس کے بعد فرمایا: اَمۡ تُنَبِّـُٔوۡنَہٗ بِمَا لَا یَعۡلَمُ فِی الۡاَرۡضِ اَمۡ بِظَاہِرٍ مِّنَ الۡقَوۡلِ ؕ.... (الرّعد ۱۳ : ۳۳) : کیا تم اللہ کو ایک نئی بات کی خبر دے رہے ہو جسے وہ اپنی زمین میں نہیں جانتا؟ یا تم لوگ بس یونہی جو منہ میں آتا ہے کہہ ڈالتے ہو؟ (المفردات، بذیل مادہ س م و)۔

تم اکثر سوچتے رہتے ہو کہ "ایسا کیوں ہے کہ اس قدر ترقی کر لینے اور چاند پر پہنچ جانے کے باوجود انسان مشرک و بت پرست ہے؟ وہ بندوں سے مانگتا ہے، مردوں کو پکارتا اور ان سے مرادیں مانگتا ہے جو سمیع الدعوات ہیں، نہ مجیب الدعوات ہیں بلکہ جو خود محتاج و فقیر ہیں۔ وہ بتوں اور شبیہوں کو سجدے کرتا ہے، جنہیں خود بناتا ہے۔ وہ اپنی تخلیق کو اپنا اِلٰہ و ربّ سمجھ بیٹھتا ہے۔" تمہاری سوچ درست ہے کہ قدرت کی جاریاتی تخلیقی فعلیّت کے ظہورِ نتائج کی بدولت انسان کے فکر و عقل و علم کا اس حد تک نشو و ارتقاء ہوا ہے کہ اس نے سائنس و ٹیکنالوجی میں حیرت انگیز ترقی کر لی ہے اور کر رہا ہے اور اس کے نتیجے میں اس نے کائنات کی تسخیرِ مسلسل کرنے کی راہ ہموار کرنے میں خاصی کامیابی بھی حاصل کر لی ہے، لیکن اس کے باوجود وہ "حسن و زندگی" کے اعتبار سے زیاں کار ہے، اور قدیم انسان کی طرح آج بھی "دینِ آزری" کا پیروکار ہے۔ تمہیں یہ جاننے کی طلب و آرزو ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ دینِ آزری کی مقبولیت کی علّتِ غائی کیا ہے؟ اس کا ایک لفظ

میں جواب چاہتے ہو تو وہ ہے: "تسمیہ بالباطل کے فن کا اِرتقاء"۔ اِجمالِ جواب طلب گارِ تفصیل ہے:

سب سے پہلے اس نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ انسان نے بلاشبہ سائنس و ٹیکنالوجی میں حیرت انگیز ترقی کی ہے، لیکن اس کے نورِ حسنِ ذات نے ترقی نہیں، یا کم از کم اس قدر ترقی نہیں کی، جس قدر اُس نے سائنس و ٹیکنالوجی میں ترقی کی ہے۔ علاوہ ازیں، انسان شیطان کے جمالیاتی فریب کے دام میں پھنس جانے اور اس کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو جانے کے باعث جس قدر اپنے حسن و نورِ قلب سے محروم ہوا ہے، اسی قدر اس نے نفاق و ریاکاری، عیاری و پرکاری، اور شیطنت و شاطریت، نیز استدلال و تاویل اور تسمیہ بالباطل کے فنون میں ترقی کی ہے۔ چنانچہ عقلِ طاغوتی نے عامۃ الناس اور دانشوروں کو لباطِ عقیدت و عقلیت پر مات دینے کی غرض سے ایک طرف مذہبی و متصوفانہ علمی و نظریاتی اسمائے بے مسمّیات وضع کرنے میں مہارتِ تامّہ حاصل کر لی ہے تو دوسری جانب انہیں سچا کرنے کی غرض سے فنِ تاویل و استدلال میں خاطر خواہ ترقی کر لی ہے چنانچہ اس واقعیت کے متعلق دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ عقلِ طاغوتی اپنے اس مشن میں ناکام نہیں رہی ہے۔ اس سے اس امر کی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں عصرِ حاضر کا انسان نظریاتی و اصطلاحاتی معبودانِ باطلہ کا پرستار ہے اور قرآنِ حکیم کے اصول و احکام اور اقوال و مصطلحات پر عقلِ طاغوتی کے وضع کردہ نظریات و اصطلاحات کو ترجیح دیتا اور سچا مانتا ہے۔ چنانچہ اس عہد میں جسے سائنسی دوَر کہا جاتا ہے، فنِ تسمیہ بالباطل نے اس قدر مقبولیت حاصل کر لی ہے کہ اسے معیارِ فلسفہ کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ اس فن میں مہارت کا مظاہرہ کیے بغیر کوئی مصنّف فلسفی یا مفکّر نہیں کہلا سکتا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ علم و فن کے ہر گوشے میں ان وضعی اصطلاحات کا، جو حقیقت میں اسمائے بے مسمّیات ہیں، طوفان موجزن ہے جس میں "ترقی یافتہ" انسان تھپیڑے کھا رہا ہے اور اپنے خیالی و نظریاتی اصنام،

نیز آب و رنگ اور گل و حجر کے بتوں کا پجاری ہے۔

فنِ تسمیہ بالباطل دراصل شیطان کی جمالیاتی فریب کاری کے فن کی تخلیق ہے۔ دلیل یہ ہے کہ یہ خود بھی جمالیاتی فریب کاری و جعلسازی ہے۔ چنانچہ اس کے ذریعے آزر بعض خدائی صفات کو کسی بُت و شبیہ، قبر و آستانہ اور مقام و شے منسوب کر دیتے ہیں، جو ان میں نہیں ہوتیں، اور لوگ اس دھوکے میں مارے جاتے ہیں، بجز موحّد انسانوں کے۔ یہی صورتِ حال، علمی و فنی، خاص کر فلسفیانہ اصطلاحات کی ہے جنہیں ایسے معانی و مفاہیم سے مزیّن کر دیا جاتا ہے جو دیکھنے میں حسین و حقیقی، لیکن حقیقت میں قبیح و باطل اور گمراہ کُن ہوتے ہیں۔ فنِ تسمیہ بالباطل کی جمالیاتی فریب کاریوں کی ہمہ گیر یلغار کے پیشِ نظر یہ کہنا مبالغہ نہ ہو گا کہ عصرِ حاضر سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی کی طرح فنِ تسمیہ بالباطل کی ترقی کا دوَر ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تسمیہ بالباطل کی جمالیاتی فریب کاریوں سے کیسے اپنے آپ کو محفوظ رکھا جا سکتا ہے؟ اس کا جواب ہے: عقیدۂ توحید اور نورِ قرآنِ حکیم کے ذریعے۔ یہ جواب مختصر تو ہے مگر جامع و مانع ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ عقیدۂ توحید کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کی صفاتِ اُلُوہیت و ربوبیّت پر ایمان رکھنا اور اس پر ہر حال میں قائم رہنا۔ بالفاظِ دیگر، اس عقیدے کو اپنی زندگی میں خون کی طرح جذب کر کے جاری و ساری رکھنا اور اس کے مطابق دیکھنا، سننا، سوچنا اور عمل کرنا۔ الغرض، اس کے مطابق زندگی کرنا۔ ایسے شخص کا قلب زندہ و منیر ہوتا ہے اور اس میں حُسن و زندگی اور دوست" کی آرزو زندہ و فعّال ہوتی ہے۔ لہٰذا اُسے شرک سے طبعًا نفرت شدید ہوتی ہے اور وہ تسمیہ بالباطل کے جمالیاتی فریب میں نہیں آتا۔

۲۔ **قرآنِ مجید**: یہ اللہ تعالیٰ کی زندہ و منیر "کتابُ الانسان" ہے، جس میں حیاتِ انسانی کے جملہ مُہمّاتِ مسائل کا حل موجود ہے؛ نیز یہ انسان کے لیے آئینۂ حُسن و حق اور

صیرفیِ حق و باطل ہے۔ چنانچہ اختلاف و التباسِ ذہنی اور شک و شبہ کی صورت میں یہ قولِ فیصل اور حتمی نتیجے پر پہنچنے کے لیے حرفِ آخر ہے۔ علاوہ بریں، اس کے نور کی بدولت ہر رہ نوردِ شوق اپنی راہ و منزل کا سراغ لگا سکتا اور تسمیہ بالباطل اور شیطان کی جمالیاتی فریب کاریوں کے سرابوں کو پہچان کر بھٹکنے سے بچ سکتا ہے۔

تسمیہ بالباطل کے فلسفے کو فلسفۂ اسمیّت سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔

مقام ۱۷

لا و اِلاّ

زندگی زمان و مکان کی اسیر ہو جائے تو عُمر کہلاتی ہے۔ عمر دراصل زندگی کا اضافی عالمِ گُزراں ہے اور اس کی ہمسفر فکر ہے۔ مفکّر وہ ہوتا ہے جس کی فکر ایک تو جالیاتی، تخلیقی ہوتی ہے اور دوسرے زمانے کے ساتھ قدم ملا کر چلتی ہے۔ رہوارِ فکر تیز رو اور فرسِ زمانہ کا پیشرو ہو تو مفکّر نابغۂ روزگار بن جاتا ہے۔ سوچنا بہر حال فکر کا وظیفہ ہے۔ ایک دن سوچتے سوچتے میں اُس وادیِ توحید کی طرف نکل گیا، جو "لا و اِلاّ" کے نام سے موسوم ہے۔ میرے پہنچتے ہی لوحِ محفوظ کا عصر نما ٹیلی وژن متحرّک ہو گیا۔ دفعتاً مجھ پہ یہ راز کھُلا کہ زمان و مکان کی حقیقت "آنِ دھر" ہے اور آنِ دھر سدا حرکت میں رہنے کے باوصف ثباتِ دوام ہے۔ پھر مجھ پہ یہ راز کھُلا کہ دین حقیقت میں ایک ہی ہے اور وہ ہے توحید، اور "لا و اِلاّ" اس کے دو اجزائے لاینفک ہیں۔

عصری ٹیلی وژن میں "آنِ دھر" کی تصویریں متحرّک تھیں۔ ہر قوم جو اپنی نمود دکھاتی تھی، اس کا نبیؑ اسے دعوتِ توحید دیتا تھا اور پکار پکار کہتا تھا:

"اِلاّ" کے ساتھ "لا" کو بھی مانو یعنی ایک اللہ تعالیٰ کو اپنا اِلٰہ و ربّ مانو اور اس کے سوا کسی کو اپنا اِلٰہ اور ربّ نہ مانو۔ تمہارے جُملہ اصنام اسمائے بے مسمّیات ہیں۔ لہٰذا

باطل ہیں، ان کا انکار و ابطال کرو۔ اِقرارِ حق اور اِنکارِ باطل لازم و ملزوم ہیں اور یہی توحید ہے۔ توحید کی ضد و نقیض شرک ہے جو ظلمِ عظیم اور ناقابلِ معافی گناہِ کبیرہ ہے۔ جانتے ہو اِلَّا کے معانی کیا ہیں؟ یہ ذو معنی لفظ ہے: یہ اللہ تعالیٰ کی اُلوہیت و ربوبیت اور اپنی معبودیت و مربوبیت کا اِثبات و اقرار ہے۔ لہٰذا صرف اور تنہا اللہ تعالیٰ کو اپنا اِلٰہ و ربّ مانو اور اسے اپنی زندگی میں جذب کرلو، جیسے لفظ معانی کو، پھول خوشبو کو، پانی روانی کو اور الماس آب و تاب کو اپنے اندر جذب کرلیتا ہے۔ اس طرح یہ سب چیزیں وہ کچھ بن جاتی ہیں جو ہیں۔ تم انسان بننا چاہتے ہو تو اپنی زندگی سے "لَا" کے ذریعے جملہ معبودانِ باطلہ کو نکال دو اور "اِلَّا" کے ذریعے صرف ایک اللہ تعالیٰ کو اپنا اِلٰہ و ربّ بناکر اس میں جذب کرلو، اس سے محبت کرو اور شدید کرو؛ اس کی پرستش و اطاعت کرو، اس کی نعمتوں کا شکریہ ادا کرو؛ اسے یاد کرو، اس کے حوالے سے سوچو اور اس کے حکم کے مطابق زندگی کرو۔ اس کے صلے میں تمہیں چار عظیم و بے مثال نعمتیں ملیں گی: ایک دُنیوی و اُخروی حسنہ۔ دوم، جنّت اور اس میں اس کے اہلِ حسن و سرور بندوں کی صحبت و رفاقت۔ سوم، ربِّ کریم و اِلٰہِ جمیل کی رحمت و مغفرت، قرب و حضوری اور ہم نظری و ہمکلامی؛ اور چہارم، رضوانِ الٰہی۔

یاد رکھو! اللہ کے بغیر تمہاری زندگی بے معنی ہے، یعنی اپنے حسن سے محروم ہے۔ حسن کے بغیر زندگی آتش بداماں ہوتی ہے اور آدمی زندہ ہوتا ہے نہ مُردہ۔ یہ حقیقت ہے جس کا بہت کم شعور رکھتے ہیں۔ تسمیہ بالباطل اور بنگری سے کسی کو اپنا دیوتا اور معبود بنانا یا سمجھنا شرک و ظلمِ عظیم ہے۔ شرک میں اللہ تعالیٰ کی اُلوہیت و ربوبیت اور اپنی معبودیت و مربوبیت کا انکار مضمر ہوتا ہے۔ دین کا فقط ایک راستہ ہے، اور وہ توحید کا راستہ ہے، جو انسان کو اس کے اِلٰہ و ربّ اور اس کی جنّت میں لے جاتا ہے۔ بخلاف اس کے شرک کا راستہ ضلالت کا راستہ ہے، جو آدمی کو اللہ تعالیٰ سے دُور جہنم میں لے جاتا ہے۔

اسمائے بے مسمّیات کے پجاری ہو تم ان گنت خیالی دیوتاؤں، آستانوں اور مزاروں کے ساتھ جس طرح ناگ اور آتش کی پرستش کرتے ہو، اسی طرح تم اپنی معاشرتی زندگی کے سرطانوں کی پرستش و اطاعت کرتے اور ان کی حمد و ثنا کے قصیدے پڑھتے ہو۔ یہ بھی شرک اور ظلمِ عظیم ہے۔ لَاْ کا مطلب ان معاشرتی سرطانوں کی نفی، انکار اور ابطال بھی ہے۔ جیسا کہ تم جانتے ہو، یہ معاشرتی سرطان فرعون و ہامان اور قارون و آزر ہیں، جو نام اور بھیس بدل بدل کر مسندِ ارشاد و اقتدار اور تختِ حکومت پر متمکن ہوتے رہتے ہیں۔ الغرض، ہر اہلِ حق نے اپنی قوم کو دعوتِ توحید دی اور ہر قوم کا جواب ایک جیسا تھا:

"ہم خدا کو تو مانتے ہیں، لیکن اوتاروں، دیوتاؤں اور بتوں کا انکار نہیں کر سکتے۔ وجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے اباؤ اجداد کو ان کی پرستش کرتے دیکھا ہے۔ نیز انہیں ان اعلیٰ ہستیوں کے سامنے بھی انتہائی عقیدت و احترام کے ساتھ جبّہ سائی کرتے اور حکم مانتے دیکھا ہے' جنہیں تم معاشرتی سرطان کہتے ہیں۔ فرعون و ہامان اور آزر و قارون معاشرتی سرطان نہیں، دین کے محافظ، ان داتا، اللہ کے دوست اور انعام یافتہ ہیں۔ اگر ان پر خدا کا سایہ نہ ہوتا تو انہیں یہ حکومت و قوت، منصب و اقتدار، تزک و احتشام، مال و دولت اور عزت و مسندِ ارشاد کیسے ملتی؟ ہم وحدت کی طرح کثرت کو بھی مانتے ہیں۔ اگر وحدت حق ہے تو کثرت بھی حق ہے، اس لیے کہ کثرت کی اصل بھی تو وحدت ہے۔ حق سے باطل کیسے نکل سکتا ہے؟ شجرِ توحید حق ہے تو اس کی فروع کیسے باطل ہو سکتی ہیں؟ خدائے واحد کثرت میں جلوہ پیدا کرتا ہے تو پھر کثرت کیسے باطل ہو سکتی ہے؟ ہم الحق کے مظاہر کو حق کیوں نہ مانیں؟ اگر وہ حق ہیں تو ان کی پرستش میں کیا قباحت ہے؟ حق وحدت میں ہو یا کثرت میں، ہر شان میں ہے۔ دیوتا خدا کے اوتار ہیں تو خدا ہی ہوئے۔ ان کی شبیہیں بنانے میں کیا مضائقہ ہے؟ ہم خوگرِ محسوس بندوں کو محسوس معبودوں کی پرستش ہی اولیٰ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ مرئی معبودوں کی پوجا پاٹ اور پرارتھنا کرنے، نیز ان کے سامنے سرنگوں

اور سربسجود ہونے میں جو لذّت اور شانتی ملتی ہے وہ ان دیکھے خدا کی پرستش و مناجات کرنے سے کہاں ملتی ہے؟ ہر مورتی میں اس کا دیوتا ہوتا ہے، اور وہ ہماری پوجا پاٹ کو دیکھتا اور ہماری دعاؤں کو سنتا اور قبول کرتا ہے، کیونکہ سمیع و بصیر اور مستجیب الدعوات ہوتا ہے۔ ہم اہلِ عشق و وفا ہیں، "دوست" کے ہر مظہر کی پرستش کریں اور اس کے بھجن گائیں گے اور اس سے مرادیں مانگیں گے۔ کاش تم جانتے کہ "دوست" کے ہر نقشِ پا پر جبیں فرسائی کرنا، شیوۂ اربابِ عشق و وفا ہے۔

بات یہ ہے کہ تم نے صہبائے کثرت پی ہی نہیں اور اس کی لذّت سے آشنا ہی نہیں، اسی لیے اس کے منکر ہو اور ہمیں بھی منکر بنا کر ہلاک و برباد کرنا چاہتے ہو۔ ہم بادۂ کثرت کے نشے سے محروم نہیں ہو سکتے، کیونکہ ہم وفا شعار ہیں اور "وفاداری بشرطِ استواری" ہمارا ایمان ہے۔ بات تو تمہاری انوکھی ہے۔ اہلِ بدعت اور روایت شکن تو تم ہو۔ بت شکن اور غارت گرِ ایمان و بتکدہ تو تم ہو۔ تم کہتے ہو کہ تمہارا دین امن و سلامتی کا دین ہے، لیکن تمہارا عقیدہ "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" تو قیامت خیز ہے۔ تمہارا نعرہ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہ تو حشر بداماں ہے۔ اے پیامبرِ امن! تم تو غارتہ برانداز چمن ہو۔ بتوں کے انتقام سے ڈرو! ان کا انکار کرو گے تو وہ تمہیں بھسم کر دیں گے، اپنی دنیا اور عاقبت خراب نہ کرو۔ سادہ لوح لوگوں کو ورغلا کر گمراہ و برباد نہ کرو۔ اپنی قوم کی ہلاکت و بربادی کے سامان پیدا نہ کرو۔ تمہاری دعوتِ امن و سلامتی نہیں، فتنہ و فساد کی دعوت ہے۔ اس سے باز آ جاؤ، ورنہ ہم تمہیں ہلاک کر ڈالیں گے۔ ہم اپنا دین چھوڑنے کے بجائے تم سے چھٹکارا حاصل کرنے کو ترجیح دیں گے۔ خوب جان لو کہ تم لوگ کمزور و قلیل ہو اور ہم طاقتور و بکثرت ہیں۔"

یہ باتیں سن کر میرا یقین پختہ ہو گیا کہ تسمیہ بالباطل، تاویل بالباطل اور طلاقت کے ذریعے بات کو سحر انگیز بنایا جا سکتا ہے۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ اتنے میں ندائے سروش آئی:

"تمہارا احساس سچا ہے۔ شعر کی طرح بعض باتیں بھی سحر انگیز ہوتی ہیں۔ شیطانی منطق کا

یہی تو کمال ہے۔ تم نے مشرکوں اور بت پرستوں کی جو باتیں سنیں، ان میں شیطانی منطق کا سحر تھا، جسے تلبیسِ ابلیس سے بھی تعبیر کر سکتے ہو۔ آدمی کی کمزوری یہ ہے کہ وہ صورت کی خوشنمائی اور رنگ روپ کی نظر افروزی کے دھوکے میں مارا جاتا ہے۔ وہ جس چیز کو اپنے شیطان کی تحریک سے نظرِ محبت سے دیکھتا ہے، اُسے اپنا معروضِ حُسن و محبّت سمجھنے لگتا اور اس پر مرنے لگتا ہے اور اس نتیجے میں حُسن و زندگی سے محروم ہو جاتا ہے؛ نیز اُسے خوب سے خوب تر کی طلب و جستجو نہیں رہتی۔ وہ صفاتِ الٰہیہ کو اعیانِ ذات قرار دے کر ان میں سے بعض کو اپنے خیال کے مطابق مجسّم و متشخص کر کے ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ اپنا اِلٰہ و رب بنا لیتا ہے۔ اس طرح شرک کے سبب اس کے اندر ایک اِلٰہ و ربّ کی آرزو میں، نیز اس کی اپنی ذات میں وحدت نہیں رہتی اور دونوں مختلف اجزاء میں منقسم ہو جاتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں انسان جمالیاتی اِرتقاء کرنے کے قابل نہیں رہتا۔

کثرت کے پجاریوں کو اگر اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا شعور ہوتا کہ وہ منفرد و یکتا اور بسیط و بحت ہے اور لَا کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ ہے، دوسرے وہ اور تنہا وہی خالقِ موجودات ہے اور جملہ موجودات اس کی مخلوقات ہیں، اس کے اجزائے ذات و صفات نہیں ہیں، تیسرے فقط وہی الحیّ والقیّوم، چوتھے، تنہا وہی سب مخلوقات کا اِلٰہ و ربّ اور پانچویں، وہ سُبحان و صمد اور عزیز و قدیر ہے تو وہ اس کی ذات و صفات میں کسی "اسم بے مسمّٰی" کو شریک سمجھتے نہ ٹھہراتے۔ اللہ تعالیٰ ماحد و احد ہے۔ اس کی ذاتِ مطلق میں کثرت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کثرت بھی اس کی تخلیق ہے اور مخلوقات کثرت کے مظاہر ہیں، جو جمالیاتی معروضاتِ محبت تو ہیں، مگر معروضاتِ پرستش و حمد و ثنا نہیں۔ اہلِ نظر ان سے اپنے اِلٰہ و ربّ کی محبت کے حوالے سے محبّت کرتے ہیں۔ محبّت کا معیار بھی یہی ہے۔

ایک بات بتاتا ہوں جو سچّی اور ذہن نشین کر لینے کی ہے ما انسان کا دین، اسلام یا توحید دین ہے۔ اہلِ دُنیا کا پہلا دین "توحید" یا اسلام تھا، لعد میں غیر اللہ کے خوف نے

انہیں مشرک و بت پرست بنا دیا۔ علاوہ بریں، اس دینِ باطل کے قیام و ثبات اور ترویج و اشاعت میں تسمیہ بالباطل اور تاویل بالباطل کے علم و فن نے نمایاں کردار ادا کیا ہے، جس کی نوعیت بلحاظِ حسن و حق ابلیسی سلبی ہے۔ اسلام کا دعویٰ ہے کہ ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے حسنِ خَلق و حُسنِ خُلق اور حسنِ دین کے ساتھ پیدا ہوتا ہے، یعنی حسین و موحد اور مسلم پیدا ہوتا ہے۔ یہ اس کے والدین ہیں جو اسے غیر مسلم بناتے ہیں۔ لوحِ قلب کے نقوشِ اولیں خصوصاً اعتقادات و نظریات اور جذبات و احساسات کو مٹانا از بس دشوار ہوتا ہے۔ اسے جابیاتی۔ نفسیاتی لمحہ ہی مٹا سکتا ہے، جو اپنی وقوع پذیری کے لیے آرزوئے حسن و زندگی کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ بہرحال، انسان کا اولیں دین، دینِ توحید تھا جسے شیطان دوست و موقع پرست لوگوں نے مال و دولت، قوت و عزت اور سیادت و حکومت کی خاطر تسمیہ بالباطل اور تاویل بالباطل کے جابیاتی فریب کے ذریعے "دینِ آزری" میں بدل دیا۔ آزر بتوں کی طرح خود بھی معبود بن بیٹھے اور دیوتا بن کر لوگوں پر حکومت اور ان کا استحصال کرنے لگے۔ امتدادِ وقت کے ساتھ آزر چار استحصالی و سرطانی طبقوں میں بٹ گئے۔ ایک طبقہ تو بدستور دینِ آزری کا محافظ و اجارہ دار اور بت خانوں کی مستقل آمدنی و دولت کا مالک بنا رہا جبکہ دوسرا طبقہ اپنے لوگوں کا سردار بن کر فرعونی کرنے لگا۔ تیسرے طبقے نے وسائلِ دولت پر قبضہ جما لیا اور قارونی کرنے لگا۔ چوتھے طبقے سے اور کچھ بن نہ پڑا تو اس نے جلبِ منفعت و حصولِ اقتدار کی خاطر فرعونوں اور قارونوں کی ملازمت و مصاحبت اختیار کر لی اور ہامانی کرنے لگے۔

فلسفۂ آرزوئے حسن کی رُو سے یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ غیر اللہ کے خوف نے انسان کو مشرک و بُت پرست بنا کر اس کے سامنے سرنگوں کر دیا تو اس میں محکومی و غلامی اور اپنی ذلت و مسکنت کی آرزو پیدا ہو گئی جسے قدرت نے پورا کر دیا۔ اس کے نتیجے میں اس پر فرعون و ہامان اور قارون و آزر مسلط ہو گئے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے حسین، آزاد اور واجب التکریم بندوں کو اپنا مطیع و منقاد اور محکوم و غلام بنا کر ذلت و مسکنت کے تحت الثریٰ میں گرا دیا۔

کاش ! مشرکوں اور بت پرستوں کو اس حقیقت کا شعور ہو تا کہ شرک میں محکومی و غلامی کی صورت مضمر ہوتی ہے۔ چنانچہ شرک کرنے سے مردِ حر میں بھی غیر اللہ کی محکومی و غلامی کی آرزو نشو و نما پانے لگتی ہے اور وہ فرعون و ہامان اور قارون و آزر کی محکومی و غلامی کو وجہ عز و افتخار اور موجبِ صیانتِ ذات اور باعثِ سلامتیِ دین و ملک سمجھنے لگتا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ معبودانِ باطلہ کی غلامی سے نکلنا نہیں چاہتا؛ نیز اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ کے اصولِ عمل اور لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے نعرے سے اس قدر دہشت زدہ ہو جاتا ہے کہ انھیں سن نہیں سکتا؛ ان کو قبول کرنے اور ان پر عمل کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ توحید ان معبودانِ باطلہ سے انکار اور ان عقائدِ جلیلہ و محرکہ کو ماننے اور انھیں اپنی ذات میں جذب کر کے ان کے مطابق زندگی کرنے سے عبارت ہے۔ یہ دینِ لَا و اِلَّا ہے۔ یہ دونوں اسلامی نظامِ حیات کی بنیادیں ہیں، جو اس وقت متزلزل ہو چکی ہیں، لہٰذا کسی ملک میں اسلامی نظام قائم نہیں؛ اور یہی اُمتِ مسلمہ کی محکومی و غلامی اور ذلت و مسکنت کی وجہِ حقیقی ہے۔

مسلمانوں کو اگر آرزوئے حسن و حیات ہے تو اسے پورا کرنے کے لیے انھیں اپنے معاشروں میں مثالی یا اسلامی نظام قائم کرنا ہوگا۔ اس کے قیام کا ایک ہی طریقہ ہے، جو سنتِ پیغمبری کہلاتا ہے، اور جس کا بہترین نمونہ (= اسوۂ حسنہ) پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ حسنہ میں ملتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے آپؐ نے دنیا میں اسلامی نظام قائم کرنے کی خاطر بیک وقت لَا و اِلَّا کا نعرہ بلند کیا اور بنی نوعِ انسان کو بتایا کہ ان کی دُنیوی و اُخروی فلاح و نجات اسی نعرہ و نصب العین میں مضمر ہے۔ چونکہ ایک محکم و پائیدار عمارت نو تعمیر کرنے کے لیے کہنہ و بوسیدہ عمارت کا استیصال ناگزیر ہوتا ہے، لہٰذا آپؐ نے لوگوں کی باطنی زندگی میں مشرکانہ عقائد و تصورات کی اور معاشرتی زندگی میں مشرکانہ و بت پرستانہ عبادات و رسوم کی بیخ کنی کے لیے اللہ تعالیٰ کے حکم اور قرآنِ حکیم کی روشنی میں اسلام کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی کا آغاز کیا اور اس میں ابتدائی کامیابی حاصل کرتے ہی آپؐ نے اپنے صحابۂ کرامؓ کے ساتھ ہجرت

کی رجانتے ہو ہجرت کی علتِ غائی کیا تھی ؟ معاشرتی سرطانوں یا شیطانوں سے جان چھڑا کر اللہ تعالیٰ کی پناہ میں جانا۔ اللہ تعالیٰ کی پناہ گاہ اسلامی معاشرہ ہے جس کی اساس آپؐ نے لَا و اِلَّا کے عقیدے پر رکھی۔ اس میں اللہ تعالیٰ تھا، لہٰذا اس میں اس کے بندوں کو غیر اللہ کا خوف تھا نہ غمِ دُنیا۔ چونکہ شرک وبت پرستی کا بنیادی مُحرّک دعامل خوفِ غیر اللہ تھا، لہٰذا وہاں شرک وبت پرستی کا رواج ہو سکتا تھا نہ ہوا۔ جب شرک وبت پرستی کا فقدان تھا تو معاشرے میں آذر کہاں پیدا ہو سکتے تھے ؟ یاد رہے کہ شرک وآذر لازم وملزوم ہیں۔ شرک وبُت پرستی کی دلدل ہی میں آذری طبقے پیدا ہوتے ہیں ؛ اور آذر کا وجود شرک وبت پرستی کی علامت ہے۔ اصل یہ ہے کہ شرک وبت پرستی کی آب وہوا ہی میں معاشرتی سرطان نشوونما پاتے ہیں، اور اسلامی معاشرے میں توحید کی وجہ سے فرعون وہامان اور قارون آذر کے پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ اسلامی معاشرے میں ملوکیت کی نمود عقیدۂ توحید میں ضعف و اضمحلال کی علامت تھی، اور ہے۔

لَا و اِلَّا کے جمیل وجلیل، ایجابی وتعمیری، منیر وحیات آفرین اور ہمہ گیر وفقید المثال اسلامی انقلاب کے بعد "لَا" کا اشتراکی انقلاب بلاشبہ سب سے بڑا انقلاب ہے لیکن "اِلَّا" کے فقدان کے سبب حسین نہیں، بلکہ سلبی واستیصالی ہے۔ ایک اعتبار سے "لَا" اسلامی اور اشتراکی انقلابوں کی قدرِ مشترک ہے، لیکن "اِلَّا" کے لحاظ سے دونوں متضاد ومتناقض ہیں جہاں تک قدرِ مشترک کا تعلّق ہے، اسلام اور اشتراکیت دونوں معاشرتی سرطانوں کے دشمن ہیں، لیکن دونوں میں ایک بنیادی فرق تو یہ ہے کہ اسلام کا آئین ہے : اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے نظام میں حاکمیت واقتدارِ اعلیٰ کا سزاوار و مالک فقط اللہ تعالیٰ ہے، جبکہ اشتراکی نظام میں عوام النّاس کو حاکمیت واقتدارِ اعلیٰ کا سزاوار سمجھا جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، اسلام بنی نوعِ انسان کو اللہ تعالیٰ کے بندے اور محکوم اور صرف ایک اللہ تعالیٰ کو ان کا حاکمِ اعلیٰ سمجھتا ہے ؛ برخلاف اس کے اشتراکی نظام میں انسان کو انسان کا محکوم اور کارل مارکس کو

اللہ تعالیٰ کے بندوں کا "خدا" یا حاکمِ اعلیٰ سمجھا جاتا ہے۔ ان دونوں نظاموں میں ایک اور بنیادی فرق یہ ہے کہ اسلام انسان کی آزادی کا نقیب اور علمبردار اور محافظ و ضامن ہے جبکہ اشتراکیت آزادیِ انسان کے بارے میں متضاد نظریات کی حامل ہے۔ ایک طرف وہ آزادیِ انسان کی نقیب اور اُسے معاشرتی سرطانوں سے نجات دلانے کی مدّعی ہے، دوسری جانب وہ فرد کی آزادی کی مخالف ہے اور اسے اجتماعی مفاد کے منافی سمجھتی ہے۔ اسلام انسان کو صاحبِ ارادہ و اختیار مانتا اور افراد کی فکر و نظر، قول و عمل اور کسب و محنت کی آزادی، نیز انفرادی ملکیت کے حق کو تسلیم اور اس کا احترام کرتا ہے۔ چنانچہ اسلامی معاشرے میں ہر فرد کو اپنی مرضی سے سوچنے، سمجھنے، تعلیم و تربیت حاصل کرنے، اظہارِ خیال و پیشہ اختیار کرنے، نیز کاروبار، کام و آرام، سیر و سیاحت کرنے اور لباس پہننے کی آزادی حاصل ہے۔ بخلاف اس کے اشتراکی نظام میں فرد اس آزادی سے محروم ہے اور یہ محرومی انسان کی اس دنیا میں سب سے بڑی محرومی ہے، جو اُسے حیوانیت کے تحت الثریٰ میں گرا دیتی ہے۔ اسلام کے نظام میں فرد کو اساسی حیثیت حاصل ہے اور اس کے تشخّص و انفرادیت کو تسلیم کیا جاتا ہے، اور ہیئتِ اجتماعیہ کا فرضِ منصبی فرد کے شخصی و بنیادی حقوق کے تحفّظ کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ بخلاف اس کے اشتراکی نظام میں ہیئتِ اجتماعیہ کو بنیادی اور فرد کو فروعی حیثیت حاصل ہے؛ اس کے نتیجے میں فرد کو شخصی آزادی حاصل ہے نہ حقِ ملکیت۔

اصل یہ ہے کہ اللہ کُل زندگی کا معنیٰ ہے، لہٰذا اس کے بغیر فرد و قوم دونوں کی زندگی بے معنیٰ ہوتی ہے۔ فلسفۂ تسمیہ کی رُو سے اللہ کے بغیر فرد و قوم کی زندگی اسم بے مُسمّیٰ ہوتی ہے اور مُسمّیٰ حُسن ہے۔ زندگی اپنے حُسن سے محروم ہو جائے تو اس کا نور و اطمینان سے محروم ہو کر آتشِ خوف و حزن میں جلنا، قدرت کے قانونِ مجازات کی رُو سے تاریخی عمل ہے، جسے روکنا انسان کے لیے ناممکن ہے۔ ایسا تاریخی عمل حیاتِ قومی کے لیے سلبی و استیصالی ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں وہ رہینِ زیانِ مسلسل ہو جاتی ہے۔ اس زیانِ مسلسل سے وہی قوم بچ سکتی اور

نکل سکتی ہے، جس میں آرزوئے حسن و زندگی زندہ و فعّال ہو جائے اور وہ اس سے بچنے یا نکلنے کے لیے "اِلّا" کی رسّی کو مضبوطی سے تھام کر مصروفِ عمل ہو جائے، اور افرادِ قوم ایک دوسرے کو صبر و حق کی تلقین کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رسّی کو تھامنے کا مطلب قرآنِ مجید کے عقائدِ جلیلہ و محرّکہ کو اپنی زندگی کے اجزائے لاینفک بنانا اور اس کے اصول و احکام پر سختی سے عمل کرنا ہے۔ یہ نکتہ ذہن نشین کرلو کہ ایسا وہی اہلِ ایمان کرتے ہیں، جنہیں اپنے الٰہ و رب سے شدید محبّت ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ محبّت ہو تو اطاعت و عبادت میں ان کے لیے قُرّۃ العین ہوتی ہے اور اسے ذوق و شوق سے کرتے ہیں۔

مقام ۱۸

سیر و مشاہدہ

دنیا میں کسی چیز کو بھی قرار نہیں، آب و باد، وجود و صورت، رنگ و نور، زمان و مکان اور حیات و فکر، کسی چیز کو بھی ثبات و قرار نہیں۔ ہر شے رنگِ تغیر سے مزین اور رہینِ گردشِ مدام ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ ہوا جو مدارِ زیست ہے نسیم و شمیم و نکہت بن کر کس کو ڈھونڈھتی رہتی ہے؟ پانی کبھی ابرِ باراں اور کبھی چشموں، ندی نالوں اور دریاؤں کی صورت کس کی تلاش میں رواں دواں رہتا ہے؟ سمندر کس کے لیے طوفان اٹھاتا اور ساحل سے ٹکراتا ہے۔ شفق کس کے فراق میں خونابہ فشاں اور لیلیِ شب کس کی مفارقت میں سیاہ پوش رہتی ہے؟ سحر ہر روز کسے دیکھنے آفتاب بکف آتی ہے؟ کوہسار چپ چاپ کس کی راہ دیکھتے رہتے ہیں؟ صحرا کس کے لیے آنکھیں بچھائے ہوئے ہے؟ ایک ایک چیز، ایک ایک ذرّے کا دل کس کی یاد میں دھڑکتا رہتا ہے؟ ہر شے کو کس کی طلب و جستجو نے سیر و مشاہدہ میں لگا رکھا ہے؟ میں یہ سوچ رہا تھا کہ ندائے سروش آئی:

"اپنے اِلٰہ کی"

یاد رکھو! ہر چیز کا اِلٰہ (یا معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود) ایک ہی ہے، اور وہ یگانہ و بے مثل ہے: الحسن والحق، الحیّ والقیّوم اور ربِّ ذوالجلال والاکرام ہے۔

اس کا جمال و جلال ہر صورتِ مجاز میں حیرت افزا و مسحور کُن اور جانفزا و قُرۃُ العین ہے،
اگرچہ صورتِ حقیقی میں نظارہ سوز و مردم افگن اور ہوش ربا و جانستاں ہے۔ وہ چونکہ علیم و
حکیم اور رحیم و کریم ہے، اس لیے اہلِ حُسن و نظر پر ان کے جمالیاتی ذوق کی کیفیت و کمیت
کے مطابق صورتِ مجاز میں اپنا جلوہ پیدا کرتا ہے۔ ایک تو انسان کے معروضِ حسن و محبّت
کی صورتِ مجاز میں نمودِ حُسن ارتقائی ہے اور دوسرے اس کا اپنا ذوقِ حُسن ارتقائی ہے۔
لہٰذا اُسے خوب سے خوب تر کی طلب و جستجو رہتی ہے، اور یہ راز ہے اس کی ثقافت کے
نشو و ارتقاء کا۔

یہی سیر و مشاہدہ کی غایت اور "فَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ" کے معانی ہیں۔ دیکھو! حُسنِ "دوست"
ہر رنگ و بو، ہر انداز و ادا، ہر صورت و آہنگ، ہر زبان و آواز اور ہر شکل و صورت میں
اپنی نمود رکھتا ہے۔ اُسے ہر انداز و رنگ میں دیکھنا چاہیے، کیونکہ اس کی ہر نمود آیۂ "دوست"
ہے جو اس کی یاد دلاتی ہے اور یادِ "دوست" طمانیتِ دل، قُرۃُ العین اور جمالیاتی ثروت
ہے۔ حُسنِ "دوست" کے گوناگوں جلوؤں سے ذوقِ نظر، شوقِ دید، آرزوئے حسن و زندگی
اور خوب سے خوب تر کی طلب و جستجو پیدا ہوتی ہے، لہٰذا ان کے مشاہدے کی خاطر قریہ قریہ
وادی وادی، شہر شہر اور ملک ملک کی سیر و سیاحت کرنی چاہیے۔ اس سے قلب کی آنکھ کھلتی
اور روشن ہوتی ہے، فکر و نظر کی جولانگاہ میں وسعت و پہنائی پیدا ہوتی ہے، تعصبات
دور ہوتے ہیں اور انسان اپنی تنگنائے دُنیا سے باہر نکلنے پر مجبور ہو جاتا ہے جس سے
اس کی دُنیا وسیع ہوتی جاتی ہے نیز اس کی کم نگاہی و کم آگاہی اور حسد و عصبیّت کا درماں بھی ہے۔

کُل جہان اور کُل بنی نوعِ انسان اللہ تعالیٰ نے پیدا کیے ہیں اور تنہا وہی ان کا
الٰہ و ربّ بھی ہے، یہ سب اس کی جمالیاتی تدریجی تخلیقی فعلیت کے حسین شہکار ہیں، انہیں اپنے
الٰہ و ربّ کے حوالے سے بنظرِ محبّت دیکھو! نظرِ محبّت سے دیکھو گے تو "دوست" کی
تمام مخلوقات تمہیں حسین نظر آئیں گی! ان سے تم اُنس و محبّت کرنے لگو گے اور تعصبات کے

اندھیرے چھٹنے لگیں گے۔ ملک ملک کی سیر کرو اور وہاں کے لوگوں کو محبت کی نظر سے دیکھو۔ ان سے ملو جلو۔ ان کا رہن سہن دیکھو! ان کے اخلاق و کردار اور عادات و اطوار کا مشاہدہ کرو! یہ معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ وہ کس طرح سوچتے اور زندگی کرتے ہیں؟ دین، زندگی، کائنات، خدا اور آخرت سے متعلق ان کے عقائد و نظریات کیا ہیں اور کیوں ہیں؟ اس مشاہدہ و تفکر اور تحقیق و جستجو سے علم و حکمت میں اضافہ ہوتا ہے اور انسان کے نورِ باطن کا نشوو ارتقاء ہونے لگتا ہے، جس کی بدولت اس پر وہ حقائقِ زندگی منکشف ہونے لگتے ہیں جو عصبیت و حسد کی ظلمتوں اور سرکشیِ علم کے طوفانوں کے سبب عقلِ سلیم سے مخفی رہتے ہیں۔

انسان خواہ کچھ بن جائے بشری کمزوریوں سے مبرا نہیں ہوتا۔ ان کمزوریوں پہ قابو پانا ہی فتوت و شہ زوری ہے اور اس کا ایک طریقہ سیر و مشاہدہ بالحق ہے۔ گوشِ حق نیوش، دیدہ عبرت نگاہ اور قلبِ حق آموز ہو تو سیر و مشاہدہ ثمرور و سودمند ہوتا ہے۔ شہروں کی ثقافتی زندگی کی معجز نما علمی، سائنسی اور تکنیکی ترقیوں کے مناظر اگر خیال انگیز و سبق آموز اور علم فزا ہوتے ہیں تو اجڑی بستیوں کے مناظر عبرتناک و بصیرت افروز ہوتے ہیں، جن سے قلب میں سعادت و حیات اور خیر و حسنہ کے چشمے پھوٹ پڑتے ہیں اور ایسے ہی زندہ و سعید قلب کو حسن و زندگی کی آرزو ہوتی ہے۔ شہری زندگی کی خوشحالی و ترقی کے مناظر کتنے ہی خوش آئند و مرعوب کن اور رشک آفریں کیوں نہ ہوں، ہمیں تاریخی عمل کی اس غیر مبدل روش کی یاد دلاتے ہیں کہ جب کوئی قوم اپنے فکر و عمل کی جہتِ صالحہ رکھتی ہے اور اس میں زندگی کی آرزو زندہ و فعّال رہتی ہے، وہ ترقی کرتی رہتی ہے، لیکن جونہی اس کی یہ آرزو مضمحل و کمزور ہونے لگتی اور اس کے فکر و عمل کی جہت صالحہ نہیں رہتی، اس کے انحطاط و زوال کا بھی آغاز ہو جاتا ہے۔ علاوہ بریں، اگر کسی قوم میں آرزوئے حسن و زندگی نہیں رہتی تو وہ خود خواہ کتنی مادّی ترقی کیوں نہ کر لے، اس کی رجعتِ قہقری، ذلّت و مسکنت

یا ہلاکت و بربادی قدرت کے قانونِ احترامِ آرزو کی رُو سے شدنی ہے۔

اُجڑی بستیاں تاریخ کا المیہ ہوتی ہیں۔ المیہ انسان کو تاریخی عمل کے اس اصل الاصول کی یاد دلاتی ہے کہ جو قوم خدا آگاہ و خود آگاہ نہیں رہتی، زمانہ اسے حرفِ غلط کی طرح لوحِ جہاں سے مٹا دیتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں آرزوئے حسن و زندگی نہیں رہتی اور اس کی جگہ آرزوئے سیّئہ و مرگ لے لیتی ہے۔ چونکہ وہ خود فراموش و خود ناشناس ہوتی ہے، اس لیے اُسے اپنی آرزوئے سیّئہ و مرگ کا شعور نہیں ہوتا، لیکن ربِّ سمیع و بصیر کو تو اس کی آرزو کا علم ہوتا ہے، لہٰذا وہ اپنے قانونِ احترامِ آرزو کے مطابق اس کی آرزو پوری کر دیتا ہے۔ آثارِ قدیمہ، کھنڈرات، اور اُجڑی بستیاں دراصل ان کے مکینوں کی آرزوئے حسن و زندگی کی موت یا آرزوئے مرگ کی علامتیں ہوتی ہیں۔ وہ ہمیں یاد دلاتی ہیں کہ جو قوم قدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل اور قانونِ احترامِ آرزو سے صرفِ نظر کرتی ہے، قدرت اس سے صرفِ نظر کر لیتی ہے، اس کے نتیجے میں وہ حسن و زندگی سے محروم ہو جاتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز اپنی زندگی اور بقا کے لیے ربِّ کریم کی صفاتِ حیات و قیومیت کی مرہونِ منت ہے۔ انسان غور کرے تو آثارِ قدیمہ عبرت و موعظت کے معروضات ہیں، لیکن اس کے لیے جو اہلِ نظر، اہلِ دل اور اولوالالباب ہیں اور ایسے ہی انسان حسن و زندگی کی آرزو رکھتے ہیں۔

چونکہ المیہ حسن و زندگی ایسی نعمتِ حسنیٰ و عظمیٰ کی بربادی و ہلاکت کا منظر ہوتی ہے، اس لیے اس میں ضربِ کلیمی کی تاثیر ہوتی ہے۔ چنانچہ المیہ کی ضرب سویدائے قلب پر ضربِ کلیمی کی صورت لگے تو اس میں بیک وقت آرزوئے حسن و زندگی کا چشمہ پھوٹ پڑتا ہے، جس سے جمالیاتی، نفسیاتی لمحہ کی وقوع پذیری کا امکان پیدا ہوتا ہے۔ آرزو ہو تو وہ پوری ہوتی ہے اور آرزو ہی نہ ہو تو وہ پوری کیسے ہو؟ نیز آرزو ہوتی ہی وہ ہے جو سچی ہو۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جمالیاتی۔ نفسیاتی لمحے کے وقوع پذیر ہونے کا سبب قدرت کا

قانونِ احترامِ آرزو ہے۔

یوں تو قدرت کی ہر تخلیق ہی معجزہ ہے، لیکن اس کا سبب سے بڑا اعجازِ تخلیقِ زندگی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ہستی "زندگی" پیدا نہیں کرسکتی۔ وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز مخلوق ہے، لہٰذا حادث ہے اور حادث چیز کا خالقِ حیات ہونا محال ہے؛ دوسرے ہر چیز نہ تو زندہ بالذّات ہے نہ قائم بالذّات۔ جو چیز اپنی زندگی و بقا کے لیے الحیّ والقیّوم کی محتاج و مرہونِ منّت ہو، وہ زندگی کیسے پیدا کرسکتی ہے؟ حیات آفرینی فقط اللہ تعالیٰ کی جمالیاتی تخلیقی فعلیت کا خاصہ ہے، جو حقیقت میں اعجاز ہے۔ زندگی معجزہ ہے اور معجزہ بھی ایسا کہ اس کے بغیر انسان ہوتا نہ جہان، زمان ہوتا نہ مکان، ہست ہوتا نہ بود، لذّت و مسرّت ہوتی نہ سوز و ساز، کچھ بھی تو نہ ہوتا۔ زندگی حسن بھی ہے اور عشق بھی، اور آئینۂ حسن و حق بھی ہے۔ یہ آرزو بھی ہے اور مقصودِ آرزو بھی۔ الحسن زندگی ہی میں اپنا جلوہ پیدا کرتا ہے اور زندگی ہی اس کا مشاہدہ کرتی اور اس سے لذّت و طمانیت اور جمالیاتی سوز و ساز حاصل کرتی ہے۔ الغرض، زندگی ایسی نعمتِ حسنیٰ و عظمیٰ ہے کہ انسان سے اس کا حقِ تشکّر ادا ہو ہی نہیں سکتا؛ لیکن بہت کم اس کی قدر پہچانتے اور اس سے مستقلاً مستفیض ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ربِّ رحمٰن و رحیم قرآنِ مجید میں انسان کو زندگی کی ہلاکت و بربادی کے المناک مناظر کے مشاہدہ بالحق کی تلقین کرتا ہے تاکہ اس کے دل میں حسن و زندگی کی آرزو بیدار و فعّال ہوجائے اور وہ ایسے کام نہ کرے جو اُسے حسن و زندگی سے محروم کردیں۔

المیہ میں تزکیۂ نفس کی تاثیر ہوتی ہے، جس پر اس کی ترقی و کامیابی اور فلاح منحصر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ تزکیہ سے حسّی، قلبی، نفسی نظام امراض سے پاک و صاف ہوکر صحت مند و توانا اور نشو و ارتقا کرنے کے قابل ہوجاتا ہے۔ دوسرے اس سے نورِ حسن ذات نشو و ارتقا کرنے لگتا ہے، جس کے نتیجے میں انسان عبدیت کے مقامِ محمود پر متمکن ہوکر ترقی کے مدارج

طے کرتا رہتا ہے۔ یہ یاد رہے کہ اس نورِ باطنی کا ارتقاء اضافی و لامتناہی، اس لیے کہ وہ الحسن کے اپنی جمالیاتی تخلیقی فعلیت میں مسلسل و پیہم اپنا جلوہ پیدا کرنے کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ الغرض، المیہ سے تزکیۂ نفس ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں حسیّ قلبی نفسی نظام اپنے وظائف انفرادی اور کلّی حیثیت سے بطریقِ احسن سرانجام دینا شروع کر دیتا ہے تو پہلے اس میں آرزوئے حسن و زندگی کا احیاء ہوتا ہے اور پھر وہ نشوونما ارتقاء کرنے لگتی ہے اور انسان کو صالح، شہید اور صدّیق بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ آرزوئے حسن و زندگی کا ارتقاء اور نورِ باطنی کا ارتقاء لازم و ملزوم ہیں۔ اس ارتقائے نور کی بدولت مؤمن پہلے صالحیت کے مقام پر متمکن ہوتا ہے اور پھر ترقی کر کے شہادت و صدیقیت کے مقام پر فائز ہوتا ہے۔ مقامِ صدّیقیت جمالیاتی ارتقاء کے لامتناہی امکانات کا امین ہے۔ جمالیاتی ارتقاء سے مراد انسان کی آرزوئے الحسن اور نورِ باطنی کا ارتقاء ہے جس کی بدولت "دوست" کے قرب و رضوان اور ہم نظری و ہم کلامی کی نعمت حُسنیٰ و عُظمیٰ میسر آتی ہے۔

دین کی غایت محبّتِ الٰہی ہے اور محبّتِ الٰہی کا خاصّہ اور ذریعہ اس کی تخلیقات خصوصاً بنی نوعِ انسان سے محبّت کرنا ہے، خواہ ان کی قوم، نسل، رنگ، ملک، زبان، دین اور مذہب کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ سیر و مشاہدہ سے آدمی کو اپنے الٰہ و ربّ کے حسین تخلیقی شاہکاروں کو دیکھنے، ملنے جُلنے اور ان سے تبادلہ خیالات کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اس سے بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً مفاہمت، خیرسگالی اور اُنس و محبّت کے جذبات پرورش پانے لگتے ہیں اور مغائرت و عصبیت کم ہونے لگتی ہے۔ قربِ مکانی سے قربِ قلبی کا امکان پیدا ہوتا ہے اور دوسروں کی تہذیب و تمدّن، ثقافت، علوم و فنون اور سائنسی و ٹیکنالوجی سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ اس طرح جذبۂ مسابقت پیدا ہوتا ہے جو رہوارِ ترقی کو مہمیز کا کام بھی دیتا ہے۔ سیر و مشاہدہ بالحق جمالیاتی حسّ کو

زندہ و فعّال، جمالیاتی ذوق میں بوقلمونی و رفعت اور فکر و نظر میں آفاقیت پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ انسان کی داخلی دُنیا کشادہ ہو جانے سے اس کی محبت کی دُنیا میں وسعت و پہنائی پیدا ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں اس کے لیے رحمۃ للعالمینی کی راہ ہموار اور واضح ہو جاتی ہے۔

انسان اپنی دُنیا میں مقیّد ہو جائے تو اُس کے نفس پر جمالیاتی اِرتقاء کی راہ مسدود اور اس پر عرصۂ حیات تنگ ہو جاتا ہے؛ نیز اسے اپنی خداداد استعدادوں کو قوت سے فعل میں لانے کی آرزو رہتی ہے نہ صلاحیت۔ اس کُفرانِ نعمت کے جرم میں وہ مغضوب و گمراہ اور محروم و ناکام رہ جاتا ہے۔ اس ضمن میں یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ شُحِّ نفس جس قدر زیادہ ہوتا ہے، اسی نسبت سے اس کی دُنیا کو تنگ و تاریک اور اس میں خوف و حزن کی آتشِ ظلمت اُسا کو تیز تر کرتا جاتا ہے، اور اس پہ اس سے باہر نکلنے کی راہیں مسدود کر دیتا ہے۔ شُحِّ نفس یا بُخل سے تنگ نظری و خود نگری، خود بینی و خود پرستی، حسد و بغض اور تکبّر و غرور ایسی مہلک بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں، جس کے نتیجے میں انسان معاشرتی سرطان بن جاتا ہے۔ ان بیماریوں کا ایک حسین علاج اور ان سے محفوظ رہنے کا ایک احسن طریقہ سیر و مشاہدہ ہے اور یہی "فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ" کے ارشادِ دُوست کی غایتِ حقیقی ہے۔

صبح کی سیر ہو اور پھر باغ سیر ہو، قُرّۃُ العین و کیف پرور اور دلآویز و جاں فزا نہ ہو تو کیا ہو؟ ہنگامِ سحر نور باری کا سماں ہوتا ہے اور نظر افروز و روح افزا ہوتا ہے۔ اس وقت روحِ حسن خود نما و مشہود ہوتی ہے۔ اگر انسان صاحبِ نظر ہو اور اس کے دل میں آرزوئے حسن زندہ و فعّال ہو تو روحِ حسن پوری آب و تاب سے اس پر اپنا جلوہ پیدا کرتی ہے۔ مشاہدۂ حسن سے جمالیاتی سوز و سرور، طمانیت و مسرت، لذت و کشادِ زندگی، الغرض جمالیاتی ثروت ملتی ہے۔ باغ میں گلہائے رنگ رنگ ہوتے ہیں، جو جمالیاتی ذوق اور

حسِ الوانی کی تسکین کرتے ہیں۔ جو اہلِ نظر اُن کا مشاہدۂ جمال کرتے ہیں وہ جواب میں انھیں جمالیاتی ثروت دیتے ہیں؛ اور جو اُن سے کلام کرتے ہیں وہ اپنی زبانِ جمال سے انھیں حُسن و زندگی کے اسرار سے آشنا کرتے ہیں۔ اشجار نظر افروز تو ہوتے ہی ہیں، ثمر ور بھی ہوں تو ان کی قدر و قیمت سوا ہوتی ہے۔ حُسنِ نظر ہو تو ہر شجرِ ثمرور پر یہ مرقوم ہوتا ہے:

"انسان کا شجرِ زندگی میری طرح ثمرور ہونا چاہیے اور میری طرح اس کا ثمر بھی دوسروں کے لیے ہونا چاہیے۔" حقیقت میں انسان ہوتا ہی وہ ہے جس کا حاصلِ زندگی دوسروں کے لیے ہو۔ یہی رحمۃ للعالمینی ہے، جو سنتِ پیغمبریؐ ہے۔ سبزہ و گل اور آبِ رواں میں حُسن بھی ہوتا ہے اور زندگی بھی، اسی لیے ان کے مشاہدے سے لذّتِ زندگی اور جمالیاتی ثروت ملتی ہے، جس کی بدولت آرزوئے حُسن و زندگی کا اِحیاء اور نشو و ارتقاء ہوتا ہے۔

باغ کی پُراسرار خاموشی میں نسیم کے خرامِ ناز کی گونج از بس معنی خیز ہوتی ہے۔ خاموشی کی بھی اپنی زبان ہے، جو منّت کشِ الفاظ و آواز نہیں، یعنی زبانِ قال نہیں زبانِ حال ہے۔ یہ اسرارِ "دوست" سے اہلِ حُسن و عشق کو آشنا کرتی ہے جو اُن کی تمنّا اور آرزوئے حُسن و زندگی رکھتے ہیں۔ نسیم و شمیم اور نکہت و باد کی پُراسرار غنائیت میں آرزوئے "دوست" کا درد و سوز ہوتا ہے، جو دلِ آشنا کو درد و سوزِ آرزومندی عطا کرتا ہے، جو جمالیاتی ثروت ہے۔ چمن کے پُراسرار سکوت میں نسیم و شمیم کے خرامِ ناز کی معنی خیز گونج اور طیور کی نغمہ سنجیاں سُرور انگیز و وجد آفرین ہونے کے ساتھ پُراسرار، معنی خیز اور خیال افروز بھی ہوتی ہیں؛ خصوصاً شفقِ شام و سحر کے وقت چڑیوں کی نغمہ سنجیوں میں درد و سوز کا طوفان ہوتا ہے، جس سے کُشادِ درِ دل ہوتی ہے، نیز اس میں برقِ حُسن ہوتی ہے، جو قساوت رُبا ہوتی ہے۔ یہ راز اہلِ جذب و شوق ہی جانتے ہیں کہ گلستانِ محبت کے طیورِ سوختہ جاں دوشیزۂ سحر میں جمالِ "دوست" دیکھتے ہیں تو وفورِ شوق میں اس کی حمد و ثنا کے نغمے گاتے ہیں اور یہ نغمہ سرائی تسبیح و تہلیل اور تقدیس و تمجید ہوتی ہے۔ شام سے پہلے یہ مطربانِ دردمند اپنی حسرتوں کا خون برنگِ شفق دیکھتے ہیں تو تڑپ

اٹھتے ہیں اور اپنے معروضِ حُسن و عشق کے فراق میں نوا سنجِ فغاں ہو جاتے ہیں۔ ان کی اس نوائے شوق میں برقِ حسن ہوتی ہے، جو قسادت کو سعادت میں بدل دینے کی تاثیر رکھتی ہے، لیکن ان کے لیے جو ذوقِ سمع رکھتے ہیں۔ ذوقِ سمع ربِّ جلیل و کریم کی بے بہا نعمتِ حسنیٰ ہے اور اس سے جمالیاتی ثروت ملتی ہے۔

باغ میں جاؤ تو طیور کے جمالِ دل فروز کو دیکھو اور ان کے نغمے سنو کہ ان میں جمالیاتی حِس اور آرزوئے حُسن و زندگی کے اِحیاء و اِرتقاء کی تاثیر ہوتی ہے۔ "دوست" کی یاد میں طیورِ آوارۂ کوئے محبّت کے پُرسوز نغمے اہلِ سمع کو عزت و عبرت دلاتے ہیں کہ اولادِ آدم میں سے اکثر عقل و فکر رکھنے کے باوجود یادِ الٰہی سے غافل اور زیانِ مدام میں رہتے ہیں جبکہ یہ "بے سمجھ" پرند "دوست" کی یاد میں سرگرمِ فغاں رہتے ہیں۔ کاش انسان کو اس حقیقت کا اِیقانِ کامل ہوتا کہ جمالیاتی ثروت اور جنّت لازم و ملزوم ہیں؛ اور جمالیاتی ثروت جو بہلائے جنّت ہے حیاتِ دُنیوی ہی میں حاصل ہو سکتی ہے۔

یہ حقیقت یاد رکھنے کے قابل ہے اور ہمیشہ پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اُنھیں یاد کرتا ہے جو اُسے یاد کرتے ہیں اور جو اُسے بُھلا دیتے ہیں وہ انھیں بھلا دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو بُھلا کر انسان خدا آگاہ رہتا ہے نہ خود آگاہ اور اس کے نتیجے میں اس کی دُنیا تنگ و تار ہو جاتی ہے۔ بزبانِ قرآن پاک وہ "اندھا" ہو جاتا ہے۔ قلب کا اندھا ہی حقیقت میں اندھا ہوتا ہے۔ جو دُنیا میں "اندھا" ہو گا، آخرت میں بھی اندھا اُٹھے گا۔ یہ قدرت کا قانونِ مجازات ہے جسے اس کی معنوی رعایت سے "جمالیاتی بے بصری" کے قانون سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

سیر و مشاہدہ انسان کو اس کے اِلٰہ و ربّ کی یاد دلاتے رہتے ہیں اور اسے خدا فراموشی و خود فراموشی ایسے مہلک مرض سے بچانے میں مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔ خدا فراموشی و خود فراموشی جس قدر اہم و معروف اصطلاحات ہیں اسی قدر لوگ ان کے معانی و مفہوم سے کم آگاہ ہیں، لہٰذا ان کی صراحت کر دی جاتی ہے۔

(الف) خدافراموشی :

اس اصطلاح کے معانی ومفہوم کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان مندرجۂ ذیل حقائق کو فراموش کردیتا ہے :

۱۔ بنی نوع انسان کا کوئی خالق و رب اور الٰہ ہے، اور وہ صرف اور تنہا اللہ تعالیٰ ہے؛ اور بحیثیتِ خالق و پروردگار اس کے انسان پہ کچھ حقوق ہیں، جن کا جاننا اور پورا کرنا اس پر لازم ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ اور انسان کا رشتہ خالق و مخلوق، ربّ و مربوب، معبود و عابد، حاکم و محکوم، مطاع و مطیع اور غنی و فقیر کا ہے، اور فقیر کے معانی محتاج و دست نگر کے ہیں۔

۳۔ انسان اللہ تعالیٰ کی تخلیق بالحق ہے اور اس کا قانونِ مکافاتِ عمل اور قانونِ احترامِ آرزو کا مکلّف و مستوجب ہے، اور اس کے قوانین غیر مبدّل ہیں۔

۴۔ اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک، بے مثل و یگانہ، الواحد والقہّار، عزیز و قدیر، سمیع و بصیر، علیم و حکیم، مالکِ یوم الدّین اور مالکِ ارض و سمٰوٰت ہے۔

۵۔ حیات و ممات، زمان و مکان، الغرض جملہ اشیائے کائنات اللہ تعالیٰ کی جالیاتی تزدیجی تخلیقی فعلیّت کے شاہکار ہیں۔ لہٰذا ایک تو وہ حادث ہیں اور دوسرے ان میں سے کوئی چیز، کوئی ہستی خواہ کتنی ہی برگزیدہ کیوں نہ ہو، اس کی ذات وصفات میں شریک ہے نہ ہو ہی سکتی ہے۔ یہ اس کے مقدور ہی میں نہیں۔

۶۔ ربِّ ذوالجلال والاکرام نے اس کائنات میں جملہ نعمتیں جملہ بنی نوع انسان کے تمتّع و استفادے کے لیے بنائی ہیں، لہٰذا کوئی فرد، جماعت یا قوم ان نعمتوں کے کسی حصّے پر قبضہ جما کر دوسروں کو ان کا تمتع کرنے سے محروم نہیں رکھ سکتی۔

۷۔ اللہ تعالیٰ جملہ مخلوقات کا خالق پروردگار اور مالک و آقا ہے۔ لہٰذا اس کی مخلوقات سے محبت کرنا اصل میں اس سے محبت کرنا، اور اس کی مخلوقات سے نفرت کرنا،

حسد و بغض یا عداوت رکھنا اور ان پر ظلم کرنا اللہ تعالیٰ سے نفرت، حسد و بغض اور عداوت رکھنے کے مترادف ہے۔

۸۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور ہستی کو اس کی ذات و صفات میں شریک کرنا، اُسے پکارنا، اس سے مدد اور مرادیں مانگنا، اسے سجدہ و رکوع کرنا شرک ہے، جو ظلم عظیم اور ناقابلِ معافی گناہ ہے۔

۹۔ اس کا دین اسلام ہے اور اس کا دو بنیادی و غیر مبدّل اُصول لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ اور لَاحُکْمَ اِلَّا لِلّٰہ ہیں۔

۱۰۔ خدا فراموشی کا نتیجہ خود فراموشی ہے، جس کی صراحت کی جاتی ہے۔

(ب) خود فراموشی:

اس اصطلاح کے معانی کا ملخص یہ ہے:

۱۔ انسان کا اس حقیقت کو فراموش کر دینا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق و مربوب اور عبد و فقیر ہے، اور تنہا وہی اس کا خالق و ربّ، وکیل و نصیر اور اِلٰہ و مستجیب الدعوات ہے نیز

۲۔ وہ محنت و مشقّت میں پیدا کیا گیا ہے اور اپنی سعی و جہد کی کیفیت و کمیت کے مطابق قومی پیداوار میں اپنے حصّے کا حقدار ہے۔

۳۔ انسان کا اپنے مقصودِ حیات کو، نیز

۴۔ اس حقیقت کو بھلا دینا کہ وہ قدرت سے قانونِ مجازات اور قانونِ احترامِ آرزو کا مستوجب ہے۔

۵۔ یہ یاد نہ رکھنا کہ اس کی زندگی لذّتِ موت سے آشنا تو ہوگی، لیکن فنا و معدوم نہ ہوگی، بلکہ اُسے موت سے آشنا جہانِ زیست یا الحیوان میں ہمیشہ زندگی کرنا ہوگی اور اپنے اعمال کے حُسن و قبح کے مطابق جنّت یا جہنّم میں رہنا ہوگا۔

۶۔ اس حقیقت کو نظر انداز کر دینا کہ انسان کی حقیقی کامیابی جنّت کا حصول ہے، جو

اس کے اِلٰہِ جمیل کی دید و لِقاء اور قرب و حضوری کا حُسنِ مقام ہے، اور جہاں "دوست" کی ہم نظری و ہمکلامی اور رضوان کی رحیقِ مختوم ملے گی، جس کی لذّت و مستی اور کیف و سُرور کا تصوّر بھی محال ہے۔

۷۔ اپنے قلبی امراض اور نورِ باطنی کے اِرتقاء و اِتمام سے غافل ہو جانا۔

۸۔ اُسے اپنے نفس کے احوال و ظروف کا شعور نہ ہونا کہ وہ مطمئن ہے یا آتشِ خوف و حزن کی اذیتوں کے سبب بیقرار ہے؛ اور اُسے عذاب النّار سے بچانے فکر نہ کرنا۔

۹۔ اُسے اپنی جمالیاتی ثروت سے محرومی کا احساس و شعور نہ رہنا۔

۱۰۔ انسان کا اپنے نفس کو پہچانتے اور اس کا محاسبہ کرنے؛ نیز اپنی آرزوئے حسن و زندگی کے اِتمام و ارتقاء کی پروا نہ کرنا۔

یہ راز کم جانتے ہیں کہ دیہی و شہری اور صحرائی و کوہستانی علاقوں اور ملکوں کی سیر کرنے کے ساتھ فکر و نظر بھی سیر کرتی ہے اور اس کے نتیجے میں انسان کے حسنِ ذات کے نور کا ارتقاء ہوتا ہے، اور باطنی دُنیا کشادہ و وسیع ہوتی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے یہ تنگیِ دامانِ حیات کا مداوا بھی ہے جو حسد و تعصّب اور بُخل سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ تینوں قلب کے سرطانی امراض ہیں، جو انسان کو ظالم بنا دیتے ہیں۔ ظُلم انسان کی قساوت و شقاوت اور جہل و خود نگلی پر دلالت کرتا ہے، لہٰذا تاریخی عمل کُفر کو تو برداشت کر لیتا ہے، مگر ظُلم کو نہیں؛ چنانچہ وہ کُفر بالعدل کی حکومت سے تو تعرض نہیں کرتا اور اسے برداشت کر لیتا ہے، لیکن ایمان بالظّلم کی حکومت ہو یا کفر بالظُلم کی، وہ اس کا مخالف و حریف بن جاتا ہے۔ یہ تاریخی واقعیّت خود اپنی شاہد ہے۔

آدمی جب چشمِ بینا اور گوشِ حق نیوش کے ساتھ محلّوں، بنگلوں اور حویلیوں کے ساتھ ساتھ کچے گھروندوں، جھونپڑوں اور سادہ مکانوں کا مشاہدہ بالحق کرتا ہے تو اس پر حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ فرعونوں، ہامانوں، قارونوں اور آزروں کے دو لتکدوں سے ظُلم و شر اور

سیئہ کے سوتے پھوٹتے اور مزرعِ حیات کو برباد کرتے رہتے ہیں۔ بخلاف اس کے مفلوک الحال محنت کشوں کے گھروندے سے خیر و حسنہ اور عدل و احسان کے چشمے اُبلتے رہتے ہیں، جن سے کشتِ زندگی سرسبز و شاداب اور بارآور ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ محنت ہی زندگی کی پرورش و نگہداشت اور آراستگی و تزئین کرتی ہے۔ پیداوار زرعی ہو یا صنعتی، حاصلِ محنت ہوتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ محنت میں رحمت کی اور سود میں ظلم کی صورت مضمر ہوتی ہے؛ اور سود عبارت ہے حاصلِ زر سے، جو ضد و نقیض ہے حاصلِ محنت کا۔

ارتقائے حیات میں سیر و مشاہدہ اور تجربے نے بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ چنانچہ زندگی کا کوئی گوشہ ہو، کسبِ ترقی و کمال کے لیے مشاہدہ و تجربے کی غیر معمولی اہمیت سے مستحق دورائیں نہیں ہو سکتیں، اور اس کا ایک اہم ذریعہ سیر و سفر ہے، لیکن سیر کا بالحق ہونا ضروری ہے۔ کوہ و صحرا اور شہر و میدان کی سیر اور ان کی زندگی کا مشاہدہ تاریخ کے حوالے سے کیا جائے تو تاریخی عمل کی اس روش کا سراغ ملتا ہے کہ اس نے آرام طلب و تن آسان اور تعیش پسند و بزدل "مہذب" قوموں کے مقابلے میں ہمیشہ کوہستانی و صحرائی "غیر مہذب" قوموں کی معاونت کی ہے، جو سادہ و جفاکش، بلند ہمت و طالع آزما اور شجاع و صابر تھیں۔

آخر میں تمہیں اجتماعی زندگی کے اصل الاصول سے آگاہ کرتا ہوں، جو یاد رکھنے اور حرزِ جان بنانے کے قابل ہے۔ غور سے سنو، عمل کرنے کے لیے، جب کسی قوم میں آرزوئے حسن و زندگی ضعیف و کمزور ہو جاتی ہے تو اس میں معاشرتی سرطان پیدا ہو جاتے ہیں۔ معاشرتی سرطانوں کی خون آشامی کے باعث وہ قوم اس قدر مضمحل و ضعیف ہو جاتی ہے کہ مادی و حیاتیاتی ارتقا کرنے کے قابل نہیں رہتی؛ نیز اس میں آرزوئے مرگ و سیئہ پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ صورتِ حال، اس قوم کی ہلاکت و بربادی کی دلیل ہوتی ہے۔ ایسی صورتِ حال سے وہی قوم عہدہ برآ ہو سکتی ہے جس کی آرزو بدل جائے اور اس میں آرزوئے حسنِ انقلاب پیدا ہو جائے۔ ربِّ ذوالجلال والاکرام کی نصرت ان کے ساتھ ہوتی ہے جو اپنی نفسیاتی

حالت بدلنے اور آزاد و حسین زندگی گزارنے کی سچی آرزو رکھتے ہیں۔

یاد رکھو! قرآنِ مجید کا اس سلسلے میں قولِ فیصل یہ ہے کہ معاشرتی انقلاب کی آرزو ہو تو پہلے نفسیاتی انقلاب لاؤ، اس لیے کہ

معاشرتی حسنِ انقلاب لانے سے پہلے نفسیاتی حسنِ انقلاب لانا ناگزیر ہے۔

یہ اصل میں قدرت کا قانونِ احترامِ آرزو ہے، جسے سہل اور مختصر لفظوں میں اس طرح کہہ سکتے ہیں:

"جیسی آرزو ویسی زندگی"

مقام ۱۹

الحیوان

(۵) جہانِ حسن و سرور (ب) جہانِ نار

ابھی کمسن تھا کہ میں نے موت کو زندگی پر حملہ کرتے دیکھا تھا۔ اس نے میری نانی محترمہ پر اس وقت حملہ کیا تھا جب وہ اپنے اِلٰہ و ربّ کے حضور سر بسجود تھیں۔ وہ اُٹھیں اور میری والدہ مرحومہ کو پکار کر کہا: "آؤ! میں مرنے لگی ہوں!" اُن کی آواز برق بن کر ہماری دُنیائے قلب پر گری اور وحشت زدہ کر گئی۔ ہم لپک کر ان کے پاس پہنچے۔ میں نے اُنہیں اپنی والدہ ماجدہ کے زانو پر سر رکھے موت کی آغوش میں جاتے دیکھا۔ یہ بڑا ہی تشکیب رُبا مشاہدہ تھا۔ موت میری دنیائے قفس میں اس طرح جلوہ فگن ہوئی کہ پھر محجوب نہ ہوئی۔ اس دن سے آج تک میں اکثر سوچتا رہتا ہوں کہ جب مرنا ہی ہے اور سب کچھ یہاں ہی چھوڑ جانا ہے، بجز "جالیاتی ثروت" کے تو پھر دنیائے بیوفا کے پیچھے مرنا کیا؟ اور جالیاتی ثروت سے منہ موڑنا کیوں؟

علامہ اقبال نے سچ کہا ہے:

یہ مال و دولتِ دُنیا، یہ رشتہ و پیوند
بُتانِ وہم و گماں! لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

میرا رہوارِ فکر تصوراتِ مرگ وحیات کی وادیوں میں پا بسفر تھا کہ سروشِ آشنا کی ندا فردوسِ گوش بنی:
مبارک ہیں وہ لوگ جو سوچتے ہیں اور ان کی سوچ تخلیقی ہوتی ہے۔ حُسن کی طلب وجستجو طائرِ فکر کو
بلند بال وپروا نہ بنا دے تو اُس کا رابطہ مجھ سے قائم ہو جاتا ہے، جیسے مثال کے طور پر وائرلیس
کے ذریعے تم آپس میں رابطہ قائم کر لیتے ہو۔ سنو! اس دُنیا میں ایک شے ایسی ہے
جو "یقینی" ہے اور جس سے کوئی متنفس انکار نہیں کر سکتا اور وہ ہے موت۔ موت "الیقین" ہے،
لیکن اس امر کے باوجود کہ ہر شخص کو یقین ہے کہ اُس نے مرنا ہے، وہ پھر بھی اس سے غافل
ہے اور یوں زندگی کرتا ہے جیسے یہ دُنیا اس کی ابدی زیست گاہ ہے۔ جب تک جیتا رہتا ہے
موت سے آنکھ بند کیے رہتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ موت شدنی ویقینی ہے، لیکن مانتا نہیں۔
اگر وہ ماننے والا ہوتا تو مرنے کی تیاری کرتا؛ اُسے زاد المعاد کی فکر ہوتی؛ وہ مال و دولتِ دُنیا
کو اکٹھا کرنے کے بجائے "جالیاتی ثروت" حاصل کرنے کی سعی وجہد میں لگا رہتا جس کے بدلے
"جہانِ حُسن وحیات" ملتا ہے۔ جانتے ہو، جہانِ حُسن وحیات کیا ہے؟ نیز تمہارے سفرِ زندگی کا
"جہانِ آخر" کون سا ہے؟ جواب دینے سے پہلے میرے سوال پر غور کر لینا۔ میں نے "جہانِ آخر"
کہا ہے، منزلِ آخر نہیں کہا۔ جانتے ہو، کیوں؟ نہیں جانتے۔

انسان کی ناکامی ونامرادی کی ایک وجہ یہ ہے کہ "وہ نہ جاننے کے باوجود سمجھتا ہے کہ وہ
جانتا ہے"۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ نہ دوسروں کی اور نہ اپنی بات پہ غور ہی کرتا ہے، جس
طرح غور کرنے کا حق ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ جدھر اس کا نفس چاہتا ہے اُدھر وہ چلنے
لگتا ہے۔ اسے منزل کا پتا ہوتا ہے نہ راہ کا، اور نہ یہ جانتا ہے کہ کاروانِ حیات کے
سفرِ دنیا کا مقصد کیا ہے اور اس کا "جہانِ آخر" کون سا ہے اور کیا ہے؟ سنو! میں تمہیں
بتاتا ہوں، لیکن پہلے ان چار حقائق کو سمجھ کر ذہن نشین کر لو:

اوّلاً، تمہارا سفرِ زندگی ازل سے جاری ہے اور ابدالآباد تک جاری رہے گا۔ یہ سفرِ مدام ولامتناہی ہے۔
ثانیاً، یہ سفرِ زندگی ایک امتحان ہے، جس کا نتیجہ اگرچہ اس دنیا میں بھی نکلتا رہتا ہے، لیکن

آخری و کلی نتیجہ دارالآخرت میں قیامت کے دن نکلے گا اور اس کے مطابق انسان کو زندگی کرنا پڑے گی۔ اہلِ حسن و سرور جہانِ حسن و سرور میں زندگی کریں گے اور اہلِ نار آتشکدۂ خوف و حزن میں، جہاں وہ لذتِ حیات سے آشنا ہوں گے نہ لذتِ موت سے، لیکن سفرِ زندگی جاری رہے گا۔

ثالثاً، دارالآخرت اس دنیا کے مانند جہانِ موت و حیات نہیں بلکہ صرف جہانِ حیات ہے، جس کے لیے قرآنِ مجید نے "الحیوان" کی تعبیر اختیار کی ہے جو بڑی ہی فکر انگیز و بصیرت افروز ہے۔ اس جہان کی ایک مابہ الامتیاز خصوصیت یہ ہے کہ اس میں "موت" نہیں ہوگی۔

رابعاً، الحیوان کے دو بڑے حصے ہیں: ایک "جہانِ حسن و سرور" ہے اور دوسرا "جہانِ خوف و حزن"۔ میں ان دونوں جہانوں کا حال باری باری بیان کرنے کی کوشش کروں گا، لیکن اس جہانِ مرگ و زیست میں رہنے والے الحیوان کی حقیقت کیسے سمجھ سکتے ہیں؟ یہی وجہ ہے کہ ربِّ علیم و حکیم نے الحیوان کے دونوں جہانوں کو تمثیلاً بیان کیا ہے۔ مجھے بھی اُسے تمثیلاً ہی بیان کرنا ہوگا۔ اہلِ علم جو اولوالالباب ہوتے ہیں، تمثیل کو تمثیل ہی سمجھتے ہیں، اُسے حقیقت پر محمول نہیں کرتے۔ عقل کا تقاضا ہے کہ تمثیل کو تمثیل ہی سمجھنا چاہیے، ورنہ پیار سے "بیٹا" یا ادب و احترام سے "باپ" کہیں اور مجاز کو حقیقت سمجھ لیں تو نتیجہ عقیدۂ ابنیت کی صورت میں نکلتا ہے۔

سنو اور غور کرو! اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو احسن الخالقین کہا ہے اور اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس کی تخلیقی فعلیت جمالیاتی۔ تزویجی ہے۔ جیسا کہ تم معلوم کر چکے ہو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے تخلیقی عمل کی سُنّت یہ ہے کہ وہ جو چیز پیدا کرتا ہے، ایک تو اُسے حسین بناتا ہے اور دوسرے اس کا جوڑا بناتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں کہ "وہ" واحد یا احد ہے، یہ حقیقت مضمر ہے کہ اس کائنات میں تنہا وہی "اکیلا" اور منفرد ہے، لہٰذا اس کا کوئی زوج یا جوڑا نہیں، اور نہ اس کا کوئی باپ، بیٹا، بیٹی اور بھائی بند ہے، نیز نہ کوئی اس کا شریک و سہیم ہے اور نہ کوئی چیز اس کے مثل ہے۔ یہ تو تھا جملہ معترضہ۔ بہر حال، یہ دُنیا جو اللہ تعالیٰ کی جمالیاتی۔ تزویجی تخلیقی فعلیت کا نتیجہ ہے، حسین ہے۔ چونکہ یہ حسین ہے، اس لیے جمیل و جلیل، دلکش و

نظرافروز اور لذّت آفرین و سُرور انگیز ہے؛ نیز جمالیاتی ذوق کی تسکین کا سامان بھی ہے۔ اس میں یہ نکتہ مضمر ہے کہ حسن کا خاصہ دلکشی و جاذبیت، نظرافروزی و سرور انگیزی اور حیرت انگیزی و جمال و جلال ہے، اور حسن و فن لازم و ملزوم ہیں۔ بالفاظِ دیگر، فنکاری کا مطلب جمالیاتی تخلیقی فعلیت ہے؛ اور اس کا معنیٰ تخلیق و حسن کاری ہے۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حسن کاری میں تحسین و اِحیاء کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اِحیاء، انفاخِ روح یا "روحِ اِنداری" کا عمل ہے، جس کی بدولت جمالیاتی۔ فنی تخلیقات میں زندگی اپنا جلوہ پیدا کرتی ہے: احسن الخالقین کی جمالیاتی تخلیقات میں اپنی حقیقی۔ مجازی صورت میں اور فنکار کی جمالیاتی تخلیقات میں اپنی مجازی صورت میں۔ غور کرو تو اس میں فلسفۂ فن کی روح مضمر ہے۔

بات اللہ تعالیٰ کی جمالیاتی۔ تدریجی تخلیقی فعلیت کی ہورہی تھی۔ اگر اُس نے ہر چیز کا جوڑا بنایا ہے اور یہ اُس کی سُنّت ہے اور اس کی سُنّت نہ کبھی بدلی ہے نہ بدلے گی تو اس سے منطقی طور پر یہ نتیجہ مستنبط ہوا کہ اس دُنیا کا بھی کوئی زوج ہونا چاہیے اور وہ ہے، جسے دارالآخرت کہتے ہیں اور وہ "الحیوان" ہے۔ الحیوان، جو جہانِ حیات ہے، کاروانِ حیات کا جہانِ آخر ہے، منزلِ آخر نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ آرزوئے حسن اہلِ حسن و سُرور کے قافلۂ حیات کو اس جہان میں بھی سدا رواں دواں رکھے گی اور اس سفر میں بھی وہ لامتناہی منازل و مقامات سے ابدالآباد تک گزرتا رہے گا۔ اصل یہ ہے کہ آرزوئے حسن کے نشو و ارتقائے دوام کا راز كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ۝ (رحمٰن 55 : 29) میں مضمر ہے۔

بہر حال، اس جہانِ حیات کے دو بڑے حصّے ہیں: ایک جہانِ حسن و سُرور، جس کے لیے قرآنِ مجید نے متعدد تعبیریں اختیار کی ہیں، مثلاً جنّت، "حسن المآب"، خُلدِ بریں، فردوس، قُرّۃ العین وغیرہ وغیرہ۔ دوسرا حصّہ نورِ حسن اور لذّتِ حیات سے ناآشنا جہانِ خوف و حزن ہوگا، جسے قرآنِ مجید نے جہنّم، شرّ المآب، سقر، حاویہ، النّار سے تعبیر کیا ہے۔ ان دونوں جہانوں کی بعض نمایاں خصوصیات سے علیحدہ علیحدہ گفتگو کی جاتی ہے۔

۱۔ جہانِ حسن و سرور :

جہانِ حسن و سرور اُن اہلِ حسن و سرور کا حسن المآب (= نہایت حسین گھر) ہے، جنہیں دُنیا میں موت نہیں ہوگی؛ حتیٰ کہ موت و قبح کی کوئی صورت و شکل نہ ہوگی؛ مثلاً خوف و حزن، احتیاج حسرت، ناکامی و نامرادی، یاس و ناامیدی، اضمحلال و انحطاط، بیماری و ضعف، بدخلقی و شر، حسد و بغض، عداوت و مخاصمت، ظلم و جہل، خرابی و فساد، وغیرہ وغیرہ۔

حسن و سرور کا یہ خزاں نادیدہ اور سدا بہار بہشت محبّت و دوستی کے پھولوں سے مزیّن اور لذّت و مسرّت کے پھلوں سے معمور ہوگا۔ وہاں لذّت و سرور کے چشمے ہر سُو جاری و ساری ہوں گے اور اہلِ ذوق و شوق کو سرشار کریں گے۔ اس میں حیاتِ انسانی اپنی اکمل و احسن صورت میں جلوہ افروز ہوگی، لہٰذا وہ اپنی صورتِ جمال میں جلوہ نما ہوگی اور صورتِ جلال میں بھی۔ چنانچہ وہاں عورت ہوگی تو جمیل و باحیا حور کی صورت اور وہ قُرّۃُ العین و ناظورۂ حیات اور جمالیاتی ذوق کی تسکین کا معروضِ دوام ہوگی۔ اس کا گُلِ حسن و شباب سدا بہار ہوگا اور ہمیشہ شگفتہ اور رستاں رہے گا رنگِ گل ہر آن ایک نئی شان میں اپنی نمود دکھائے گا اور دل و جان کو وجد میں لائے گا؛ اور اس کی خوشبو کی ہر لپک ایک نئے رنگ میں مشامِ جاں کو معطّر کرے گی۔ وہاں سبزۂ بیدار و آبِ رواں کے مناظر جنّتِ نگاہ اور حور و طیور کے نغمے فردوسِ گوش ہوں گے۔

نفس جو چیز چاہے گا موجود پائے گا اور ہر چیز حسنِ تصوّر سے بڑھ کر حسین و لذّت انگیز ہوگی۔ جلال بصورتِ دیگر بشرِ سویّا اور بشر بحسنِ ملکِ کریم ہوگا اور اس کا ہر نظّارہ صنفِ جمیلہ کے لیے قُرّۃُ العین و روح پرور ہوگا۔ لیکن سب سے بڑھ کر جو چیز مسرّت و طرب، کیف و سرور، وجد و حال اور حیرت و مستی کا باعث ہوگی۔ وہ دیدِ "دوست" ہوگی۔ رنگ و لُو کے اس حیرتکدے میں "الحسن" جو آرزوئے حیات ہے، ہر آن شانِ نو بنو میں جلوہ افروز ہوگا تو نظّارے حسین سے حسین تر صورت میں جلوہ پیدا کرتے اور اہلِ جنّت کو متکیّف و مسحور کرتے اور اُن کی آرزوئے حسن

کی تکمیل کرتے رہیں گے؛ اصل یہ ہے کہ اسی میں اُن کے ارتقائے نور یا جمالیاتی ارتقار کا راز مضمر ہوگا۔ سفرِ حیات جاری رہے گا، احوال و مقامات بدلتے رہیں گے اور اہلِ حسن و سرور وجد و کیف کے عالم میں "دوست" کی ہم نظری و ہمکلامی کے آرزومند رہیں گے۔ ان کی آرزو پوری ہوتی رہے گی، لیکن اس طرح کہ لذّتِ سیری برنگِ تشنگی دوام ہوگی۔ "دوست" ہر آن اپنے حسن کی شانِ نو بنو میں جلوہ پیدا کرتا رہے گا، اور اس کی صوت اور صورت کے رنگ و انداز میں حسنِ تغیّر و تنوّع سحر انگیز و اشتیاق افزا ہوگا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جب رضوانِ "دوست" کی رحیقِ مختوم کا دور چلے گا تو اس کی سرخوشیِ سرمدی کی لذّت کی بوقلمونی و افزونی برنگِ دوام ہوگی۔

جنّت کسی متنفّس نے نہیں دیکھی، لیکن جس طرح اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں اس کی منظر کشی برنگِ تمثیل کی ہے اور اس حسین و بلیغ انداز میں کی ہے کہ جمالیاتی ذوق کی تشفی کے ساتھ اشتیاق و تجسّس افزوں تر ہوتا جاتا ہے، اسی طرح وہ اپنے جس اہلِ ذوق و آرزومند بندے کو جنّت کا مشاہدہ کراتا ہے تو برنگِ تمثیل اور اس کے نورِ حسنِ ذات کی نوعیتِ ارتقار اور جمالیاتی ذوق کی کیفیت کے مطابق کراتا ہے۔ جنّت میں ہر حسین چیز ہوگی جو دنیا میں ہے، لیکن صوری و معنوی اعتبار سے اکمل و احسن صورت میں ہوگی اور اس کے رنگ و صورت اور فائقہ و لذت میں حسنِ تغیّر مدام ہوگا، اور وہ ہر عیب و نقص سے منزّہ ہوگی۔ دنیا کی حسین چیزوں کے علاوہ ان گنت نعمتیں ایسی بھی ہوں گی جو کسی بشر نے دیکھی نہ سُنی ہوں گی اور اس کے حسنِ خیالؔ گمان سے بھی بڑھ کر حسین و لذّت انگیز اور سرور آفرین و کیف پرور ہوں گی۔ بے شمار انواع و اقسام کے اشجارِ ثمر دار بھی ہوں گے، جن کی نظر افروزی و دلکشی سحر انگیز ہوگی۔ بوقلمون و گوناگوں مشروبات کی نہریں رواں دواں ہوں گی اور ان کی روانی و رنگ کا ہر نظارہ دلربا بھی ہوگا اور جانفزا بھی۔ لیکن اہلِ جنّت کو ماکولات و مشروبات برنگِ سحر و طلسم ملیں گے۔ ہر تختِ مرصّع و دیدہ زیب کے ساتھ شہد کے چھتے کے مانند کوئی طلسماتی خانہ دار شے ہوگی جس میں

جنت کے نظارے اور مناظر، نیز نعمتیں متحرک اور اشارۂ دیدہ و دل کی منتظر ہوں گی، اور نمودِ خواہش کے ساتھ ہی نعمتِ مطلوبہ اہلِ شوق کی دسترس میں ہوگی۔

جنت میں ابعاد برنگِ دیگر ہوں گے، جن کا فہم و ادراک اس دنیا میں محال ہے۔ وسعت و پہنائی اور رفعت و گہرائی بے قیاس ہونے کے باوجود برنگِ قرب و رسائی ہو گی۔ زمان آنِ دھر اور مکان نقطۂ لامکان ہوگا۔ جنت کی کششِ ثقل کی نوعیت بھی جداگانہ اور راحت وافزا و طربناک ہوگی۔ دور بلکہ بہت دور ہونے کے باوجود کوئی چیز دور نہ ہوگی، اور ہر منظر حدِ نظر سے ماوراء ہونے کے باوصف نظرِ آرزومند پر مشہود ہوگا۔ جنت کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہاں شعورِ زندگی اور احساسِ لذتِ زندگی تو ہوگا، لیکن درد و الم کا احساس نہ ہوگا۔ وہاں ایسی کوئی چیز نہیں ہوگی جو مہلک و مضرت رساں یا درد انگیز و اذیت ناک ہو۔ اس میں اہل جنت کے لیے ضعف و مرض، انحطاط و زوال، پژمردگی و پیری، خرابی و فساد، خوف و حزن اور حسرت و یاس ایسی کوئی شے نہ ہوگی۔ کسی چیز کا ذائقہ خراب ہوگا نہ لذت میں کمی ہوگی؛ پانی میں روانی و گہرائی تو ہوگی، مگر اہلِ جنت کو ان کی مرضی کے بغیر نہ بہا سکے گی اور ڈبو سکے گی اور موت تو بہرحال و بہرنگ وہاں ہوگی نہیں۔ اہلِ جنت کی سیر و دید کی خاطر رفعت کے مناظرِ جلیل تو ہوں گے، مگر لغزشِ پا ہوگی نہ گراوٹ۔ فضا نور و رنگ کے سحر انگیز نظاروں اور امواجِ غنائیت و خوشبو سے معمور ہوگی۔ ہر آن نظر شہیدِ نظارہ، سامعہ قتیلِ غنائیت اور شامّہ فدائے خوشبو ہوگی اور نفس ہر لحظہ لذتِ حیاتِ نو سے سرشار رہے گا۔

حسن و نور، رنگ و بو، جمال و جلال اور شعریت و غنائیت کا یہ فردوسِ کیف و طرب نوبنو اور تازہ بتازہ گلہائے آرزو سے آراستہ و پیراستہ بھی ہوگا۔ یہ آرزوئیں پھولوں کی طرح حسین و مطہر ہوں گی، اس لیے کہ نفسِ مطمئنہ کی آرزوئیں ہوں گی، نفسِ امارہ کی نہیں۔ جنت میں موت کی طرح نفسِ امارہ نہ ہوگا۔ وہ تو فقط نفسِ مطمئنہ کے لیے "شاہی" مہمان خانہ اور حسنِ المآب ہے۔ اصل یہ ہے کہ جنت میں وہ جائے گا، جسے دنیا میں اس کی سچی آرزو ہوگی اور وہ

نفسِ مطمئنہ ہوگا، جسے اہلِ حسن آرزو سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے سوا دُنیا میں کوئی چیز واحد یا یکتا نہیں، بلکہ ہر چیز کا زوج ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہر چیز جوڑا ہوتی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ربِّ کریم کی تخلیقی فعلیت جمالیاتی تزویجی ہے اور اسی میں کائنات کے جمال و جلال، دلکشی و جاذبیت اور دلچسپی و نظر افروزی کا راز ہے۔ بشر احسن الخالقین کا جمالیاتی تخلیقی شاہکار ہے، جس کے جوڑے کو مرد و زن کہتے ہیں۔ مرد صنفِ جلیلہ اور عورت صنفِ جمیلہ ہے اور ان کے جلال و جمال کا امتزاج عبارت ہے حسنِ بشر سے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس طرح ایک رنگ یا ایک خط سے تصویر نہیں بن سکتی، اور ایک آہنگ سے نغمے کی تشکیل نہیں ہو سکتی، اسی طرح اکیلے مرد یا اکیلی عورت سے نہ تو حُسنِ بشر کی تشکیل و تکمیل اور نہ اس کے جمالیاتی جنسی ذوق کی تسکین ہی ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس طرح ربِّ علیم و حکیم نے اس دُنیا میں بشر کے حسنِ ذات کی تکمیل کے لیے مرد و زن کا جوڑا بنایا ہے، اُسی طرح اُس نے جنّت میں بھی انسان کے حُسنِ ذات کے اِرتقاء و اِتمامِ مدام اور جمالیاتی ذوق کی تسکین جاوداں کے لیے اس کا جوڑا بنایا ہے۔ چنانچہ جنّت جلالِ مرد اور جمالِ زن سے مزیّن ہوگی۔ علاوہ بریں چونکہ جنّت انسان کے لیے بنائی گئی ہے، لہٰذا اس کے حوالے سے جنّت کی تکمیل جمالِ زن و جلالِ مرد کے بغیر ممکن نہیں۔ اس سے اس امر کی توجیہ ہو جاتی ہے کہ کیوں جنّت صنفِ جلیلہ کے ساتھ صنفِ جمیلہ سے بھی معمور ہوگی۔

چونکہ جنّت میں نفسِ امّارہ ہوگا نہ شیطان، نیز وہاں موت ہوگی نہ افزائشِ نسل کی حاجت و طلب، لہٰذا وہاں جنسی تقاضے اور عمل کی نوعیت تخلیقی نہیں ہوگی، بلکہ مختلف قسم کی ہوگی؛ ولیکن یہ ضرور ہے کہ اس سے جمالیاتی۔ جنسی حظ کیفیت و کمیّت کے لحاظ سے بدرجۂ اتم حاصل ہوگا۔ جس طرح عورت کے بغیر مرد اپنی ذات کی تکمیل نہیں کر سکتا، اسی طرح عورت بھی ایسا نہیں کر سکتی، لہٰذا دونوں اپنی ذات کی تکمیل کے لیے ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر، جس طرح مرد کا جلالِ ذات عورت کے جمالِ ذات کے بغیر "حُسن" نہیں بن سکتا، اسی طرح عورت

کے جمالِ ذات کو "حسن" بننے کے لیے جلالِ مرد کی حاجت ہوتی ہے؛ اور یہ حسن سبب ہے جو انسان کی طمانیت و مسرت، اس کے جمالیاتی ذوق کی تسکین اور ارتقائے نورِ ذات کی علتِ غائی ہے۔

حاصلِ کلام یہ کہ صنفِ جمیلہ کا وجود دُنیا کی طرح جنت میں بھی صنفِ جلیلہ کی تکمیلِ ذات کے لیے ناگزیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید کی جنت حسنِ وجودِ زن سے مزین ہوگی۔

جنت میں موت کی طرح پیدائش بھی نہ ہوگی۔ یہ نکتہ وضاحت طلب ہے۔ زندگی ایسی حسین نعمتِ غیر مترقبہ ہے کہ انسان اس سے محروم ہونا یا مرنا نہیں چاہتا، بلکہ ہمیشہ زندہ رہنا چاہتا ہے لیکن دُنیا جہانِ پیدائش و فنا ہے اور اس میں موت شدنی ہے، لہٰذا آدمی اپنی نسل کی صورت میں زندہ رہنا چاہتا ہے۔ اس سے مستنبط ہوا کہ انسان میں اولاد کی خواہش کا محرکِ حقیقی اس کی آرزوئے بقائے دوام ہے۔ دُنیا کے برعکس جنت الحیوان ہے، یعنی موت سے نا آشنا جہانِ حسن و حیات ہے، جہاں انسان کو طبیعی طور سے ہمیشہ زندہ رہنا ہے، لہٰذا اُسے اولاد کی آرزو نہ ہوگی، نتیجۃً پیدائش بھی نہ ہوگی، اس لیے کہ یہ قدرت کا قانونِ احترامِ آرزو ہے۔

قرآنِ حکیم نے جنت کو حسنُ المآب سے تعبیر کیا ہے اور یہ تعبیر دو بصیرت افروز حقائق کی آئینہ دار ہے۔ ایک یہ کہ جنت کی حقیقت حسن ہے۔ چونکہ جنت کی حقیقت حسن ہے، اس لیے اس میں حسن و حسنہ کی ہر صورت ہوگی، لیکن قبح و سیئہ کی کوئی صورت نہ ہوگی۔ اس میں ہر چیز حسین و خوبصورت ہوگی، قبیح و بدصورت نہ ہوگی؛ مطہر و طیب ہوگی، ناپاک و خبیث نہ ہوگی؛ خوشگوار و سرور انگیز، لذت انگیز و راحت افزا اور دلآویز و نظر افروز ہوگی لیکن ناگوار و مکروہ، خوفناک و غم انگیز، تکلیف دہ و مشقت طلب اور اذیت ناک و درد انگیز نہ ہوگی۔ وہاں امید کی روشنی ہوگی یاس کی تاریکی نہ ہوگی۔ وہاں امن و سلامتی اور طمانیت و سکینت کی فضا ہوگی جو فتنہ و فساد، حسد و بغض اور جنگ و جدال سے نا آشنا ہوگی۔ جنت کے ہر گوشہ حسن اور حسنِ اشیاء میں زندگی اپنی حقیقی شان میں جلوہ افروز ہوگی، اس لیے غایت درجہ قُرۃُ العین اور دلکش ہوگی؛ بخلاف

اس کے وہاں خوف و حزن کا نام و نشان ہو گا نہ موت کا۔ یہ جہانِ حسن و سرور ان اہلِ ایمان کے لیے ہے جو اہلِ حسن و سرور ہوں گے، اور ان کی چار اصناف ہیں: انبیآء، صدیقین، شہدآء اور صالحین۔ یہی اولیآء اللہ اور عباد الرحمٰن ہیں۔ جہاں یہ اہل حسن و سرور ہوں، وہ جگہ جنت نہ بھی ہو تو رشکِ جنت ہے، کیونکہ ان کی صحبت و رفاقت کا ہر لمحہ دُنیا کی لذتِ ماہ و سال سے افضل ہے۔ قرآنِ حکیم نے اس حقیقت کی طرف نہایت بلیغ و بصیرت افروز اشارہ کیا ہے:

يَآأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِيٓ إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ۝ وَادْخُلِي جَنَّتِي ۝ (الفجر ۸۹: ۲۷تا ۳۰) : اے مطمئن نفس! اپنے رب کی طرف لوٹ آ۔ تو اس سے خوش و مطمئن اور وہ تجھ سے خوش ہے۔ پس میرے بندوں میں داخل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔

ان آیاتِ جمیلہ میں سب سے پہلا قابلِ غور بلکہ بصیرت افروز نکتہ یہ ہے کہ ربِ جلیل کا خطاب نفسِ مطمئنہ سے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ طمانیتِ نفس اہلِ جنت کا موضوعی معیار ہے، لہٰذا ہر شخص اپنے نفس کا جائزہ لے کر معلوم کر سکتا ہے کہ وہ مطمئن ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو وہ خوش نصیب اہلِ جنت میں سے ہے؛ اگر وہ مطمئن نہیں ہے تو وہ اہلِ نار میں سے ہے۔ معلوم ہوا کہ جنت میں داخل ہونے کے لیے طمانیتِ نفس کا ہونا ناگزیر ہے۔ اس اعتبار سے طمانیتِ نفس بہلائے جنت ہوئی۔ عارف کو اس حقیقت کا بھی شعور ہوتا ہے۔ طمانیتِ نفس ہی اصل میں دولتِ دل ہے، جس کے لیے ہم نے جمالیاتی ثروت کی تعبیر اختیار کی ہے، جو بہائے حسنُ المآب ہے۔ قرآنِ حکیم نے طمانیت کو حسنہ سے بھی تعبیر کیا ہے اور حسنہ کو نار کی ضد و نقیض کے طور پر استعمال کر کے یہ حقیقت بے نقاب کر دی کہ جس دل میں طمانیت نہیں، اس میں آگ ہو گی، خوف و حزن کی آگ، محرومی و نامرادی اور یاس و احساسِ تنہائی کی آگ۔ یہ آگ اہلِ نار کی پہچان ہے اور اس کا شعور بھی معرفتِ نفس یا خود آگاہی کے زمرے میں آتا ہے۔ جس طرح طمانیتِ نفس اس حقیقت کی مظہر ہوتی ہے کہ نفس کو اس کی آرزو و جستجو ہے، اسی طرح نار بھی اس

حقیقت کی غماز ہوتی ہے کہ نفس کو آگ کی طلب وجستجو ہے۔ چونکہ قدرت انسان کی آرزو کا پاس واحترام کرتی ہے، لہٰذا وہ اسے آخرت یا الحیوان میں بھی وہی کچھ عطا کرے گی جس کی اُسے دُنیا میں آرزو ہو گی۔ عارف کو اپنی آرزو اور قدرت کے قانونِ احترامِ آرزو کا شعور بھی ہوتا ہے۔

دوسرا خیال انگیز نکتہ اِرْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّكِ میں مضمر ہے۔ یہ ارشادِ الٰہی اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ نفسِ مطمئنہ دُنیا میں اپنے رب کے قرب وحضور میں رہنے اور بار بار اس کی طرف رجوع کرنے والا اور فقط اُسے ہی نظری وعملی طور سے اپنا رازق و پروردگار، وکیل ونصیر اور مستجیب الدعوات حاکم وآقا ماننے والا ہوتا ہے۔ بقول اللہ تعالیٰ کے اس کی زندگی اس آیتِ جمیلہ کے مصداق ہوتی ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ (الاحقاف ۴۶: ۱۳-۱۴؛ نیز دیکھیے فصلت ۴۱: ۳۰)؛ بلاشبہ جن لوگوں نے کہا: "اللہ ہمارا رب ہے"، پھر اس بات پر قائم رہے تو ان پر نہ تو خوف مسلّط ہو گا اور نہ وہ غم ہی کریں گے۔ ایسے ہی لوگ اہلِ جنّت ہیں جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ ان کے اعمال کی جزا ہے"۔ مختصر یہ کہ نفسِ مطمئنہ موحِد اور اپنے ربّ کا مقرّب و دوست ہوتا ہے۔

تیسرا بصیرت افروز نکتہ یہ ہے کہ نفسِ مطمئنہ محسن، بندۂ تسلیم ورضا اور مقامِ احسان پر متمکن ہوتا ہے، نیز اُسے رضوانِ الٰہی بھی حاصل ہوتی ہے، لہٰذا وہ صاحبِ حسن و سُرور ہوتا ہے۔ چوتھا اور آخری اہم فکر انگیز نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قاعدے کے مطابق یہ نہیں فرمایا کہ (پہلے) میری جنّت میں داخل ہو اور (پھر) میرے بندوں میں شامل ہو، بلکہ شمولیتِ بندگانِ الٰہی کو جنّت کے داخلے پر مقدّم کر کے یہ جتا دیا کہ بندگانِ الٰہی کی صحبت جنّت سے افضل ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دُنیا میں بھی اہلِ حسن و سُرور کی صحبت میں جمالیاتی ثمرات، جو

ہلائے جنت ہے، ملتی ہے اور از خود ملتی ہے، جس طرح پھولوں کی صحبت میں خوشبو خود بخود ملتی اور مشامِ جاں کو معطر کرتی ہے۔

جنت میں ان اہلِ حسن و سرور کی صحبت میں ہر لحظہ ایک نئی روحِ حسن و حیات ملے گی اور ان کے فیضانِ نظر سے نورِ باطنی کے ارتقا کا سلسلہ جاری رہے گا، جس پر علوِ مرتبت کا دار و مدار ہوگا۔ رحیقِ مختوم کے دور چلیں گے اور ہر شربِ طہور زنجبیلی بھی ہوگا اور کافوری بھی اور اس کی لذت و سرخوشی بہ رنگِ دوام ہوگی۔ اہلِ حسن و سرور زندہ دل و بے تکلف دوستوں کی طرح زندگی کریں گے۔ ان میں بذلہ سنجی و دل لگی اور لطائف و ظرائف بھی ہوں گے، چھینا جھپٹی بھی ہوگی، مگر باندازِ دوستی و شائستگی۔ الغرض ان کی ہر بات، ہر ادا اور ہر اشارت بہ رنگِ حسن و محبت ہوگی۔

جنت میں اشتہائے پیہم کے ساتھ لذتِ کام و دہن کے لیے ہر نعمت ہوگی، دیکھی بھی ان دیکھی بھی، لیکن ذائقے میں آپ اپنی مثال ہوگی۔ اشتہا میں لذت آفرینی کی اور سیری میں اشتہا انگیزی کی تاثیر ہوگی۔ دوستوں کی نشاط انگیز محفلوں کے علاوہ ازواجِ جمیل و دلکش کی مجلسیں بھی ہوں گی۔ ہر صنفِ جمیلہ دوشیزۂ نوخیز و نظارہ سوز بھی ہوگی اور قرۃ العین و نظر افروز بھی۔ وہ پیکرِ عفت و حیا بھی ہوگی اور شوخی و رعنائی کی تصویرِ متحرک بھی۔ اس کی دزدیدہ نگاہی میں دعوتِ نظارہ ہوگی اور تبسمِ زیرِ لب مظہرِ پذیرائی ہوگا۔ وہ دلکشی و جاذبیت اور محبوبیت و دلربائی میں آپ اپنی مثال ہوگی؛ نیز وہ گوہرِ ناسفتہ و تابدار اپنی تب و تابِ خیرہ کناں میں محجوب ہوگی۔ اہلِ جلال کی نظر اس کے جمالِ دلفروز و دل ستاں کی تابِ نظارہ نہ لا سکنے کے باوصف اسے دیکھے گی تو دیکھتی رہ جائے گی۔ دل کی حالت یہ ہوگی کہ قتیلِ حسن آمادہ بھی ہوگا اور شہیدِ نظارۂ جمال بھی؛ لیکن ناظورۂ حیات کا ہر جلوۂ جمال حیات آفرین و روح افزا بھی ہوگا۔ بادۂ دیدِ حور کی سرخوشی کی کیفیت بہ رنگِ سرمستی جاوداں ہوگی۔ اس کی بوئے پیرہن کیف پرور و وجد آفرین ہوگی تو بوئے بدن سحر انگیز و جاں ربا ہوگی۔ چشمِ مخمور سے ہر نظرِ شوق

مسحور ہوگی۔ جمالِ شباب و دوشیزگی بصورتِ حور اور حور بصورتِ برقِ حُسن ہوگی۔ غلمانِ مہوش جام بدست ساقی گری کرتے اس طرح محوِ خرامِ ناز ہوں گے جیسے گوہر ہائے آبدار فرشِ حریرِ رنگیں پر رقصاں ہوں۔

جنّت کا بیاں فردِ دس گوش بھی ہو تو برنگ مجازہ ہوگا۔ ایک ایسا جہانِ حسن و سُرور جو مرگ و قبح اور خوف وحزن سے نا آشنا ہو، جسے نہ تو کسی نے دیکھا ہو اور نہ وہ تصوّر ہی میں آسکتا ہو، اس کے احوال و ظروف کا بیان منّت کشِ قلم ہو نہیں سکتا۔ جو کچھ بیان ہوا تمثیل میں ہوا، اور تمثیل آئینۂ حق ہے۔ جنّت حُسنُ المآب ہے تو اس بنا پر قیاس کرسکتے ہیں کہ اس کی حقیقت حُسن ہے، لہٰذا اس کے زمان و مکان کی ماہیت وہ نہیں جو اس دُنیا کے زمان و مکان کی ہے اور جسے مادہ کہتے ہیں؛ نیز وہاں ابعادِ ثلاثہ اور ثقلِ زمینی کی نوعیت بھی مختلف ہوگی۔ موسم رنگین اور سہانا، فضا پُربہار و شاداب اور مناظر جمیل و جلیل ہوں گے اور سدا ایسے رہیں گے؛ لیکن نظارے رنگِ تغیّرِ مدام سے مزیّن ہوں گے؛ اس لیے کہ اہلِ جنّت کے نورِ ذات کے اِرتقائے مدام کے ساتھ ان کے جمالیاتی ذوق کا نشو و ارتقا بھی ہوتا رہے گا۔ دلوں میں آرزوؤں کے چشمے پھوٹتے رہیں گے اور آرزوئیں پوری ہوتی اور طمانیت و مسرت اور کیف و مستی کی صورتیں اختیار کرتی رہیں گی۔ اِلٰہِ جمیل ہر آن اپنے جمال و جلال کی شانِ نو بنو میں جلوہ پیدا کرتا رہے گا اور اس کی نسبت سے اہلِ حُسن و سُرور کے نورِ ذات کی تکمیل بصورتِ کمالِ نو بنو ہوتی رہے گی۔ اس طرح ایک طرف اِلٰہِ جمیل کی جمالیاتی تخلیقی فعلیت سدا اِرتقائے مطلق کی حالت میں رہے گی اور دوسری طرف اہلِ جنّت کے حُسنِ ذات کا نورِ اضافی حیثیت میں اپنا اِتمام و ارتقاء کرتا رہے گا۔

کسی نعمت کی قدر و قیمت کا اندازہ اس کی کم یابی نہایابی یا ضد کے حوالے سے ہوتا ہے۔ بالفاظِ دیگر کسی نعمت کی قدر و قیمت کا احساس و شعور اس کی منفی اقدار کے تصوّر سے ہوتا ہے۔ مثال کے طور سے موسم گرما میں کسی خوشگوار و خنک اور صحت افزا کوہستانی مقام

کی قدر کا صحیح اندازہ میدانی علاقے کی جاں سوز تمازت کے تصور سے ہوتا ہے۔ پانی کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ ان لوگوں کو نہیں ہوتا، جو دریاؤں چشموں نہروں اور کنوؤں کے قرب و جوار میں رہتے ہیں، بلکہ ان علاقے کے لوگوں کو ہوتا ہے، جہاں پانی کمیاب و دُور اور اس کا حصول دشوار ہوتا ہے۔ چنانچہ اہلِ حُسن و سُرور میں جنّت کی نعمتوں کی قدر کے احساس و شعور کو زندہ اور ان کے دلوں کو جذباتِ شکر و امتنان سے معمور رکھنے کی خاطر انہیں گاہے گاہے ایک تو شررِ المآب یا جہنم جھلک دکھائی جائے گی اور دوسرے انہیں بادۂ فراقِ "دوست" کی لذّت سے آشنا کیا جائے گا۔ بادۂ فراق سے آرزوئے وصالِ "دوست" افزوں تر اور آتشِ شوق تیز تر ہوگی۔

(ب) جہانِ نار

جمالیاتی مشاہدہ و واردات اور حسین خواب و نظّارہ کی طرح حسین سوچ بھی نعمتِ حسنٰی ہے۔ مبارک و خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہیں یہ نعمت میسّر ہے۔ جنّت کتنی حسین چیز ہے! ایک جھلک اور وہ بھی تمثیل میں دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ بہائے جنّت نقدِ جاں ہو تو یہ ارزاں بلکہ سر مہ مفت نظر ہے۔ انسان ہی زیاں کار و غافل اور ظالم و جاہل ہے کہ اپنے اِلٰہِ جمیل و ربِّ کریم سے یہ مفت کا سودا نہیں کرتا۔ تُف بر عقلِ عیار! دیکھنے میں آیا ہے کہ انسان جتنا بڑا سوداگر ہوتا ہے جنّت کے سودے میں اتنا ہی نادان و کم عیار ہوتا ہے۔ دولت و شہرت اور قوّت و عزّت آدمی کو متکبّر و مغرور بنا کر اس انتہائی نفع بخش تجارت سے غافل کر دیتی ہے۔ تکبّر اس تجارت کو جس کا نفع لازوال و بے قیاس ہے، گھاٹے کا سودا بنا کر دکھاتا ہے، اور تکبّر خاصّۂ شیطنت ہے۔ حسن کو قبیح، حسنہ کو سیئہ اور خیر کو شر اور نفع کو زیاں بنا کر دکھانا ابلیسی نفسی شیطان کی جمالیاتی فریب کاری و وسوسہ اندازی کا کرشمہ ہے۔ آدمی اپنے اس حریفِ پیدائشی کے جمالیاتی دھوکے میں مارا جاتا ہے۔

فرعون وہامان اور قارون و آزر تو حکومت و اقتدار، مال و دولت، جاہ و منصب؛ عزت و شہرت اور شان و شوکت کے نشے میں سرمست ہیں، ان کا جنت سے بے نیاز ہونا اور اس کا سودا نہ کرنا تو سمجھ میں آتا ہے، لیکن عامۃ الناس کیوں یہ سودا نہیں کرتے؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ میں اس سوچ میں تھا اور میری سوچ کا سفر جاری تھا۔ یہ تو ہر حال میں جاری رہتا ہے۔

سوچ، وقت اور عمر ازل سے میرے ہم سفر ہیں۔ ان کے ساتھ "دوست" بھی میرا ہمسفر ہوتا ہے۔ رفیقِ سفر تو حقیقت میں "دوست" ہی ہے۔ معبود و محبوب بھی وہ، مطلوب و مقصود بھی وہ، دلیلِ راہ و ندا و رساں بھی وہ، وکیل و مولیٰ اور حافظ و ناصر بھی وہ ہے؛ لیکن بہت کم اس کا شعور رکھتے ہیں۔ میں اس سوچ میں غلطاں و پیچاں تھا کہ ندائے سروش آئی:

تم نے الحیوان کی تصویر کا ایک رُخ دیکھا ہے، دوسرا رُخ بھی دیکھیے۔ جہانِ حسن و سُرور دیکھا ہے تو جہانِ نار کی بھی ایک جھلک دیکھیے۔ ان کو بھی دیکھیے جو بشر سَمَندر سرشت ہیں، مایۂ النّار ہیں؛ وہ سَمَندر خود بنے ہیں جس طرح آدمی زہر خور خود بنتا ہے۔ تم نے زہر خور لوگوں کو دیکھا ہوگا۔ وہ بیک وقت اتنی مقدار میں زہر کھا جاتے ہیں، جو کسی انسانوں کو ہلاک کر ڈالے۔ زہر خور بزعمِ خویش جینے کے لیے زہر کھاتے ہیں، لیکن انہیں زندگی نہیں ملتی۔ وہ تو لذتِ زندگی سے بھی محروم رہتے ہیں۔ زندگی کرنا تو بڑی بات ہے، وہ تو مرنا بھی نہیں جانتے۔ یہ بشری سَمَندر دُنیا میں لذتِ زندگی سے نا آشنا تھے۔ بظاہر جینے پر مرتے تھے، لیکن حقیقت میں حسن و زندگی سے گریزاں و ترساں رہتے تھے۔ اب جہانِ نار میں زندگی ان سے گریزاں و ترساں ہے۔ جہانِ نار میں حسن و زندگی کہاں رہ جاتے ہیں؟ کیا اجتماعِ ضدّین محال نہیں؟ ان بشری سمندروں کو آگ ہی سزاوار ہے، دُنیا میں بھی اور الحیوان میں بھی۔ "خوگرِ نار کو نار ہی چاہیے"۔ یہ قدرت کا قانونِ آرزو ہے۔ انہیں زندگی ایسی نعمتِ عظمیٰ و حسنیٰ عطا ہوئی، لیکن انہوں نے اس کی قدر نہ کی اور اس سے محروم ہو گئے۔

قدرناشناسی دلیلِ فقدانِ آرزو اور وجۂ زوالِ نعمت ہے۔ آرزو نہ رہے تو وہ نعمت چھین جاتی ہے۔ یہ قدرت کا قانونِ آرزو ہے۔ بشری سمندر نار پسند تھے، انہیں جہانِ نار ملا۔ اب آگ کے عذاب سے نالاں ہیں اور موت چاہتے ہیں، لیکن الحیوان میں موت کہاں؟ انہیں جینا تو کیا؟ مرنا بھی نہیں آتا تھا۔ جینا اور مرنا انہیں آتا ہے جو "دوست" کے لیے جیتے اور مرتے ہیں۔ اہلِ مہر و وفا "دوست" کے ساتھ جیتے، اس پہ جان دیتے اور اس کے لیے مرتے ہیں۔ ان کی زندگی اور موت "دوست" کے لیے ہوتی ہے۔

یہ بشری سمندر دُنیا میں آتشِ اندروں میں رہتے تھے۔ انہوں نے ظلم وحرام خوری سے اپنے اندر خوف وحزن کا آتشکدہ بنا رکھا تھا اور اسے جرم وگناہ کی تابکاری سے فروزاں رکھتے تھے۔ وہ جلتے جلتے سمندر کی طرح آگ میں رہنے اور جلنے کے عادی ہو چکے تھے اور انہیں حسن و زندگی کی لذّت اور اپنی محرومی و زیاں کا احساس وشعور نہ رہا تھا، اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو بھول چکے تھے۔ خدا کو بھولنے والا اپنے آپ کو بھول جاتا ہے۔ خدا فراموشی وخود فراموشی لازم وملزوم ہیں۔

ربِّ جلیل وحکیم نے ہر چیز کا جوڑا بنایا ہے۔ دُنیا کا زوج الحیوان ہے تو اس میں جہانِ حسُن وسُرور کا زوج جہانِ نار ہے، جسے دوزخ، جہنم، النّار، سقر وغیرہ متعدّد ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس میں وہ لوگ آتے ہیں جو دُنیا میں اپنے "جہانِ نار" میں رہتے تھے؛ تنگ وتار جہانِ خوف وحزن میں، حسُن و زندگی سے عاری دُنیا میں۔ انہوں نے اس نور کو بجھا رکھا تھا جو ربِّ رحیم نے انہیں ودیعت کیا تھا۔ نورِ باطنی خدافراموشی سے بجھتا ہے۔ انسان خدافراموش ہو جائے تو خود فراموش اور سیاہ کار بن جاتا ہے۔ سیاہ کاری سے حسُن ونور کے کیف وسُرور کی ٹھنڈک کافور ہو جاتی ہے اور اس کے اندر آگ لگ جاتی ہے، خوف وحزن کی آتشِ سوزاں۔ رفتہ رفتہ وہ خوگرِ کربِ نار ہو جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں اُسے حسُن و زندگی کی آرزو نہیں رہتی، اور یہ نہ رہے تو انسان اپنے آتشکدۂ اندروں

کا سمندر بن جاتا ہے۔ یہ جہانِ نار ایسے ایسی بشری سمندروں کے لیے بنایا گیا ہے۔ اس میں ہر سمندر کی اپنی دنیا ہے، جو اس کے باطنی آتشکدے کے نمونے کے مطابق ہے؛ اتنی ہی تنگ و تار، اسی قدر آتش بداماں اور اتنی ہی اذیت ناک و کرب انگیز ہے۔ "جیسا کروگے ویسا بھروگے"، قدرت کا قانونِ حیات ہے جسے قانونِ مجازات اور قانونِ مکافاتِ عمل بھی کہتے ہیں۔

اس جہانِ نار میں انسان میں جمالیاتی انقلاب آتا ہے اور اس کا احساس و شعور زندہ ہو جاتا ہے۔ دنیا میں وہ اپنے جہانِ نار میں خدا فراموش و خود فراموش ہوتا ہے، لیکن یہاں آکر اسے خدا بھی یاد آتا ہے اور خودی بھی۔ اپنے آتشکدے میں نورِ باطنی سے محروم ہونے کے سبب وہ حسن کور اور کور ذوق ہوتا ہے۔ ایسا شخص اصل میں "اندھا" ہوتا ہے۔ ہر بشری سمندر اندھا ہوتا ہے۔ الحیوان میں اندھا ہی اٹھتا ہے، لیکن جب اسے جہانِ نار میں جہانِ حسن و سرور اور اس کے مکینوں (= اہلِ حسن و سرور) کی جھلکیاں دکھائی جاتی ہیں تو اس مشاہدے سے اس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور اس پر حسن و زندگی کی حقیقت منکشف ہو جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں اگرچہ اس کی آتشِ حسرت و ندامت تیز تر ہو جاتی ہے، لیکن اس میں اپنی محرومی و نامرادی کا شعور اس شدت سے بیدار و فعّال ہو جاتا ہے کہ وہ خدا آگاہ و خود آگاہ بن جاتا ہے اور اس حسن و زندگی کی آرزو زندہ و حرکی ہو جاتی ہے۔ چونکہ قدرت کو اپنے "قانونِ آرزو" کا پاس ہے، لہٰذا جن اہلِ نار کی آرزوئے حسن و زندگی ارتقا کر کے اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہے، انہیں اپنے جہانِ نار سے جہانِ حسن و سرور کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت مل جاتی ہے اور وہ اپنے نور کے ذریعے راہِ حسن و حیات کو معلوم کر کے وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں اس نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ آرزوئے حسن و حیات کے نشوونما و ارتقاء کے ساتھ نورِ باطنی کا بھی نشوونما و ارتقاء ہوتا رہتا ہے۔ اصل

یہ ہے کہ اِرتقائے آرزو اور اِرتقائے نور لازم و ملزوم ہیں ۔

اس گفتگو سے تم یہ استنباط کر سکتے ہو کہ جہانِ نار بیمار و سقیم اور مفلوج و مردہ نفوس کا "دارالتزکیہ" ہے، جہاں ان کی بیماریوں کا علاج نیزان کی تطہیر و تحسین کی جاتی ہے تاکہ وہ زندہ و صحت مند ہو جائیں اور ان کا نور اور آرزوئے حسن و حیات نشوو ارتقاء کریں ۔ یہ سامنے کی بات ہے کہ بعض بیماریاں ایسی ہیں جو جرّاحی کے بغیر شفایاب نہیں ہو سکتیں ، لہٰذا شفایابی کی خاطر مریضوں کو جراحت کے اذیت ناک تجربوں سے گزرنا اور اس کے لیے جرّاح کا رہینِ منّت ہونا ہی پڑتا ہے ۔ اس اعتبار سے جہانِ نار بھی انسان کے لیے ربِّ رحمان و رحیم کا "دارِ رحمت" ہوا ۔ اصل یہ ہے کہ ربِّ رحمان نے رحمت کو اپنے اوپر لازم کر لیا ہے ، لہٰذا اس کی ہر تخلیقی فعلیت میں رحمت مضمر ہوتی ہے ۔ اس لحاظ سے جہانِ نار بھی مظہرِ رحمتِ الٰہی ہوا ۔

نفس کا ایک مرض ایسا بھی ہے ، جس کا موت سے پہلے علاج ممکن ہے ، لیکن موت کے بعد وہ لاعلاج ہو جاتا ہے ۔ یہ شرک کا سرطانی مرض ہے ، جو دوا سے شفا پاتا ہے نہ جرّاحی سے ، بلکہ ان دونوں سے مرض اور بڑھتا ہے ۔ نفس میں ہر بیماری سے شفا پانے کی فطری استعداد ہوتی ہے ، لیکن شرک ایسا سرطانی مرض ہے جو نفسِ انسانی کی استعدادِ شفایابی کا استیصالِ کُلّی کر دیتا ہے اور اس کے نتیجے میں شفا پانا اس کے مقدور ہی میں نہیں رہتا ۔ بالفاظِ دیگر ، شرک نفس میں شفا و صحت یابی کے جملہ امکانات کا خاتمہ کر دیتا ہے جس طرح گھُن بیج کو کھا جائے تو اس میں نشوونما پانے کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا ۔ چنانچہ جہانِ نار میں مُشرک ہی ایسے سرطانی مریض ہوں گے ، جو لاعلاج ہوں گے اور ان کی از بس خطرناک و موذی سرطانی بیماری کی بنا پر انہیں دوسرے شفا پانے والے مریضوں کی طرح یہاں سے ہجرت کر کے جہانِ حسن و سرور میں جانے کی کبھی اجازت نہیں ملے گی ۔ لہٰذا مُشرک آتشِ حسرت و یاس

کے کربِ شدید و مدام میں اس طرح رہیں گے کہ انہیں نہ موت آئے گی نہ وہ لذتِ حیات سے آشنا ہی ہوں گے۔

حاصلِ کلام یہ کہ جہانِ حسن و سرور میں اہلِ حسن و سرور جاتے ہیں جنہیں حسن و زندگی کی آرزو ہوتی ہے اور جہانِ نار میں بشری سمندروں کو جانا پڑتا ہے، جنہیں حسن و زندگی کی نہیں بلکہ نار کی آرزو ہوتی ہے، لیکن انہیں اس کا شعور نہیں ہوتا۔

مطبوعہ فیروز سنز لمیٹڈ لاہور۔ باہتمام عبدالسلام پرنٹر اور پبلشر